محمد خالد عابدی

ایک مطالعہ

محمد خالد عابدی اپنی فیملی کے ساتھ

محمد خالد عابدی : محو خوشخطی

ڈاکٹر رضیہ حامد، حضرت اختر سعید خاں اور محمد خالد عابدی

محمد خالد عابدی

ایک مطالعہ

مرتّبین

ڈاکٹر رضیہ حامد　　رہبر جونپوری

کتاب : محمد خالد عابدی ایک مطالعہ
مرتبین : ڈاکٹر رضیہ حامد، رہبر جونپوری
تعداد : ۶۰۰
سنِ اشاعت : ۲۰۰۷ء
کمپیوٹر کمپوزنگ : لاریب کمپیوٹر سینٹر، بھوپال۔
کمپوزر : محمد نعیم انصاری رعذرا خان
طباعت :
قیمت : تین سو روپیے (Rs. 300/-)

ملنے کے پتے

۱۔ مکتبہ عابدیہ، ۵۴۵۔ دِل آرام ہاؤس، ہوا محل روڈ، بھوپال۔

۲۔ محمد خالد عابدی، رائل ہومس فلیٹ نمبر G-3، ۱۷ چوبدار پورہ، پرانا قلعہ بھوپال۔

۳۔ لاریب کمپیوٹر سینٹر، اسکائی ٹاور، نزد اسٹیٹ بینک سلطانیہ روڈ، بھوپال۔

۴۔ مرکز ادب، قادری لائبریری، گنوری روڈ، بھوپال۔

۵۔ بھوپال بک ہاؤس، بدھوارہ، بھوپال۔

انتساب

تعلیم و تعلّم سے شغف

اور اُردو زبان و ادب سے

محبت اور دلچسپی رکھنے والی شخصیت

ڈاکٹر سیّد محمد حامد صاحب

کے نام

فہرست

پیش لفظ

محمد خالد عابدی علم وادب کے گہوارے بھوپال سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھیں مطالعہ کا شوق اوائل عمر سے ہے۔ تقسیم وطن کے بعد اردو شعروادب کی بساط کسی نہ کسی حد تک لپیٹی جاچکی تھی۔ مگر بھوپال میں اردو کی جڑیں کافی گہری تھیں۔ اسکولوں میں اساتذہ اپنے معلموں سے گہری وابستگی رکھتے تھے اور ان کی تعلیم کے ساتھ ذہنی تربیت دینا بھی ان کا شعار تھا۔ اپنے استادوں کی حوصلہ افزائی سے محمد خالد عابدی کا مطالعہ کا شوق پروان چڑھا۔

بھوپال میں تقریباً ہر تعلیم یافتہ گھر میں اپنی ذاتی لائبریری ہونا ناگزیر تھا علم وادب کا چرچا عام تھا۔ خالد عابدی نے جب شعور کی آنکھیں کھولیں اس وقت بھوپال میں کئی مستند ادیب وشاعر حیات تھے۔ جن کا نام اور کام بھوپال سے باہر بھی جانا پہچانا جاتا تھا۔ کئی ادبی انجمنیں نئی نسلوں کی رہبری کے لیے موجود تھیں۔ جن میں شاعروادیب اپنی تخلیقات پیش کرتے اور ان پر کھل کر بحث ہوتی۔ ان میں نوعمر، عمر رسیدہ کی کوئی قید نہیں تھی۔ نوعمروں کی رہبری کے ساتھ حوصلہ افزائی بھی کی جاتی تھی۔ یہی راہیں ان کو اعتماد اور وقار بخشتی تھیں۔

دنیائے ادب کی نامور ہستیوں کے بھوپال سے رابطے قائم تھے۔ بھوپال کے عوام اپنے زمانے کی تحریکات سے واقف ہی نہیں ان میں شامل بھی تھے۔ ترقی پسند تحریک کی دوسری بڑی سہ روزہ کانفرنس بھوپال میں منعقد ہوئی اس وقت کے حمیدیہ کالج میں جو منٹو ہال کی عمارت میں واقع تھا اس کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ بھوپال کے شہر قاضی سید سلیمان ندوی نے افتتاح کیا۔ بھوپال میں ترقی پسند تحریک بہت تیزی سے پروان چڑھی۔ جاں نثار اختر اور

صفیہ اختر اس کانفرنس کے روحِ رواں تھے۔ ان کے علاوہ قدوس صہبائی، احمد علی خاں، صہبا لکھنوی، احسن علی خاں، قمر جمالی، اشتیاق عارف، اختر سعید خاں، اظہر سعید خاں، کیف بھوپالی وغیرہ بھوپال میں اس تحریک کے بانیوں میں تھے۔

محمد خالد عابدی کا اپنے ماحول سے متاثر ہونا ناگزیر تھا۔ قلیل معاش کے باوجود ان کے والد نے ان کے مطالعہ کے شوق کو پروان چڑھایا۔ تعلیم کے مدارج طے کرنے کے ساتھ ہی کتابیں جمع کرنے کا شوق بھی پختہ ہوتا گیا۔ یہ ذاتی لائبریری آج مکتبہ عابدیہ کی صورت میں ایک شجر سایہ دار ہے، جس کے فیض سے کئی طالب علم اور دانشور فیضیاب ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔

ایم۔اے۔ اردو کرنے کے بعد انھوں نے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کے لیے برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال میں پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب کے زیرِ نگرانی رجسٹریشن کروایا۔ شومیِ قسمت خالد عابدی کی تھیسیس تکمیل کے قریب تھی جب ان کا تبادلہ بیتول ہو گیا۔ وہ آل انڈیا ریڈیو بیتول میں اپنی ڈیوٹی پر تھے کہ موسلا دھار بارش نے جل تھل کا سماں باندھ دیا۔ اس سے بے شمار لوگوں کے گھروں اور سامان کا نقصان ہوا خالد عابدی کا گھر نشیب میں تھا اس لیے کئی دن تک پانی کمروں میں بھرا رہا۔ تھیسیس کے اوراق اور بیش قیمت کتب ضائع ہو گئیں۔ اور خالد عابدی کا پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کرنے کا خواب ہنوز تشنۂ تکمیل ہے۔

خالد عابدی صرف مطالعہ ہی نہیں کرتے وہ ایک تخلیق کار، محقق، نقاد، مزاح نگار، ڈرامہ نگار ہیں۔ ان کی ادبی جہات کئی ہیں جن پر وہ کامیابی سے گامزن ہیں۔ ہند و بیرونِ ہند کے بے شمار دانشوروں نے ان کو خراجِ تحسین اور کلمہ ہائے خلوص سے نوازا ہے۔ خالد عابدی کی ادب میں انتھک محنت اور لگن کو دیکھتے ہوئے ان کے احباب نے یہ طے کیا کہ ان پر ایک کتاب مرتب کی جائے۔

رسالہ فکر و آگہی دہلی کے کام کے علاوہ میرے اپنے ہی کام تکمیل کے منتظر ہیں۔ آج کل میں نواب سلطان جہاں بیگم کی حیات اور خدمات پر ایک کتاب مکمل کرنے میں مصروف ہوں ایسے وقت میں خالد عابدی پر کتاب کے لانے کا فیصلہ ____ !! میں بہت مشکل میں پڑ گئی۔ مگر خالد عابدی کی اردو سے دیوانہ وار محبت، اس کے فروغ کے لئے ان کی جنون کی حد تک سرگرمیاں ادب، ادیب اور کتابیں جمع کرنے کے شغف نے میرے لئے

فیصلہ کرنا آسان کر دیا جو محمد خالد عابدی کے حق میں ہوا۔

محمد خالد عابدی پر بہت لکھا جا چکا ہے جو کئی رسالوں میں منتشر ہے۔ ان کی تلاش اور نئے مضامین لکھوانا جان جوکھم کا کام تھا۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ خالد عابدی کی شخصیت اور خدمات کے ہر پہلو کو مکمل طور پر اس کتاب کے قاری کے سامنے پیش کر دیں۔ یقیناً خالد عابدی کو ابھی اور آگے جانا ہے۔ امید ہے وہ اسی جوش و خروش سے اردو کے فروغ کے لئے کام کرتے رہیں گے۔

آخر میں یہ بات بھی واضح کرنا ضروری ہے کہ ریاستی دور میں بھوپال کا جو اعلیٰ ادبی معیار اور وقار تھا اس کا ایک سبب یہ تھا کہ اہلِ علم اور شرفاء کے بیشتر گھروں میں علمی، ادبی اور دیگر موضوعات سے متعلق کتابوں کا خاصا ذخیرہ ہوا کرتا تھا۔ لیکن حالات کی تبدیلی کے نتیجے میں وہ سب کچھ خواب و خیال ہو کر رہ گیا ہے۔ اگر قارئین اسے تعلّی سے تعبیر نہ کریں تو اس وقت صرف اقبال لائبریری، باب العلم پبلیکشنز اور قادری لائبریری کے علاوہ محمد خالد عابدی کا مکتبۂ عابدیہ ایسے ادارے ہیں۔ جہاں نایاب اور اہم کتابوں کا بڑا ذخیرہ موجود ہے، مکتبۂ عابدیہ محمد خالد عابدی کا ایک بڑا کارنامہ ہے جسے جتنا بھی سراہا جائے کم ہے۔ انھوں اپنے کتب خانے کے کیٹلاگ وغیرہ کو بہت سلیقہ سے مرتب کیا ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ جناب محمد خالد عابدی پر مواد جمع کرنے میں ان کی بیٹیوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جس کی وجہ سے یہ کام جلد تکمیل کے مراحل طے کر سکا۔ ان کے لئے دلی دعائیں۔

رضیہ حامد

حرفِ آغاز

محمد خالد عابدی ادبی، تہذیبی اور ثقافتی شہر بھوپال میں ۱۷/اگست ۱۹۴۷ء میں پیدا ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان نے آزادی کی کروٹیں لی تھیں اور ملک نے غلامی کی زنجیروں سے چھٹکارا حاصل کیا تھا۔ اس زمانے میں بھوپال شہر تعلیمی اداروں کے لحاظ سے گو بہت وسیع تر نہ تھا اس کے باوجود انھوں نے نہ صرف درسی میدان سر کرلیا بلکہ یہیں سے قابلِ قدر ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔

محمد خالد عابدی کے خمیر میں یہاں کی ادبی اور شعری آب و ہوا کی آمیزش ہونے کی وجہ سے ان میں بھی وہ تمام تر خوبیاں جلوہ گر تھیں جو ایک اچھے ادیب میں ہونی چاہیئے۔ انھوں نے باوجود ملازماتی ذمہ داریوں کے اپنے ادبی رجحانات کو جلا بخشی اور ادب کے بیشتر شعبوں سے خود کو وابستہ رکھا۔ ریڈیائی ڈراموں، اسٹیج ڈراموں، افسانوں، طنزیہ و مزاحیہ مضامین، مراسلاتی و ذاتی انٹرویوز اور فلمی مضامین وغیرہ کے کئی مجموعے انھوں نے ادبی دنیا کو پیش کئے جسے کافی سراہا گیا۔ تحقیقی میدان میں بھی انھوں نے کئی بڑے اہم کارنامے انجام دیے۔ جن میں ''شعرائے اجین'' اور ''اجین کے ہندو شعراء'' کے ساتھ ساتھ انھوں نے عبدالغفور نساخ کی تلاش و جستجو میں بے حد جاں فشانی کی اور اسے منظرِ عام پر لاکر ادبی دنیا میں اپنی ایک شناخت بطور محقق قائم کی، جس کے لئے انھیں ملک کے نامور ادباء و ناقدین کی جانب سے سندِ تحسین حاصل ہوئی اور بہت سے اداروں نے ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں اعزازات و استقبالیہ سے سرفراز کیا۔ پروفیسر عنوان چشتی، ڈاکٹر قمر رئیس، جناب رفعت سروش، سید شرافت علی ندوی وغیرہ جیسے اہلِ قلم نے اپنے اپنے طور پر خالد عابدی کی ادبی خدمات کو سراہا ہے۔ جناب رفعت سروش خالد عابدی سے متعلق اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:۔

> ''ایک بات جو موصوف کی جملہ سرگرمیوں کو سامنے رکھ کر کہی جاسکتی ہے
> وہ یہ ہے کہ تخلیقی سرچشمہ اپنی جڑیں ادھر اُدھر ضرور رکھتا ہے مگر جب مخرج سے
> پھوٹ کر ندی کی شکل اختیار کرتا ہے تو چشمہ کی تمام تہوں کا جوہر اس ندی میں
> نمودار ہوکر اکائی بن جاتا ہے۔''

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ خالد عابدی نے ان تمام ادبی جہتوں کو مخرج کے ذریعہ ندی کا روپ دے دیا ہے جسے ادبی شعائر سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

محمد خالد عابدی نے جہاں ادب اور تحقیق کے ذریعہ اپنی ایک شاندار مثال قائم کی ہے وہیں انھوں نے اپنے تمام تر محدود وسائل کے باوجود ایک خوبصورت اور قیمتی لائبریری کے قیام کو بھی زینت بخشی ہے جس میں دور قدیم سے لیکر عصر جدید تک کی ہزاروں قیمتی اور نایاب کتابیں موجود ہیں جن سے نہ صرف طلباء و طالبات بلکہ تمام ضرورت مند لوگ استفادہ کرتے ہیں۔ ان کی اس ذاتی لائبریری کے متعلق سید شرافت علی ندوی صاحب فرماتے ہیں:۔

> "میں نے ان کی ذاتی لائبریری کی زیارت کی ہے۔ موصوف نے اپنے ادبی نیز علمی ذوق کے تحت مذہبی، علمی اور تنقیدی کتب کا نایاب ذخیرہ جمع کر رکھا ہے۔ تقریباً چار ہزار سے زائد تصنیفات یہاں موجود ہیں۔ ہندو پاک کے معیاری رسائل، مشاہیر علم کے خطوط اور نادر تصاویر سلیقہ اور ترتیب کے ساتھ یہاں آپ کو مل جائیں گے۔"

محمد خالد عابدی کی ادبی خدمات اور ان کے ذوقِ سلیم کے سلسلے میں صرف دو قابلِ قدر شناسائے ادب کے تاثرات پیش کیے گئے ہیں جبکہ اس طرح کی تحسینی اور تعریفی تحریریں ان کی خدمات کے اعتراف میں متعدد اہلِ قلم نے تحریر کی ہیں۔

محمد خالد عابدی کو میں تقریباً تین دہائیوں سے جانتا ہوں اور ان کی ادبی سرگرمیوں سے واقف ہوں۔ انھوں نے جس طرح اپنی ادبی چھاپ ذہنوں پر نقش کی ہے اسی طرح اپنے اخلاق و اطوار سے بھی دلوں کو مسحر کیا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو میں ایک ذمہ دار عہدے پر فائز ہوتے ہوئے بھی لوگوں سے خلوص کے ساتھ پیش آنا، ہر چھوٹے بڑے فنکار اور شاعر کا خیال رکھنا اور سب کے ساتھ انصاف کرنا ان کی فطرتِ ثانیہ ہے۔ میں نے یہاں تک دیکھا ہے کہ اگر ان کو یہ احتمال ہو کہ آل انڈیا ریڈیو کا دعوت نامہ بذریعہ ڈاک بروقت کسی فنکار یا شاعر کو نہیں مل سکے گا تو وہ اپنا وقت اور پیٹرول صرف کر کے خود اس تک پہنچانے کی سعی کرتے ہیں، یہ جذبۂ ادب نوازی یا ادیب نوازی آج بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔

یہ دیکھ کر واقعی خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ ان تمام بکھرے مضامین اور اوراق کو یکجا کر کے اسے کتابی شکل دینے کے لیے قرعۂ فال محترمہ ڈاکٹر رضیہ حامد صاحبہ اور میرے نام نکلا۔ مجھے امید ہے کہ زیرِ ترتیب کتاب کے منظرِ عام پر آنے سے خالد عابدی کی تخلیقی و تحقیقی خدمات کے روشن پہلو سامنے آئیں گے جو اب تک مخفی تھے۔

رہبر جونپوری

کچھ اپنے بارے میں۔۔۔۔

محمد خالد عابدی

قلم سے میرا رشتہ گزشتہ چالیس سال سے ہے۔ اس اثناء میں میرے فلمی مضامین کی تعداد خاصی رہی ہے۔ میں اوائل میں فلمی اخبار و رسائل میں لکھتا تھا میرے مضامین حلقۂ احباب میں پسند کیے جاتے تھے لیکن میں نے محسوس کیا کہ خاندان کے اور محلے کے بزرگ نیز سنجیدہ حضرات میرے عمل سے خوش نہیں ہیں انہیں میرے فلمی مضامین ناپسند تھے لیکن میں نے اس کی پروانہیں کی۔

میرے فلمی مضامین اس زمانے کے کہکشاں بمبئی، سب رنگ حیدرآباد، تیج دہلی، پرتاپ دہلی، انقلاب بمبئی، اردو ٹائمز بمبئی، بسنے ایڈوانس بنگلور، سالار بنگلور، نگینہ کشمیر، لگن سہارن پور، فن اور فن کار کانپور، فلم ویکلی کلکتہ وغیرہ متعدد اخبار و رسائل تھے جن میں میرے فلمی مضامین شائع ہوتے تھے۔

بھوپال کے کچھ سنجیدہ حضرات نے بھی مجھ سے کہا کہ آپ کو اللہ نے مضمون لکھنے کی صلاحیت ودیعت فرمائی ہے تو آپ ان فلمی شخصیات وغیرہ پر کیوں لکھتے ہیں، ادب پر لکھیے، شاعری، افسانہ، ڈرامے پر طبع آزمائی کیجیے۔ مجھے ان کی یہ تجویز پسند نہیں آئی کہ میں فلمی مضامین لکھنا ترک کردوں۔

میں جہانقدر صاحب چغتائی کا شاگرد تھا۔ جب ان کے یہ علم میں آیا کہ میں فلمی مضامین لکھتا ہوں تو انہوں نے بھی ناگواری ظاہر کی۔ چغتائی صاحب ہم طلباء سے بہت شفقت فرماتے تھے ان کا اردو پڑھانے کا طریقہ بہت دلچسپ ہوا کرتا تھا۔ کلاس میں ایک دن گویا ہوئے کہ میرے پڑھائے ہوئے طلباء میں ڈاکٹر، انجینئر، پروفیسر ہوئے لیکن کوئی ''رائٹر'' نہیں ہوا، میں کلاس میں کھڑا ہوا، اور چغتائی صاحب سے میں نے کہا ''سر میں بنوں گا رائٹر''۔ فلمی مضامین تو خوب چھپ رہے تھے لہٰذا ادبی مضمون لکھنے میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا۔ خالد بھوپالی تخلص اختیار کیا۔ حضرت عشرت قادری کے تلامذہ میں شامل ہوگیا۔ کچھ غزلیں شائع بھی ہوئیں۔ عشرت قادری صاحب نے سال ڈیڑھ سال بعد کہا کہ شاعری آپ کے بس کی نہیں۔ آپ تو نثر لکھا کیجیے۔ موصوف خود بھی افسانہ نگار سے شاعر ہوئے تھے۔ ہمیں فیصلہ کرنے میں کسی غور و خوض کی ضرورت نہیں پڑی۔ چنانچہ ہم نے افسانے بھی لکھے، ڈرامے بھی لکھے۔ افسانے کا مجموعہ شائع ہوا، ڈرامے کے مجموعے بھی شائع

ہوئے۔ حضرت کوثر چاند پوری، علامہ جمیل مظہری، ڈاکٹر صفدر آہ سیتا پوری اور ڈاکٹر قمر رئیس صاحبان سے توصیفی تحریریں بھی حاصل ہوئیں۔

گاندھی شتابدی کے زمانے میں کالج سطح کے مقابلے میں گاندھی جی پر مضمون نویسی میں انعام بھی پایا۔ عشرت قادری صاحب، جہانقدر چغتائی صاحب اور عبدالقوی دسنوی صاحب نے پیٹھ تھپتھپائی۔ گویا رائٹر ہونے کی مہر ثبت کردی۔ ان بزرگوں کی دعاؤں اور شفقتوں کا فیضان ہے کہ اب سے بارہ سال پہلے تک کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اکیڈمیوں سے انعامات بھی ملے ہیں۔ بی۔بی۔سی۔ لندن سے انٹرویو بھی نشر ہوا ہے۔ اردو زبان وادب سے شغف کے باعث ہی آل انڈیا ریڈیو میں پروگرام ایکزیکیٹو کی ملازمت ملی۔

میرے ساتھ کے کئی لکھنے والے تائب ہو گئے وہ تنقید برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ حسد اور منافقت کے شکار بھی ہوئے۔ آخرش انہوں نے ادب کو خیرباد کہہ دیا۔ بہر حال میں اپنے محاذ پر قائم ہوں طنزاً ہر طرح کے لقب بھی پا چکا ہوں۔

بدرو اسطی، رفیع شبیر، عظیم الدین احمد، عبدالسنان خاں اور حسن احمد میرے ایسے احباب ہیں جو عرصے سے مجھ پر اخلاقی دباؤ ڈال رہے تھے کہ تمہارا متنوع کام ہے چنانچہ ادبی خدمات کے اعتراف میں کوئی سوونیئر وغیرہ شائع ہونا چاہیے۔ تین چار سال سے یہ کوشش چل رہی تھی جس نے سوونیئر سے کتاب کا روپ لے لیا۔ سوونیئر کی اشاعت کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ لیکن ''کتاب'' کی اشاعت بہر حال مسئلہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس مسئلے کا بھی حل نکال دیا۔ ڈاکٹر رضیہ حامد صاحبہ جو کئی کتابوں کی مصنفہ، مؤلفہ اور مرتبہ اور اشاعتی ادارہ باب العلم کی سربراہ ہیں جہاں وہ بھوپال کے ادیبوں، شاعروں اور ان کی تصنیفات و تالیفات کے لئے بیحد فکرمند رہتی ہیں وہاں اسلاف بھوپال کی خدمات کو منظرِ عام پر لانے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتی ہیں اور رہبر جونپوری صاحب جو کہ معروف شاعر و ادیب ہیں ان دونوں کی مشترکہ کوششوں نے ساری قباحتیں، صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے، اور تمام دقتوں کا سامنا کرتے ہوئے ''محمد خالد عابدی: ایک مطالعہ'' کتاب ترتیب دی ہے جو آپ کے دست مبارک کا لمس حاصل کر رہی ہے۔

میں ڈاکٹر رضیہ حامد صاحبہ، ڈاکٹر سید محمد حامد صاحب اور رہبر جونپوری صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے میری خدمات کو سراہا، مجھے عزت دی۔

شخصیت

آپ سے ملیئے

ابراہیم یوسف

میں تعارف کا مطلب یہ سمجھتا ہوں کہ اپنے کمرے میں بیٹھا ہوں یا سڑک پر جارہا ہوں میرے ساتھ میرا ایک دوست بھی ہے کہ دوسرا دوست آجاتا ہے یا سڑک پر مل جاتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو اجنبی نظروں سے دیکھتے ہیں اور میں سمجھ جاتا ہوں کہ وہ ایک دوسرے کو نہیں پہچانتے، اس لئے کہتا ہوں کہ ''آپ سے ملیئے آپ ہیں مسٹر فلاں اور آپ مسٹر فلاں'' وہ دونوں فوراً مسکرا کر ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے ہیں اور کہتے ہیں آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ یہ خوشی کبھی تکلفاً ہوتی ہے کبھی رسماً اور کبھی حقیقی اور پُر خلوص، جس طرح یہ خوشی کبھی تکلفاً کبھی رسماً اور کبھی حقیقی ہوتی ہے اسی طرح تعارف کرانا بھی کبھی رسماً ہوتا ہے کبھی تکلفاً اور کبھی حقیقی اس لئے یہ مسئلہ بڑی نازک شکل اختیار کئے ہوئے ہے۔ بس یوں سمجھئے اس میں قدم قدم پر کانٹے ہی کانٹے ہیں اور پھول کم۔ اس لئے کبھی جس کا تعارف کرایا جاتا ہے اُس کے ناراض ہونے کا خطرہ ہوتا ہے تو کبھی جس سے تعارف کرایا جائے اُس کے بگڑ جانے کا خطرہ اور بے چارہ تعارف کرانے والا کہتا رہ جاتا ہے کہ ''بھائی صاحب مجھ پر کیوں ناراض ہو رہے ہو؟ میں تو آپ دونوں کا مخلص ہوں۔ پھر بھلا اُس کی سنتا کون ہے اور وہ دل ہی دل میں پچھتا تا رہتا ہے یہی نہیں بلکہ تعارف کرانا ایک مشکل فن بھی ہے۔

اس لئے کہ خدانخواستہ آپ نے تعارف کراتے وقت کہہ دیا کہ ''آپ ملاحظہ ہوں ذرا آپ سے بھی ملیئے'' تو آپ خود سوچئے کہ آپ کہاں تک سلامت رہیں گے۔ بہر حال تعارف کی سماجی وتہذیبی اہمیت سے انکار نہیں اور اس دشت کے پرخار ہونے کے باوجود اس میں قدم رکھنا ہی پڑتا ہے۔ اب پگڑی سلامت رہے گی یا نہ رہے گی اور عزت سادات کا کیا ہوگا یہ سب خدا پر چھوڑنا پڑتا ہے کہ خدا ہی اس گناہ کا منتقم حقیقی ہے تعارف چونکہ ایک سماجی ضرورت ہے اور ادب ایک سماجی وتہذیبی عمل اس لئے یہ حضرت تعارف ادب میں بھی شان سے وارد ہوگئے ہیں۔ ادیبوں کے تعارف کرائے جاتے ہیں بلکہ مزید تعارف کرائے جاتے ہیں۔ ان کے ادب کا تعارف کرایا جاتا ہے اور مزید تعارف کرایا جاتا ہے۔ کتابوں کا تعارف کرایا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ جانے

پہچانے ادیبوں کا تعارف اور مشہور کتابوں کا تعارف ہوتا یہ دوسری بات ہے کہ تعارف کرانے والوں کے پیمانے مختلف ہوتے ہیں اور ان ہی پیمانوں کو سامنے رکھ کر وہ تعارف کراتے ہیں۔

تو صاحب آپ سے ملیئے آپ ہیں حضرت محمد خالد عابدی۔ حضرت اس لئے کہ ادب میں مسٹر یا شری ہمیشہ سے ذات باہر رہے ہیں۔ بے حد مخلص، علم دوست اور ادب کے دیوانے، کتابیں اور رسائل جمع کرنے کا دیوانگی کی حد تک شوق۔ آپ کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین، نام، صاحب مکان، گمشدہ شیروانی، خواہ مخواہ، سالانہ خریداری، فلم انسائیکلو پیڈیا وغیرہ وغیرہ شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ تحقیقی و تنقیدی مضامین، خلیق برہانپوری، سراج میر خاں سحر بھوپالی، میر حیات اور شاعری، آپ کی محنت اور کاوش کے آئینہ دار ہیں۔ ادیبوں سے انٹرویو لینا آپ کا محبوب مشغلہ ہے لیکن آپ کا اصل میدان ریڈیو ڈرامہ ہے، جو اکثر بھوپال ریڈیو اور دوردرشن بھارتی سے نشر ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔

ایک بات میں آپ کے کان میں کہہ دوں کہ آپ فرہاد بھی ہیں کہ آپ نے ریڈیو ڈراموں کا مجموعہ چھپوا ڈالا۔ فرہاد کو ممکن ہے آسانیاں رہی ہوں اور وہ جوئے شیر لانے میں کامیاب ہو گیا ہو مگر آج کے زمانے میں فرہاد ہوتا تو اس کو یہی حکم ہوتا کہ اگر شیریں کو حاصل کرنا ہے تو ایک کتاب چھپوا کر لاؤ اور یقین ہے کہ اُس کے سارے حوصلے پست ہو جاتے اور وہ کان پکڑ کر عشق شیریں سے توبہ کر لیتا۔ خالد عابدی صاحب نے آپ خود سوچیئے کس قدر حوصلے اور ہمت کا ثبوت دیا ہے کہ کتاب چھپوا ڈالی۔ "ریڈیو ڈراما" نام کی چیز کا ذاتی طور پر قائل نہیں کہ یہ ڈرامہ ہوتا ہے۔ مگر اُس سے انکار بھی نہیں کر سکتا کہ اس نے وہ مقبولیت حاصل کر لی ہے کہ ادب کی دوسری اصناف اس کے سامنے پھیکی پڑ گئی ہیں۔

دوسری اصناف ادب سے لطف اندوز ہونے کے لئے پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے۔ جب کہ ریڈیو ڈرامے کے لئے کسی شرط کی ضرورت نہیں۔ بس ریڈیو کے کان موڑ دیئے اور ڈرامہ سنیئے اگر ریڈیو نہیں ہے تو کسی ہوٹل میں بیٹھ جایئے کسی پان کی دوکان پر کھڑے ہو جایئے اور ڈراما حاضر ہے۔ اگلے وقتوں میں داستان گوئی ایک فن تھا اور داستان گو مخصوص محفلوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ شاعر مشاعروں میں اپنے جوہر دکھلاتے تھے۔ اگر داستان گو کو محفل اور شاعر کو مشاعرہ نصیب نہیں ہوتا تھا تو بے چارے اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کے لئے تڑپتے رہتے تھے۔ مگر ریڈیو ڈرامہ نگار کو نہ تو محفلوں کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ مشاعروں کی اس کو سب سے بڑا اطمینان ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ پیش کر رہا ہے لوگوں تک پہونچ جائے گا۔ ریڈیو ڈراما لکھنا ایک بڑا

محفوظ فن بھی ہے اگر شاعر کو مشاعرے میں لوگ ناپسند کرتے ہیں تو ہوٹنگ کر کے بے چارے شاعر کی سٹی گم کر دیتے ہیں اگر اسٹیج ڈراما نگار کو لوگ ناپسند کرتے ہیں تو گندے انڈے اور سڑے ہوئے ٹماٹروں سے اسکا سواگت کرتے ہیں اگر ریڈیو ڈراما نگار کو لوگ ناپسند کریں تو اپنے ریڈیو سیٹ توڑ ڈالیں خود اپنا نقصان کریں گے۔ بہر حال ریڈیو ڈراما نگار محفوظ رہے گا۔ خالد عابدی صاحب نے اس قدر محفوظ فن کو اپنا کر اپنی بالغ نظری کا ثبوت دیا ہے۔

خالد عابدی صاحب کے ان ڈراموں کی فنی خوبیوں اور خامیوں پر ڈاکٹر اخلاق آثر نے روشنی ڈالی ہے اب اُس پر مزید کچھ کہنا غیر ضروری ہے۔ بہر حال پھر بھی ان ڈراموں کو دیکھنے کے بعد خالد صاحب کی اس فن پر گرفت کا ثبوت ملتا ہے۔ خالد صاحب کے اس مجموعے "آواز نما" کے بارے میں یہ چند سطور لکھ کر مجھے خوشی ہو رہی ہے اردو میں ڈراموں اور ریڈیو ڈراموں کے مجموعے کم ہیں۔ اس لحاظ سے آواز نما اردو میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ ان ڈراموں کو پڑھ کر ضرور کہیں گے کہ "خالد صاحب آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی" اور یقیناً یہ خوشی نہ تو تکلفاً ہوگی اور نہ رسماً بلکہ حقیقی ہوگی۔

● **ہمت رائے شرما**

آرٹ ڈائریکٹر، شاعر، ادیب

آج بھوپال ریڈیو اسٹیشن میں داخل ہوا تو ایک عجیب مسرت حاصل ہوئی۔ جناب محمد خالد عابدی صاحب نے انٹرویو (جو میری شخصیت اور فن کے بارے میں تھا) لے کر اس خاکسار کی ہمت افزائی کی۔ آج پہلی بار بھوپال ریڈیو اسٹیشن پر انٹرویو لیا گیا ہے۔ جس سے میں بے حد متاثر ہوا ہوں۔

۲۶ ر ستمبر ۱۹۹۰ء

محمد خالد عابدی: جیسا میں نے دیکھا اور پایا

انعام لودھی

علم کی قدر و قیمت یا تو ایک عالم جانتا ہے یا علم سے محروم جو شخص علم کی قدر و قیمت جان کر اسے حاصل کرے اور پھر سوچ سمجھ کر عمل پیرا ہو تو "سونے پر سہاگہ" ایسے ہی شخص ہیں جناب محمد خالد عابدی جو کہ ایک متوسط گھرانہ کے چشم و چراغ ہیں۔ جہاں دنیاوی علم کا چرچہ نہیں تھا (عزیزم خالد عابدی سے معذرت) مگر علم بصیرت یعنی مذہب کا بول بالا اور دبدبہ بار ہا۔ محترم مقام عابد بھائی (خالد کے والد محترم) جہاں تک میرے علم میں ہے پابند صوم وصلوٰۃ اور تقویٰ کے پابند انسان تھے۔ دیگر اہل خانہ کے بارے میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ لیکن عزیزم محمد خالد عابدی کو لڑکپن سے ہی پابندی سے نماز روزہ وغیرہ کی ادائگی کرتے دیکھا جس پر اَلْحَمْدُ لِلّٰہ وہ آج بھی بسرو چشم پابند ہیں۔ دورِ حاضر میں پراگندہ ماحول میں کسی نوجوان کا کردار اتنا مستحکم کم ہی دیکھنے میں آیا۔ کیونکہ محمد خالد عابدی نے پیشہ اور شوق کی بنیاد پر جن لائنوں کو اختیار کیا وہ کسی بھی پارسا متقی کو گمراہی کی راہ پر گامزن کر سکتی تھیں۔

جی ہاں محمد خالد عابدی کی فلمی دنیا اور انکی ہستیوں کی زندگی کی معلومات حاصل کرنے اور تبصرے کرنے کا شوق رہا ہے جو کہ عموی طور پر ایک خالص دنیادار انسان کا کام ہو سکتا ہے مگر کردار کی پختگی اور بچپن میں اندرون خانہ حاصل کی ہوئی تربیت کا نتیجہ سامنے ہے کہ محمد خالد نے اپنے والد کے نام کو اپنے نام کا ایک امٹ حصہ بنالیا ہے۔ اپنے نام کے ساتھ عابدی استعمال کرتے ہیں۔ خالد عابدی کا چہرہ ڈاڑھی سے معریٰ ہے مگر راقم انہیں بغیر ڈاڑھی والا مولوی تصوّر کرتا ہے یہ شرف ہر کس وناکس کے حصہ میں نہیں آتا۔

اپنے فرائض منصبی آل انڈیا ریڈیو میں ادا کرتے وقت جب وہ مدعو مقررین کو تقریر کے لیے عنوانات پیش کرتے ہیں تو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ متعلقہ لائن سے ناواقف ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مطالعہ کرنے کے شوقین ہیں اور مطالعہ کے شوق نے موصوف کو ایک نجی لائبریری کا مالک بنا دیا ہے۔ جس میں ہمہ رنگ موضوعات سے متعلق کُتب موجود ہیں۔ بڑی تکلیف دہ بات ہے کہ خالد کی درجنوں کُتب پُرانے زمانہ کے ناپختہ مکان کی دیواروں میں بنی ہوئی الماریوں میں رکھی تھیں اور خالد اپنی

ملازمت کے سلسلہ میں تبادلوں کے تحت ادھر سے ادھر جاتے رہے اور قیمتی کتب دیمک کی خوراک بنتی گئیں۔ کیوں کہ دیگر اہل خانہ کو ان کی دیکھ بھال سے قطعی دلچسپی نہیں تھی۔ "مرے پر سو درے" کہ ۱۹۹۸ء میں جب وہ بیتول مدھیہ پردیش میں تعینات تھے مگر ٹریننگ کے لئے دہلی گئے ہوئے تھے تو باران رحمت ان کے لئے زحمت کا سبب بن گئیں۔ ۲۵ راگست ۹۸ء اور ۱۴ ستمبر ۱۹۹۸ء کے درمیان بیتول میں بارش ہوئی اور خوب ہوئی۔ وہاں کی ریڈیو کالونی نشیبی علاقہ میں واقع تھی نتیجہ میں خالد میاں کی کتب لگدی بن گئیں۔ کیوں کہ مکان کے اندر آٹھ دس فٹ پانی تھا۔ ان کتب کی تعداد سات سو سے تجاوز کرتی ہے۔ یہ پانی گھر کے اندر مسلسل پانچ یوم باقی رہا۔ یہ تباہی دیکھ کر بیبنہ طور پر خالد رو پڑے اور کئی ہفتوں بلکہ مہینوں سیل رواں جاری رہا اور جب اس سال خالد سے میری طویل گفتگو ہو رہی تھی تو خالد اس وقت بھی پھوٹ پڑے آواز روندھ گئی کیوں کہ ان میں کچھ نادر و نایاب کتب بھی برباد ہو گئیں۔ کوئی دیگر کم ہمت ان کی جگہ ہوتا تو پست ہمتی کا شکار ہو کر اپنے ارادہ سے باز آتا مگر "واہ واہ شاباش خالد عابدی کہ تم عزم مصمم کے ساتھ آج بھی کم از کم ۱۶ الماریوں میں بھری ہوئی کتب کے تنہا مالک ہو۔"

راقم اس بات کا قائل ہے کہ جس شعبہ کی کافی شد بد نہ ہو اس میں قدم نہ رکھو۔ عجب اتفاق ہے کہ خالد عابدی میرے ہم مزاج ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہونے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ اسی دوران راقم کے پاس ریڈیو کا کورس پڑھنے اور پریکٹیکل کرنے کا عزم کیا اور اگر چہ اس میں مہارت حاصل نہ کی لیکن بدلہ میں ریڈیو آرٹسٹ بن گئے۔ اس دور میں موصوف الیکٹر سٹی بورڈ میں ملازم تھے۔ یہیں سے خالد سے میری شناسائی ہوئی بعد میں معلوم ہوا کہ یہ حضرت "دل آرام ٹیلرس" کے مالک عابد بھائی کے صاحبزادہ ہیں جن سے میرے خاندان کے دور کے سہی مگر دیرینہ تعلقات رہے ہیں۔ عابد بھائی کی ہمشیرہ قریشہ آپا سلطانیہ گرلس ہائی اسکول میں معلمہ تھیں اور میری تین بڑی بہنوں کی استانی رہی ہیں۔ یہاں یہ ذکر بے جا نہ ہوگا کہ خالد عابدی کی دادی محترمہ خدیجہ بی صاحبہ بھوپال کے مشہور مفتی خاندان کی بیٹی تھیں۔ دادا محترم حافظ محمد صادق صاحب بڑے عالم اور محدث دیو بند تھے۔ والد محمد عابد صاحب سلطانیہ انفنٹری بھوپال میں ملازم تھے لیکن یہاں فوج کی ملازمت راس نہ آئی تو حیدر آباد گئے اور وہاں بھی فوج میں بھرتی ہو گئے۔ لیکن مختصر یہ کہ اپنی دوکان کے مالک ہو گئے۔ ایمانداری کا یہ عالم تھا کہ گراہک کو کپڑے کی بچی ہوئی کترن بھی واپس کر دیا کرتے تھے۔

جیسا کہ شروع میں عرض کیا تھا کہ محمد خالد عابدی ہمہ قسم کی کتب اپنی زنبیل میں رکھتے ہیں تو

شوق بھی مختلف ہیں۔ بچپن میں ان کی کتابوں میں تتلیوں اور پھولوں کے فوٹو چسپاں ہوتے تھے۔ ڈاک ٹکٹ اور سکے جمع کرنے کا بھی شوق فرماتے ہیں۔ حالانکہ آپ کو شاید یقین نہ آئے کہ پڑھنے لکھنے میں خالد ہمیشہ پھسڈی ہی رہے مگر کچھ کر گزرنے کی سمجھ اور تڑپ نے ایم اے اردو میں فرسٹ ڈویژن اور سیکنڈ پوزیشن دلا دی کیوں کہ اب شعور کی ایک منزل طے کر چکے تھے اور ان کمیوں کا ازالہ کرنا چاہتے تھے۔

جوانی کے دور میں جب نوجوان لہولعب اور کچھ نوجوان خرافات میں مصروف ہو جاتے ہیں خالد عابدی نے اپنے والد کی حیات ہی میں لائبریری کی شکل میں مکتبہ عابدیہ قائم کر لیا تھا جو اپنی ضخامت بڑھاتا جا رہا ہے۔ اس میں مختلف موضوعات پر کتب، رسالے، اخبار ادیبوں اور شاعروں کے کوائف نامے بقید حیات اور مرحوم شعراء ادباء اور صحافیوں کے فوٹو گراف موجود ہیں۔ اس لائبریری کے لئے خالد صاحب نے اپنے نفس اور ضمیر پر کیا کیا مظالم کئے۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔ (گو کہ میں اس طرح شوق کی تکمیل کا قائل نہیں ہوں مگر خالد عابدی کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ واقعی بڑے دل گردہ کا کام ہے۔)

اپنی لائبریری ''مکتبہ عابدیہ'' سے خالد عابدی کو کس قدر لگاؤ بلکہ عشق ہے کہ گذشتہ چار سال سے اس کا کیٹلاگ تیار کرنے میں مصروف ہیں۔ تا حال یعنی جون ۲۰۰۶ء تک اٹھارہ رجسٹر تیار ہو چکے ہیں جو الگ الگ موضوعات پر مشتمل ہیں جیسے کہ عام طور پر منظم لائبریریوں میں ہوا کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے کسی سے مدد نہیں لی اپنے ذہن کے مطابق تشکیل دے رہے ہیں مگر موضوعات کا باقاعدہ اہتمام ہے مثلاً شخصیات۔ تحقیق و تنقید، افسانے، ڈرامے، ناول، ناولٹ، سفرنامے، رپورتاژ، انٹرویو، انشائیے، طنز و مزاح خطوط، تاثرات کا رجسٹر، خریداری رجسٹر بحریہ و موصولہ رجسٹر، صحافت، قلمی مخطوطات، ڈکشنری، فرہنگ، اصطلاحات، تلمیحات، شروح، عروض و قواعد، قصہ، داستان، حکایات پر مشتمل کتب، خصوصی نمبرات وغیرہ وغیرہ۔ یہ بڑی جاں فشانی اور عزم کے ساتھ حاضر دماغی والا کام ہے۔ فلم سے متعلق دو تین طرح کے رجسٹر بنانے کا کام بھی جاری ہے۔

مدھیہ پردیش میں اردو زبان کے موضوع پر جس میں موجودہ چھتیس گڑھ ریاست بھی شامل ہے۔ ضخیم فائلیں مرتب ہو چکی ہیں۔ خوبی یہ ہے کہ یہ تمام کام خود کی تحریر میں ہیں کیوں کہ کمپیوٹر خریدنے کی استطاعت نہیں۔ اگر کمپیوٹر خریدیں تو کتب و اخبارات و جرائد کی خریداری متاثر ہو گی۔ اس لئے کہ آمدنی محدود ہے۔ انتہائی دیانت اور ایمانداری سے فرائض منصبی انجام دیتے ہیں کیوں کہ اپنی آخرت کا بھی خیال ہے اس لئے کسی قسم کی ''اضافی آمدنی'' کا بھی سوال نہیں۔ یعنی یوں کہا

جائے کہ ''وَن مین شو'' ہے جو اپنے قوت بازو پر ہی چل رہا ہے۔

فلمی ادب کا شوق بچپن سے ہی ''مہنگا'' پڑا کیوں کہ اس سلسلہ میں کئی بار والدین کی سختیاں اور سزائیں بھی برداشت کی ہیں۔ کئی بار ان کے والد فلموں سے متعلق لٹریچر نذر آتش کر دیا کیوں کہ مذہبی ذہن کے حامل تھے اور شاید یہ سوچتے تھے کہ بیٹا بگڑ نہ جائے۔ مگر یہاں راقم یہ بات کہنے پر مجبور ہے کہ ہمارے معاشرہ میں پورے ملک میں بچہ کے رجحان کو سمجھنے والے اذہان کی کمی ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ عرض کرنے میں بھی گریز نہیں ہے کہ اگر عابد بھائی کہ یہ سختی روا نہیں ہوتی تو یہ عین ممکن تھا کہ خالد عابدی کے قدم بہک جاتے۔ مگر خالد دھن کے پکے ہیں انھوں نے یہ اس کا جاری رکھا اور آج آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت میں وہ فلموں، فلمی شعراء، ان کے گیتوں، موسیقاروں کے لئے ایک ریڈی ریکو کا کام انجام دیتے ہیں۔ فلم سے متعلق ان کے پاس نایاب کتب کا ذخیرہ ہے۔ بولتی فلمیں ۱۹۳۱ء میں شروع ہوئی تھیں خالد نے مکتبہ عابدیہ میں ۱۹۳۶ء تک کے قدیم رسائل مجلد کر کے محفوظ کر لیے ہیں۔

اپنے آرام کے وقت اپنے شوق اور ادھورے کام پورے کرنے کا جذبہ ہر کسی کو عطا نہیں ہوتا۔ خالد عابدی کو ڈاک ٹکٹ جمع کرنے کا بھی شوق ہے مگر صرف تاریخی اور ادبی یا فلمی حیثیت والے۔ اب یہ ٹکٹ مرزا غالب کا ہو، سرسید خاں کا ہو، علامہ اقبال کا یا کسی اور کا۔ ہندو پاک کے اس قسم کے ٹکٹ موصوف کے پاس موجود ہیں۔

خالد عابدی کا مزاج کیسا ہے اور وہ کیا چاہتے ہیں۔ چند سطور ہیں تحریر نہیں ہو سکتا اس کے لئے خالو کے ساتھ مختلف ادوار چند گھنٹے گزار کر ہی ان کو سمجھا جا سکتا ہے۔ وہ کسی کو نظر انداز ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ کسی کی غریبی اور مفلسی ان کے دل کو کچوکے لگاتی ہے۔ کسی ان پڑھ کی علم سے محرومی بھی انہیں گراں گزرتی ہے۔ اپنی جیب سے رقم خرچ کر کے شناساؤں کے کام کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر آل انڈیا ریڈیو پر اردو سیکشن کے پروگراموں سے متعلق ڈاک ارسال کرنے کے باوجود متعلقہ شاعر، نقاد یا مقرر کو مطلع کرنے کے لیے اس کے گھر تک پہنچ جانا۔ کسی ریسرچ اسکالر کو اس کی ضرورت کی کتاب یا کتب اور مواد فراہم کرنا۔ غرباء کی اور مساکین کی مدد مستحق کو تلاش کر کے کرنا۔ وغیرہ وغیرہ۔

مذکورہ بالا سطور سے منسلک ایک عمل اس وقت سرگرمی سے خالد مکمل کر رہے ہیں وہ ہے ہندوستان کے منتخبہ اور قابل ذکر شعراء و ادباء کی ڈائریکٹری ہے جس میں تقریباً پانچ سو نام شامل ہیں۔ ان میں کچھ نام ایسے بھی ہوں گے جو کہ لوگوں کو چونکا دیں گے کیوں کہ موجودہ گروپ

بازی کے دور میں متعدد ایسے نام ہوں گے جو کہ کسی گروپ میں شامل نہ ہونے کی وجہ سے ہر گروپ کی نظر اندازی، بے توجہی کا شکار ہیں۔ (گو کہ یہ گروپ بازی قدیمی ورثہ ہے مگر دور حاضر بلکہ رواں دور میں بام عروج پر ہے)

خالد عابدی شہر بھوپال اور بیرون بھوپال کے فن کاروں کو طلبی تحریری، ملی نوٹنگ یا اشتہاری پر اپنے پاس موجود مواد اپنے خرچ پر فراہم کرتے ہیں۔ (نہ ستائش کی تمنا نہ "صلے" کی "پرواہ" مگر واہ واہ قوم اردو کی بے حسی کو شکریہ ادا کرنا تو کجا فراہم کردہ کتب یا مواد واپس لوٹانے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کرتے۔ (شاید اسے سرقہ جائز تصور کرتے ہوں۔) ایسے حضرات میں طلباء ہی نہیں اسکالر اور پروفیسرس بھی شامل ہیں۔ (اس حمام میں سب ہی برہنہ ہیں)

خالد کو یہ سب کچھ وراثت میں ملا ہے۔ کیوں کہ ان کے والد محترم عابد بھائی کا مزاج کچھ ایسا تھا کہ دوسروں کی مدد کرتے تھے۔ ان جان لوگوں کی اعانت دبے ہاتھ سے کیا کرتے تھے۔ اگر کسی کی امانت ہو تو "امین" کا پورا حق ادا کرتے تھے۔ (یہ باتیں وثوق کے ساتھ تحریر کر رہا ہوں کیوں کہ خود آزمایا ہے)۔

مضمون طویل ہوتا جا رہا ہے۔ حرف آخر کے طور پر یہ ضرور کہنے پر مجبور ہوں کہ کسی اکادمی نے حتیٰ کہ مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے کبھی بھی عابدی کو اس قابل تصور نہیں کیا کہ کوئی ایوارڈ دیا جائے یا اعزاز کیا جائے کیوں کہ خالد کا کوئی گروپ نہیں ہے وہ کسی گروپ سے منسلک نہیں ہیں۔ وہ اپنی ذات میں انجمن ہیں۔

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضان محبت عام سہی عرفان محبت عام نہیں

● **شیخ سلیم احمد**

آل انڈیا ریڈیو بھوپال اسٹیشن پر آج آنے کا موقع ملا۔ جناب خالد عابدی صاحب نے مختلف موضوعات پر مجھ سے گفتگو فرمائی۔ میں اس کے لیے ان کا ممنون ہوں۔ عابدی صاحب جہاں خود بھی ایک صاحب علم اور ادب نواز انسان ہیں وہاں ان کا حسن اخلاق بھی مثالی ہے۔

ایک بات کا ایمانداری سے اعتراف نہ کرنا گناہ ہوگا اور وہ یہ کہ خالد عابدی کی ریڈیو کی فنی مہارت سے میں خاص طور پر متاثر ہوا۔

۳ر فروری ۱۹۹۲ء

خالد عابدی: قلمی چہرہ

بدر واسطی

چہرے پر تمازت پوشیدہ، ذہانت، درخشاں پیشانی علمیت کی نشانی، آدھے سے زیادہ سر صاف ہے کنگھے کا خرچ انکو معاف ہے، آنکھیں بولتی ہوئی دنیا کو تولتی ہوئی، گلابی گال بے نیاز ماہ و سال، طبیعت رنگین حالات سنگین، مقرر تیز رفتار مگر خوش گفتار، بے لگام بولتے ہیں کئی راز کھولتے ہیں، ہنستے ہنساتے ہیں زندہ رہنا سکھاتے ہیں، انکا شیوہ ہے بے باکی دور ہے ان سے چالاکی، دوست دشمن سبھی کے ہمدرد واقعی اک جواں مرد، کئی اصناف پر قلم رگڑتے ہیں یعنی یہ چوکھی ہی لڑتے ہیں، افسانہ و ڈرامہ و طنز و مزاح نگار فلموں کے مکمل جانکار، انکی نو کتابیں ہیں منظر عام پر کچھ اور منتظر ہیں بام پر، کتابیں خریدتے ہیں کسی بھی قیمت پر آفریں ہے ان کی ہمت پر، قوم کو دے دیا اک ہدیہ نام ہے مکتبہ عابدیہ، ادب کا حقیقت شناس کتابوں کا دیو داس، معلومات کا خزانہ شمع علم کا پروانہ، اسیری میں آزاد ساکنِ کتاب آباد، مرقع شوخی و شرارت و زندہ دلی جی ہاں محمد خالد عابدی۔

۱۷ راگست کو پیدا ہوئے بھوپال میں ان کی قسمت کا پانی بھی ہے بڑے تال میں، ۱۹۴۷ء کا زمانہ تھا فضا میں آزادی کا ترانہ تھا، گھر کا ماحول مذہبی ملا وہیں سے شعور نے پائی جلا، گھر ہی سے تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا بصیرت کا سورج طلوع ہوا، پھر اسکول میں داخل کرائے گئے تو اکثر تھیٹر میں فلم دیکھتے پائے گئے، جہانقدر چغتائی نے رہنمائی کی مکمل اسکول کی پڑھائی کی، دھیرے دھیرے اردو میں ایم۔ اے۔ کرلیا اس کی خدمت کا ذمہ اپنے سر لیا، لکھنے لکھانے سے رشتہ جڑ گیا زندگی کا رخ اسی طرف مڑ گیا، فلموں پر لکھتے تھے جب، عشرت قادری نے دکھائی راہ ادب، جا کے دیکھا مختلف دفاتر میں پر کسی کو نہ لائے خاطر میں، آخرش ریڈیو پسند آیا اس کے دفتر میں سکون پایا، اب بھی یہ نام کے ملازم ہیں۔ سچ میں اردو زبان کے خادم ہیں، قلم والوں کی ڈائریکٹری مرتب کی ہے اردو دنیا کو ایک سوغات دی ہے، ادیبوں شاعروں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں ٹھنڈے چولہوں میں آگ بھرتے ہیں، ڈیڑھ سو سے زائد لکھے ہیں مضامین گل ملا کر ہیں باریک بین، شہر کے سارے شجرے از بر ہیں گویا یادداشت کا سمندر ہیں، اپنی تنہائی کو اس طرح دور کیا تین شمعوں سے گھر میں نور کیا، سب کو پہونچاتے ہیں روٹی اور کپڑا کہتے ہیں اب بھی کچھ نہیں بگڑا، جہاں جاتے ہیں رشتہ ہو جاتا ہے

اک نیا سلسلہ ہو جاتا ہے، ہتھیلی پر سرسوں جماتے ہیں حال پوچھو تو مسکراتے ہیں، فوجیانہ روش سے جیتے ہیں غم کا شربت بنا کے پیتے ہیں، خود کسی سے قرض نہیں لیتے ہیں ضرورت مندوں کو چپ چاپ دے دیتے ہیں، کھانے پینے کا شوق رکھتے ہیں ہر طرح کی چیزیں چکھتے ہیں، خود کھاتے ہیں سب کو کھلاتے ہیں زندگی کا لطف اٹھاتے ہیں۔

جہد و عمل پر ہے بھروسہ دنیا سے مانگا نہیں اپنا حصہ، ناقدری کے شاکی تو ہیں شدید لیکن چھوڑا نہیں ہے دامنِ امید، منزلِ مراد کی جانب ہیں رواں بلند حوصلہ عزم جواں، بات ہے دوستو مختصر بلندیاں ہیں انکی منتظر۔

ہم دعا گو ہیں سرخرو ہو جاؤ	تم بھی موضوعِ گفتگو ہو جاؤ
ایک دن خالد عابدی صاحب	قصرِ اردو کی آبرو ہو جاؤ

● **جاوید اختر**

فلمی کہانی نویس، مکالمہ نویس، شاعر، گیت کار

یوں تو آج ٹیلی ویژن کو میڈیا، سمجھا جاتا ہے۔ مگر جو جانتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ریڈیو آج کے دور میں ہندوستانیوں اور دُنیا کے درمیان ایک پُل ہے۔

میں خالد عابدی کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ انھوں نے مجھے یہاں آنے کی دعوت دی۔ بھوپال ریڈیو اسٹیشن اپنے معیاری پروگرام کے لیے جانا اور مانا جاتا ہے۔ یہاں آکے خوشی ہوئی۔

یکم جون ۱۹۹۵ء

خالد عابدی اور ان کی اردو خدمات

جاوید یزدانی

افسانہ نگار، محقق، نقاد اور بہترین لائبریرین، یعنی محمد خالد عابدی ایک ایسے شخص کا نام ہے جس میں انگنت خوبیاں سموئی ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ بہترین انسان دوست کی حیثیت سے میں انھیں برسوں سے جانتا ہوں۔ بہت سال پہلے میری ان سے ریڈیو اسٹیشن پر ایک پروگرام کے سلسلے میں ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے ان کو تب ریڈیو پروگرامر کی حیثیت سے جانا تھا۔ پھر ان کا ایک ڈراما دیکھا تو ان کی ایک اور شخصیت میرے سامنے نکھل کر آئی۔ اور اس کے بعد تو ان میں جو انگنت خوبیاں تھیں اور میری نظروں سے اوجھل تھیں وہ مجھ پر ظاہر ہونے لگیں نیز مجھے حیرانی میں ڈالتی رہیں۔ وہ مضمون نگار بھی ہیں، نقاد بھی ہیں، محقق بھی ہیں اور ڈراما نگار بھی۔ فلمی مضامین پر تو ان کی زبردست گرفت ہے۔ میں محوِ حیرت ہوں کہ کیا واقعی ایک انسان میں اتنی ساری خوبیاں یکجا ہو سکتی ہیں جو مجھے محمد خالد عابدی میں دیکھنے کو ملیں۔ میں ان کے بارے میں بہت کچھ جاننے کے لیے کوشاں رہنے لگا۔ خالد عابدی بہت پرانے بلکہ پیدائشی بھوپالی ہیں اور یہاں کی مردم خیز آب و ہوا نے ان میں ادبی شعور کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔

ایک بار انھوں نے مجھے اپنے گھر کھانے پر مدعو کیا۔ میں جب ان کے گھر پہنچا تو ان کی لائبریری دیکھ کر حیران رہ گیا۔ دو کمروں پر مشتمل یہ لائبریری جس میں آٹھ بڑی بڑی گودریج کی الماریاں جو خاص طور پر کتابوں کے لئے بنائی گئی تھیں کتابوں سے بڑے سلیقے سے سجی ہوئی تھیں۔ کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ میں نے آج تک کسی ذاتی لائبریری میں نہیں دیکھا۔ خالد عابدی کی لائبریری میں وہ کتابیں تھیں جو ہر مکتبہ فکر سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان سب کا رجسٹر میں باقاعدہ اندراج دیکھ کر میری آنکھیں حیرت زدہ ہو گئیں۔ میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ یہ انسان ہے یا دیوزاد۔ آخر ایک تنہا آدمی اتنے سارے کام اتنے سلیقے سے کیسے کرتا ہے، وقت پر ڈیوٹی جانا، لکھنا پڑھنا، بیوی بچوں کی ضروریات کا خیال رکھنا اور پھر لائبریری کی تزئین و ترتیب پر دھیان دینا اور اس کے بعد لوگوں سے اخلاص و محبت سے ملنا جلنا اور پیش آنا اور ایسا محسوس نہیں ہونے دینا کہ اس پر کوئی بوجھ یا کوئی بڑی ذمہ داری ہے یعنی ہمیشہ مسکراتے رہنا جس سے یہ پتہ ہی نہ چلے کہ وہ اتنی ذمہ

داریوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ خالد عابدی بیچ بیچ اردو کے مضبوط سپاہی ہیں۔ جس کے لئے انھیں اعزازت واکرام سے بھی نوازا جا چکا ہے۔ جو ان کی قربانی اور لگن سے دیکھنے میں بہت کم لگتا ہے۔ یوں تو پروفیسر عنوان چشتی، ڈاکٹر قمر رئیس، جناب رفعت سروش اور ڈاکٹر شمیم حنفی جیسی اردو کی معتبر ہستیوں نے ان کی ادبی خدمات کو سراہا ہے تاہم میں سمجھتا ہوں کہ اردو کے ایک بے لوث عاشق کے لئے یہ بہت کم ہے۔

مجھے بڑی مسرت ہوئی جب مجھے یہ پتہ چلا کہ خالد عابدی پر کوئی کتاب محترمہ ڈاکٹر رضیہ حامد صاحبہ اور جناب رہبر جونپوری صاحب ترتیب دے رہے ہیں۔ ان کی ادبی خدمات حقیقتاً اسکی متقاضی ہیں۔ خالد عابدی میں اتنی خوبیاں ہیں جن کا برملا اعتراف نہ کرنا میرے خیال میں ادبی بددیانتی ہوگی۔ میں نے ان کی تصنیف کردہ تقریباً سبھی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کی کتاب ''آواز نُما'' جو آٹھ ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ہے بہت دلچسپ ہے میری رائے میں خالد عابدی کی کتاب آواز نُما کے ڈرامے ادب میں گراں قدر اضافہ ہیں۔ اس کتاب کو اترپردیش سرکار نے انعام سے بھی نوازا ہے۔ ان کی دوسری کتاب ''پیکرِ آواز'' ہے جس میں انھوں نے ریڈیائی ڈرامے تحریر کئے ہیں۔ ۱۹۸۸ء میں خالد عابدی صاحب کے افسانوں کا مجموعہ شائع ہوا۔ ان افسانوں میں سماج کی عکاسی بڑے دل پسند انداز میں کی گئی ہے جس کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی بھی ہوئی ہے۔ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ''شکایت عرض ہے'' میں طنز کے تیرونشتر کے ساتھ ساتھ وہ ہنسی ہنسی میں قاری کو سوچنے پر بھی مجبور کرتے ہیں۔ اس کے بعد اردو انٹرویوز پر مشتمل ان کی کتاب شائع ہوئی جس میں ملک کے پندرہ مقتدر ادیبوں کے انٹرویوز شامل ہیں۔ یہ انٹرویوز اتنے مکمل ہیں کہ انھیں اگر شاملِ نصاب کیا جائے تو طالب علموں کی معلومات میں بے حد اضافہ ہوگا۔

خالد عابدی نے بچوں کے لئے بھی ڈرامے لکھے ہیں۔ ان کی ایک کتاب ''ٹیچر کے بغیر'' ۱۹۹۶ء میں آئی تھی۔ اس میں صرف بچوں کے لئے چھ ڈرامے تحریر کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ''مضامینِ خالد'' میں خالد عابدی کے تحقیقی و تنقیدی مضامین شامل ہیں جس میں ان شاعروں اور ادیبوں پر خالد عابدی نے قلم کو اٹھایا ہے جن کو لوگ غالباً فراموش کر چکے ہیں یا جنھیں نہیں جانتے یہ ان کا بہت اہم کارنامہ ہے۔ ان کی ایک اور کتاب ''اردو مراسلاتی انٹرویوز'' ہے جس میں انھوں نے ۲۵ نامور ادیبوں، شاعروں اور قلمی ہستیوں کے مراسلاتی انٹرویوز قلم بند کئے ہیں۔ ان میں سردار جعفری، شہریار، اخترالایمان، جوگیندر پال، خمار بارہ بنکوی اور رام لعل وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان انٹرویوز میں ان شخصیات کے حالات وکوائف کے ساتھ ساتھ ان کے فن کے بارے میں بھی

سیر حاصل معلومات مجتمع ہیں۔ ایک اور بڑا کام خالد عابدی کا یہ ہے کہ انھوں نے عبدالغفور نساخ کے مقطعات پر مشتمل کتابچہ ترتیب دیا ہے جس کو انھوں نے کافی جدوجہد اور جانفشانی کے بعد شائع کیا ہے۔ جو غالباً نایاب ہو چکا تھا۔ اس طرح انھوں نے عبدالغفور نساخ کو دوبارہ ادب میں زندہ کر دیا۔

بھرپور تھکا دینے والی زندگی کے بیچ متعدد کتابوں کی اشاعت، خالد عابدی صاحب کے ادبی کردار کی مظہر ہے۔ وہ ایسی منزل کے مسافر ہیں جن کے قدم کبھی نہیں لڑکھڑاتے۔ ان کی فکر بہت عظیم اور ان کی سوچ بہت بلند ہے۔ اپنی ایک ذاتی لائبریری تیار کرنا اور اس میں معیاری اور اہم کتابیں یکجا کرنا جو دستاویزی حیثیت رکھتی ہوں وہ بھی محدود وسائل سرکاری ملازمت اور گھریلو کشمکش کے باوجود ایک بڑا کارنامہ ہے۔ کتابیں خریدنا ان پر اپنا وقت اور روپیہ صرف کرنا ایک ذمے دار بیوی بچے والے انسان کے لیے بڑی ہی نہیں بہت بڑی بات ہے مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ اردو کے نام پر ہزاروں اور لاکھوں روپے عطیہ اور امداد لینے والے عابدی کی لائبریری کے لیے چند روپے کا تعاون بھی نہیں کرتے اور نہ ہی سرکار کوئی اعانت کرتی ہے اور نہ ہی ان کی ادبی خدمات کا بھرپور اعتراف کرتی ہے۔ اس بے حسی اور جمود کو توڑنے کی سخت ضرورت ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ صوبائی اردو اکیڈمی سے بھی خالد عابدی کو اب تک کوئی انعام نہیں ملا۔ حالانکہ ان کی لائبریری ایسے مالی تعاون کی زبردست مستحق ہے۔ ان کی بیش بہا کتابوں کے لئے بھی وہ جگہ ناکافی ہے جہاں وہ موجودہ حالت میں ہیں۔ اکثر لوگ انھیں یہ مشورہ دیتے ہیں کہ ان کتابوں کو کسی لائبریری کو ہدیہ کر دیں یا تحفتاً دے دیں اور یہ نہیں سوچتے کہ اس بات سے خالد عابدی کے دل پر کیا گزرتی ہوگی جس نے تکلیفیں اٹھا کر اور روپیہ خرچ کر کے کتابیں جمع کی ہیں اور اردو والوں کی خدمت نیز ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے اسٹوڈینٹس کو حوالے کے لئے فراہم کرتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ اس بات کا ذکر کوئی بھی اپنے مقالے یا تھیسس میں نہیں کرتا کہ یہ کتابیں کہاں سے حوالے کے لئے حاصل کی گئی ہیں۔ یقیناً یہ ادبی بددیانتی ہے۔ تاہم اس عدم توجہی کے بعد بھی وہ اپنا تعاون برابر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ عابدی صاحب سے جب اس سلسلے میں بات ہوئی تو انھوں نے پرزور لفظوں میں زبان کی بقا پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ ادب کا نمبر بعد میں آتا ہے اگر زبان ہی کو فروغ اور بقا حاصل نہ ہوگی تو پھر ادب کیسے ترقی کرے گا۔ ان کو شکایت ان لوگوں سے ہے جو اردو کا شور تو مچاتے ہیں لیکن اردو کا ایک اخبار تک خرید کر نہیں پڑھتے اور ان کے بچے بھی اردو نہیں جانتے۔ خالد عابدی اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود اردو کے لئے برابر تعاون دیتے رہتے ہیں۔ ضرورت مندوں کو اردو کی کتابیں مہیا کراتے ہیں اور اس کا وہ کوئی معاوضہ نہیں لیتے۔ انھیں خوشی اس بات کی

ہے کہ ان سے اردو پڑھنے والے زیادہ تر غیر مسلم ہیں۔ عابدی صاحب کی لگ بھگ بیس کتابوں کے مسودے اشاعت کے لئے تیار ہیں اگر مدھیہ پردیش اردو اکادمی انھیں مالی تعاون دیتی ہے تو ان کی اشاعت آنے والی نسلوں کے لئے بہت مفید ہوگی۔

خالد عابدی اردو کے ایسے مضبوط سپاہی کا نام ہے جو بجا طور پر بھوپال کا بابائے اردو کہلانے کا مستحق ہے۔

● رفعت سروش

سابق اردو پروگرام افسر، شاعر، ادیب

آج بھوپال ریڈیو اسٹیشن کے اسٹوڈیو میں بیٹھ کر گزشتہ نصف صدی کی یادیں ذہن میں اُبھر آئیں۔ ریڈیو اسٹیشن ثقافت کا مرکز ہے۔ ما گر وفون فن کار کے حواس ناطقہ کا ترجمان۔ وہ لمحہ یاد آ گیا جب ۲۶ دسمبر ۱۹۴۵ء کو میں نے آل انڈیا ریڈیو بمبئی میں بحیثیت ملازم کے قدم رکھا۔ اور سید ذوالفقار علی بخاری (اسٹیشن ڈائریکٹر) نے مجھے انگلی پکڑ کر اس راہ دشوار پر چلنا سکھایا۔

ہندوستان میں آل انڈیا ریڈیو نے بے بہا خدمات انجام دی ہیں میں نے ۳۱ جنوری ۱۹۸۴ء تک اس شعبہ کی خدمت کی ہے۔ ایک کہکشاں ہے ادیبوں اور شاعروں اور دانشوروں کی جن سے اس ادارہ کی رونق رہی ہے۔ آج اس گلستان ادب وتہذیب میں اردو شعبہ کے خالد عابدی ایک ایسے ہی گل شگفتہ ہیں جیسے اس سے بہت پہلے دوسرے ادیب تھے۔

گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے
اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے

میں توقع کرتا ہوں کہ اس تنا تنی اور فن کی ناقدری کے دور میں آل انڈیا ریڈیو اپنی روایات کو زندہ رکھے گا۔

۲۰ جون ۱۹۹۵ء

اپنی شخصیت اپنے فن کا چشم دید گواہ۔۔۔محمد خالد عابدی

رشید انجم

محمد خالدی عابدی بھوپال کی ان ادبی کاوشوں کا وقار ہیں جس نے کہیں افسانہ، کہیں غزل، کہیں تحقیق، کہیں تنقید، کہیں ڈرامہ اور کہیں صحافت کی زمینوں پر اپنے جوش و خروش سے علمیانہ بستیاں آباد کی ہیں۔

محمد خالد عابدی اس ستم پیشہ وقت اور شر خیز موسم کی دین ہیں جب انسان کی ذات نے رشتوں کی تقدیس کو تقسیم کرنے کا درندہ صفت فیصلہ کرلیا تھا۔ جب زمین خونی سیرگاہ تعمیر کر چکی تھی اور انسان، تہذیب و اقدار، اخلاقی ضابطے اور رفاقتوں کو فاصلوں کی زنجیر پہنا چکا تھا۔ دھوپ کا صحرا تھا جو تنہا کھڑا ہر اس شے کو جھلسا دینے کی فراغ میں تھا۔ جس کے نزدیک آدمیت کی تھوڑی سی بھی شفق موجود تھی۔ ایسے ہی پر شور بے ہنگام اور آندھی بدست دور میں اپنا پرچم انسانیت اٹھائے، مائیں اپنی کوکھ خالی کر رہی تھیں اور وہ نونہال دُنیا میں آ رہے تھے جن کے چہروں پر فرشتوں کا تقدس اور جن کے نوزائدہ وجود میں گلوں کے لمس کی تو قیر قوس و قزح کی مانند کھلی ہوئی تھی۔ ان کی زمزمہ ریز پلکوں پر اپنی حیات کی کچھ ان بُوجھ عبارتیں نور کی روشنائی سے لکھی ہوئی تھیں۔ وہ موہوم کائنات کے نا موہوم پرندے تھے جو حیران فسوں آنکھیں لئے ناسپاس اس دھرتی کی انگنائی میں اتر آئے تھے۔ ایسا ہی ایک نشانِ زیست وہ بھی تھا جو آگے چل کر اپنی وجودی حیثیت قائم کرسکا اور اردو زبان و ادب میں محمد خالد عابدی کی نسبت سے باوقار مقام پانے میں کامیاب ہوا!

۱۵ ر اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان دورِ غلامی سے نکلا اور ۷ ار اگست ۱۹۴۷ء کو محمد خالد عابدی نے اپنے والد محمد عابد صاحب کی پدرانہ شفقتوں کو اجالے دئے!

میں آج جب خالد کو سوچتا ہوں۔ میں آج جب خالد کو دیکھتا ہوں۔ میں آج جب خالد کو پڑھتا ہوں تو مجھے اس ایک شخصیت میں کبھی دریا کا ٹھہراؤ نظر آتا ہے۔ کبھی سمندر کی گہرائی دکھائی دیتی ہے کبھی صحرا کی بے کنار مسافرت ملتی ہے۔ کبھی انسانی رشتوں سے بندھی جذباتی قربتوں کا احساس ہوتا ہے۔ کبھی لامحدود اردو ادب کی آبرومندی بہرہ مند کرتی ہے اور یہ سب دیکھ کر، محسوس کر کے میری آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں کہ خدایا یہ شخص ادب کا مبلغ ہے یا محض آواز کی آوارگی؟

یہ شخص درجہ بند کہیں سے نہیں ہے۔ کسی ادبی یا غیر ادبی گروہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ طلب گار ہے تو صرف اس سرمایۂ افتخار کا جو قلم سے نکلی ہوئی تحریروں سے اس کی وجودی صداقت کو اردو زبان و ادب کی نقش گری دیدے۔ محمد خالد عابدی ان شخصیات میں سے ایسے ایک شخص ہیں جنہوں نے اپنی راہیں خود تلاش کی ہیں اور اپنی تعمیر حیات کی خود اینٹیں جوڑ کر ایک مرعوب کن عمارت کے مالک بن گئے۔ یہ عالیشان عمارت بڑی ہی خیرہ کن ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ محمد خالد عابدی ایک لٹریری ایمپائر اسٹیٹ کے مالک ہیں۔ یہ ایمپائر کئی ونگز میں تقسیم ہے۔ ہر ونگ بڑا ہی دیدہ زیب ہے۔ مختلف رنگوں سے نگاہ و دل میں اُترتا ہوا، پاس بلا کر خود کو قریب سے دیکھنے کی دعوت دیتا ہوا!

پہلا ونگ جسے عرف عام میں شعبۂ آمد و رفت کہا جاتا ہے۔ دوسرے ونگ میں جذباتی رشتوں کی وہ معتبر ہستیاں آباد ہیں جن کے بغیر کسی شریف و بدانسان کا ذکر بے معنی اور فضول سمجھا گیا ہے۔ تیسرا ونگ قصرِ عافیت ہے، جس میں ایک عجیب و غریب شخص رہتا ہے، جو دیکھنے میں، ملنے میں اور مل کر ہمیشہ کے لئے اپنا بنا لینے کے حربوں سے لیس اور واقف ہے۔ انکی سادہ سی شخصیت میں انجانا ساسحر ہے، مقناطیسی کشش ہے اور ایک دلکش پیرایہ بھی جو زندگی کو زندہ دلی کا درس دیتا ہوا سا لگتا ہے۔

چوتھے ونگ میں اس شخص کا وہ پورا شہر آباد ہے، جس میں جنون ہے، دیوانگی ہے، پاگل پن ہے، جوش و ولولہ ہے، وجود کی گرمی ہے، بیکراں سمندر ہے، وارفتگی ہے اور وجود کی تلاش کے وہ امکانات روشن ہیں جو تم کی حد تک راحت بخش بھی ہیں اور فرحت خیز بھی۔ اس ونگ میں چو طرفہ دریچے ہیں۔ کھڑکیاں ہیں جن سے شعری، ادبی، فلمی، افسانوی اور ڈرامائی ہوائیں اپنے پروں پر ترکش اٹھائے بے خوفی سے داخل ہوتی ہیں اور ان تیروں کو اس شخص کے جسم میں پیوست کرتی ہوئی واپس لوٹ جاتی ہیں مگر نہیں، وہ تو وہیں چکراتی رہتی ہیں۔ اندازہ لگاتی ہیں کہ ان تیروں نے جسم کے کتنے حصوں کو لہولہان کیا۔ جب یقین ہو جاتا ہے کہ تیر کارگر ہوئے، صحیح نشانے پر لگے تو مطمئن ہو کر لوٹ جاتی ہیں لیکن وہ شخص عجب جان رکھتا ہے کہ اپنے اندر تیر پیوست ہیں اور تکلیف و درد کا کوئی تاثر چہرے پر نہیں آتا۔ ایک آسودہ سی مسکواہٹ لبوں پر تڑپ رہی ہے۔ بہت خندہ پیشانی سے ایک ایک نکالتا ہے، چومتا ہے اور بہت گہری نگاہ سے پھل پر چمکتی لہو کی بوند کا مطالعہ کرتا ہے اور سامنے بچھے سادہ کاغذ پر تحریر کے سورج ابھارتا چلا جاتا ہے۔!

اس اسٹیٹ کے آخری ونگ میں ایک فیکوی قائم ہے۔ اس پر کوئی پہرہ کوئی سیکیوریٹی اور

کوئی چیک پوسٹ نہیں ہے۔ یہ فیکٹری ہر قدم کو خوش آمدید کہتی ہے۔ اس میں دشمن کو زیر کرنے یا آمرانہ طاقتوں میں خود کو نمایاں کرنے یا انسان کو انسان کے ہی ہاتھوں فنا کرنے یا ایٹمی دھماکے سے پوکھرن کو لرزیدہ کرنے یا ہیروشیما پر ایٹمی توانائی سے انسانیت کی دھجیاں اڑانے یا بغداد اور افغانستان کو دنیا کے نقشے سے مٹانے یا آسمانی، بحری اور بری افواج کو اپنی سرحدوں پر زہر آلود اسلحہ سے لیس کرنے، قاتل انسانیت سوز ایمونیشن نہیں بناتی بلکہ ادب اور ادب کے وہ سارے اسلحہ بناتی ہے جو آدمی کے نفس کو شعلہ بدامانی سے نکال کر نغمہ و رنگ اور خوشبو کی شبنمی ٹھنڈک کا حریری احساس دے کر اس کے شعور کو آگہی اور روئے نگارِ صبح کے خوش آئیند زمانوں کو جمالِ فن سے آشفتہ سامان کرتا ہے!

محمد خالد عابدی کسی کی تلاش و جستجو نہیں ہیں۔ وہ اپنی جستجو بھی خود ہیں اور تلاش بھی خود ہیں اور جو شخص اپنے کردار اور تشخص کا خود معمار ہو اسے دستِ طلب دراز کرنا نہیں آتا۔ اسکے اندر خودداری کا پر تو ہوتا ہے۔ انا پرستی اور خود نمائی سے پرہیز ہی اس کی اپنی شناخت بنتا ہے۔ محمد خالد عابدی بھی اسی زمرے کے ادیب ہیں۔ انہوں نے اپنی عمر کا زیادہ عرصہ تصنیف و تالیف میں صرف کیا ہے۔ بیس سال کی عمر بڑی ہی جان لیوا عمر ہوتی ہے (یہاں اپنی جان سے مراد نہیں بلکہ دوسرے کی جان سے مراد ہے) نفس امّارہ خود پرستی کی جانب راغب کرتا ہے تو سوچ، ذہن اور دل کسی ایک سمت کا تعین نہیں کر پاتے ۔تب عمر نے جس کے ہاتھ میں اپنی تکمیل تھمادی وہ پھر عمر کے آخری پڑاؤ تک بے تعبیر خوابوں کی زمین کا مسافر بن کر رہ جاتا ہے لیکن جو نو خیز عمر شکستہ ہواؤں کو اپنے بازوؤں پر بوجھ بن کر ڈھوتی ہے، جو نو خیز عمر نا مساعد حالات کو حیات کی کھردری حقیقتوں پر سانس لیتے دیکھتی ہے، جو نو خیز عمر کائنات کے ناہموار راستوں پر اپنی منزلوں کے تعین میں خود کفیل ہوتی ہے، وہ عمر وقت کا زیاں کبھی نہیں بنتی۔ محمد خالد عابدی نے بھی اپنی نو خیز عمر میں افسردہ سامانیاں دیکھیں تو انہوں نے ذہن کے ناپختہ کواڑ پر شعور کی دستک بھی سنی اور اس دستک نے لاشعور پر ادراک کے کواڑ کھول دئے۔ عام بچوں کی طرح انہوں نے گلی محلے میں کبڈی اور گلی ڈنڈا کھیل کر یا پتنگ کے پیچ لڑا کر وقت کو ضائع نہیں کیا۔ احساس بیدار ہوا تو ذہن نے شگفتہ چمن آرائیاں کر لیں۔ ہمواریت نے تعلیم کی جانب راغب کیا اور وہ تعلیم کی سیڑھیاں بتدریج طے کرتے گئے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے خود کو یقین دلانے میں کامیاب ہو گئے کہ اقبال کا شاہین چٹانوں پر ہی بسیرا لیتا ہے، کرگس کا غول نہیں بنتا!

محمد خالد عابدی شروع سے ہی ہر نوجوان کی طرح ہندی فلموں کے رسیا رہے۔ فلمیں دیکھنا، فلموں کی تکنیک سے واقف ہونا، ہر منظر کو گہرائی سے دیکھنا اور اداکاروں کی فنی باریکیوں کو سمجھنا، فلم

کے اسلوب، فلم کی تخلیق اور ان عوامل کو تلاش کرنا جن سے فلم کا نغمہ سے نکل کر کیمرے کی آنکھ سے سلولائڈ کی باریک جھلی میں قید ہوتی ہے اور پھر مخصوص روشنیوں سے سلولائڈ کی قید سے پردۂ سیمیں پر متحرک کرتی ہے اور فلم بین کی تسکین کا باعث بنتی ہے۔ محمد خالد عابدی کے لئے بے حد دلچسپ موضوع ثابت ہوا اور انہوں نے اسی لمحاتی کشمکش سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کر دیا۔ ۱۹۶۷ء میں حیدرآباد کے فلم میگزین میں ان کا پہلا فلمی مضمون شائع ہوا تو محمد خالد عابدی کے جسم میں خوشیوں نے سنسنی دوڑا دی۔ اس وقت ان کی عمر محض بیس سال تھی۔ اس مضمون کی اشاعت نے حوصلہ دیا اور وہ باقاعدہ فلمی مضامین لکھنے لگے۔ ملک کے متعدد فلمی ماہناموں میں فلموں سے متعلق ان کے تحقیقی، تنقیدی اور معلوماتی مضامین تسلسل سے شائع ہوتے رہے لیکن والد کو ان کا یہ عمل ناگوار گزرتا تھا اور وہ انہیں سرزنش بھی کرتے رہتے تھے۔ خالد اپنے والد عابد صاحب کا بے حد احترام کرتے تھے۔ وہ ان کے عقیدت مند تھے۔ خالد کی سعادت مندی وعقیدت کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے نام کے ساتھ عابدی کا اضافہ کیا ہوا ہے۔ اپنی ذاتی لائبریری کا نام بھی مکتبہ عابدیہ سے منسوب کیا ہوا ہے۔ والد کی ناگواری نے جب شدت اختیار کی تو انہوں نے بے حد خاموشی کے ساتھ اپنے ادراک، اپنی سوچ اور فکر کے رہوار کو اردو زبان وادب کی سمت موڑ دیا اور پھر خالد عابدی ایک نئی شکل اور نئی صورت لے کر اردو ادب میں وارد ہوئے اور بے حد پائدار وجود کی تخلیق کا واضح امکان بن گئے۔

ابتدا انہوں نے شاعری سے کی مگر بہت جلد انہوں نے محسوس کر لیا کہ وہ محض شاعر بن کر رہ جائیں گے جو ردیف قافیہ بحر اور اوزان کے دریا میں غوطے لگاتا رہے گا۔ شاعری کے مقابلے میں انہوں نے نثر کو زیادہ وقیع اور زیادہ وسیع اور زیادہ ہموار محسوس کیا تو اپنی پوری توجہ نثر کی طرف مبذول کر دی۔

محمد خالد عابدی نے اپنے نثری ادب کا ابتدائی تخلیقی سفر چھوٹے چھوٹے مضامین لکھ کر کیا۔ یہ مضامین مزاحیہ اور طنزیہ تھے جو کبھی شائع ہوئے اور کبھی شائع نہیں بھی ہوئے۔ مگر دل برداشتگی ان پر حاوی نہ ہو سکی۔

محمد خالد عابدی نے اردو ادب کی خاص صنف اردو ڈرامے پر اپنی توجہ مبذول کی اور سب سے قبل ریڈیائی ڈراموں پر مشتمل ان کے تین مجموعے 'آواز نما' ۱۹۷۵ء، 'پیکرِ آواز' ۱۹۸۳ء اور بچوں کے ڈراموں پر مشتمل "ٹیچر کے بغیر" مجموعہ ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئے۔ 'آواز نما' کی ملک گیر پذیرائی ہوئی۔ اسے نہ صرف اردو اکادمی یوپی نے انعام سے نوازا بلکہ ان قلم کاروں نے اپنے

تبصروں، ذاتی خطوط اور مضامین میں خالد عابدی کی شگفتہ مزاج قلم کو تسلیم کیا۔ ایک طویل ترین فہرست ان دانشوروں اور نقادوں کی میرے سامنے ہے جو نہ صرف اردو ادب کی مجملہ اصناف بلکہ اردو ڈرامے کے فن پر بھی اپنی گرفت سے شناخت کیے جاتے رہے۔ طوالت کے پیشِ نظر چند ناموں پر ہی اکتفا کر رہا ہوں!

ڈاکٹر اخلاق اثر جنھوں نے نہ صرف ''آواز نما'' پر مقدمہ تحریر کیا بلکہ خالد عابدی کے فن کو بھی سراہا۔ ڈاکٹر صفدر آہ'' ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر گیان چند جین۔ علاؤالدین جینابوے۔ مشہور افسانہ نگار جوگندر پال۔ ابراہیم یوسف۔ پروفیسر شفیقہ فرحت، ڈاکٹر بانو سرتاج قاضی۔ مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر حامد حسین، عبدالاحد خاں تخلص اور سلام سندیلوی وغیرہ نے خالد عابدی کے ریڈیائی ڈراموں پر اپنی غیر جانبدارانہ رائے دینے میں بخل سے کام نہیں لیا۔ ان کے فن کو سراہا۔ ریڈیائی ڈراموں پر ان کے صوت وصدا کی بندشوں اور پابندیوں کے مطابق موضوعات کے انتخابات اور ان موضوعات میں کرداروں کے ربط باہمی کی تکنیکی اساس کی داد بھی دی۔

''پیکرِ آواز'' اور ''منیجر کے بغیر'' کی پذیرائی اسی پیمانے پر ہوئی۔ ان تمام ڈراموں میں اور خالد عابدی کی شگفتہ تحریروں کی نقش گری ابھری۔ گو ان میں بیشتر ڈرامے قدامت پرست گھرانوں کی داخلی وباہمی کشمکش پرمبنی ہیں۔ مگر ان میں خالد عابدی کے قلم کی مسکراہٹیں شامل ہیں۔ عام سے کردار، مزاح کا خوشگوار لمس لیے ہوئے۔ ان میں طنز کا عنصر بھی ہے اور اصلاحی بیان بھی۔ گھریلو مسائل، نفسیاتی الجھنیں ان ڈراموں کا خاص موضوع ہیں۔ جنھیں خالد عابدی بہت سادگی سے حل کرتے ہیں۔

''انارکلی کا مقدمہ'' دراصل تمثیلی پیروڈی ہے جسے خالد عابدی نے پُر مزاح منظرنامہ دیا ہے۔!

''منیجر کے بغیر'' بچوں کے چھ مختصر پُر مزاح ڈرامے جن میں ہلکا پھلکا طنز بھی ہے اور مقصدیت بھی خالد عابدی نے ان ڈراموں میں بچوں کی معصوم شرارتوں کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ان شرارتوں سے بچوں کی ذہانت بھی جھلکتی ہے اور ہنسی ہنسی میں مقصد بھی واضح ہو جاتا ہے ریڈیائی ڈرامے صرف سامع کے کانوں کے لئے ہوتے ہیں۔ ریڈیائی ڈراموں میں صوتی تاثر، پس منظر موسیقی، بازگشت اور کرداروں کے باہمی ربط وضبط کا اندازہ ان کے مکالموں کی ادائیگی سے ہی لگایا جاسکتا ہے۔ چونکہ تب تک محمد خالد عابدی آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس سے وابستہ ہو چکے تھے اس لئے ان میں فن اور تکنیکی خوبیاں آنا لازمی تھا۔ ان ڈراموں کو بھی ''آواز نما'' کی مانند سراہا گیا!

ایک حساس اور پُر تجسس فنکار کی فطرت ہے کہ وہ نئے جہان تلاش کرتا رہے تاکہ اس کی پرواز میں وسعت اور ہمہ گیریت آئے۔ محمد خالد عابدی ریڈیائی ڈراموں کی اشاعت اور خاطر خواہ

پذیرائی سے اس حد تک مطمئن ہوئے کہ پھر انھوں نے کوئی ڈرامہ تخلیق نہیں کیا۔ اپنے قلم کو دوسری صنفِ ادب سے آشنا کیا۔ یہ صنف تھی اردو افسانے کی انھوں نے روایت کے پاسدار افسانے تخلیق کئے اور ۱۹۸۸ء میں ان کے ۱۰ افسانوں "کانٹے کی خوشبو"۔ "زخموں کے دریچے"۔ "احساس کا زخم"۔ "لنچ ٹائم"۔ "سڑاندھ"۔ "خون کا نام"۔ "ہیرو"۔ "زندہ لاش" اور "ہمدرد" پر مشتمل مجموعہ "زخموں کے دریچے" شائع ہو گیا۔ یہ افسانے ان کی حساس طبیعت کے آئینہ دار ہیں اور اس سے قبل مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے تھے۔ ان افسانوں پر ملک کے معروف افسانہ نگار اور دانشور کوثر چاندپوری نے اپنی صائب رائے پیش کی تو مشہور افسانہ نگار رام لعل نے بھی سراہا تھا۔ چونکہ خالد عابدی خوشنویس بھی ہیں اور خطاطی کا انھیں شوق بھی ہے، "زخموں کے دریچے" کی کتابت ان کی خوشنویسی کا نتیجہ ہے اور نوشتی الگ جھلکتی ہے۔ ان افسانوں میں خالد عابدی کے ذاتی تجربات، روزمرہ کے مشاہدات ملتے ہیں جن میں انسان دوستی کا سبق بھی ہے اور دور جاتی تہذیب واقدار کو واپس لانے کی کوشش بھی ہے!

محمد خالد عابدی افسانوں کی اشاعت سے پوری طرح محظوظ بھی نہیں ہو پائے تھے کہ ان کے ذہن نے ایک اور چھلانگ لگائی "شکایتاً عرض ہے" ۱۹۹۱ء طبع ہو کر منظرِ عام پر آ گیا۔ یہ ان طنزیہ ومزاحیہ مضامین پر مشتمل کتاب تھی جو وقتاً فوقتاً مختلف رسائل میں شائع ہوئے تھے۔

"شکایتاً عرض ہے" کو بھی ملک گیر پذیرائی حاصل ہوئی اور ان ہاتھوں میں پہنچا جو اس صنف پر گویا اقتدارئی رہے۔ اپنے وقت کے دیدہ ور طنز و مزاح نگار وجاہت علی سندیلوی نے اُن کے مضامین کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا تھا۔

"عابدی صاحب کو زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ وہ اپنی بات صاف اور سیدھے انداز میں کہتے ہیں۔ اپنے قاری کو ایک لمحے کے لیے بھی جمود کا شکار نہیں ہونے دیتے بلکہ یکے بعد دیگرے پُر لطف جملوں سے اس کے تجسس اور اشتیاق میں اضافہ ہی کرتے ہیں۔ عام زندگی سے اپنے طنز و مزاح کا مواد حاصل کرتے ہیں۔ ان کا شعورِ ظرافت بڑا ہی زود حس ہے ان میں بے ساختگی بھی ہے۔ برجستگی بھی اور تنوع بھی"۔

یوسف ناظم کی شگفتہ تحریروں اور طنزیہ مزاحیہ ادب میں اُن کے مقام سے کون واقف نہیں ہے۔ "شکایتاً عرض ہے" پر انھوں نے یوں تبصرہ کیا تھا۔

"ان کی (خالد عابدی) تحریروں میں مزاح کی چاشنی ہے۔ حالی نے مزاح کو ہوا

کا جھونکا کہا ہے اور یہ کیفیت ان کی تحریروں میں ملتی ہے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ ان کے یہاں ہوا کے جھونکوں کی بہتات ہے۔ نہایت ہی شگفتہ مزاج ان کا خاص الخاص نسخہ ہے۔"

پروفیسر عنوان چشتی اور دیگر صفِ اول کے فنکاروں نے بھی "شکایتاً عرض ہے" کو اردو طنزومزاح میں ایک اضافہ قرار دیا!

"شکایتاً عرض ہے" کی مقبولیت نے خالد عابدی کو ذہنی آسودگی فراہم کی تو کچھ اور در بیچے وا ہوئے۔ انھوں نے ایک انوکھی اور اردو ادب کو قدرے نئی صنف سے آشنا کرانے کا بیڑا اٹھایا۔ اردو ادب، شعروسخن کی قابلِ قدر ہستیوں سے مراسلاتی انٹرویوز بے حد صبر آزما، تکلیف دہ اور پُرخاش کام تھا مگر خالد عابدی نے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ ان کو اپنے صبر کا پھل میسر آیا۔ اہلِ قلم اور اہلِ اردو ادب نے اس سفر میں ان کا ہمراہی بننا قبول کیا اور "روبہ رو" کے عنوان سے ۱۵ بھوپال کے شعراء اور ادباء پر مشتمل کتاب زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر ۱۹۹۲ء میں منظرِ عام پر آگئی اور اس کے بعد اردو مراسلاتی انٹرویوز" بھی اشاعت پذیر ہوئے۔ یہ کتاب ۱۹۹۶ء میں طبع ہوئی اس میں پچیس اہلِ علم ودانش اور قلموں سے منسلک ہستیوں کے مراسلاتی انٹرویوز ہیں۔ یہ دونوں کتابیں ملک کے ان ناقدین، صاحبِ فن اور پاسبانِ زبان وادب کے نزدیک قابلِ قدر ٹھہریں جو اس صنف پر اس سے قبل کسی طرح کا ردِ عمل ظاہر کرنے سے قاصر تھے۔ مراسلاتی انٹرویوز اور بالمشافہ انٹرویوز میں بنیادی فرق ہے۔ صاحبِ ملاقات سے جو گوشہ بالمشافہ گفتگو میں مخفی رہ جاتا ہے، مراسلاتی انٹرویوز میں وہی گوشہ نمایاں ہو کر روشنی میں آجاتا ہے۔

یہ انٹرویو لینے والے کی صلاحیت پر دلالت کرتا ہے کہ وہ کس طرح اُن مخفی گوشوں کو منظرِ قرطاس پر لے آئے جن سے عام نظر ناواقف رہی ہو۔ ان انٹرویوز کو بھی دادوتحسین سے نوازا گیا۔

خالد عابدی محقق بھی ہیں۔ انھوں نے تحقیق کا کام بے حد عرق ریزی سے کیا ہے۔ ان کے تحقیقی مضامین ان کی متجسس طبیعت و مزاج کے عکاس ہیں۔ ان کا سب سے پہلا تحقیقی مضمون "اوجین کے ہندو شعراء" ہے۔ یہ ان کا پر تحسین ادبی مضمون تھا جو انھوں نے کمالِ تحقیق سے مرتب کیا اور ان سربستہ ہندو شعراء کو منظرِ عام پر لے آئے جنھیں کوئی نہیں جانتا تھا۔ بارہ تحقیقی مضامین پر مشتمل کتاب "مضامینِ خالد" ۱۹۹۵ء میں طبع ہو کر شائع ہوئی جس کے توسط سے انھوں نے اردو زبان وادب کی بلند پایہ ہستیوں کی ادبی خدمات پر تحقیقی مواد بھی فراہم کیا ہے۔ جن پر لکھا تو بہت کچھ جاچکا ہے لیکن معدودے چند مضامین کو چھوڑ کر بھوپال کی سرزمین علم وادب پر یہ

پہلی تحقیقی وتنقیدی کتاب ہے جو شائع ہوئی اور خالد عابدی نے اپنی سادہ بیانی سے بے حد پُر کیف بنا دیا ہے۔ پروفیسر شہاب اشرف بھوپال کے وہ شاعر تھے جنھیں بھوپال کی شعری سرپرستی بھی حاصل نہیں ہوئی۔ علاوہ ڈاکٹر سید حامد رضوی کے جنھوں نے اس شاعر خوش گلو اور خوش کلام کا ذکر اپنے مقالے میں کیا ہے۔ خالد عابدی نے اردو کے بلند قامت شاعر فراق گورکھپوری کے اس مضمون کو اپنی تحقیق میں شامل کرتے ہوئے پروفیسر شہاب اشرف کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ شعرائے مدھیہ پردیش کے عنوان سے زمانہ پہلے قلم بند کیا گیا تھا اور فراق نے اس جیالے اور خوش بیان شاعر شہاب اشرف کا ذکر بے حد "فراق" (فراخ) دلی سے کیا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت میں جب خالد عابدی ٹرانسفر ہو کر ریڈیو ریوا سے وابستہ ہوئے اور مستقل قیام ریوا جیسے خشک اور اردو زبان ادب سے نابلد اس پسماندہ شہر میں رہا تو وہاں بھی وہ خود کو محدود نہیں رکھ پائے۔ ان کی ملاقات مقامی باشندے حافظ محمد فیضان خان سے ہوئی تو وہ ان کی ذاتی لائبریری تک جا پہنچے۔ اس مختصر کتب خانے میں انھیں ایک بے حد قدیم اور نایاب شعری نسخہ دستیاب ہوا۔ یہ ریاست ٹونک کے شعرا کے کلام پر مشتمل "چمنستانِ خلیل" کے عنوان سے شائع شدہ نسخہ تھا جو کسی طرح محمد فیضان خاں کے کتب خانے میں محفوظ رہ گیا۔ خالد عابدی نے اس پر ایک تحقیقی مضمون قلم بند کیا جو ریاست ٹونک کے شاعرانہ کلام پر دلالت کرتا ہے۔ اسی طرح انھوں نے والئی ریاست بھوپال نواب شاہ جہاں بیگم کے سفرِ کلکتہ پر محققانہ روشنی ڈالی ہے۔ غرض "رفعت سروش کے ڈرامے" ہو یا "بہزاد لکھنوی کے خطوط نشتر اندوری کے نام" "میر سید علی شائق دہلوی" ہو "درسی کتب میں مولانا ابوالکلام آزاد" ہو۔ نازش پرتاپ گڈھی کی شاعری میں قومی یک جہتی" ہو، ہر مضمون خالد عابدی کی نادر کار گذاری کا ادبی سرمایہ ہے جو بھوپال کے شعر وسخن تاریخ علم وادب کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس سرمائے کو محفوظ رکھے تاکہ اگلی نسلیں مستفید ہو سکیں! اس کتاب میں "فصیح الملک۔ ایک قدیم رسالہ" جیسا مضمون بھی شامل ہے۔ اس رسالہ کا پہلا شمارہ خالد عابدی کی تحویل میں آیا تو انھوں نے تنقیدی نگاہ سے پرکھا اور تحقیقی ہر گوشوں کو قلم کی نوازشیں دے ڈالیں۔ یہ رسالہ زمانوں قبل اردو ادب کے افق پر ماہ مئی ۱۹۰۵ء میں لاہور سے طلوع ہوا تھا۔ خالد عابدی نے چونکانے والے انکشافات کیے تو اردو زبان اور اردو ادب اس رسالے کی اہمیت وافادیت سے واقف ہو سکا۔ یہ رسالہ داغ دہلوی کے شاگرد عزیز احسن مارہروی نے داغ کی وفات کے ٹھیک ڈھائی سال بعد شائع کیا تھا۔ آج یہ رسالہ شاید ہی کہیں اور موجود ہو!

خالد عابدی کا ایک اور اہم کارنامہ عبدالغفور نساخ کی کھوج ہے۔ یہ ادبی کارنامہ ایسا ہے

جیسے کوئی بھی باہوش اور زیرک ادیب اور محقق فراموش نہیں کر سکتا۔ عبدالغفور نساخ اردو ادب کی وہ اہم شخصیت رہے، جنھوں نے شاعری، نثر نگاری، تاریخ اور تذکرہ نویسی، فنِ عروض، فنِ خطاطی اور علمِ رمل میں نہ صرف مہارت حاصل کی بلکہ ان تمام علوم پر انھیں دسترس بھی حاصل تھی اور کمال بھی ''اردو قطعات''، اور ''قطعات نساخ'' ''باغ فکر معروف بہ مقطعاتِ نساخ'' (ترتیب و تدوین) کے عنوان سے ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی تو بیشتر ناقدین، تبصرہ نگار اور محققین نے عبدالغفور نساخ باغ فکر سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تھا اور یہ تحقیق خالصتاً خالد عابدی سے منسوب ہو کر رہ گئی!

خالد عابدی نے اپنی تحقیق کا دائرہ بے حد وسیع رکھا ہے وہ بھوپال تک محدود نہیں رہے۔ انھوں نے ''مدھیہ پردیش میں لوک ادب اور فن'' مدھیہ پردیش میں ''اردو ڈراما'' اور ''اردو افسانہ''، مدھیہ پردیش میں ''اردو طنز و مزاح''، مدھیہ پردیش کی ''خواتین قلمکار''۔ ''مدھیہ پردیش کے'' ہندو شعراء اور ادباء کی اردو خدمات'' مدھیہ پردیش میں ''امیر مینائی'' ۔ داغ دہلوی۔ مضطر خیر آبادی سیماب اکبر آبادی اور مولانا احسن مارہری کے تلامذہ۔ مدھیہ پردیش میں ''اردو اخبار اور رسائل''، ''تذکرہ شعراء مدھیہ پردیش'' فلموں کی ترقی میں اردو کا حصہ۔ ''بیسویں صدی میں اردو کا مکتوباتی ادب''۔ ''فلم اور ادب'' اور ''ہندوستانی فلموں کی تاریخ'' جیسے عنوانات کو اپنے دائرہ تحقیق میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ تقریباً ۵۰۰ ادباء شعراء، محقق، ناقد، افسانہ و ناول نویس اور اردو ادب سے وابستہ اہلِ قلم پر مشتمل ایک ڈائریکٹری ترتیب دی ہے۔

محمد خالد عابدی کی شخصیت کے پہلو بے حد متوازن پہلو ہیں۔ وہ فلموں کے انسائیکلوپیڈیا کہلاتے ہیں۔ ان کا ذاتی کتب خانہ انتہائی نادر و نایاب اور کامیاب، علمی تاریخی، شعری، ادبی، تحقیقی، فنی اور فلمی گوشوں پر مشتمل ہے۔ ان کتابوں کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔ وہ بڑی ہی خوددار طبیعت کے مالک ہیں۔ کسی لائبریری کے ممبر بھی نہیں رہے۔ کبھی کسی سے کوئی کتاب مستعار نہیں لی۔ اپنی آمدنی کا ایک حصہ کتب اور رسائل کی خریداری پر ہر ماہ پابندی سے خرچ کرتے ہیں۔ کبھی کوئی رسالہ ڈاک کی لاپرواہی کی نذر ہو جاتا ہے تو اس وقت تک بے چین و بے قرار رہتے ہیں جب تک اُسے حاصل کر کے فائل مکمل نہ کر لیں۔ ہر قابلِ فکر قابلِ غور اور قابلِ مطالعہ کتاب کو خریدنا اور اسکا مطالعہ کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ مطالعہ بہت غور و فکر سے کرتے ہیں۔ کتابوں کے حاشئے پر اپنے نوٹس بھی لکھتے جاتے ہیں۔ کہیں کوئی غلطی یا سہو نظر آتا ہے تو فوراً ایڈیٹر یا صاحب مضمون کو خط لکھ کر اس غلطی کی جانب توجہ مبذول کراتے ہیں اور صحیح لفظ یا صحیح جملہ لکھ کر احساس دلانے سے نہیں چوکتے۔

غیر معمولی ذہانت کے مالک ہیں۔ کسی بھی مضمون یا واقعہ کو پڑھ کر ذہن نشین کر لیتے ہیں۔ ان کی طبیعت میں عجیب جستجو اور جس موجود ہے۔ وہ جب تک تحقیق نہ کر لیں کہ کسی شخص نے ادب میں جو منصب حاصل کیا ہے، کیا وہ واقعی اس منصب کا حقدار ہے؟ آیا کس کارنامے نے اسے یہ منصب دلایا؟ وہ پُر سکون نہیں رہ پاتے۔ بے حد خاموشی سے تحقیق میں مصروف رہ کر دور کی کوڑی لے ہی آتے ہیں اور ثابت کر دیتے ہیں کہ یہ شخص اس منصب کا حقدار بنا تو کون سے عوامل کارفرما تھے!

ان کے کتب خانے ''مکتبہ عابدیہ'' میں جو ذخیرہ موجود ہے اس پر نہ صرف ڈاکٹر حامد حسین نے بلکہ دیگر کئی صاحب قلم حضرات نے مضامین تحریر کر کے ان کی خدمات اور کاوشوں کو خراج تحسین پیش کیا ہے نہ صرف اردو زبان و ادب کی خدمت پر محمول کیا ہے بلکہ فن کی پرستش جیسے الفاظ سے نوازا ہے۔ ان نایاب کتب سے جہاں دیگر تشنگانِ علم و ادب استفادہ حاصل کرتے رہے ہیں، وہاں حیران کن یہ بھی ہے کہ مختار آرزو اور مالک رام جیسے ملک گیر اردو کے خدمت گار اصحاب نے بھی اپنا مطلوبہ مواد مکتبہ عابدیہ سے حاصل کیا ہے۔

ایک زمانے میں رئیس المتغزلین، جگر مراد آبادی نے بھوپال میں ''دار الکہلا'' کے نام سے ایک کاہلوں کی انجمن قائم کی تھی۔ خالد عابدی نے اس پر بھی تحقیقی کام انجام دیا جس میں کئی دلچسپ اور بے حد پُر شوق مگر ایک الگ قسم کے کلچر سے انھوں نے اہل ذوق کو متعارف کرایا ہے!

خالد عابدی نے جہاں خالص فکری و ادبی و تخلیقی کام کیے ہیں تو فلم میکنگ کے فن سے بھی کیوں کر ناواقف رہتے؟ مشہور فلم میکر، ہدایت کار، گیت کار، مصنف اور کوریوگرافر کیدار شرما کے لئے کیف بھوپالی کے ساتھ ایک فلم پر کام شروع کیا تھا جو کافی حد تک تکمیل کے مراحل طے کر چکا تھا کہ کیف بھوپالی داغ مفارقت دے گئے اور یہ فلم خالد عابدی کو داغ مفارقت دے گئی!

خالد عابدی کی ذات بے حد محدود ہے۔ کوئی شوق ان کے نزدیک جگہ نہیں پا سکا۔ حلقۂ احباب وسیع ہوتے ہوئے بھی محدود ہے۔ سگریٹ کا ذائقہ چکھا نہیں۔ پان کی لالی سے دہن نا آشنا رہا۔ فلموں سے جنون کی حد تک شوق ہوتے ہوئے بھی سینما ہال میں فلم نہیں دیکھی۔ صرف ایک شوق ہے، تلاش اور جستجو۔ اس تلاش کو پایۂ تکمیل تک پہونچا کر آگہی حاصل کرنا۔ غم روزگار، غم زمانہ اور غم دوراں میں بھی مطالعہ کا شوق ان سے دامن کشا نہیں رہتا۔ وہ پس منظر رہ کر اپنی جستجو، شوق اور تلاش کو تحریروں کے توسط سے پیش منظر لاتے ہیں۔ مجاہد حسین حُسینی کا یہ تبصرہ واقعی قابل تحسین ہے۔

''خالد عابدی پس پردہ رہنے کے باوجود اپنی تحریروں کے ایک ایک لفظ کے دریچے سے جھانکتے ہوئے نظر آتے ہیں''

انھیں نہ ستائش کی تمنا ہے اور نہ صلے کی پرواہ۔ یہ ایک فرسودہ سی بات ہے اور غیر فطری بھی۔ خالد عابدی کو بھی ستائش کی آرزو ہے۔ اپنی خدمات کا صلہ وہ بھی چاہتے ہیں۔ انھیں بھی خواہش ہے کہ وہ بھی سراہے جاتے رہیں۔ نوازے جاتے رہیں اور انھیں ان کا جائز مقام حاصل ہو۔ ان کے مختصر ڈرائنگ روم میں بھی سپاسنامے، اعزاز، انعام اور ایوارڈ کی ٹرافیاں سجی ہوں مگر۔۔۔!

خالد عابدی پوری طرح مذہبی نہ ہوتے ہوئے بھی مذہبی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارا مذہب (اسلام) ہی سب سے زیادہ ترقی پسند مذہب ہے۔ مارکسزم والے مزدور کے حقوق کا رونا روتے رہتے ہیں۔ لیکن اسلام تو مزدور کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے مزدوری ادا کرنے کا حکم دیتا ہے۔

خالد عابدی کی شخصیت تین دنیاؤں میں بٹی ہوئی ہے۔ آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت جہاں وہ آٹھ گھنٹے کے پابند رہتے ہیں۔ دوسری دنیا گھر بیوی اور بچے ہیں جن سے آدمی کی کلفتیں دور ہوتی ہیں اور اعصابی ''تکان'' نرم حریری شبنمی لمس سے جسمانی سکون میں تبدیل ہوتی ہے۔ تیسری وہ دنیا ہے جہاں ان کی کتابیں ہیں۔ ان کتابوں کے بیچ آ کر وہ ساری پرشور، پُرآشوب، غمِ دوراں، غمِ زمانہ کو وجود سے جھٹک کر بیگانہ ہو جاتے ہیں۔ کوئی منفی صدا ان کے کانوں تک راہ نہیں بنا پاتی۔ ایک خاموش سی قربت ان کے آس پاس سانس لیتی ہے۔ جہاں اقبال کا فلسفۂ حیات ہے۔ جہاں غالبؔ و میرؔ، مومنؔ و جوشؔ، فیضؔ و کیفیؔ کی نادر الکلامی ہے۔ ادب ہے تاریخ ہے فلسفہ ہے شاعری ہے قلم ہے تحقیق ہے زبان کی سطوت ہے، ادب کی توقیر ہے۔ اردو کی اس وسیع تر دنیا میں خالد عابدی کہاں تنہا ہیں؟

کہیں سے مدھوبالا کا حسنِ بے پناہ آشکار ہے۔ کس صفحے سے پرتھوی راج، دلیپ کمار، راج کپور، اشوک کمار، دیو آنند، پران اور چندر موہن جیسی شباہتیں اثر آفرین ہوتی ہیں کسی ورق پر مینا کماری، نرگس، نمی، نوتن، شبانہ اعظمی، سمیتا پاٹل اور شرمیلا ٹیگور کی اداکارانہ فن کاری جھلکتی ہے۔ کسی کتاب سے شعریؔ، سراج میر خاں سحر، کیف، تاج، کوثر، ابراہیم یوسف اور قمر جمالی و اسد بھوپالی کی آبرومندانہ صفات شعر و ادب کے آسمان پر چاند طلوع کرتی ہیں اور خالد عابدی اپنی اس دنیا میں خود اپنے آپ میں گم اپنے آپ کو تلاش کرتے رہتے ہیں۔ وقت کب گذر گیا احساس تب ہوتا ہے۔ جب ہوا کا کوئی سرد یا گرم یا مرطوب جھونکا وجود سے ٹکراتا ہے یا پھر اچانک بجلی گل ہو جائے!

بھوپال نے جہاں دیدہ ور پیدا کیے وہیں اُن کو نظر انداز بھی کیا گیا اور کھل کر کبھی خدمات کا اعتراف فراخ دلی سے نہیں کیا گیا۔ کسی سرکاری یا غیر سرکاری ادارے نے کبھی نوازنے کی زحمت

گوارا نہیں کی! حتیٰ کہ مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے جہاں ہر کس و ناکس کو نوازا۔ ایک شعری مجموعہ شائع ہونے پر نو مشق شاعر کو اعزاز و خلعت کا اسٹیج فراہم کیا خالد عابدی اکادمی کے انتخاب کی نظر میں بے اعتنا ٹھہرے آج تک انھیں جو بھی انعامات و اعزازات دیئے گئے وہ تمام و کمال ہندی اداروں نے دیئے اور وہ بھی ان کی علمی تحقیق و جستجو کے صلے میں!

محمد خالد عابدی ایک فعال شخصیت کا نام ہے۔ ایک ACTIVIST WRITER ان کے اندر رہتا ہے۔ اور اس ACTIVIST WRITER کو کسی بھی مادّی ستائش یا مادّی اعزاز کی ضرورت نہیں ہے۔

چونکہ تخلیق کار اپنے قاری کا محتاج ہوتا ہے۔ قاری ہی ان کی تخلیق کا باکس آفس ہے۔ وہی اُس کے فن کی کسوٹی ہے۔ قاری ہی اس کی حرکت و عمل اور ترغیب کا آئینہ بھی ہے اور عکس بھی۔ وہ قاری کے فیصلے سے ہی اپنے قلم کی مصالحت کو سبقت دیتا ہے۔ اور جہاں قاری ہی مصلح ہو، قاری ہی مبلغ ہو اور قاری ہی اس کی مانوس و ناموس قلم کی شناخت ہو تو اسے پھر کسی انفرادی یا اجتماعی سرفراز فوزمندی اور آدمی کی قدری و مقداری واہبے سے کوئی سروکار نہیں رہ جاتا۔ وہ تو اپنے وارفتگی شوق کو قرب کی لذتوں کا بیدار تعاون دینے میں آزاد ہو چکا ہوتا ہے۔

● ڈاکٹر رحمت یوسف زئی

سابق صدر شعبۂ اردو سینٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد

مجھے بے حد مسرّت ہے کہ آج مجھے آل انڈیا ریڈیو بھوپال میں انٹرویو ریکارڈ کروانے کا موقع ملا۔ جس کے لیے میں جناب خالد عابدی صاحب کا شکر گذار ہوں مجھے اس بات کی بھی مسرت ہے کہ بھوپال کے ریڈیو اسٹیشن سے اردو پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ اس اسٹیشن کے توسط سے اردو زبان و ادب کی ترویج ہو اور اس ریاست کے اردو بولنے والوں کے ادبی و علمی ذوق کی تکمیل ہو سکے۔

۲۸ر جنوری ۲۰۰۲ء

ایک چشمہ ندی بننے کے انتظار میں

رفعت سروش

مراسلاتی انٹرویو۔ ریڈیو ڈراما نگاری ۔ ریڈیائی پروگراموں کی ترتیب و پیشکش۔ افسانہ نگاری۔ تحقیقی اور تنقیدی مقالے۔ لائبریری کی ترتیب کا جنون دوستوں اور اپنے سے بزرگ لوگوں کے لیے اپنا وقت اور پیسہ خرچ کرنے والے۔

ان صفات کا کوئی آدمی ہو تو اسے ہر فن مولا ہی کہہ سکتے ہیں۔ اور ایک ایسے ہر فن مولا کو نہ صرف ہم جانتے ہیں بلکہ اُسے عزیز رکھتے ہیں۔ اس ہر فن مولا نے اپنے فنون وصفات کو گڈمڈ نہیں کیا ہے اور اس لئے ان کے سب کاموں میں خلوص کی جھلک ہے۔ اب رہی پختگی تو وہ تو عمر کے ساتھ ہی آتی ہے۔ اور یہ صاحبزادے خیر سے نوجوان ہیں۔ ایک بار ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا تو ان کے مختصر گھر میں خاندان کے افراد کے ساتھ کتابیں بھی اس طرح رہتی دیکھیں جیسے کبوتر باز، کی کابکوں میں کبوتر۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کبوتر کو کوئی اڑا لے مگر وہ واپس اپنے اڈے پر آجاتا ہے اور یہ اپنی کتاب کا کبوتر اپنے ہاتھ سے اس طرح اُڑاتے ہیں کہ اکثر واپس نہیں آتا۔ حوالے کی کتابوں اور تحقیقی مصالحوں کا خزانہ" ہے ان کے پاس۔ مگر اس خزانہ پر سانپ بن کر بیٹھنے کا فن انھیں نہیں آتا۔

اپنی جیب خاص سے کیا۔ اپنا تن پیٹ کاٹ کر کتابیں خرید کر پڑھنے اور جمع کرنے کا شوق ان صاحب کو جانے کیسے پڑ گیا۔ یہ شوق تو اچھے اچھے صاحب ثروت لوگوں کے حصوں میں نہیں آتا اور جن شان بگھارنے والے امراء اور نوابوں کو کتابوں کے کبوتر پالنے کا شوق نمائش کی حد تک ہوتا ہے وہ انھیں کابکوں میں بند رکھتے ہیں۔ نہ خود پڑھتے ہیں نہ کسی کو پڑھنے دیتے ہیں۔ اور ہمارے ان "غیر نواب" کا یہ عالم ہے کہ کارخانہ خیر جاری ہے۔ ان کے کان میں بھنک پڑ جائے کہ فلاں صاحب فلاں موضوع پر کام کر رہے ہیں۔ بس "خدمت خلق" کا لبادہ پہن کر اس کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے کتابوں کا نذرانہ لیکر۔ اور کیا خبر کہ اس کے تحقیقی مقالے کے کچھ باب بھی قلم بند کر دیتے ہوں۔ کیوں کہ ان کا اصول ہے کہ قلم کی خیرات میں بڑی برکت ہوتی ہے۔ ان کی خیرات کا کارخانہ کھلا ہے تحقیق کرنے والوں کے لئے، مقالہ نگاروں کے لیئے، ریڈیو کے لیے تقریریں اور فیچر وغیرہ لکھنے والوں کے لئے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ 'نیکی کر دریا میں ڈال' پر عمل کرتے

ہیں۔ ستائش کی تمنا اور صلہ کی خواہش ان کے مذہب خدمت میں کفر کا درجہ رکھتی ہے اور ان سے مستفید ہونے والے بھی ان کی خدمات کا احترام کرتے ہوئے کسی سے ذکر بھی نہیں کرتے کہ کس دریائے فیض سے ان کو فیض پہنچا ہے۔ وہ سب کچھ اپنے ہی کھاتے میں جمع کر لیتے ہیں۔ ایک صاحبہ نے بتایا کہ موصوف ان کے پاس گئے کہ فلاں موضوع پر تقریر لکھ دیجئے۔ وہ حیرت سے بولیں۔ میاں کہاں میں اور کہاں یہ ادق مضمون۔ موصوف نے کہا کہ آپ ہاں کر دیجئے، کنٹریکٹ فارم پر دستخط کر دیجئے، چیک وصول کرنے کا وعدہ کر لیجئے، باقی کام میرا۔ یہاں تک تفصیل بتا کر وہ کچھ خاموش ہو گئیں۔ یعنی یہ بات گول کر گئیں کہ اسکرپٹ کس نے لکھا۔ ہم نے بھی نہیں کریدی یہ بات۔

موصوف مراسلاتی انٹرویو لینے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں سوالنامہ بنانے سے پہلے اپنے شکار کے بارے میں بڑی عرق ریزی کے ساتھ تفصیلات بہم پہونچاتے ہیں پھر ان باتوں کو شکار کے منہ سے اگلوانے کے لئے انہیں سوالوں میں بکھیر دیتے ہیں۔ ذاتی طور پر ہم اس پکی پکائی تحریر کو انٹرویو کہنے سے معذور ہیں۔ اور اس لئے ہم نے ان کا سوالنامہ نہیں بھرا اور ان کی کتاب میں شامل نہ ہونے کا نقصان برداشت کیا۔ لیکن ہمارا کیا ہم تو اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کی مہارت رکھتے ہیں البتہ ہم سے بزرگ اور اعلیٰ ترین ادیبوں کے مراسلاتی انٹرویو ان کی کتابوں کی زینت بن گئے ہیں۔

ان کے ڈرامے ہلکے پھلکے اور نشاطیہ۔ بلکہ بعض اوقات طنز و مزاح کی چاشنی لئے ہوتے ہیں۔ ریڈیائی آدمی کی یہ مصیبت ہوتی ہے کہ ڈرامے فوری ضرورت پر لکھے جاتے ہیں اس لیے ایسی تحریریں اکثر کاتا اور لے دوڑے کے ذیل میں آتی ہیں۔ ان کی شخصیت میں جو تجرباتی رچاؤ ہے وہ ان کے ڈراموں میں ابھر کر نہیں آیا ہے۔ موصوف ایک ایسی چنگاری ہیں جو اندر ہی اندر سلگ رہی ہے۔ اسے شعلہ جوالہ بننے کے لئے وقت کی تیز آندھی کی ضرورت ہے۔ اور وقت ! ۔ وقت ان سے مطالبہ کرتا ہے کہ میاں جم کر کسی ایک صنف سخن کی طرف آؤ یہ انٹرویو وغیرہ صحافتی قسم کے کام ہیں۔ بہت کر چکے اب آگے بڑھو۔ تم تخلیقی جوہر رکھتے ہو۔ تم دل درد مند رکھتے ہو تم لفظ کے مزاج داں ہو اور لفظ کے استعمال کی صلاحیت رکھتے ہو۔ تم اپنے آپ کو پہچانو اور کسی ایک منزل کی طرف ثابت قدمی سے چلو۔

وقت کی اس نصیحت کو جب ہم نے سنا موصوف کے باب میں۔ تو ہم نے کہا کہ وقت بھی پہچاننے میں غلطی کرتا ہے۔ جب موصوف کی جذباتی منزل کے "دو نشانے" ہیں تو تخلیقی جوہر دکھانے کے لئے وہ اپنے کو کسی ایک صنف تک کیوں محدود کریں وہ تو تو شے کے قائل ہیں چاہے ذاتی

زندگی میں ہو یا تخلیقی اور اجتماعی زندگی میں۔

ایک بات جو موصوف کی جملہ سرگرمیوں کو سامنے رکھ کر کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ تخلیقی سرچشمہ اپنی جڑیں ادھر اُدھر ضرور رکھتا ہے۔ مگر جب مخرج سے پھوٹ کر ندی کی شکل اختیار کرتا ہے تو چشمہ کی تمام تہوں کا جوہر اس ندی میں نمودار ہو کر اکائی بن جاتا ہے۔ موصوف کے سرچشمہ تخلیق سے پیدا شدہ ندی کا نام ہمارے خیال میں ہے۔ ڈرامہ۔ ادھر اُدھر کی تحریریں سے قطع نظر ان کے ڈرامے ان کی پہچان بن سکتے ہیں۔ ہلکے پھلکے مختلف ڈرامے اور جھلکیاں اور ان کی کتابوں۔ ''آواز نما'' اور ''پیکر آواز'' میں موجود ہیں مگر ان کا فن صاف کہہ رہا ہے۔ ع

کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لیے

وہ زندگی کے عمیق مطالعے اور مشاہدے کو ضرور آج نہیں تو کل۔ بھرپور اور ایک بڑے ڈرامے میں پیش کرنے کی جسارت کریں گے۔ اور جس دن وہ ایسا کرینگے ان کے کام اور نام کی ایک پہچان ہوگی۔ ہم تو خیر ان کے نام سے واقف ہی ہیں اور ان کی ظاہری اور باطنی صلاحیتوں کی قدر کرتے ہیں۔ لیجئے۔ آل انڈیا ریڈیو بھوپال کے اس فعال فنکار کا نام آپ کو بتلا ہی دیں۔ کئی کتابوں اور درجنوں مضامین اور ڈراموں کے خالق۔ خالد عابدی۔

● صبیحہ صدیقی

بچوں کے کوئز پروگرام میں خالد عابدی صاحب نے موقع دیا۔ دوسری بار پھر خالد عابدی صاحب پروگرام ایکزیکٹیو ہو کر آئے تھے ان کی جانب سے جو موضوعات لکھنے کے لئے ملے ان میں کافی محنت کرنی پڑی۔ اس ضرورت کو پوری کرنے کے لئے مکتبہ عابدیہ سے کتب حاصل کی گئیں۔ مکتبہ عابدیہ سے کافی مدد ملی۔ وہاں خالد عابدی کا مجھے خلوص، محبت اور شفقت سب ہی کچھ حاصل ہوا۔ یہاں خالد صاحب انتہائی اور اپنے کام کو بہتر بنانے میں گہری دلچسپی لیتے ہیں وہ لب ولہجہ درست کراتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ وہ پروگرام ترتیب دینے میں کس طرح مصروف رہتے ہیں۔ ان کو زیادہ تر نئے آرٹسٹوں کی بھی تلاش رہتی ہے۔ وہ نئے آرٹسٹوں کے لئے کوئی نہ کوئی گنجائش ضرور نکال لیا کرتے ہیں۔

خالد عابدی کی خدمات ادب

سرسوتی سرن کیف

جناب خالد عابدی کی شخصیت نا قابل فراموش ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک نادر انسان ہیں۔ اقتصادی حیثیت سے دیکھئے تو اوسط طبقے کے فرد نظر آتے ہیں اور علم و ادب کا شوق دیکھئے تو وہ دل پایا ہے کہ رئیسوں کو مات کرتے ہیں۔ کتابیں جمع کرنے کا شوق جنون کی حد تک بڑھا ہوا ہے۔ ان کے ذاتی کتب خانے میں پانچ چھ ہزر سے زائد ہی کتابیں ہوں گی۔ رکھنے کی جگہ محدود ہے لیکن کتابیں جمع کرتے ہی چلے جاتے ہیں۔ اردو، ہندی اور انگریزی ادب کی شاید ہی کوئی اہم کتاب ہو جو ان کی کتب خانے کی زینت نہ ہو۔ وہ اہم کتابوں کے پڑنے اور نایاب نسخے حاصل کرنے میں روپیہ پانی کی طرح بہاتے ہیں۔ ادب لطیف یعنی افسانوی اور شعری ادب کے علاوہ ڈرامائی اسٹیج اور سنیما کے متعلق بھی نایاب کتابیں انہوں نے حاصل کر رکھی ہیں اور ادبی اور فلمی رسالوں کے خصوصی نمبر بھی ان کے ہاں مل جائیں گے۔ مختصر یہ کہ صرف ان کے ذاتی کتب خانے پر تکیہ کر کے دس بارہ تحقیق کار ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے سکتے ہیں۔ میرے خیال میں کم از کم بھوپال میں اتنا بڑا ذاتی ذخیرۂ کتب کہیں اور نہیں ملے گا۔

خالد صاحب کو شوق صرف کتابیں جمع کرنے کا نہیں ہے۔ افسانے، ڈرامے، تنقیدی، موضوعات وغیرہ پر ان کی لکھی ہوئی نو کتابیں ہیں۔ یک بابی ڈرامے لکھنے میں انہیں خاص مہارت ہے۔ ان کی تخلیقات کی خصوصیات میں ٹکسالی زبان تو ہے ہی ساتھ میں عام آدمی کے سامنے درپیش مسائل بہت موثر انداز میں پیش کئے جاتے ہیں۔ افسانوی اور ڈرامائی کرداروں میں زیادہ تر متوسط طبقے کے افراد ہوتے ہیں۔ ان میں مسلمان بھی ہوتے ہیں اور ہندو بھی اور زیادہ حالات میں ہندو اور مسلمان کرداروں کے باہمی تعلقات بہت اچھے دکھائے جاتے ہیں۔ میرے خیال میں مذہبی رواداری کی توسیع کیلئے اس قسم کے ادب کی اہمیت کافی بڑھ جاتی ہے۔

خالد صاحب اردو کے ادیب ہیں لیکن ان کی اردو نوازی کسی دوسری زبان کی نکتہ چینی سے

ملوث نہیں ہے۔ ہندی ادب اور ہندی الفاظ سے ان کا لگاؤ ان کی صلح کل کی ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے۔

افسانوی اور ڈرامائی ادب کے علاوہ خالد صاحب کو طنزیہ اور مزاحیہ ادب میں بھی کافی دلچسپی ہے۔ ریڈیائی ڈراموں میں تو طنز و مزاح خاص مزہ دے جاتا ہے۔

تخلیقی ادب کے مندرجہ بالا شعبہ جات کے علاوہ خالد عابدی صاحب کا قلم تنقیدی اور تاریخی ادب کے میدانوں میں بھی رواں ہی رہتا ہے۔ بھوپال اور مدھیہ پردیش کے ادب کی تاریخ پر ان کی خاص نظر ہے۔

خدا سے دعا ہے کہ خالد عابدی صاحب کا جوش ادب برابر بڑھتا رہے۔

❖❖❖

● ذاکر حسین (نیشنل آرکائیوز بھوپال)

جب خاکسار پہلی مرتبہ ریکارڈنگ کے لئے آیا تو جناب خالد عابدی صاحب کے ساتھ جب پہلا سابقہ پڑا تو اتفاق سے ریکارڈنگ کا بھی موقع ملا کیوں کہ انہوں نے ازراہ نوازش بہ نفسِ نفیس مجھے دعوتِ تقریر دی تھی۔ اگر چہ موضوع تقریر یاد نہیں رہا بس یہ ان کی بات سن کر غالبؔ کا شعر یاد آ گیا۔

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا　　　میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

• ان کے ساتھ متعدد ریکارڈنگ کا اتفاق ہوا اگر چہ اُن کا طریقہ کار دیکھ کر یہ لگا کہ وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی ہاں البتہ یہ ضرور رہا کہ میں نے اس تبادلہ خیال کے نتیجے میں تاریخ بھوپال کے کچھ نارسیدہ گوشوں کو ضرور وا کرنے کی کوشش کی کیونکہ انھیں بھوپال سے عشق ہے اور مجھے تاریخ اسلام سے محبت ہے انھوں نے ایڈجسٹ منٹ سے کام لیا اور ان کا مکمل تعاون مجھے حاصل رہا۔ بقول حاتم طائی آپ کو اک بار دیکھا ہے دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے بحیثیت پروگرام آفیسر اردو کے لیے آپ کی کارکردگی قابل داد ہے۔

محمد خالد عابدی : تعارف کے آئینے میں

سُلطان احمد صدیقی

محمد خالد عابدی سے نہ تو میری کوئی پُرانی واقفیت تھی اور نہ وہ ایسے مقبول و معروف کہ ذہن نشین ہوتے۔ کچھ مضامین اور افسانے نظر سے گذرے تھے۔ انجمن ترقی اردو ہند کے ہفت روزہ "ہماری زبان" میں ان کا مراسلہ شائع ہوا تھا۔ جس میں اعلان کیا تھا کہ وہ مدھیہ پردیش کے شعراء کا تذکرہ تیار کر رہے ہیں۔ ان کو میں نے خط لکھا، ایک دن ان کا خط ریوا سے آیا جس سے معلوم ہوا کہ وہ مدھیہ پردیش کے شاعروں اور ادیبوں کی تاریخ لکھ رہے ہیں۔

مجھے ایسے لوگوں سے ہمیشہ شکایت رہی ہے جو اس قسم کے مراسلے شائع کرانے کے بعد خط کا جواب دینے میں تساہل سے کام لیتے ہیں لیکن محمد خالد عابدی کچھ ایسے واقع ہوئے کہ خط کا جواب لکھنے میں بے حد تعجیل پسند (Prompt) کبھی کبھی تو ایسا ہوا کہ میں نے انھیں خط لکھا لیکن ان کے دو خط آگئے۔ اُجین کے شعراء کے سلسلے میں ان کا سوال نامہ آیا جس کے مطابق میں نے اُجین کے قدیم و جدید سو شعراء کرام کے حالات زندگی، منتخب کلام اور کچھ فوٹو فراہم کر دیئے۔ عابدی صاحب نے ان کو ترتیب دے کر تذکرہ شعرائے اجین، کو بالاقساط مختلف اخبارات و رسائل میں شائع تو کرا دیا ہے امید ہے کہ وہ کبھی یکجا کتابی شکل میں بھی منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوگا۔

خطوط کے تبادلے میں ان سے اتنی واقفیت بڑھی کہ آج خط و کتابت بالمشافہ گفتگو اور اب اوجین سے رشتہ کی وجہ سے دیرینہ تعلقات معلوم ہوتے ہیں۔ دیرینہ تعلقات اور خوشگوار تعلقات وہاں قائم رہ سکتے ہیں جہاں ذاتی مفاد یا غرض نہ ہو۔ ان چھ سات سالوں میں محمد خالد عابدی کو بہت قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ وہ ریوا سے تبدیل ہو کر آکاش وانی اندور آگئے ہیں۔ وہ جب کبھی اوجین آتے ہیں اور جب کبھی میں اندور گیا ہوں تو ان سے خوب ملاقاتیں رہی ہیں۔ ان ملاقاتوں میں ہر طرح کے موضوعات پر ان سے تبادلۂ خیال ہوا ہے۔ میں نے اردو زبان و ادب کی بقا و فروغ کے لیے انھیں بہت فعال پایا۔ اردو زبان و ادب سے اتنی دلچسپی اور تڑپ میں نے بہت کم لوگوں میں دیکھی ہے۔

جب میں نے یہ دیکھا کہ محمد خالد عابدی دیوانہ وار مدھیہ پردیش میں اُردو زبان و ادب

کے بارے میں مواد کی تلاش میں کوشاں ہیں تو میں نے جس صورت میں ان کی مدد ہو سکتی تھی وہ کی اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ محمد خالد عابدی کے پاس مدھیہ پردیش کا اردو میں جو ذخیرہ ہے وہ شاید ہی کہیں دوسری جگہ ہو۔ انھوں نے بعض معمولی کتابیں بھی ایک بڑی رقم خرچ کرنے کے بعد حاصل کی ہیں۔

محمد خالد عابدی کے افسانوں کا مجموعہ "زخموں کے دریچے" شائع ہو رہا ہے۔ اس مجموعے سے پہلے بھی ان کی دو کتابیں چھپ چکی ہیں اب سے دس گیارہ ماہ پہلے اوجین کے کچھ ادب دوست ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک ادبی تقریب کا انعقاد کر رہے تھے اس موقعہ پر میں نے محمد خالد عابدی کا مختصر تعارف اور ان کی ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے ایک مضمون لکھا۔ لیکن بعض وجوہ کی بناء پر وہ تقریب التواء میں پڑ گئی عابدی صاحب سے جب میری ان کی تقریب کے بارے میں بات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ اگر آپ نے وہ مضمون لکھ لیا ہو تو مجھے دے دیجئے میں اسے "زخموں کے دریچے" میں شامل کر لیتا ہوں۔ چنانچہ کچھ رد و بدل کے بعد مضمون حاضر ہے۔

محمد خالد عابدی اصلی اور قلمی نام ہے ان کے والد محمد عابد صاحب عرف دل آرام ٹیلر" بھوپال کے مشہور خیاط ہیں۔ مسٹر عابدی کی زبانی معلوم ہوا کہ محمد عابد صاحب کچھ عرصے بھوپال کی سلطانیہ انفینٹری (فوج) میں ملازم رہے لیکن ملازمت میں طبیعت نہیں لگی لیکن خیاطی کے کام میں انھیں اتنی دلچسپی ہوئی کہ بھوپال ریاست کے زیادہ سے زیادہ روٴسا کے ملبوسات آپ ہی تیار کرتے تھے۔ نواب حمید اللہ خاں آف بھوپال سر راس مسعود سررشتہ تعلیم بھوپال، مولانا سہا مجددی بھوپالی، علامہ اقبال اور مولانا ارشد تھانوی وغیرہ کے لباس سینے کا انھیں فخر حاصل رہا ہے۔

محمد خالد عابدی شہر بھوپال میں ۱۷ راگست ۱۹۴۷ء میں پیدا ہوئے لیکن اسکول اور کالج کی اسناد میں ان کی تاریخ پیدائش ۱۷ رنومبر ۱۹۴۹ء درج ہے۔ مسٹر عابدی نے پہلی ملازمت ۱۹۷۲ء میں بجلی گھر میں کی۔ بجلی گھر کی کلرکی انھیں پسند نہیں تھی۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۷۷ء سے وہ آل انڈیا ریڈیو ریوا میں ہیں جون ۱۹۸۱ء تک وہ آل انڈیا ریڈیو ریوا میں رہے اور جولائی ۱۹۸۱ء میں تبدیل ہو کر اندور آگئے اور تا حال آل انڈیا ریڈیو اندور سے وابستہ ہیں۔

عابدی صاحب نے ۱۹۷۲ء میں بھوپال سے ہائر سیکنڈری کا امتحان پاس کیا ریوا میں ملازمت کے ساتھ ساتھ ۱۹۷۸ء میں بی اے پاس کیا۔ ریوا سے تبادلے کے بعد اندور یونیورسٹی سے ۸۵-۱۹۸۴ء میں پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے اردو میں ایم۔ اے۔ فرسٹ ڈویژن میں امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔

عابدی صاحب کو اردو زبان و ادب سے دلچسپی ان کے استاذ محترم حضرت جہاں قدر چغتائی کی ترغیب سے ہوئی جہاں قدر چغتائی صاحب حضرت عشرت قادری اور پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب، عابدی کو لکھنے پڑھنے کے لئے مسلسل حوصلہ افزائی فرماتے رہے۔ ابراہیم یوسف اور انجم سلمانی صاحبان کو بھی عابدی اپنا ادبی رہنما تسلیم کرتے ہیں۔

محمد خالد عابدی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا تھا۔ کچھ غزلیں اور نظمیں شائع بھی ہوئی تھیں لیکن ان کے اساتذہ نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ نثر کی طرف توجہ کریں۔ چنانچہ عابدی نثر میں بہت تیزی سے اُبھرے۔ افسانے ڈرامے، تنقیدی و تحقیقی مضامین، رپورتاژ، خاکے، انٹرویو اور معلوماتی مراسلے ملک کے مقتدر رسالوں میں شائع ہونے لگے۔

عابدی صاحب کے شوق اور ان کی فلمی معلومات کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ انھیں فلمیات سے بہت دلچسپی ہے اردو ہندی کے بیشتر اخباروں اور رسالوں میں فلمی مضامین شائع ہوئے ہیں جو فلمی معلومات سے پُر ہیں۔ اس کو دیکھتے ہوئے انھیں یہ مشورہ بھی دیا گیا ہے کہ وہ فلمیات پر اردو میں کوئی تصنیف پیش کریں مجھے بھی ان کی لائبریری دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ فلم پر ان کے پاس ایک بہت ہی اچھا ذخیرہ ہے۔

مدھیہ پردیش کے مقبول ہندی روزنامہ "نئی دنیا" اندور اور "بھاسکر" اندور میں ان کے فلمی مضامین اکثر شائع ہوتے ہیں۔ محمد خالد عابدی اس کوشش میں ہیں کہ وہ "فلموں کی ترقی میں اردو کا حصہ" موضوع پر پی۔ ایچ۔ ڈی کریں۔ موضوع دلچسپ ہے اور میرے خیال سے ابھی تک اس پر کام کم ہی ہوا ہے۔ عابدی صاحب مستقبل میں ایک اچھی اور باقاعدہ لائبریری قائم کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ ان کے پاس تقریباً چھ الماریاں کتابوں سے بھری ہیں، جس میں تازہ ترین شاہکار موجود ہیں اور ان میں ہر ماہ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ انھیں کتابوں سے عشق ہے۔ لائبریری کے تعلق سے ان کا ایک مضمون عرصہ ہوا بھوپال ریڈیو سے نشر ہوا تھا۔ بی بی سی لندن کی اردو نشریات میں بھی کتابوں کے متعلق ان کا ایک انٹرویو نشر اور شائع ہو چکا ہے۔

محمد خالد عابدی کے ذخیرۂ کتب میں مختلف موضوعات پر اچھی اچھی کتابیں تو ہیں ہی بہت سے رسالوں کے مجلد فائل بھی ہیں۔ رسالوں کے فائل مکمل کرنے اور ان فائلوں کو جمع کرنے میں وہ کیا کیا جتن کرتے ہیں اس کا ذکر ضروری ہے۔ وہ بیس بائیس پرچوں کے سالانہ خریدار ہیں۔

اکثر ڈاک کی بدنظمی سے پرچے ضائع بھی ہو جاتے ہیں۔ ان گمشدہ شماروں کو وہ بہت ہی کوشش سے اِدھر اُدھر سے تلاش کر کے فائل مکمل کرنے کے چکر میں منہ مانگی قیمت پر شمارہ خرید لیتے

ہیں۔ جو کہ ایک عام آدمی اس طرح خریدنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ عابدی اس سلسلے میں اکثر کہا کرتے ہیں کہ وہ اپنے وطن (بھوپال) میں اس طرح کی خرید کے معاملے میں بہت معتوب ہیں۔

مسٹر خالد عابدی کو یہ شکایت بھی ہے کہ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کے ایسے طلباء و طالبات ان سے کتابیں اور حوالہ جات لے جاتے ہیں۔ لیکن یہ حوالہ نہیں دیتے کہ یہ سب کچھ انھوں نے کس سے کہاں سے اور کس طرح حاصل کیا ہے وہ اسے بددیانتی پر محمول کرتے ہیں، تاہم وہ اپنا یہ تعاون جاری رکھے ہوئے ہیں۔

عابدی صاحب اس بنیاد پر زور دیتے ہیں کہ پہلے زبان ہے اور بعد میں ادب۔ جب زبان ہی کو فروغ اور بقاء حاصل نہ ہوگی تو ادب کیسے ترقی کریگا۔ یہ پوچھتے پر پوچھتے جو تخلیق کیے جا رہے ہیں۔ خود اردو کے ادیب شاعر استاد، اور صحافی ایسے کتنے ہیں جو اردو کے اخبار رسالے خرید کر پڑھتے ہیں اور ان کے بچے کیا اردو پڑھ رہے ہیں؟ وہ اس سلسلے میں کافی کوشاں ہیں کہ اپنے ضروری کاموں کو چھوڑ کر وہ لوگوں کو اردو پڑھاتے ہیں وہ بغیر معاوضے کے یہ خدمت انجام دیتے ہیں۔ بعض اوقات کتابیں تک فراہم کرتے ہیں۔ حیرت اور مسرت کی بات تو یہ ہے کہ اردو سیکھنے والے غیر مسلم ہیں۔

محمد خالد عابدی نے جب لکھنؤ میں ڈاکٹر سید نورالحسن ہاشمی سے ملاقات کی تو ہاشمی صاحب نے اپنے مہمان شری راز کرہلوی (مدیر سنگتی لکیریں) لکھنؤ سے تعارف کراتے ہوئے فرمایا تھا کہ ''عابدی صاحب بہت لکھاڑ'' ہیں۔ موصوف کا اشارہ محمد خالد عابدی کی طرف سے لکھے گئے خطوں کی طرف تھا۔

خط لکھنا عابدی کی Hobby ہے۔ عابدی اب سے تقریباً دس بارہ سال قبل ڈائری لکھا کرتے تھے ڈائری نویسی میں پابندی عین ضروری ہے۔ انھوں نے کچھ عرصے تک تو پابندی کی لیکن وہ سلسلہ قائم نہیں رکھ سکے اور اس سلسلے کو انھوں نے خط نگاری میں بدل دیا۔ ان کے خط کسی حد تک ڈائری کی ضرورت پوری کرتے ہیں۔ لوگ نوادرات جمع کرتے ہیں، عابدی صاحب خطوط کو نوادرات کا درجہ دیتے ہیں۔ لہذا وہ بے تکان لوگوں کو خط لکھتے ہیں۔ اور مشاہیر کے خطوط جمع کرتے ہیں۔ اگر آپ قارئین حضرات، مشاہیر کے خط محفوظ نہ رکھ سکیں تو میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ تمام خط آپ عابدی صاحب کے پاس محفوظ کر دیں۔ یہ میرا دعویٰ ہے کہ محمد خالد عابدی محفوظ رہیں یا نہ رہیں لیکن آپ کے خطوط ضرور محفوظ رہیں گے۔ میرے دعوے کو اگر آپ غلط نہ سمجھیں تو۔ اُن کے پاس جو خطوط کا ذخیرہ ہے اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے ان کو ترتیب دے کر وہ اس کی اشاعت کی فکر میں ہیں۔

محمد خالد عابدی کو بچپن سے فلم اور ریڈیو سے دلچسپی تھی۔ ۱۹۷۲ء میں انھوں نے بجلی گھر بھوپال میں کلرکی کر لی اور اپنی آرزو کی تکمیل کے لئے جد وجہد کرتے رہے۔ ریڈیو میں وہ گذشتہ دس گیارہ سال سے پروڈکشن اسسٹنٹ کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ لیکن اب ان کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ریڈیو سروس سے بیزار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے عابدی کو جو صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں وہاں ان کا صحیح استعمال نہیں بلکہ استحصال ہو رہا ہے انھیں ڈرامے سے خصوصی دلچسپی ہے، ڈرامے پر ان کی دو کتابیں ہیں۔ ایم۔اے اردو میں انھوں نے اپنا مقالہ ''ڈرامہ اور ڈراما نگار'' ابراہم یوسف پر لکھا ہے۔ کالج اور اسکولوں میں ان کے لکھے ہوئے ڈرامے اسٹیج کیے جا چکے ہیں بلکہ وہ ڈرامے پیش کش کے اعتبار سے انعامات کے مستحق قرار دیئے گئے'' شگوفہ'' حیدرآباد کے مزاحیہ ڈراما نمبر میں ان کا ایک مزاحیہ ڈراما ''غالب فلم انڈسٹری میں'' منتخب ہوا۔ ''مدھیہ پردیش میں اردو ادب کے پچیس سال'' ضخیم انتخاب میں، ان کا ڈراما ''دوسرا جنم'' شامل ہے۔ حیرت ہے کہ ریڈیو باہر سے تو فنکاروں کو تلاش کرتا ہے لیکن خود اپنے فنکاروں کا استحصال کرتا ہے۔

عابدی بالعموم اسٹوڈیو میں ریکارڈنگ، ڈبنگ، ایڈیٹنگ اور سیدھے سادے پروڈکشن میں مصروف رہتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ بیرونی پروگراموں کی ریکارڈنگ ان کے ذمے ہے۔ اگر ان کی یہی مصروفیت رہی تو ان کے تخلیقی سوتے خشک ہو سکتے ہیں۔ ریڈیو میں فنکار کا اب اس سے بڑھ کر استحصال اور کیا ہوگا کہ بیشتر اچھے پروڈکشن پر افسران اپنا نام ثبت کر دیتے ہیں، جب کے وہ پروڈکشن اسسٹنٹ کے تیار کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ محمد خالد عابدی ان میں سے ایک ہیں جو اس استحصال کا شکار ہوئے ہیں۔ عابدی اس طرح کی اور بھی صعوبتیں ریڈیو سروس میں برداشت کر رہے ہیں۔ وہ ریڈیو میں بے حد مصروف ہونے کے بعد بھی ادبی ذوق کی تکمیل کے لیے کچھ وقت نکال ہی لیتے ہیں، خواہ وہ وقت ان کے آرام کا ہی کیوں نہ ہو۔

مسٹر عابدی صرف اپنے کاموں کی حد تک ہی ذمہ دار نہیں بلکہ وہ دیگر حضرات کے لیے بھی سنجیدہ ہیں لوگوں میں اُردو سے دلچسپی پیدا کرنا شاعروں، ادیبوں کو رسائل وغیرہ کی فہرستیں ترتیب دے کر فراہم کرنا، ان کے لئے مختلف اداروں سے خط و کتابت کرنا، اسکولوں اور کالجوں میں اردو کتابوں کی خرید کے لئے شوق پیدا کرنا، ایم۔اے کے مقالے ہوں یا پی۔ایچ۔ڈی۔ کے تحقیقی مقالے ہوں یا اشاریہ تیار کرنا ہوں یا مسودے کی نقل کرنا ہو وہ اس طرح کے کاموں میں پیش پیش رہتے ہیں۔ انکے مشاہدے میں ایسے اشخاص بھی ہیں کہ جب جب انھیں حوالہ جات وغیرہ فراہم کئے تو انھوں نے نہایت بے اعتنائی سے کہہ دیا کہ یہ حوالہ تو فلاں صاحب نے دے دیا تھا، یا اس

حوالے کے بارے میں تو مجھے معلوم ہے، لیکن بعد میں کسی نہ کسی چالاکی سے وہ لوگ یہ سب کچھ حاصل کرنے کی سعی کرتے ہیں یہ نہایت نامناسب حرکت ہے۔

محمد خالد عابدی کو خوش خطی سے بھی بہت دلچسپی ہے۔ ان کے والد محترم کا خط بھی نہایت پاکیزہ ہے انھوں نے خوش خطی کے کسی ادارے یا استاد سے باقاعدہ تعلیم و تربیت حاصل نہیں کی ہے۔ لیکن ذاتی ذوق وشوق سے انھوں نے یہ فن سیکھا ہے۔ مشہور خوش نویسوں اور خطاط و کاتبوں کی کتابوں اور نمونوں کو وہ اپنے مطالعے و مشاہدے میں رکھتے ہیں۔ وہ ان کتابوں کی مدد سے مشق کر کے اس فن کو سیکھ رہے ہیں۔ وہ وقتاً فوقتاً بھوپال کے مشہور خطاط و کاتب، حضرت صادق حسین (رضوی آرٹ پریس) سے اس سلسلے میں مشورہ کرتے ہیں۔

جیسا بھی اور جتنا بھی خوش خطی کا فن انھوں نے سیکھا ہے اس بنیاد پر وہ چھوٹے موٹے پوسٹر، ہینڈ بل رمضان شریف کی تقویم اور شادی کارڈ وغیرہ لکھ لیتے ہیں۔ حال ہی میں حضرت ساغرؔ چشتی اوجینی مرحوم کا شعری مجموعہ ''متاعِ ساغرؔ'' کی کتابت انھوں نے کی ہے جو کہ آفسیٹ پر شائع ہوئی ہے۔ کتابت اساتذۂ فن کے لحاظ سے ابھی کچھ کمزور تو ہے لیکن ذوق وشوق اور مشق سے یہ کمی بہت جلد دور ہو سکتی ہے۔

محمد خالد عابدی ابھی تک ان چار کتابوں کے مصنف و مرتب ہیں۔

(۱) آوازنما:۔ عابدی صاحب نے آل انڈیا ریڈیو بھوپال کے لیے بہت سے ڈرامے لکھے تھے۔ ان ڈراموں پر مشتمل آواز نما میں آٹھ ڈرامے شامل ہیں۔ ریڈیو ڈراموں کا یہ مجموعہ ۱۹۷۵ء میں شائع کیا۔ اس مجموعہ میں ڈاکٹر اخلاق اثر نے محمد خالد عابدی کی مختصر سوانح اور ان کے ریڈیو ڈراموں پر تفصیلی مضمون ''پیش لفظ'' کے طور پر لکھا تھا اور معروف ڈرامہ نگار ابراہیم یوسف صاحب نے دلچسپ انداز میں عابدی کا تعارف لکھا تھا۔

آواز نما کے مصنف کو اُتر پردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ سے ۱۹۷۵ء میں ایک ہزار روپیہ کا انعام دیا گیا۔ آواز نما پر بہت سے رسالوں اور اخباروں میں تبصرے شائع ہوئے تھے۔ آواز نما کی اشاعت اور انعام حاصل کرنے کی خوشی میں انجمن ترقی اردو بھوپال اور ''بزم محور ادب بھوپال'' کی جانب سے تقاریب بھی منعقد کی گئی تھیں ان تقاریب میں سابق وزیر اعلیٰ مدھیہ پردیش شری شیاما چرن شکلا اور ڈاکٹر شنکر دیال صاحبان نے گل پوشی فرمائی تھی۔

(۲) باغِ فکر معروف بہ مقطعات نساخ:۔ آواز نما کی اشاعت کے بعد ۱۹۷۷ء میں بھوپال بک ہاؤس بھوپال کے مالی اشتراک سے ''باغِ فکر معروف بہ مقطعات نساخ'' شائع ہوئی۔ یہ دراصل عبدالغفور نساخ کے مقطعات پر مشتمل ایک کتابچہ تھا جو کم یاب اور کافی حد تک

نایاب تھا۔ اس کتابچے کو عابدی نے ایڈٹ کیا تھا۔ تحقیق ایک مشکل اور نازک فن ہے مذکورہ کتاب میں عابدی سے ایک ایسا سہو ہو گیا جسے مقامی ادیبوں نے نہایت پھوہڑپن اور بے ہنگم طریقوں سے طول دیا۔ عابدی نے غلطی کا اعتراف کرلیا اور کتاب میں مناسب ترمیم و تنسیخ بھی کرلی تھی لیکن بدخواہوں نے انھیں کافی عرصے تک ذہنی اذیتیں پہونچائیں۔ مسٹر عابدی اس سلسلے میں کہتے ہیں کہ "جن لوگوں کے علم میں وہ سہو تھا انھوں نے کتاب کی اشاعت کے دوران دانستہ خاموشی اختیار کر رکھی تھی اور اشاعت کے بعد نہایت بُرے طریقوں سے اس غلطی کو ظاہر کیا گیا۔

(۳) پیکرِ آواز:۔ یہ محمد خالد عابدی کی تیسری کتاب ہے "پیکرِ آواز ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ہے، جو کہ فخر الدین علی احمد میموریل اردو کمیٹی لکھنؤ کے مالی اشتراک سے ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ اس پر آواز نما سے زیادہ تبصرے شائع ہوئے ہیں۔ یہ آواز نما کے بعد ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ہے۔

(۴) زخموں کے دریچے:۔ عابدی صاحب کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس میں اُن کے ابتدائی افسانے ہیں جو کہ مختلف رسائل میں شائع بھی ہوئے ہیں۔ عابدی نے اس مجموعے کا نام "کانٹے کی خوشبو" رکھا تھا۔ لیکن کتاب کا مسودہ فخر الدین علی احمد میموریل اردو کمیٹی لکھنؤ میں مالی تعاون کے لیے زیرِ غور تھا کہ اس اثناء میں دو الگ الگ مجموعے کسی اور شخص کے اسی نام سے آگئے۔ چنانچہ عابدی نے اپنے مجموعے کا نام اب "زخموں کے دریچے" رکھا ہے یہ مجموعہ ۱۹۸۷ء میں شائع ہو رہا ہے۔

محمد خالد عابدی کی کم از کم پندرہ بیس کتابوں کے مسودے اشاعت کے منتظر ہیں۔ کاش یہ مسودے مدھیہ پردیش اردو اکادمی بھوپال کے مالی تعاون یا اکادمی کی جانب سے جلد از جلد شائع ہو سکیں۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ صوبائی اردو اکادمی سے عابدی کے مسودوں کو مالی تعاون نہیں ملا اور کل ہند ادارہ، فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی نے دو مجموعے شائع کرا دیئے۔ متوقع کتب کی فہرست ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) ابراہیم یوسف ایک مطالعہ (اردو ڈراما نگار ابراہیم یوسف کی شخصیت اور فن پر لکھا گیا مقالہ، برائے ایم۔ اے) (۲) متاعِ رفتہ (مرحوم شعراء و ادباء کے خط بنام محمد خالد عابدی) (۳) شکایتاً عرض ہے (طنزیہ و مزاحیہ مضامین) (۴) روبرو (بھوپال کے شعراء و ادباء سے انٹرویو (۵) اردو میں انٹرویو نگاری (۶) مضامینِ خالد:۔ (تحقیقی و تنقیدی) (۷) تبصرے اور تجزیے:۔ (دیگر مصنفین کی کتب پر تبصرے وغیرہ) (۸) فلموں کی ترقی میں اردو کا حصہ (۹) مدھیہ پردیش کے قابلِ دید مقامات (۱۰) مدھیہ پردیش کا لوک ادب و فن (۱۱) مدھیہ پردیش میں امیر مینائی کے تلامذہ (۱۲) مدھیہ پردیش میں داغ دہلوی کے تلامذہ (۱۳) مدھیہ پردیش میں مضطر خیر آبادی کے تلامذہ

(۱۴) مدھیہ پردیش میں سیماب اکبر آبادی کے تلامذہ (۱۵) مدھیہ پردیش میں مولانا احسن مارہروی کے تلامذہ (۱۶) مدھیہ پردیش میں اردو کے ہندو شعراء و ادباء (۱۷) مدھیہ پردیش کے ڈراما نگار (۱۸) مدھیہ پردیش کی خواتین قلمکار (۱۹) مدھیہ پردیش میں اردو صحافت (۲۰) مدھیہ پردیش کے افسانہ نگار (۲۱) تذکرہ شعرائے مدھیہ پردیش۔

محمد خالد عابدیؔ نے طالب علمی سے اب تک کئی انعامات و اعزازات حاصل کئے ہیں۔ اسکول اور کالج کے زمانے میں انھیں بیت بازی سے کافی دلچسپی تھی۔ نمائندگی کی انعامات و سند حاصل کیں۔ گاندھی شتابدی کے موقع پر مضمون نویسی کے مقابلے میں شریک ہو کر انعام کے مستحق قرار دیے گئے۔

''آواز نما'' کے انعام کے سلسلے میں انجمن ترقی اردو اور ''محورِ ادب'' بھوپال نے استقبال کیا۔ ریوا کے ٹھاکر رنمت سنگھ کالج کے ایک اردو پروگرام میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔

مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے ضخیم مجموعہ انتخاب میں ''دوسرا جنم'' ڈراما شامل ہے۔ حیدر آباد کے ماہنامہ ''شگوفہ'' کے مزاحیہ ڈراما نمبر میں۔ ''غالب فلم انڈسٹری میں'' شریک ہے۔

ڈاکٹر اخلاق اثر نے اپنی تالیف ''ریڈیو ڈرامے کی تاریخ'' کا انتساب عابدی کے نام کیا ہے۔

ڈاکٹر انصار اللہ نظر کی تالیف ''زبان ریختہ'' اور ڈاکٹر کشور سلطان کی کتاب ''جاں نثار اختر، حیات اور فن'' میں حوالے ہیں۔ بی بی سی لندن کی اردو نشریات پر مشتمل کتاب ''کتب خانہ'' میں جا بجا محمد خالد عابدی کا ذکر ہے۔ اتر پردیش اردو اکادمی کی شائع شدہ کتاب ''دستاویز'' میں عابدی کی مختصر سوانح شائع ہوئی ہے۔ آل انڈیا ریڈیو بھوپال کی فرمائش پر، اندور اور مہو پر دو تین اردو فیچر بھی پیش کر چکے ہیں۔

وہ برابر لکھ رہے ہیں۔ میری دعا ہے اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

خالد عابدی میری نظر میں

سید شرافت علی ندوی

بھوپال کی سرزمین مردم خیز ہے یہاں کی ہوا و فضا میں زرخیزی ہے یہاں شخصیت کی تعمیر و تزئین کے بھرپور اسباب موجود ہیں۔ شرط یہ ہے کہ آدمی میں خود بھی کچھ صلاحیت ہو۔ کچھ کرنے کا کچھ بننے کا جذبہ ہو۔ بھوپال کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ یہاں جو باہر سے آیا وہ یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ اور اساتذہ و مربین کی شفقت و تربیت سے کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ پھر وہ شخصیتیں جو یہیں پیدا ہوئیں اور ابتدا سے ہی ان کو پھلنے پھولنے کے مواقع ملے۔ خوشنما، دلکش ماحول ملا۔ قابل اتحاد و تعلیمی ادارے ملے۔ علمی و ادبی مجلسوں کی آغوش ملی۔ بڑوں اور بزرگوں کا سایہ وہ شہرت وعظمت سے ہم کنار ہوئیں۔ بھوپال نے ان پر ناز کیا اور وہ خود بھی بھوپال پر ناز کرتے رہے۔ ایسے خوش نصیبوں کی فہرست بڑی طویل ہے۔ لیکن ان میں ایک نام جو مجھ کو اس لحاظ سے زیادہ متاثر کرتا ہے کہ اس کی خدمات ہوا میں تحلیل ہونے والی خدمات نہ ہو کر دل و دماغ پر ثبت ہونے والے نقوش کی طرح ہیں یہ نام خالد عابدی کا ہے۔

خالد عابدی سے میرا تعلق و تعارف تو بعد میں ہوا لیکن ان کے والد محترم محمد عابد صاحب مرحوم سے میرے مراسم پہلے ہوئے میں تاج المساجد بھوپال میں جمعہ کی امامت کرتا اور نماز سے پہلے کسی موضوع پر تقریر کرتا۔ وہ دیگر مقتدیوں کی طرح سنتے اور نماز کے بعد میری حوصلہ افزائی کرتے۔ مسجد و مدرسہ سے میرے تعلق کی بنا پر مجھ سے ان کی محبت و خلوص کچھ زیادہ ہی تھا غالباً میری زبان و بیان سے مانوسیت کی بنا پر انھوں نے اپنے لائق و فائق فرزند خالد عابدی سے جو آکاش وانی سے وابستہ ہیں میرا ذکر کیا ہوگا۔ اور پھر خالد صاحب نے مجھے دیکھ کر اور سن کر اس قابل سمجھا کہ آکاش وانی کے اخلاقی و ادبی پروگراموں میں مجھے موقع دیا۔ اس تعلق سے میں ان کے قریب ہوتا گیا اور ان کو سمجھنے کا موقعہ ملتا گیا۔

ایک دو ملاقاتوں میں ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ خالد عابدی علم و ادب، مطالعہ و تحقیق، تصنیف و تالیف کی ایک اہم شخصیت ہیں ان کا علمی و ادبی ذوق نہ صرف معیاری ہے بلکہ مستند بھی ہے میں نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ وہ اپنی علمی افتاد طبع، تخلیقی صلاحیت اور جذبۂ خدمت کے اعتبار سے

اس سرکاری ملازمت، عہدہ و امتیاز سے کہیں زیادہ بلند ہیں جس پر وہ فائز ہیں۔ اور پھر یہ دیکھ کر اور بھی حیرت رہی کہ آکاش وانی کی مختلف ذمہ داریوں اور پابندیوں کے ساتھ ساتھ وہ وقت کی خیانت کئے بغیر اپنے پسندیدہ موضوعات پر لکھتے رہتے ہیں اور مطالعہ و تحقیق کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں آکاش وانی کے مختلف مراکز میں ادھر سے ادھر منتقلی، خانگی اعتبار سے دوہری ذمہ داریاں۔ بچوں کی تعلیم و تربیت رشتوں کا احترام، حقوق و واجبات کی ادائیگی۔ یہ سب مختلف النوع فرائض ان کے ذوق و شوق کی تکمیل و تسکین میں مانع نہیں بنتے بلکہ تمام تر مذہبی، اخلاقی، عائلی اور معاشی ذمہ داریاں خوش اسلوبی اور خندہ پیشانی سے انجام دیتے رہتے ہیں جس کا مشاہدہ تو کم ہوا لیکن اندازہ ان کی گفتگو اور اندازِ گفتگو سے بہ آسانی ہو جاتا ہے۔

میں نے ان کی ذاتی لائبریری کی بھی زیارت کی ہے، موصوف نے اپنے علمی، ادبی ذوق کے تحت مذہبی، علمی اور تنقیدی کتب کا نایاب ذخیرہ جمع کر رکھا ہے۔ تقریباً چار ہزار سے زائد تصنیفات یہاں موجود ہیں۔ ہندو پاک کے معیاری رسائل مشاہیر علم کے خطوط اور نادر تصاویر۔ قدیم اخبارات فنی سلیقہ اور ترتیب کے ساتھ یہاں آپ کو مل جائیں گے بھوپال کے اہلِ علم اپنے مطالعہ کی تکمیل اور علمی تحقیقات کے لئے یہاں آتے رہتے ہیں۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کے متعدد اسکالروں نے یہاں آکر کسبِ فیض کیا ہے۔ اور اپنے مقالات کے لئے سیر حاصل مواد ان کو ملا ہے۔ راقم الحروف بھی اپنے بعض مقالات و مضامین کے سلسلہ میں یہاں حاضر ہو چکا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ کسی وقت خالد عابدی کے اس کتب خانہ کا باقاعدہ فنون کی ترتیب کے ساتھ جائزہ لوں۔ کتابوں کی تفصیلات و امتیازات نیز مصنفین و مؤلفین کے احوال معلوم کر کے مستقل ایک تعارفی مقالہ تحریر کروں اب دیکھئے یہ تمنا کب پوری ہوتی ہے اور ایک پوشیدہ خزانہ کی اہمیت وافادیت اہل بھوپال تک کب پہنچتی ہے۔

خالد عابدی کا خاص موضوع اردو ادب ہے۔ ان کی تخلیقات میں افسانے اور ڈرامے ہیں، طنزیہ مزاحیہ مضامین ہیں، تبصرے، جائزے اور تنقیدیں ہیں۔ ان کے علاوہ تحقیقی مضامین و مقالات بھی انھوں نے تحریر کئے ہیں۔ جو مختلف سیمناروں میں پڑھے گئے اور سراہے گئے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ انھوں نے بیسویں صدی میں اردو کا مکتوباتی ادب موضوع پر تھیسس لکھا ہے۔ یہ ایک خاصا مشکل کام تھا۔ جس پر انفرادیت کے ساتھ کتابیں ملنا ممکن نہ تھا لیکن محنت اور جانفشانی کے ساتھ انھوں نے متعدد قدیم و جدید ماخذ سے استفادہ کیا اور ایک کامیاب کوشش منظر عام پر آگئی۔ میری معلومات کی حد تک اس موضوع پر ہندو پاک میں کسی نے کوئی مستقل تصنیف

پیش نہیں کی ہے۔ یہ خالد عابدی کا امتیاز ہے کہ انھوں نے مکتوب نگاری کو فنی و ادبی امتیازات کے ساتھ مرتب کیا۔ بلاشبہ ان کی یہ محنت اردو ادب میں ایک اضافہ ہے اور اس لائق ہے کہ اسے اردو زبان و ادب کی نصاب تعلیم میں شامل کیا جائے۔

ایک بہترین ادیب اور مصنف کا امتیاز یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے بارے میں حسن ظن رکھتا ہے اور دل سے چاہتا ہے کہ نو آموزوں کی صلاحیتوں میں نکھار پیدا ہو۔ ان کی شخصیت تعمیر ہو اور علم و ادب کو ہر وقت خدمت گذار ملتے رہیں۔ بھوپال میں اکثر اساتذۂ فن اور اکابرِ قلم میں یہ جذبہ اور خلوص پایا جاتا ہے۔ موجودہ دور میں یہ وصف میں نے سیفیہ کالج شعبہ اردو کے روح رواں پروفیسر عبدالقوی صاحب دسنوی (اب ملازمت سے ریٹائرڈ ہو چکے ہیں) میں خاص طور پر دیکھا اور محترم خالد عابدی صاحب بھی مجھے ان کا آئینہ نظر آئے۔ ذاتی ملاقاتوں میں عابدی صاحب جہاں اپنے معاصرین، احباب اور رفقاء کو کچھ کرتے رہنے کا مشورہ دیتے رہتے ہیں۔ موضوعات کی رہبری کرتے ہیں وہیں طالبانِ علم و ادب کی کامیاب رہنمائی کرنے میں۔ وہ دل سے چاہتے ہیں کہ قوم کے عوام و خواص مذہب و ملت، علم و ادب کے خدمت گذار بنیں۔ خاص طور پر زبان و ادب کے شعبہ میں قحط الرجال کے پیش نظر ان کی آرزو ہے کہ تعلیمی اداروں کے طلبہ اسکالر محنت کریں۔ انھیں مطالعہ کا ذوق و شوق ہو اور وہ بزرگوں کی وراثت کے علمبردار بن جائیں خالد عابدی کو سرزمین بھوپال سے قلبی محبت ہے وہ اس کے ماضی کو قابلِ افتخار سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہاں کی شخصیات اور ان کی خدمات و کارناموں کو منظرِ عام پر لایا جائے۔ وہ اکثر بھوپال سے متعلق مختلف موضوعات پر نشاندہی کرتے رہتے ہیں کہ ان پر کام کیا جائے اور نئی نسل کو اپنے ماضی سے واقف کرایا جائے۔

یہ ایک مختصر سا جائزہ ہے خالد عابدی کی شخصیت کا جو میں نے دیکھا، سنا اور جو معلوم ہوا وہ سپردِ قلم کر دیا ان کی تخلیقات و تصنیفات کو پڑھنے کا مجھے اتفاق کم ہوا۔ صحیح یہ ہے کہ آدمی کی شخصیت اس کی تخلیق و تحریر سے عیاں ہوتی ہے اس کے نظریات و افکار، اس کے جذبات و احساسات، اس کا بلیغ علم، مقصد اور مطمح نظر سب کچھ اس کی زبان و قلم سے ظاہر ہوتا ہے۔ بہت پہلے میں نے کہا تھا

ہر ادیب اپنے تشخص کا پتہ دیتا ہے
اس کی تحریر کو تم غور سے پڑھ کر دیکھو

واقعی خالد عابدی کو ابھی پڑھنے کی ضرورت ہے وہ ایک مثالی شخصیت ہیں وہ علم و ادب کی حقیقی پہچان ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ مستقبل میں وہ بھوپال کی تاریخ کے ایک اہم حصہ قرار دیے جائیں گے۔

محمد خالد عابدی سچا عاشقِ اردو

ڈاکٹر سیفی سرونجی

یہ بات میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ دنیا میں ایسا کوئی بھی سچا ادیب شاعر نہیں ہو سکتا جس میں کوئی رسالہ یہ کتاب دیکھ کر اسے دیکھنے اور پڑھنے کی تڑپ پیدا نہ ہو جو لوگ دنیا میں ترقی نہیں کر پاتے یا ادب میں شہرت حاصل نہیں کر پاتے وہ ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جنھیں کتابوں یا پڑھنے لکھنے کی عادت نہیں ہوتی۔ اس لئے بغیر مطالعہ یا کتابوں سے محبت کے کوئی بھی شہرت عزت یا مرتبہ حاصل نہیں کر سکتا۔ اردو ادب کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جن لوگوں نے، جن قلم کاروں نے، ادیبوں شاعروں نے، علم سے دوستی کی، کتابوں سے عشق کیا وہ دنیا میں عزت وشہرت مقام ومرتبہ میں دنیا میں نمایاں رہے۔ میں نے مدھیہ پردیش کے کسی بھی شاعر ادیب میں کتابوں سے اتنا عشق نہیں دیکھا جتنا کہ خالد عابدی میں دیکھا ہے کتابوں سے اسی عشق نے انھیں آج شہر کے سارے ادبی لوگوں کی نظر میں ایک ہر دلعزیز شخصیت بنا دیا ہے جن لوگوں نے خالد عابدی کی پرسنل لائبریری دیکھی ہے وہ اس بات کی گواہی بھی دیں گے کہ خالد عابدی نے کتنی محنت اور اپنے بچوں اور اپنی ذاتی تمام خواہشوں کو نظرانداز کر کے صرف اپنی لائبریری پر نظر رکھی ہے۔

ہر ماہ اپنی آدھی تنخواہ نکال کر کتابوں میں لگاتا اور پھر انھیں سلیقے سے ترتیب دے کر فہرست بنا کر رکھنا دن دن بھر چھٹیوں میں صرف لائبریری کو زیادہ سے زیادہ وقت دینا ہزاروں کتابوں سینکڑوں رسالوں اور بے شمار مشاہیر کے خطوط جمع کرنے میں خالد عابدی نے اپنی آدھی زندگی صرف کر دی ہے تب کہیں جا کر ان کی لائبریری آج مدھیہ پردیش کی سب سے اہم لائبریری بنی ہے۔ اپنے خون پسینے کی کمائی سے اتنا بڑا کتابوں رسالوں کا ذخیرہ ابھی تک تو میری نظر میں کسی کے پاس نہیں دیکھا ہے ہاں کالی داس گپتا رضا صاحب کی لائبریری ضرور ایسی تھی کہ جس کی افادیت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا جہاں ایک طرف خالد عابدی ایک اچھے ادیب ایک اچھے ڈرامہ نگار کی حیثیت سے پہلے ہی نام پیدا کر چکے ہیں وہیں دوسری طرف ایک اچھے شخص اچھے دوست اور کتابوں کے سچے عاشق کی حیثیت سے بھی ان کا نام ہمیشہ تذکروں میں رہتا ہے۔ وہ آل انڈیا ریڈیو پر ایک اچھے عہدے پر فائز ہیں اور جہاں تک ممکن ہوتا ہے وہ ریڈیو کے پروگراموں میں اپنے

دوستوں اور ضرورت مندوں کو ہمیشہ اولیت دیتے رہے ہیں۔ یہی نہیں ان کے خلوص کی انتہا دیکھئے کہ پروگرام میں شرکت کرنے والے تو چیک لیکر غائب ہو جاتے ہیں لیکن خالد عابدی اپنی جیب خرچ سے اس کی خاطر تواضع بھی کرتے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو، ٹی وی کے زیادہ تر عہدیداران کیا کیا کرتے ہیں اور کیا کیا کرنا پڑتا ہے کسی سے پوشیدہ نہیں ہے لیکن خالد عابدی کا معاملہ کچھ دوسرا ہی ہے وہ یاروں کے یار ہیں دوست نوازی، ملنساری، اخلاق و محبت کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔ وہ جہاں جاتے ہیں کتابوں کا بوجھ ان کے کاندھوں پر ہوتا ہے دوستوں کو خط لکھنا ان کے جواب دینا اپنا اخلاقی فرض سمجھتے ہیں۔ ہندوستان سے جتنے بھی ادبی رسائل نکلتے ہیں وہ ان کے باقاعدہ خریدار ہیں۔ کسی سے اعزازی پرچہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ خرید کر رکھتے ہیں۔ دوسروں کے کام آتے ہیں لیکن دوسروں سے کوئی امید نہیں رکھتے اگر خالد عابدی جیسے چند لوگ ہی دنیا میں پیدا ہو جائیں تو اردو زبان و ادب کا ڈنکا گھر گھر بجنے لگے اور رسائل اور اخبارات کے سارے مسائل حل ہو جائیں کہ اخبارات اور رسائل کا سارا انحصار ان کے پڑھنے اور خریدنے والوں پر ہوتا ہے لیکن افسوس ہے ہمارے اردو کے لیکچرار اور پروفیسر حضرات اپنی بیس پچیس ہزار تنخواہ سے اردو کے اخبار اور رسالوں کے لئے پانچ سو روپئے مہینہ بھی نہیں نکال سکتے جبکہ وہ اردو کے نام پر ہی کھاتے ہیں لیکن خالد عابدی جو کہ نہ پروفیسر ہیں نہ اردو کے لیکچرار ہیں لیکن اردو زبان سے عشق اتنا ہے کہ اس کے لئے ہر وقت تنخواہ تو کیا قرض لے کر کتابیں خریدتے ہیں۔ آج سے بیس سال پہلے ان کے مضامین ڈرامے مسلسل اخبارات اور رسائل میں شائع ہو رہے تھے لیکن خالد عابدی نے اپنے سارے تخلیقی کارناموں کو پسِ پشت ڈال کر صرف پڑھنے کتابوں کا ذخیرہ بڑھانے اور لوگوں کو اپنی لائبریری سے تحقیقی کاموں میں مدد کرنے کو اپنا شعار بنا لیا اور تمام عمر خدمتِ خلق میں صرف کر دی اس سے ان کے اندر کا وہ تخلیق کار جو بیس سال پہلے کی کتابوں اور درجنوں معیاری مضامین اور ڈرامے تخلیق کر چکا تھا جو شائع بھی ہو چکے تھے۔ اپنے اس تخلیقی کام کو بھی بالائے طاق رکھ کر عوام کی خدمت میں لگ گیا۔ آج ان کی لائبریری سے سینکڑوں طلباء مستفید ہو رہے ہیں۔ کئی پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کر چکے ہیں لیکن خود خالد عابدی کو کیا ملا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ اسے تمام اساتذہ طلباء مل کو گورنمنٹ سے ان کی ادبی خدمات کے بارے میں تفصیلی مضامین لکھتے اور احساس دلاتے کہ ایسے بے لوث ادبی خدمت کرنے والے کو کوئی بڑا ایوارڈ یا مالی تعاون دیا جائے جس سے کہ وہ اپنی لائبریری کو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے کام میں لانے کے قابل بنا سکیں۔

ان کے پاس غیر مطبوعہ ہزاروں مشاہیر کے خطوط ہیں جنھیں کتابی شکل میں آنا چاہیئے اور

بھی کئی غیر مطبوعہ اہم دستاویزی مسودے ان کے پاس ہیں جو شائع ہو جائیں تو ہزاروں تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوں اس بات کا احساس گورنمنٹ کو دلایا جانا چاہیئے۔ خاص طور پر اہلِ بھوپال کے لئے یہ بات ضرور یاد رکھنا چاہیئے کہ خالد عابدی جیسے بے لوث ادبی خدمت کرنے والے لوگ بار بار پیدا نہیں ہوتے کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنے خونِ جگر سے قائم کرنے والی ان کی لائبریری کھنڈر بن جائے ان کے رفقا نے یہ قابلِ مبارک باد کام کیا ہے کہ وہ خالد عابدی جیسے سچے عاشقِ اردو کی ادبی خدمات پر کتاب ترتیب دے کر ان کی ادبی خدمات سے ساری ادبی دنیا کو واقف کرانے کی سعی کر رہے ہیں۔

● برجیس انجم

عابدی صاحب کی لائبریری میں تقریباً ہر موضوع پر قیمتی و نادر کتابوں کا ذخیرہ ہے۔ پی۔ایچ۔ڈی۔ اور پوسٹ گریجویشن کرنے والوں کے لیے آپ کی لائبریری کے دریچے کھلے ہیں۔ کتابیں جمع کرنا، ترتیب دینا، اور لکھنا آپ کے محبوب ترین مشاغل ہیں۔

عابدی صاحب ریڈیو کے لکھنے والوں کے ساتھ بہت تعاون کرتے ہیں۔ خالد عابدی صاحب کے تعاون کا یہ عالم ہے کہ وہ لکھنے والوں کی سہولت کے مدنظر پروگرام براڈ کاسٹنگ کی تواریخ بدلنے میں بھی ہر ممکن تعاون فرماتے ہیں۔ حال ہی میں انھوں نے مجھے میرے جذبات کو چھو لینے والے دو موضوعات پر تقریر لکھنے اور ریکارڈنگ کرنے کے لیے جو ڈیٹ دی اس دن میں اپنی انتہائی مصروفیات کی وجہ سے نہ آسکی۔ ڈیٹ بدل کر سہولت دی اور میری تقریر اسی دن نشر ہوئی جس دن ہونی تھی۔ اسد اللہ خان ایک مورخ اور ایک قلم کار، اسد اللہ خاں اور ان کی غیر مطبوعہ کتاب بھوپال کا قدیم ارتقاء" موضوعات دے کر مجھے لکھنے کا سنہری موقع ملا۔ مجھے اس بات سے بے حد مسرت ہوئی کہ اسد اللہ خاں پر مضمون و موضوعات تجویز کیے اور ان مضامین کو لکھنے کے لیے میرا ہی انتخاب کیا۔ عابدی صاحب کے موضوعات میں ندرت ہوتی ہے اور وہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتے ہیں۔

زندہ دل اور ولی صفت انسان۔ محمد خالد عابدی

ڈاکٹر شعائر اللہ خاں وجیہی

اگر سنہ ۱۹۸۸ عیسوی کی یادوں کو تازہ کروں تو بھوپال کا تاریخی سفر ذہن کے پردے پر گردش کرنے لگتا ہے۔ میں اس زمانے میں خدا بخش لائبریری پٹنہ سے بحیثیت ریسرچ فیلو وابستہ تھا خدا بخش لائبریری بورڈ نے ایک تحقیقی پروجیکٹ میرے سپرد کر رکھا تھا جس کا عنوان تھا۔

"انیسویں صدی کے اردو رسائل کا تجزیاتی مطالعہ"

اسی موضوع کے تحت مواد کی فراہمی کے لئے میں بھوپال گیا تھا۔ پٹنہ سے بھوپال پہنچنے کے بعد میرا قیام جامعہ عربیہ (مسجد ترجمہ والی) کے مہمان خانہ میں رہا جہاں حضرت مولانا مفتی عبدالرزاق خاں صاحب مدظلہ کی سرپرستی حاصل رہی۔ یوں تو میرا زیادہ وقت سیفیہ کالج بھوپال اور مولانا آزاد سینٹرل لائبریری میں گذرا لیکن آخری ایام میں پروفیسر عبدالقوی دسنوی کے توسط سے برادرم خالد عابدی صاحب سے ملاقات ہوگئی اس پہلی ملاقات نے ہی مجھے ان کا گرویدہ بنالیا تھا۔

ملاقات کے بعد خالد صاحب مجھے بھوپال کے مشہور اخباری میوزیم مادھوراو سپرے سنگھر الیہ لے گئے اس میوزیم میں مدھیہ پردیش کے متعلق جرائد محفوظ ہیں، میرے موضوع سے متعلق تو کوئی رسالہ وہاں نہیں ملا لیکن اخبارات کو جس سلیقہ سے محفوظ رکھا گیا تھا اس سسٹم نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ میوزیم سے ہی خالد صاحب اخبار ایکشن کے دفتر لے گئے جہاں اخبار کے ایڈیٹر ڈاکٹر ماجد حسین صاحب (ابن مرحوم چودھری واحد حسین صاحب، رام پوری) سے ملاقات ہوئی جنھوں نے رام پوری محبت و رواداری کا سلوک کرتے ہوئے میری پٹنہ واپسی کے لیے ریلوے ٹکٹ کا ریزرویشن اپنے دفتر میں بیٹھے ہی بیٹھے کرادیا اور میں اسٹیشن کے دھکوں سے بچ گیا۔

پٹنہ واپس پہونچنے کے خالد صاحب سے باقاعدہ مراسلت جاری ہوگئی اور اُن کے استفساری خطوط آنے لگے جن کے جواب پابندی سے دیتا رہا۔ اگست ۱۹۹۱ء میں میری رام پور واپسی ہوگئی اور میں رضا لائبریری میں کیٹلاگر وابستہ ہوگیا تب خالد صاحب نے رشتہ رسل و رسائل جاری رکھا اور بحمد للہ آج تک جاری ہے۔

جہاں تک خالد صاحب کی ذات کا تعلق ہے وہ نہایت سادہ دل، متحرک اور وسیع الظرف
...ان ہیں۔ مادہ پرستی کے موجودہ دور میں اگر محبت و خلوص کے دو الفاظ سے نواز دے تو بہت بڑی
...ت لگتی ہے اور یہ محبت اور خلوص تو ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ہمارے خالد عابدی
...احب ریاکاری اور مطلب پرستی سے بہت دور ہیں۔ جدید دور میں یہ صفات تو اب نام نہاد
...نقاہوں کے صوفیہ کرام کے اندر بھی مفقود ہیں جس سے خالد صاحب متصف ہیں۔

خالد عابدی صاحب نہایت زود نویس ادیب ہیں وہ جن موضوعات پر مضامین لکھتے رہے
...ں وہ زیادہ تر علاقہ مدھیہ پردیش سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ امر میرے نزدیک ایک فال نیک کی
...ثیت رکھتا ہے کیونکہ جب تک علاقائی مراکز کی تاریخ مکمل طور پر ضبط تحریر میں نہیں آجاتی اردو
...ب کی بنیادی تاریخ اس وقت تک نامکمل رہے گی۔ علاقائی ادب نگاری کی طرف سب سے
...پہلے اہل دکن نے توجہ کی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دکنی ادب کی مبسوط تاریخ آج ہمیں بآسانی مل جاتی
...ہے۔ اس کے بعد اہل بہار نے علاقائی ادب پر تحقیقی کام کیے جس کے باعث بہار کا علاقائی ادب
...ی تکمیل کی طرف گامزن ہے۔ دہلی اور لکھنو چھوڑ کر اردو کے بقیہ علمی مراکز جیسے رام پور، بھوپال،
...کلکتہ وغیرہ میں علاقائی ادب کی تاریخوں پر کام تو ہوئے لیکن تکمیل کی منازل سے ابھی دور ہیں۔

ان حالات میں خالد عابدی صاحب نے جن موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے اس سے خوشی
...وتی ہے کہ انھوں نے نامور شعراء اردو مثلاً امیر مینائی، داغ دہلوی، مضطر خیرآبادی، احسن مارہروی
...ر سیماب اکبرآبادی کے مدھیہ پردیشی تلامذہ کے احوال اور کلام کی کھوج کر کے انھیں زندہ و جاوید
...کر دیا ہے۔ اسی طرح نثر نگاروں کے ذیل میں خالد صاحب نے افسانہ، ڈرامہ، انشائیہ، صحافت،
...ت نویسی او تذکرہ نویسوں کے حالات کی تلاش و جستجو بھی سرگرمی سے کی ہے اور گمنام حضرات کے
...کارناموں کو از سر نو متعارف کر رہے ہیں انھوں نے بھوپالی لغت پر بھی کام کیا ہے اس کے لیے بھی
...کسی حد تک میں ذمہ دار ہوں کیونکہ علاقائی لغت نویسی کا میں ہمیشہ سے موید رہا ہوں جس کا ایک
...نمونہ "روہیل کھنڈ اردو لغت" (مرتبہ رئیس رام پوری) کی شکل میں ۱۹۹۵ میں خدا بخش لائبریری پٹنہ
...سے شائع ہو چکا ہے۔ کاش خالد صاحب سب کام چھوڑ کر اس اہم کام کی تکمیل کی طرف جلد از جلد
...متوجہ ہو جائیں ورنہ یہ کام پھر کبھی پورا نہیں ہو سکے گا۔

خالد صاحب نے حوالجاتی امور کی طرف بھی بہت اچھے انداز سے کام کیا ہے مثلاً شعراء
...ادباء سے انٹرویو لیکر انھیں مرتب کر دیا ہے، ریڈیو اسٹیشن پر جن مشاہیر سے انٹرویو لیے جاتے ہیں
...وہ عموماً ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں لیکن خالد صاحب نے اس طرف بھی توجہ فرمائی اور گفتگو کے عنوان

سے ریڈیو سے نشر شدہ انٹرویو مرتب کررہے ہیں انھوں نے ''فلموں کی ترقی میں اردو کا حصہ'' عنوان سے بھی مضمون لکھا تو قلم ڈائریکٹری بھی مرتب کرڈالی، اسی طرح انھوں نے اردو والوں کی ڈائریکٹری بھی مرتب کردی ہے۔ مدھیہ پردیش کی صحافت کے ذیل میں اخبارات، رسائل اور گلدستوں کے تعارف پر بھی مفید مضامین لکھ کر داد و تحسین حاصل کرچکے ہیں۔ ریاست بھوپال اور اردو کی ترقی کے سلسلہ میں آپ نے متعدد مضامین لکھے۔ یہی نہیں تذکرہ گلزار سخن مولفہ فیض بلاسپوری ضخیم کتاب کو بھی آپ کئی سال سے ایڈٹ کررہے ہیں یہ تذکرہ شائع ہونے کے بعد یقیناً خاص اہمیت کا حامل ہوگا۔

سال گزشتہ ایک اہم کام کے سلسلہ میں خالد عابدی صاحب نے میری عجیب وغریب طرح سے مدد کرائی۔ میں رام پور کی تاریخی مساجد پر چند برس سے کام کررہا ہوں اس سلسلہ میں کہیں تبصرہ پڑھا تھا کہ ''بھوپال کی مساجد'' پر کوئی کتاب چھپی ہے میں اس کو حاصل کرنے کی جستجو میں لگ گیا۔ پرگتی میدان نئی دہلی کے کئی کتابی میلے دیکھ ڈالے لیکن کتاب وہاں نہیں ملی۔ دہلی کے اہم بک سیلروں سے دریافت کیا وہاں سے بھی ناکامی ہاتھ لگی۔ بھوپال کے عزیز و اقرباء سے مراسلت کی، فون کیے لیکن گوہر مقصود ہاتھ نہ لگا۔ اچانک خیال آیا میں سب سے اہم آدمی کو بھلائے بیٹھا ہوں جو کہ ہر ادبی مرض کی دوا ہے۔

فوراً خط لکھا خالد صاحب نے فی الفور جواب سے نوازا کہ بے فکر رہیے کتاب کو حاصل کرنے میں لگ گیا ہوں اور ایک روز ڈاکیہ نے بنڈل لاکر عارف عزیز کی کتاب ''بھوپال کی مساجد'' کے درشن کرا ہی دیے۔ کتاب کو پڑھ کر سر آنکھوں سے لگایا اور دل سے بے شمار مرتبہ دعائیں نکلیں کہ اللہ تعالی اس ولی صفت انسان کو ہمیشہ صحت و تندرستی کے ساتھ متحرک اور فاعل رکھے (آمین)

آج خالد صاحب کا شمار اردو کے بزرگ قلم کاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے مختلف جہتوں سے ادبی خدمات انجام دی ہیں اس لئے ان کی مجموعی خدمات کو دیکھتے ہوئے میں اہل بھوپال سے ملتمس ہوں کہ وہ ان کی زیادہ سے زیادہ قدر افزائی فرمائے اور اردو کے سب سے بڑے ادبی ایوارڈ سے انھیں نوازیں کہ خالد عابدی صاحب کا بنیادی حق ہے۔

ہمہ جہت شخصیت: خالد عابدی

ڈاکٹر شفیقہ فرحت

خالد عابدی بھوپال کا ایک جانا پہچانا نام ہے۔ وہ اپنی تحریروں کی وجہ سے بھی مدھیہ پردیش میں پہچانا جانے لگا ہے پھر اپنی آواز اور پروگرام (اردو) کے ذریعہ بھی ریڈیو اسٹیشن کے تعلق سے پورے ہندوستان کا اردو داں طبقہ اس سے واقف ہوتا گیا۔ وہ ادیبوں، شاعروں کو ریڈیو پروگراموں میں مدعو کرتا ہے اور خود اس کی تخلیقات بھی نشر ہوتی رہتی ہیں۔

سب کے لئے خالد عابدی ایک محقق، نقاد افسانہ نگار ہے ڈراما نگار ہے۔ مگر میرے لئے وہ ایک خوبصورت زبان جس سے علمیت چھلکتی ہے بولنے والا ہے کہ برسوں پہلے جب میری اس کی ملاقات ہوئی اس نے اپنی زندگی کے ورق اُلٹنے شروع کئے تو اُس نے یہ کہا میرے والد خیاط ہیں لفظ خیاط ''درزی'' کے لئے اہلِ زبان ہی بول سکتے ہیں۔

میں نے خالد عابدی کی کتاب ''نساخ'' کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ اس موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ شاید خالد عابدی کے علاوہ کسی نے اتنی محنت کی ہو پھر مجھے اس سے بات چیت کرتے ہوئے معلوم ہوا کہ وہ لکھنے پڑھنے کے معاملے میں بھی مجنوں سے زیادہ دیوانہ ہے (مجنوں گورکھپوری کی روح سے معذرت کے ساتھ) کاغذ کے ایک ایک پُرزے کو چُوم چُوم کر آنکھوں سے لگا کر رکھتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے عربی رسم الخط میں لکھی چیز کو چوم کر رکھتے ہیں۔ وہ اپنی آمدنی جو پہلے بہت قلیل تھی کا آدھا حصہ کتابوں اور رسالوں کے خریدنے پر خرچ کرتا ہے۔ اب بھی اس کا یہی عالم ہے۔ میرے اس سوال پر اس نے یہ کہا ''ہم لوگ بہت سیدھی سادی معمولی زندگی گذارنے کے عادی ہیں۔ میرا کوئی اور شوق نہیں ہیں ہے نہ پان نہ سگریٹ نہ قیمتی لباس۔ عید پر بھی دھلے ہوئے کپڑے۔'' ''سادہ جیون اُچیہ وچار''۔

خالد عابدی ہمہ جہت شخصیت کا نام ہے۔ میں دنیا میں بے شمار لوگوں سے ملی ہوں ہر شخص کے اندر ایک اور شخص چھپا ہوتا ہے بالکل لکڑی کی گڑیا کی طرح مگر خالد عابدی کی طرح بے شمار پرتیں اور شخصیت کے پہلو بہت کم دیکھے ہیں کہ وہ ملازمت اور لکھنے پڑھنے کے علاوہ اپنی والدہ (جو سرطان کی مریضہ تھیں) کا سارا کام برسوں وہ خود کرتا رہا۔ جب وہ خدمت گذار بیٹا ہے تو یقیناً شفیق

باپ بھی ہوگا نہ ذاتی بات سے ہم پھر ادب کی طرف آجائیں جیسے ادب، زندگی سے الگ ہو ہی نہیں سکتا۔ ہر ایک ایک تحریر میں اس کی زندگی جھلکتی اور چھلکتی ہے۔ خالد عابدی کو خطوط جمع کرنے کا شوق بھی ہے اُس کے پاس مشاہیر کے بے شمار خطوط ہیں وہ اکثر ریڈیو اور رسالوں کے لئے انٹرویو بھی لیتا ہے۔ یہ شاید اس کی ملازمت کا حصہ ہو مگر وہ اس تفصیل سے اور گہرائی سے انٹرویو لیتا ہے کہ اسے لکھ کر وہ ایک کاپی انٹرویو دینے والے کی خدمت میں بھی پیش کر دیتا ہے۔ جس سے انٹرویو دینے والے شخص کے پاس بھی اس کے سارے کارنامے اور تحریروں کی تاریخ محفوظ ہو جاتی ہے کہ ہم جیسے لوگوں کو اپنی ڈگریوں کی تاریخیں اور تصانیف کی اشاعتوں کی تفصیلات کی یاد بھی نہیں رہتی اور میں نے کبھی ان تفصیلات کو لکھ کر بھی نہیں رکھا۔ لہذا اس معاملے میں، میں خالد عابدی کی بے حد ممنون ہوں۔

پیکرِ عزم و عمل

صابر ادیب

ہوائی جہاز فضا میں پرواز سے پہلے بڑا شور مچاتا ہے۔ گرجتا دہاڑتا ہوائی اڈے کا چکر لگا کر رَن وے پر پہونچتا ہے۔ پھر پرواز کے لیے روانہ ہوتا ہے۔

ہیلی کاپٹر کو دوڑ لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی وہ پرواز پر روانگی کے پہلے خاصا شور مچاتا ہے۔ لرزتا تھرتھراتا ہے جیسے اُس پر کوئی دورہ پڑا ہو۔

اور عقاب اپنی چٹان سے اڑ کر سیدھا آسمان کی وسعتوں میں پہونچ جاتا ہے اور بڑے شاہانہ انداز میں ہوا میں منڈلاتا چکر لگاتا اوپر اٹھتا چلا جاتا ہے اور اوپر اور اوپر اور اوپر یہاں تک کہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ نہ کوئی شور نہ شرابانہ تھرتھراہٹ اور نہ کوئی ہلچل۔

ٹھیک عقاب کی مانند ہی خالد عابدی بھی اپنی منزل۔۔۔ اپنی کامیابی کی شاہراہ پر گامزن ہوئے ہیں اور بڑے شاہانہ انداز میں آگے بڑھے ہیں۔ بغیر کسی تزک بھڑک۔ دھوم دھڑاکے اور غرور تمکنت کے۔

یہ صورتِ حال ہر فنکار کے ساتھ نہیں ہوتی۔ یہ ان کا مقدر رہتا ہے جنھیں کچھ کر گذرنے کی تڑپ ہوتی ہے۔ اپنے حصول مقصد کے لئے اُن میں عزم محکم ہوتا ہے۔ صداقت پسندی ہوتی ہے۔ جذبۂ ایثار ہوتا ہے۔ جن کے سہارے وہ اپنے نامساعد حالات کو سازگار بناتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔ صعوبتیں برداشت کرتا ہے۔ اپنے ہم عصروں کی نوک جھونک کا شکار ہوتے ہوئے، ہر اچھے بُرے عمل کا نشانہ بنتے ہوئے مسلسل آگے بڑھنے کے جذبہ کو مستحکم کرتے ہوئے چلتا رہتا ہے۔۔۔ چلتا رہتا ہے۔ یہی وہ عمل ہوتا ہے جو اُسے کامیابی سے ہمکنار کرتا ہے۔ دراصل قیمتی پتھر کے جوہر کا انحصار اس پر ہے کہ وہ جڑا کہاں ہے۔

خالد بھائی مخلص، ملنسار، خوش مزاج اور انکسارانہ طبیعت کے مالک ہیں۔ ان کی شخصیت میں انسانیت نوازی، غمگساری اور اپنائیت ہے۔ ان کی بذلہ سنجی اور زندہ دلی انھیں دوسرے فنکاروں سے ممیز کرتی ہے۔ وہ دھن کے پکے اور کام کے سچے ہیں۔ انھوں نے اپنا ہر کام بڑی محنت اور لگن سے کیا ہے چاہے وہ پیشہ وارانہ (ملازمتی) ہو یا فنکارانہ (ادبی) ہو۔ چنانچہ انھوں نے زبان و ادب

کی خدمت کے لئے اپنی دوسری ادبی مصروفیات کے ساتھ ۱۹۷۰ء میں ایک دارالکتب ''مکتبۂ عابدیہ'' اس نظریہ سے قائم کیا کہ ہر مکتب خیال کے طلباء بطور خاص تحقیق کے اس سے استفادہ کر سکیں۔ آج اس ذاتی لائبریری میں مختلف خیال وفکر اور موضوع کی تقریباً سات ہزار کتب، مقتدر جرائد ورسائل کے تمام خاص نمبروں کی مجلد فائلیں، شعراء وادباء کی تصویرات بایوڈیٹاز موجود ہیں۔ موضوع کتب میں اردو زبان وادب کی تاریخ، تحقیق وتنقید، صحافت، مصوری، ڈرامہ، رپورتاژ، موسیقی، سائنس خطاطی، انٹرویوز، خوش نویسی، کارٹون سازی، شکاریات، نفسیات، فلم، نوشنگی، سرکس، تذکرے، سکہ جات، ڈاک ٹکٹ، لغات، شاعری، افسانے، داستان، ناول، بچوں اور خواتین کا ادب، ہندو اور مسیحی مذاہب پر کتابوں کے علاوہ بھوپالیات پر اہم اور کمیاب کتب موجود ہیں۔ مدھیہ پردیش اردو زبان وادب پر نایاب کتابیں، ہندوؤں کی اردو وفارسی کی خدمات، قومی یکجہتی کے موضوع پر قابل قدر کتب کا ذخیرہ موجود ہے۔ مشاہیر کے خطوط کا خزینہ، قدیم وجدید رسائل کے خصوصی نمبروں کی مجلد فائلیں اور قلمی مخطوطے ہیں۔

ان کتب ورسائل کا رکارڈ دس بارہ رجسٹروں میں محفوظ کیا گیا ہے۔ ہر کتاب کی مکمل تفصیلات رکھی گئی ہیں۔ مثلاً کتاب کا نام، موضوع، سن اشاعت، ناشر، پتہ، اس کے ساتھ کتاب کے اندرونی صفحات کے عنوانات کی مع مصنف کے تفصیل۔ اگر کسی اہم بات کا ذکر ہے تو اس کے بارے میں نوٹ دیا گیا ہے۔ اس طرح ایک کتاب مع مکمل معلومات رجسٹر کے ایک صفحہ پر مشتمل ہے۔ یہ معلومات اور تفصیلات ایک عام قاری اور طالب علم کے لئے تو کارآمد ثابت ہوتی ہی ہے۔ تحقیق کا کام کرنے والے حضرات ان سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ''مکتبہ عابدیہ'' اور اس کے مالک ومحافظ محمد خالد عابدی نے اپنے فرض کو بحسن خوبی انجام دیا ہے۔ اور دے رہے ہیں خواہشمند حضرات کو ان کی مطلوبہ کتب اور حوالہ جات بھی ان تک (گھر تک) پہونچانا خالد بھائی اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ لیکن انھیں اس وقت افسوس ہوتا ہے۔ جب ان حوالوں کے ساتھ ان کا یا مکتبۂ عابدیہ کا کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ اس ادبی بددیانتی سے انھیں اکثر دوچار ہونا پڑتا ہے۔ پھر بھی وہ اپنا فرض نبھاتے رہتے ہیں۔ خواہش مندوں اور ضرورت مندوں کو ان کے مطلوبہ حوالہ جات اور معلومات بہم پہنچاتے رہتے ہیں۔

اس کے علاوہ ایک کارنامہ خالد بھائی اور انجام دے رہے ہیں۔ وہ ادباء شعراء کی ایک ڈائریکٹری ترتیب دے رہے ہیں۔ اس ڈائریکٹری سے ایک نظر میں متعلقہ فنکار، تخلیق، تنقید نگار کی فنکارانہ صلاحیتوں، اس کی داخلی اور خارجی زندگی سے خاطر خواہ واقفیت ہو جائے گی۔ جو ایک محقق کے

لئے کار آمد ثابت ہوگی۔ اسے اِدھر اُدھر نہیں بھٹکنا پڑے گا۔ یہ ڈائریکٹری اردو ادب میں تحقیق و تنقید کے میدان میں یقیناً ایک قابلِ قدر اضافہ ہوگی۔ اہل نظر اس کارنامے کو فراموش نہیں کر سکیں گے۔

ان کا یہ کام پانچ سال سے چل رہا ہے۔ مشاہیر چھ چھ سات سات خط لکھنے کے باوجود متعلقہ معلومات فراہم نہیں کر پا رہے ہیں۔ خطوط لکھے جا رہے ہیں۔ جوابات آ رہے ہیں۔ نہیں بھی آ رہے ہیں۔ بہر حال کام ہو رہا ہے۔ ایک سر پھرے سے شخص نے ایک سر پھرے سے کام کا بیڑا اُٹھا لیا ہے۔۔۔ بس کام چل رہا ہے۔ کام چل رہا ہے تو تکمیل بھی ہو رہا ہے۔ جو لوگ اس کی افادیت اور انفرادیت کو سمجھ رہے ہیں وہ ہمت افزائی کر رہے ہیں اور جو لوگ اس کام کی اہمیت کو ابھی سمجھ نہیں پا رہے ہیں وہ نکتہ چیں بن کر حوصلہ پسپا کر رہے ہیں۔ لیکن خالد بھائی جو اس کام میں لگے ہیں تو لگے ہیں۔ اب یہ کام اختتام کو پہنچ گیا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب قارئین اس کام کو دیکھیں گے اور خالد بھائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہیں گے۔

ع یہ دیوانہ یہ پاگل شخص دیدہ ور سا لگتا ہے

خالد بھائی کی شخصیت کے اس "ادبی پہلو" کے قطع نظر وہ اپنی پیشاورانہ یعنی ملازماتی فرائض میں بھی پیچھے نہیں ہیں۔ آکاش وانی بھوپال میں فائز پروگرام ایکزیکٹو کی حیثیت سے اردو زبان قائم و دوائم رکھنے کے لئے اُن کی کوشش اور جد و جہد کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے کسی ادبی شخصیت کو بھوپال آکاش وانی کے پروگرام میں مدعو کر کے اس پر احسان کرنے کا تمغہ نہیں لگایا بلکہ اس شخصیت کا اپنے اور آکاش وانی پر احسان ثابت کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ریڈیو کنٹریکٹ اس شخصیت تک خود پہنچانے گئے۔ یہ احسان کرنے والا نہیں بلکہ احسان ماننے والا عمل ہے جسے ہر دیانت دار فنکار تحسین آمیز نظروں سے دیکھے گا۔ اپنی ذاتی مصروفیات کے باوجود وہ اپنے ملازمانہ فرائض کے لیے ڈیوٹی کے علاوہ بھی وقت نکال کر اردو زبان اور اردو والوں کے لئے کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں۔

بہر حال خالد عابدی ایک ذی شعور اور بیدار ذہن والے فنکار ہیں۔ اولوالعزم، جہدِ پیہم اور یقینِ محکم جبلیت کی حامل شخصیت کے مالک ہیں۔ منکسر المزاجی اور کرم گستری ان کا شعار ہے۔

انھوں نے اردو ادب کی اصناف پر کتابیں تصنیف کر کے دوامی نقوش چھوڑے ہیں جنھیں اربابِ ادب یاد رکھیں گے۔ ان کے ادبی ڈائریکٹری کے کام کو کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔ ان کی خارجی زندگی میں ان کی فنکارانہ شخصیت میں میں نے جو دیکھا سنا مشاہدہ اور تجربہ کیا لکھ دیا۔ ان کی شخصیت کے کچھ اور پہلوؤں کو "صحبتِ معتبر" میں ملاحظہ فرمائیں۔

پیکرِ خلوص: خالد عابدی

ظفر نسیمی

خالد عابدی صاحب سے میری پہلی ملاقات دس بارہ سال پہلے حضرت عشرت قادری کے دولتکدے پر ہوئی تھی۔ عشرت بھائی نے بتایا کہ عابدی صاحب فلمی موضوعات پر ایک کتاب تصنیف کر رہے ہیں جس کی طباعت و اشاعت کے سلسلہ میں آئے ہیں۔ مختصر تعارف کے بعد وہ ہم دونوں کو یہ ہدایت دے کر چلے گئے کہ آپ حضرات اس کے ایک باب کی پروف ریڈنگ کر لیجئے۔ میں پانچ منٹ میں آتا ہوں۔ پانچ منٹ کا وقفہ کتنا طویل ہوتا ہے یہ وہی لوگ جانتے ہیں جو ہجرت کی ملعوبتیں اٹھا چکے ہوں۔ بہر حال ہم پوری سنجیدگی کے ساتھ پروف ریڈنگ کرنے لگے۔ میں مسودہ پڑھتا جا رہا تھا اور خالد صاحب حسبِ ضرورت تصحیح کرتے جا رہے تھے۔ موضوع دلچسپ تھا اور صاحبِ قلم کی طرزِ نگارش نے اسے اور شگفتہ بنا دیا تھا۔ بیان میں غضب کی روانی تھی۔ بقول مرزا غالبؔ کے وہ حال تھا کہ

"بادل سے چلے آتے ہیں مضموں مرے آگے"

خالد صاحب خوش تھے کہ کچھ کام بن رہا ہے اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ کچھ سیکھ رہا ہوں۔ جی چاہتا تھا کہ عشرت بھائی کے پانچ منٹ پانچ گھنٹے ہو جائیں اور مجھے اشاعت سے پہلے کتاب کے چند ابواب پڑھنے کا موقع مل جائے۔ لیکن ایسا کہاں ہوتا ہے اور ایسا ہوا بھی نہیں۔ عشرت بھائی آگئے اور جذبۂ شوق ناتمام رہ گیا۔

یہ تھی ہماری پہلی ملاقات۔ اس کے بعد ایک بار ان کی نظامت میں ریڈیائی مشاعرے میں شامل ہوا۔ اس وقت تک ان کے اوصاف کھلے بھی نہیں تھے کہ ان کا جھالاواڑ ٹرانسفر ہو گیا۔ کئی سال گزر گئے۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ مجھے بھول گئے ہوں گے۔ لیکن اچانک ایک بڑا ہی محبت بھرا خط ملا جس میں مجھ سے بایوڈاٹا طلب کرتے ہوئے دو تین غزلوں کی فرمائش کی گئی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ وہ شعرا کی ایک ڈکشنری ترتیب دینا چاہتے تھے۔ میں نے تعمیل کرتے ہوئے اپنا شعری مجموعہ "پتھری کی لکیر" معہ کوائف کے ارسال کر دیا۔ اس کے بعد برائے نام خط و کتابت ہوئی پھر یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔

ایک دن یہ خوشخبری سنی کہ عابدی صاحب ٹرانسفر ہو کر واپس بھوپال آگئے ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں ان سے ملنے جاتا ہمارے مشترک دوست جناب صابر ادیب کی بیٹی کی شادی میں اچانک ان سے ملاقات ہو گئی۔ اس کی تفصیل بھی دلچسپ ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ بھوپال کی گیس ٹریجڈی نے جن امراض کو جنم دیا ہے ان میں سے ایک ضعفِ نسیان بھی ہے۔ میں اس مرض کا شکار ہوں۔ (ویسے عمر کی ایسی منزل پر ہوں جہاں یہ شکایت ہونا کوئی حیرت کی بات نہیں ہے لیکن میں ایسا کیوں مانوں)۔ عالم یہ ہے کہ خود اپنے کہے ہوئے اشعار یاد نہیں رہتے۔ کئی دیرینہ دوستوں کے نام بھول جاتا ہوں۔ سوچتا ہوں انھیں پہلے کہیں دیکھا ہے۔ کبھی کبھی بڑی ندامت ہوئی ہے۔ ایک صاحب کافی عرصہ بعد ملے۔ بڑے تپاک سے پیش آئے۔ پوچھنے لگے آج کل آپ کہاں ہیں؟ میں نے کہا ''وہیں''۔ پھر تکلفاً ان سے بھی پوچھا اور آپ کہاں ہیں۔ کہنے لگے میں بھی 'وہیں'۔ قصہ ختم ہوا۔ دونوں بچھڑ گئے پھر کبھی سرِ راہ ملنے کے لئے۔ خیر صاحب اس شادی کی محفل میں ایک صاحب کے اردگرد کافی ادیب و شاعر جمع تھے اور وہ صاحب بڑے لہک کر باتیں کر رہے تھے۔ میں بھی قریب پہنچ گیا۔ ان صاحب نے سب کو چھوڑ کر مجھے گلے سے لگا لیا۔ میں نے بھی انھیں بھینچ کر جوابی محبت کا ثبوت دیا۔ پھر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ موقع نہیں مل رہا تھا کہ ان کا نام ونشان معلوم کروں۔ بمشکل تمام صابر ادیب ہاتھ لگے۔ جب انھوں نے بتایا کہ یہ خالد عابدی ہیں تو میری عجیب کیفیت ہوئی۔ جی چاہتا تھا پھر ایک بار گرم جوشی سے معانقہ کروں۔ چنانچہ دوبارہ ان کے پاس جا کر اپنی سرد مہری کا ازالہ کیا۔

حضرت خالد عابدی کی شخصیت کو سمجھنے کا موقع اس وقت ملا جب بھوپال کی مشہور ادبی تنظیم کہکشانِ ادب کی جانب سے ان کا استقبال کیا گیا۔ فاضل مقررین نے جن میں کہکشانِ ادب کے سرپرست جناب عارف عقیل اور میرے مشفق حضرت عشرت قادری شامل تھے ان کی بیش بہا ادبی خدمات پر سیر حاصل تبصرہ کیا اور مسٹر بدر واسطی نے قلمی چہرہ پیش کر کے تحریر کو تصویر بنا دیا۔ تقاریر کے بعد جو کمی رہ گئی تھی اسے بسوط و مربوط سپاس نامے نے پورا کر دیا۔

خالد صاحب اتنے مخلص ہیں کہ آکاش وانی کے پروگراموں کے دعوت نامے اور چیک بدستِ خود تقسیم کرتے ہیں۔ ایک دن میرے غریب خانے پر آئے لیکن بعد سلام دعا کے باہر سے ہی دعوت نامہ دے کر چلے گئے۔ میرے اصرار کرنے پر یہ تاویل پیش کی کہ ابھی اور کئی شاعروں کے پاس جانا ہے۔ چلتے چلتے کہہ گئے کہ دعوت نامے کی رسید جلد بھجوا دیجئے گا۔ میں بھی اس معاملے میں چست ہوں۔ دوسرے ہی دن دستخط ثبت کر کے ایک نقل سپرد ڈاک کر دی۔ پروگرام کی ریکارڈنگ میں کافی دن باقی تھے۔ اس اثنا میں ان سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ مقررہ دن شام کو چار بجے ان کے آفس پہنچا تو معلوم ہوا

اپنے چیمبر میں تشریف فرما ہیں۔ وہاں پہنچا۔ بڑی خندہ پیشانی سے ملے۔ کہنے لگے آج کے پروگرام میں پانچ شعرا کو مدعو کیا گیا تھا۔ آپ پہلے شخص ہیں جو وقت پر آئے ہیں۔ فی الحال اسٹوڈیو بھی خالی نہیں ہے۔ بیٹھئے انتظار کرتے ہیں۔ پھر اچانک انھوں نے دعوت نامے کی کاپی طلب کی۔ میں نے عرض کیا حضور وہ تو میں بہت پہلے ڈاک سے ارسال کر چکا ہوں۔ بس پھر کیا تھا میری شامت آگئی۔ انھوں نے آکاش وانی کے ناقص انتظام کی شکایتوں کے دفتر کھولتے ہوئے کہا کہ یہاں ڈاک مرسل الیہ تک شاذ و نادر ہی پہنچتی ہے۔ اس لئے میں خود مراسلے پہنچاتا ہوں اور وصول کرتا ہوں۔ مسلسل بولتے ہوئے دس بیس ایسی مثالیں پیش کر دیں جن سے انھیں تکلیف پہنچی تھی۔ شکایت کا انداز بڑا محبوبانہ تھا لیکن مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کا ہر لفظ تیر بن کر دل میں اتر رہا ہو۔

یہ وہ ملاقات تھی جس میں ان کے باطنی اوصاف کی ایک جھلک نظر آئی۔ معلوم ہوا کہ وہ ادیبوں اور شاعروں کے انتظار میں رات کو آٹھ بجے تک آفس میں بیٹھتے ہیں۔ صبح وقت سے پہلے پہنچ جاتے ہیں۔ دن بھر پروگرام بناتے ہیں۔ ایڈیٹنگ کرتے ہیں۔ دعوت نامے تیار کرتے ہیں پھر اپنے اسکوٹر سے شہر کے گلی کوچوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ بعض لوگوں سے لعن طعن بھی سنتے ہیں لیکن اپنی عادتوں سے مجبور ہیں۔ ظاہر ہے کہ ریکارڈنگ ہونے کے بعد چیک بننے میں وقت لگتا ہے۔ چنانچہ دو چار دن بعد جب چیک بن جاتے ہیں تو پھر اسی ترتیب سے فنکاروں تک پہنچاتے ہیں۔ یعنی اپنے فرائض منصبی کی حدود سے اس درجہ تجاوز کر جاتے ہیں کہ ان کو شخصی فرائض میں داخل کر لیتے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ پیاسا کنوئیں کے پاس جاتا ہے لیکن یہ حضرات پیاسوں کے لیے مشکیزہ لئے پھرتے ہیں۔ ادب کی خدمت کے لئے وہ جتنا پیسہ، وقت اور انرجی صرف کرتے ہیں۔

خالد صاحب کو رسالے اور کتابیں خرید کر پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ آپ کی ذاتی لائبریری میں مختلف علمی و ادبی موضوعات پر ہزاروں نادر و نایاب کتابیں رسالے اور اخبارات موجود ہیں۔ بڑی محنت سے کتابوں کے کیٹلاگ تیار کئے ہیں۔ حسب ضرورت کتابیں آسانی سے دستیاب ہو جاتی ہے۔ کسی طالب علم یا محقق کو اس کی مطلوبہ کتاب فراہم کرنا خالد صاحب اپنی عین سعادت سمجھتے ہیں۔ اگر آپ کو کوئی کتاب نہ مل رہی ہو اور اس فکر میں نیند نہ آتی ہو تو اپنی ضرورت سے خالد صاحب کو آگاہ کر دیجئے۔ پھر آپ گھوڑے بیچ کر سو جائیے۔ کوئی بعید نہیں کہ کسی روز رات کو بارہ بجے آپ کے در دولت پر دستک ہو اور یہ فرشتۂ رحمت مطلوبہ کتاب لئے حاضر ہو۔

ایسے محسن ادب کو اگر میں پیکرِ خلوص کہتا ہوں تو کیا غلط ہے؟

خالد عابدی کا تہ در تہ چہرہ

عارف عزیز

بھوپال ایک ایسا مردم خیز خطہ ہے جس کی سرزمین پر کتنے ہی گل و لالہ کھلے اور ان کے رنگ و رامش سے فضا مہک اٹھی، ان شخصیتوں نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کر کے اس کی معنویت میں اضافہ کیا ہے۔ خالد عابدی بھی ان میں سے ایک ہیں، زمانہ طالب علمی سے انہیں اردو شعر و ادب سے گہری دلچسپی تھی، وہ بھوپال کی ادبی محفلوں میں دکھائی دینے لگے تھے لیکن اس وقت شاید ہی کسی کو یہ احساس ہو کہ یہ نوجوان ایک دن اردو کا ناقد، محقق، مبصر، ڈرامہ نویس اور انٹرویو نگار بن کر ابھرے گا، ریڈیو کی ملازمت کے دوران انہیں مدھیہ پردیش اور راجستھان کے جن مختلف سنگلاخ علاقوں اور ریگستانی آبادیوں میں بود و باش اختیار کرنی پڑی، وہاں بھی انہوں نے اپنی اردو دانی اور ادب نوازی کے لئے ایک ماحول پیدا کر لیا، اپنی جڑوں کی تلاش میں وطن بھوپال بھی آتے جاتے رہے، اردو زبان و ادب سے گہرے رشتہ اور اس سے زیادہ اس پر عبور کی وجہ سے وہ اپنی گفتگو میں بھی ایک نیا لسانی تجربہ کرتے نظر آتے ہیں۔ جس سے دو چار ہونے پر عام آدمی کو ڈکشنری کا سہارا لینا پڑتا ہے، معمول کی گفتگو میں ایسی مرصع و مسجع زبان کا استعمال کرنا نیا نہیں تو منفرد بات ضرور ہے۔

خالد عابدی نے اپنے تخلیقی سفر کی ابتدا شاعری سے کی اور خالد بھوپالی تخلص رکھا لیکن انہیں شاعری کی مبالغہ آرائی اور شاعروں کی بے اعتدالی پسند نہیں آئی، لہذا اپنے قلم کو نثر کے لئے وقف کر دیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی نو کتب شائع ہو چکی ہیں اور تقریباً اتنی ہی زیر ترتیب ہیں، خالد عابدی شاعر نہیں، لیکن ان کی باتوں سے، لہجہ سے، انداز سے وہی اضطراب آمیز ذہانت اور زندہ دلی ٹپکتی ہے جو ایک معیاری شاعر کے کلام میں ہوتی ہے، وہ جتنا تیز سوچتے ہیں، اس سے زیادہ تیزی سے گفتگو کرتے ہیں، جس طرح ان کو گفتار میں ایک ملکہ حاصل ہے، اسی طرح رفتار میں بھی بے تکان ان کے قدم اٹھتے ہیں، آج کل کا تو اندازہ نہیں کیوں کہ اکثر وہ اسکوٹر پر سوار نظر آ جاتے ہیں لیکن کچھ سال پہلے تک روزانہ چار پانچ کلو میٹر پیدل چلنا ان کا معمول تھا، عابدی کا یہ چلنا پھرنا بھی خارج از علت نہیں ہوتا، اس کے ذریعہ وہ لوگوں سے ملاقات کرتے ہیں، ریڈیائی ٹاک کے لیے ان کو

کنٹریکٹ فارم تھماتے ہیں، اگر ضرورت پیش آجائے تو دیئے گئے موضوع پر تفصیلات بھی گوش گزار کردیتے ہیں، اس کے بعد جب متعلقہ فنکار ریکارڈنگ کے لئے ریڈیو اسٹیشن کے اسٹوڈیو پہنچتا ہے تو وہ اس سے بجا طور پر توقع کرتے ہیں کہ اپنے موضوع کے ساتھ شخص مذکور انصاف کرے اور ریڈیو کی ضرورتوں کا لحاظ رکھے، انھوں نے خصوصی دلچسپی لے کر ایسے موضوعات پر کام کرایا جو مقامی ہیں اور اب تک نظر انداز ہوتے رہے ہیں۔

موجودہ خود غرضی، مفاد پرستی اور ریاکاری کے دور میں جب بیشتر چہرے ایک خود ساختہ نقاب کے اسیر ہیں، خالد عابدی ایک آر پار نظر آنے والی شخصیت کے مالک ہیں، اپنے کام میں انہماک اور وقت کی پابندی یہ دو خصوصیتیں ایسی ہیں جن سے خالد عابدی کی شخصیت ترکیب پاتی ہے، نمود و نمائش سے وہ دور رہتے ہیں، حرص و ہوس سے ان کا رشتہ نہیں، فرسٹریشن کا بھی وہ شکار نہیں ہوتے، اچھے محقق، معیاری نقاد، ڈرامہ نویس، اور نثر نگار ہیں۔

اپنے منصبی امور کی انجام دہی کے لئے وہ جہاں اور جس علاقے میں گئے وہاں کے مقامی ادب کو کھنگالنے کا کام کر کے تحقیق و تنقید سے اپنے فطری لگاؤ کا مظاہرہ بھی کرتے رہے، ان کا یہ کام شائع ہو جائے تو ایک وقیع کتاب منظر عام پر آسکتی ہے۔

خالد عابدی کے مختلف مشاغل اور شوق میں کتابیں جمع کرنا بھی شامل ہے جو لائبریری انہوں نے بنائی ہے اس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ عابدی کو کتابوں سے کتنی محبت ہے، آٹھ ہزار کتابوں کی ترتیب و تنظیم اور ان میں اضافہ کے لئے وہ اپنی کمائی کا ایک حصہ ہر ماہ پوری خوش دلی کے ساتھ صرف کر دیتے ہیں، عام طور پر لائبریریاں، ادارے یا تنظیمیں قائم کرتی ہیں، لیکن خالد عابدی شاید واحد مثال ہیں جو یکہ و تنہا اپنے بل بوتے پر یہ کام انجام دے رہے ہیں۔ پٹنہ کی خدا بخش لائبریری بھی مولوی خدا بخش نے اپنی کمائی کا ایک حصہ خرچ کر کے بنائی تھی، اسی طرح خالد عابدی اپنا شوق پورا کر رہے ہیں اور اس میں انہوں نے کتب کا وہ نادر ذخیرہ جمع کر لیا ہے جو ریسرچ اسکالرس کے کام آتا ہے، انشائیہ نگار فضل جاوید نے صحیح لکھا ہے کہ "خالد عابدی جو ادیب ہے، طنز و مزاح نگار ہے، ریڈیو ڈرامہ نگار ہے اور نہ جانے کیا کیا ہے آنے والا وقت ان کی شخصیت سے تہیں ہٹاتا جائے گا اور ہر تہہ کے نیچے سے خالد عابدی کا نیا چہرہ سامنے آئے گا۔"

خالد عابدی، ایک سادہ لیکن باعمل شخص

عبدالقوی دسنوی

زندگی کے بعض خوشگوار واقعات انسان کبھی نہیں بھولتا، ایسے واقعات اسے بار بار یاد آتے ہیں اور اس کی زندگی میں ایک عجیب پُرمسرت کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ میری زندگی کا یہ واقعہ بھی اسی خصوصیت کی وجہ سے میری یادداشت کی گرفت سے اب تک باہر نہیں ہوا ہے۔

تقریباً چالیس ۴۰ سال قبل کی بات ہے، میں شعبۂ اردو میں بیٹھا مطالعہ میں غرق تھا کہ شعبہ میں کسی کے آنے کی آہٹ سنائی دی، نگاہیں اٹھی ہی تھیں کہ سامنے ایک کم سن طالب علم اپنے بھولے بھالے چہرے کے ساتھ مجھ سے "مجلّہ سیفیہ" کے تازہ شمارے کی فرمائش کر رہا تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ سیفیہ ہائر سیکنڈری اسکول کا طالب علم ہے۔ اسے مجلّہ سیفیہ کا تازہ شمارہ نہیں مل سکا ہے وہ اسے پڑھنا چاہتا ہے۔ میں نہایت حیرت کے ساتھ اس طالب علم کو دیکھنے لگا۔ مجھے بے حد مسرت ہو رہی تھی کہ اسکول کے طالب علم کو مطالعہ کا اس قدر شوق ہے، میں نے اپنی خوشی کا اظہار اسے مجلّۂ سیفیہ کا تازہ شمارہ دے کر کیا، وہ بھی خوشی سے جھوم اٹھا اور میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے واپس چلا گیا۔ لیکن اپنی اس خوبی کا سکہ میرے دل و دماغ پر جما گیا۔

یہ برادرم خالد عابدی تھے مہذب، مؤدب، کتابوں اور رسائل کے رسیاؔ، بظاہر تن تنہا لیکن بلند مقاصد اور آرزوؤں میں گھرے رہنا ان کی زندگی ہے۔ سب کی مدد کرنا، کسی کو نقصان نہ پہونچانا یہ ان کی فطرت ہے۔

میں دیر تک سوچتا رہا کہ اسکول کے طالب علم میں مطالعہ کا ایسا شوق ہو جائیگا تو وہ آگے چل کر ادب کی دنیا میں کچھ نہ کچھ اضافہ کرنے میں کامیاب ضرور ہوگا۔

بعد میں خالد عابدی اکثر شعبۂ اردو سیفیہ کالج کے کتب خانہ میں آکر رسائل کے مطالعہ میں غرق ہو جاتے تھے۔ اس کے بعد ان سے قربت بڑھتی گئی۔ معلوم ہوا کہ جہانقدر، چغتائی صاحب کے خاص شاگردوں میں ہیں انھیں کی تعلیم و تربیت کا یہ نتیجہ ہے کہ خالد عابدی کو لکھنے، پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا ہے۔ اسی شوق نے انھیں اسکول کی تعلیم میں کامیابیاں عطا کیں اور بعد میں بی اے اور ایم اے کی ڈگریاں دلوائیں۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے مقالہ لکھنے پر بھی اکسایا۔

ملازمت کی وجہ سے جب تک وہ بھوپال میں بجلی گھر سے وابستہ رہے ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں لیکن جب وہ ریڈیو اسٹیشن سے وابستہ ہوئے تو ان کا تبادلہ کچھ عرصہ بعد بھوپال سے باہر ہو گیا۔

جب تک خالد عابدی بھوپال سے باہر رہے خطوط کا سلسلہ جاری رہا۔ جو زیادہ تر ادب کے متعلق ہوتے تھے اس دوران میں ان کی تحریریں، مختلف رسائل میں شائع ہونے لگی تھیں اور وہ نیک نامی کے ساتھ ابھر کر ادب کے میدان میں مسکراتے نظر آنے لگے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ خود اعتماد کی دولت سے بھی مالا مال ہونے لگے تھے۔

خالد عابدی کی پہلی تصنیف ان کے ریڈیو ڈرامہ کا مجموعہ ''آواز نما'' ۱۹۷۵ء میں جلوہ نما ہوا ۔جس نے ادبی حلقہ کو خالد عابدی کی طرف اور زیادہ متوجہ کیا۔ اس کے بعد دوسری کتاب ''باغ فکر ومعروف بہ مقطعات نساخ'' ۱۹۷۷ء میں منظر عام پر آئی ۔ جس کے ''مقدمہ'' اور ''عبد الغفور نساخ'' اور ان کی ادبی خدمات'' خالد کے لکھے ہوئے ان دونوں حصوں نے قاری کو محقق خالد عابدی سے ملایا۔ ان سے قربت رکھنے والے ان کی تحقیقی خبر و نظر سے متحیر ہو گئے۔

تیسری کتاب ریڈیو اسٹیج ڈرامہ کا مجموعہ 'پیکرِ آواز' ۱۹۸۳ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا جسے اہل نظر نے قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ اس کتاب کے آخری صفحہ ۱۴۴ پر ''محمد خالد عابدی کی متوقع کتب'' کے تحت ان دس کتابوں کی اشاعت کا اعلان بھی ہوا جن کے نام یہ ہیں:

(۱) 'کانٹے کی خوشبو'۔ (افسانوں کا مجموعہ)

(۲) 'شکایت عرض ہے'۔ (طنزیہ مزاحیہ مضامین)

(۳) مدھیہ پردیش میں امیر مینائی کے تلامذہ

(۴) مدھیہ پردیش میں داغ دہلوی کے تلامذہ

(۵) مدھیہ پردیش میں ہندو شعراء

(۶) مدھیہ پردیش کے افسانہ نگار

(۷) مدھیہ پردیش کی خواتین قلم کار

(۸) اُجین میں اردو

(۹) مدھیہ پردیش کے اخبار اور رسائل

(۱۰) مدھیہ پردیش میں اردو

خالد عابدی کے اس اعلان نے بھی نہ صرف مجھے حیرت زدہ کر دیا بلکہ خوشی کی ایک لہر نے

میرے دل و دماغ میں ایک کیفیت پیدا کر دی۔ حیرت اس لئے کہ خالد عابدی ناموافق حالات کے باوجود علمی و ادبی کام کرنے کے کیا کیا عزائم رکھتے ہیں اور خوشی اس بات کی کہ بھوپال ایک اہم قلمکار کا اردو میں اضافہ کرتے جارہا ہے۔

اپنی چوتھی کتاب "زخموں کے دریچے" کو انھوں نے ۱۹۸۸ء میں دنیائے ادب کے سامنے پیش کی جو ان کی دس افسانوں پر مشتمل ہے ان کے یہ افسانے رومانی اور معاشرتی زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں، جس سے ان کے روشن مستقبل کی امید بندھی تھی۔

پانچویں تصنیف "شکایتاً عرض ہے" طنزیہ، مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا۔

چھٹی کتاب "اردو انٹرویوز" کی اشاعت ۱۹۹۲ء میں ہوئی جس میں پندرہ ادباء قلمی شخصیتوں سے مراسلاتی انٹرویوز شامل ہیں۔

ساتویں کتاب "تیچر کے بغیر" بچوں کے ڈرامے پر مشتمل ہے۔ یہ مجموعہ ۱۹۹۴ء میں منظر عام پر آیا۔ جس میں بچوں کے چھ دلچسپ ڈرامے شامل ہیں۔

"مضامین خالد" میں خالد عابدی کے بارہ ۱۲ تحقیقی تنقیدی مضامین یکجا ہیں جو ان کی تحقیقی، تنقید نظر کی گواہی دیتے ہیں اور خوب ہیں۔

ان کی آخر مطبوعہ کتاب "اردو مراسلاتی انٹرویوز" ۱۹۹۶ء میں شائع ہوئی ہے جس میں اردو کے اہم پچیس ادباء سے مراسلاتی انٹرویوز ہیں جو اہم اس لئے بھی ہیں کہ ان شخصیات سے متعلق اہم معلومات سے آگاہی ہوتی ہے۔

ان کے علاوہ اس دوران میں طویل عرصہ تک ملازمت کے سلسلے میں وہ بھوپال سے باہر رہے جہاں ملازمت کی مصروفیت کے ساتھ ساتھ مطالعہ اور زبان کی خدمت کرتے رہے۔ اسی دوران میں انھوں نے ام۔ اے کی ڈگری بھی حاصل کی اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کرنے کے لئے کوشاں رہے۔ جہاں جہاں رہے وہاں اردو کی نایاب کتابوں اور قلمی نسخوں کی تلاش میں بھی مصروف رہے اگر چہ اب تک پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی اپنی عدیم الفرصتی کی وجہ سے حاصل نہیں کر سکے ہیں لیکن اس دوران میں انھوں نے جو کچھ بھی لکھنے پڑھنے اور اردو کی خدمت کرنے میں وقت صرف کیا وہ قابلِ قدر ہے۔

آج اگر اہلِ نظر خالد عابدی کو افسانہ نگار، طنز و مزاح کا قلمکار، ڈرامہ نگار، اور انھیں محقق اور ناقد کی حیثیت سے جانتے ہیں تو ساتھ ساتھ انھیں اردو کا مخلص خدمت کرنے والا بھی مانتے ہیں۔ انھوں نے اپنی ریڈیو اسٹیشن کی ملازمت کے دوران میں اردو کی ترقی کی جم کر کوشش کی۔ جس میں

انھیں اپنی آمدنی کا اہم حصہ خرچ کرنا پڑا۔ انھوں نے اردو کی مفید اور نایاب کتابیں خرید خرید کر اپنے گھر کو "کتاب گھر" بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ کتابوں کی فہرست اس سلیقہ سے ترتیب دی کہ محققین و ناقدین اور شائقین ادب نہایت آسانی کے ساتھ اپنی مرضی کے مطابق کتابیں مطالعہ کر سکتے ہیں۔ انھوں نے اردو سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اپنے کتب خانہ کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔ جس کا جی چاہے اس ادبی خزانہ سے فیض اٹھائے۔

سچ ہے خالد عابدی:

اب کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

● ساجدہ بیگ

آکاش وانی بھوپال سے میرا رشتہ بہت پرانا ہے آج سے تقریباً چھتیس سال پہلے اردو تقریر کے لیے میں نے اپنا پہلا پروگرام ریکارڈ کرایا تھا اس وقت میں کالج میں زیر تعلیم تھی۔ میرے ماموں محترم آصف شاہ میری مرحوم مجھے وہاں لے کر گئے تھے۔

میرا سب سے زیادہ سابقہ آکاش وانی بھوپال میں اردو کے موجودہ انچارج محترم جناب خالد عابدی سے پڑا پہلے بھی میں نے ان کے زیر نگرانی کئی پروگرام ریکارڈ کرائے تھے پھر ان کا تبادلہ بیتول اور جھالاواڑ دوسرے آکاش وانی کیندروں پر ہو گیا تھا جب وہ بھوپال واپس آئے تو وہ سلسلہ دوبارہ جاری ہو گیا وہ نہایت ہمدرد، مخلص، منکسر المزاج و حلیم الطبع انسان ہیں ان کی طبیعت کی سادگی کی وجہ سے ان کے ساتھ کام کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے ہر پروگرام میں ان کا پورا تعاون حاصل رہتا ہے اور جو مدد درکار ہوتی ہے وہ اس میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے ہیں۔ پروگرام اچھے سے اچھا تیار ہو جائے یہی ان کا مقصد ہوتا ہے۔

ڈاک کی تاخیر کے باعث اگر اطلاع نہ پہونچ سکے تو وہ بذات خود رابطہ قائم کر کے پروگرام کی اطلاع دیتے ہیں۔

وہ متعلقہ شخص کی مجبوری کو سمجھ کر ریکارڈنگ میں سہولت دے کر خود پریشانی اٹھا کر دوسروں کو آسانیاں مہیا کرا دیتے ہیں۔ جو کام ان کا نہیں ہے اسے انجام دینے میں بھی کبھی گریز نہیں کرتے ہیں ان کی یہ خوبیاں ان کے ایک اچھے انسان ہونے کی نشانی ہیں۔

ریڈیو مین۔ محمد خالد عابدی

عبدالمنان خاں

میں جب ریڈیو میں آیا اس وقت ریڈیو کی نوکری "ذریعۂ عزت" سمجھی جاتی تھی۔ ایک عام خیال تھا کہ یہ محکمہ تعلیم یافتہ، باخبر اور فنکار لوگوں کا ہے اور ان کے لئے ہی عزت واحترام کے ساتھ ہی ریڈیو کے ملازمان کو رشک وپسندیدگی کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کو زیادہ عرصہ نہیں گذرا۔ تقریباً ۳۵ سال ہوئے ۱۹۶۸ء کے مئی ماہ میں میرا تقرر ہوا تھا پہلی پوسٹنگ گوالیار میں ملی، سات سال کا عرصہ گوالیار میں گذرا یعنی ۱۹۷۵ء تک۔

فروری ۱۹۷۵ء میں بھوپال تبادلہ ہوا اور وودھ بھارتی بھوپال میں جوائن کرایا گیا۔ ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۵ء تک گوالیار رہتے ہوئے بھی بھوپال آمدورفت جاری رہی۔ ظاہر ہے کہ جب بھی اپنے گھر بھوپال آتا تو ایک دو بار آل انڈیا ریڈیو بھوپال کا بھی طواف کر جاتا، اگر کوئی کام نہ بھی ہوتا تو یہاں کے ساتھیوں سے سینئر لوگوں سے ملاقات ہیڈکوارٹر کی تازہ ترین خبروں میں دلچسپی اور دیگر وجوہ سے بھی اس دوران جہاں تک مجھے یاد ہے ریڈیو بھوپال سے ایک اردو پروگرام ہوا کرتا تھا جی ہاں محض ایک پروگرام آدھ گھنٹے کا وہ بھی ماہانہ۔ یہاں باقاعدہ اور آزادانہ اردو پروڈیوسر کی کوئی پوسٹ نہیں تھی۔ ایک ڈیوٹی آفسر تھے ایم۔ ایچ۔ صدیقی (مظفر حسین صدیقی) جو اس پروگرام کے ذمہ دار یا نگراں تھے۔ پروگرام میں زیادہ تر شعری تخلیقات ہوتی تھیں صرف عیدین کے دو خصوصی پروگرام کو چھوڑ کر جن کے مشمولات میں تلاوت قرآن کریم معہ ترجمہ عید کے متعلق ایک تقریر اور کبھی کبھی کوئی قوالی بھی شامل کی جاتی تھی، بس یہی اردو پروگرام کی کل کائنات تھی شہرِ غزل بھوپال کا یہی ادھورا خواب تھا۔

۱۹۷۵ء کے ماہ فروری میں جب بھوپال پہونچا تو یہ منظر بھی بدل چکا تھا۔ اقبال مجید صاحب بھوپال میں بحیثیت اردو پروڈیوسر آچکے تھے اور اردو پروگرام باقاعدہ ہوا کرتے تھے۔ اقبال مجید اپنی صحت مند روایات اور حسین خوابوں کے ساتھ آئے تھے۔ آل انڈیا ریڈیو بھوپال کے اردو پروگرام کا یہ عہد عہد زریں تھا۔ کسی بھی ریڈیو کا کوئی بھی پروگرام اپنے مشمولات ترتیب وتدوین اور انداز پیش کش سے نمایاں کامیابی حاصل کرتا ہے اور یہ کام اقبال مجید نے کر دکھایا۔ ان کے

پروڈیوس کیئے ہوئے پروگرام .Ideal Prog ہیں۔ اقبال مجید صاحب کے دور میں پروگرام نہایت جانفشانی، عرق ریزی اور محنت سے ترتیب دیئے گئے اور نشر ہوئے۔ فنی باریکیوں کا لحاظ رکھتے ہوئے نئے تجربات ہوئے ادب کی تقریباً تمام اصناف کی نمائندگی ہوئی اردو پروگرام صرف شعری نشست یا قوالی کا پروگرام نہیں رہ گیا تھا۔ بلکہ ایک قابل ذکر ادبی پروگرام بن گیا تھا۔ اس میں تقاریر ڈراما، فیچر، تمثیل، ملاقات، مباحثہ مذاکرہ، تبصرہ، ترجمہ بھی کچھ ہوتا تھا اردو کے آسمان پر ایک کہکشاں سج گئی تھی۔ مزاح کی صنف جھلکیوں ڈرامہ کے علاوہ اقبال مجید نے ایک بالکل نیا سلسلہ شروع کیا۔ اسکو ریڈیو کارٹون پروگرام کہا گیا عنوان تھا ''دیکھی سنی'' یہ زیادہ سے پانچ منٹ کی مدت کی مکالماتی اسکرپٹ ہوتی تھی اسکو دو اسٹاک کریکٹر ماموں بھانجے، اقبال مجید اور ڈراما آرٹسٹ مقبول حسن پیش کرتے تھے۔ موضوع میں تنوع ہوتا تھا، مثلاً شہر میں پیاز کی کمی، پانی کی قلت، ٹریفک کی بد انتظامی اور عوام کی زندگی سے متعلق مسائل حاضرہ وغیرہ اسکرپٹ نہایت شگفتہ و برجستہ ہوتی تھی۔ چار سے پانچ منٹ کے وقفہ میں وہ اپنی بات کہہ دیتے تھے اور اختصار ہی اس کا حسن ہوتا تھا۔ ریڈیو میں مقبولیت کے ساتھ ساتھ یہ پروگرام متعدد بار اسٹیج پر بھی پیش کیا گیا۔

اقبال مجید صاحب نے براڈ کاسٹنگ میں خاص طور سے بھوپال کے اردو پروگرام میں ''تمثیلی تقریر'' کو متعارف کرایا جو اہل بھوپال بلکہ صوبہ مدھیہ پردیش کے ریڈیو سامعین کے لیے اپنے قسم کی ایک نئی چیز تھی۔ کلاسیکی ادب میں سعدی کی گلستاں و بوستاں کی حکایات کے مختصر تراجم (پانچ منٹ کے) پیش کئے گئے اور یہ کام انجام دیا مجھ حقیر پرتقصیر عبدالمنان نے۔ اسکے علاوہ ریڈیو پر غالباً پہلی بار میری معلومات میں طلسم ہوش ربا۔ میرامن کی باغ و بہار یا قصہ چہار درویش اور فسانہ آزاد کو فیچرائزڈ کیا اور نہایت کامیابی سے نشر کیا۔ طلسم ہوشربا کو آدھ گھنٹہ کے آٹھ حصوں اور دودویش کو ۳۰ منٹ کے چار حصوں میں پیش کیا گیا۔ ساتھ ہی اساتذہ شعرائے کرام غالب، میر، مومن، اقبال، انیس پر فیچر نشر کیئے گئے جو بعد میں آل انڈیا ریڈیو لکھنو سے بھی نشر ہوئے۔ آل انڈیا کے سالانہ انعامی مقابلوں میں اقبال مجید کے ڈرامے فیچر متواتر چار سال انعامات اور سرٹیفکیٹ سے نوازے گئے ان کے لکھے فیچر ''ریڈیو اناؤنسر'' کو سرٹیفکیٹ ملے یہ فیچر میں نے پروڈیوس کیا تھا۔ اس لئے سرٹیفکیٹ مجھے بھی ملا۔ بھوپال گیس المیہ پر اقبال مجید کے پروگرام ''کاش اخبار جھوٹ بولتے ہوں'' کو بھی انعام ملا۔ بہر حال اقبال مجید صاحب نے بھوپال میں اپنا کامیاب عہد پورا کیا اور ان کا تبادلہ لکھنؤ ہو گیا اور ان کی جگہ تو کیا۔۔۔ اردو پروگرام میں نیر صدر الدین آئیں۔ وہ بنیادی طور پر سائنس کی طالبہ رہی تھیں۔ لیکن انکی والدہ ذکیہ سلطان حزیں افسانہ نگار تھیں، نیر صدر الدین نے بھی

کچھ افسانے لکھے تھے۔ بہر حال انھوں نے اردو پروگرام لیا ہی تھا کہ جناب خالد عابدی نے بھوپال میں ورود مسعود فرمایا۔ ان کے ریڈیو میں آنے کی خبر کچھ سالوں اور بھوپال آنے کی خبر کچھ مہینوں سے گردش میں تھی۔ خالد عابدی نے ریوا سے ریڈیو میں ملازمت کی شروعات کی جہاں ان کا تقرر بحیثیت پروڈکشن اسسٹنٹ (یا اسسٹنٹ پروڈیوسر) ہوا تھا تقریباً چار سال ریوا میں رہے وہاں سے اندور پہونچے اور پھر بھوپال ریڈیو آئے۔

خالد عابدی کے بھوپال آنے سے میری ایک بڑی الجھن رفع ہوگئی۔ خالد عابدی کے تقرر کے بعد ہی سے شناسا اور احباب ان کے ذکر پر اکثر مجھ سے یہ کہتے کہ 'ارے بھئی بھوپال کا لڑکا ہے' تمہاری ملاقات رہی ہوگی۔ میں خالد عابدی کے نام سے اپنے جاننے والوں کا چہرہ یاد کرتا مگر کوئی چہرہ ذہن کے نہاں خانوں سے نہ ابھرا کہ اس نام کو اپنا لیتا، ہزار چہرے اسکول، کالج، بازار و بزم کے ذہن پر ابھرتے معدوم ہو جاتے اور خالد عابدی کا نام میرے لئے پھر بے چہرہ رہ جاتا۔ بارے اس کشمکش سے چھوٹا خدا خدا کر کے جب خالد عابدی نے بھوپال اسٹیشن جوائن کیا۔ میری ملاقات ہوئی اور یہ خیال کہ یہ تو وہی ہے چہرہ جانا پہچانا، گھنگھریالے بال، گورے پن کی حدوں کو چھوتا رنگ، دلفریب مسکراہٹ جس میں اکثر شرارت جھلکتی، باتوں میں بے تکلفی اور اپنا پن۔ دھیرے دھیرے...... نہیں بلکہ بعجلت تمام وکمال یہ بے تکلفی اپنے تمام حدود طے کرتی ...... نہیں ...... پھلانگتی ہوئی نہ گفتہ بہ حدود میں داخل ہوگئی۔ ہم ایک جان دو قالب تو (خدا کا شکر) نہیں ہو سکے ہاں شیر وشکر اور انگریزی میں Thikas thives ضرور ہو گئے۔

خالد عابدی کی پیدائش، تعلیم وتربیت بھوپال میں ہوئی یہ ان کا وطن اور کارگہہ عمل تھی، لکھنا پڑھنا کی ابتداء زمانہ طالب علمی سے ہو چکی تھی۔ طبیعت میں تلاش و تحقیق وجستجو حد سے زیادہ حلقۂ احباب بہت وسیع معلومات اس سے سوا، خوش اخلاق، متواضع، ملنسار، یار باش ہمدرد انسان تھے ہی اس لئے انھیں کوئی پریشانی نہیں ہوئی لیکن معاون جب زیادہ ذہین اور باخبر ہو تو آفیسر سے کبھی کبھی ٹکراؤ کی نوبت آجاتی ہے یہ ہر جگہ ہوتا ہے، بہر حال خالد عابدی نے یہ مراحل بھی خوش اسلوبی سے طے کر لئے۔

خالد عابدی کی مقامی شعراء ادبا سے واقفیت اور موضوع سے از حد دلچسپی کا نتیجہ کامیاب اور اچھے پروگراموں کی شکل میں ظاہر ہوتا رہا۔ (اگر چہ بیشتر کے کریڈٹ سے وہ محروم رہے) لیکن اس سے ان کے خوب سے خوب تر کے شوق میں کوئی کمی نہیں آئی ان کا جذبۂ عمل کبھی یخ بستہ نہیں ہوا۔

خالد عابدی کی معلومات اور واقفیت اردو پروگرام کی بے حد ممدوح ومعاون ثابت ہوئی،

اس کا فائدہ ریڈیو، سامعین، شعراء و ادیب فنکاروں کو خالد عابدی کے سوا سب کو ہوا، ان کے حصے میں صرف محنت آئی (کبھی کبھی غیر ضروری بھی) موصوف کو اگر کم وقت میں یا بر وقت کوئی پروگرام تیار کرنا پڑ جائے اور ایسے مواقع اکثر آئے، اور کانٹریکٹ بھیجنے کے لئے وقت کافی نہ ہوتا، یا سرے سے وقت ہوتا ہی نہیں، یا پھر یہ خدشہ ہوتا کہ بروقت کانٹریکٹ نہیں پہنچ سکے گا۔ تو موصوف بنفسِ نفیس شرکاء کو ان کے کانٹریکٹ پیدل ان کے دولت خانے پر پہنچاتے تاکہ ان کی شرکت یقینی ہو جائے اور عدمِ حاضری کی شکل میں بروقت یا سرے سے نہ ہونے کا خطرہ نہ رہے۔

خالد عابدی کے اس حد سے زیادہ احساس ذمہ داری کا بھی خوب فائدہ اٹھایا گیا اور وہ اسے اپنی ڈیوٹی کے ساتھ ساتھ اردو کی خدمت سمجھ کر پوری کرتے رہے۔ دریں اثناء دہلی سے سلطانہ اختر آ گئیں وہ اُردو پروگرام ایکزیکیٹو ہو کر آئی تھیں اور وہ اس مژدہ کے ساتھ آئی تھیں۔ دہلی میں مجھے کہا گیا ہے کہ آپ کو کچھ نہیں کرنا ہے خالد عابدی پر ہی Depend رہنا ہے۔ غالب کی طرح سلطانہ اختر سے بھی دتی نہیں چھٹتی تھی وہ ڈیڑھ دو ماہ میں ہی واپس دہلی چلی گئیں۔ خالد عابدی نہ تو کسی کے ماتحت کام کر سکتے تھے نہ یہ ان کا مزاج تھا۔ اب پھر اردو پروگرام میں خالد عابدی کا پرچم لہرانے لگا۔ کئی برس بعد دہلی سے رئیس صدیقی آئے ان کا جسم بھوپال میں اور دل و دماغ دہلی میں رہتا تھا۔ وہ بھی آئے اور چلے گئے خالد عابدی پھر قائم مقام صدر ہو گئے۔

خالد عابدی بیرونی شعراء و ادبا کو بھی مدعو کیا اور پروگرام کا کینوس وسیع ہوتا گیا صرف بھوپال نہیں پورے صوبے کی نمائندگی ہونے لگی۔ شعراء و ادیبوں کے وفات پر خالد عابدی نے بہت سے پروگرام تیار کئے ان میں شعری صاحب، کیف بھوپالی، کوثر چاند پوری، مالک رام، شوکت علی فہمی، قاضی سید وجدی الحسینی، عصمت چغتائی جگن ناتھ آزاد اور اختر سعید خاں کی رحلت پر پروگرام ہوئے، لوگوں نے دنوں ان پروگرام کو یاد کیا بیگم اختر ایک فیچر جو خالد عابدی نے لکھا اور تیار کیا اس میں بیگم اختر کی آواز کی ریکارڈنگ حاصل کرنے کے لئے لکھنؤ اور حیدر آباد کا سفر ذاتی طور پر کیا اور بہترین پروگرام تیار کیا، جو بھوپال، اور دودھ بھارتی سے اور بعد میں دودھ بھارتی بمبئی سے نشر کیا گیا۔ اس کے علاوہ ہندوستانی فلموں کے ۷۵ سال پورے ہونے کے سلسلے میں ایک فیچر لکھا جس میں میں نے اور انیس فاطمہ ڈراما آرٹسٹ نے بطور راوی کے حصہ لیا۔ یہ فیچر میں نے پروڈیوس کیا تھا اسکرپٹ خالد عابدی کی تھی۔

ریڈیو کی ایک اچھی روایت یہ رہی ہے کہ بیرون شہر سے آنے والے مشاہیر اور فنکاروں کو اسٹوڈیو میں ریکارڈنگ کے لئے مدعو کیا جاتا ہے اس سلسلہ میں بھی موصوف بہت بیدار اور فعال

رہے۔ جب بھی کوئی اہم شخصیت بھوپال آئی موصوف نے تابڑ توڑ کوششوں سے خصوصی اجازت حاصل کر کے انہیں اسٹوڈیو میں مدعو کیا اور پروگرام تیار کئے اس سلسلے سے اس وقت جو چند نام قلم اور ادب کے یاد آرہے ہیں، ان میں موسیقار راج، رتن ہمت رائے شرما، جاوید اختر منظور الامین، عصمت چغتائی، گوپی چند نارنگ، پروفیسر جگنناتھ آزاد وغیرہ شامل رہے ہیں۔

خالد عابدی نے بھوپال سیریز کی بھی تجدید کی، بھوپال کی تاریخی عمارات دلچسپ اور معلوماتی سیریز ثابت ہوئی اور پسند کی گئی۔ اقبال مجید کے بعد خالد عابدی اس سلسلے کو ہنوز قائم رکھے ہوئے ہیں۔

خالد عابدی نیر صدرالدین کو اسسٹ کرتے تھے۔ نیر صدرالدین کچھ عرصے بعد دہلی منتقل ہو گئیں۔

فیاض رفعت صاحب (اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائرکٹر) نے بہت سوچ سمجھ کر خالد عابدی کو اردو پروگرام آزادانہ دے دیا پھر تو خالد عابدی کے جوہر خوب کھلے۔ خواتین، نوجوانوں، طالب علموں کے پروگرام شروع ہوئے۔ یہاں تک کے بچوں کے پروگرام اردو میں ہونے لگے۔ جو شخص "اردو" میں اپنی بات کہنے کا ذرا بھی سلیقہ رکھتا تھا خالد عابدی نے اسے قلم کار بنا دیا۔ غالب کوئز، مولانا آزاد کوئز، قلم کوئز میں تو ان نوجوانوں کو بھرپور موقع ملا جنھوں نے کبھی ریڈیو کی چہار دیواری بھی نہیں دیکھی تھی۔ ان پروگراموں کی تیاری میں خالد عابدی نے بہت محنت اور بہت وقت صرف کیا لیکن ریڈیو کے لئے بہت اچھے Talent تلاش کیے۔

بہر حال بھوپال ریڈیو اسٹیشن پر وہ وقت ہر لحاظ سے بہت اچھا تھا۔ فیاض رفعت کی موجودگی میں بھوپال ریڈیو اسٹیشن پر کامیابی سے اردو پروگرام چلانے کی ذمہ داری کچھ سہل کام نہیں تھا لیکن خالد عابدی اس ذمہ داری سے بھی خوش سلیقگی سے عہدہ برآ ہوئے۔ انہوں نے خالد عابدی کو کچھ زیادہ ہی مراعات دے رکھی تھیں۔ وہ خالد عابدی سے بھوپال میں متعارف نہیں ہوئے تھے بلکہ جو بلٹز (اردو) وہ بمبئی سے اپنے ساتھ لائے تھے اس میں خالد عابدی ایک فلمی مضمون کی شکل میں لپٹے ہوئے تھے۔

ریڈیو کی مصروفیات خاصی تھیں اور موصوف کو ذمہ داریاں اوڑھنے کا شوق بھی، ہمہ وقت دوسروں کی مدد کے لئے تیار رہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود ان کے تصنیف و تالیف کے کام کا کافی حرج ہوا، لیکن یہ میرے لئے ایک طرح سے کافی فائدہ مند ثابت ہوا۔ میں قلم برداشتہ کچھ بھی لکھتا رہتا تھا، خط بھی خاصا تھا اور یہ موصوف آرٹسٹ کی تلاش میں رہتے تھے چنانچہ موصوف نے اس کا فائدہ

اٹھایا اور تجویز رکھی کہ میں ان کے مضامین صاف کردوں، مشاہیر کے جو خطوط ان کے پاس ہیں ان کی سلسلے وار نقول تیار کروں میں نے اس کو بخوشی قبول کرلیا اور موصوف سے زیادہ فائدہ مجھے پہونچنے لگا کیوں کہ یہ بیگار نہیں تھی بلکہ اس کی ایک معقول فیس (آپ اجرت بھی کہہ سکتے ہیں) مجھے کبھی پیشگی کبھی بروقت ادا کی گئی۔ ہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ خود خالد عابدی کا خط ماشاء اللہ بہت اچھا ہے وہ فن کتابت سے کسی قدر واقف ہیں اور دوران مجھے فن کتابت کے اسرار و رموز سے بھی آگاہ کرتے رہے حوصلہ افزائی تو کی ہی عملی مدد بھی کی میں کتابت سیکھ لوں مگر میں ان کی امیدوں پر پورا نہیں اترا حالانکہ ان کی نصیحتوں، حوصلہ افزائی اور رہنمائی نے مجھے بھوپال کے ایک بزرگ کاتب کے شاگردی کے مرتبہ تک پہنچا دیا لیکن یہاں بھی میں مکتب سے بھاگنے والا ثابت ہوا۔ ہاں ایک فائدہ ضرور ہوا جس طرح بگڑا ہوا فنکار کارٹونسٹ بن جاتا ہے اس طرح کاتب تو نہ بنا، خوشنویسوں میں میرا شمار ہونے لگا اور شہر میں ایک شناخت قائم ہونے لگی۔ خالد عابدی کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچنے لگا تو انہوں نے ایک ضرورت مند ریسرچ اسکالر سے میرا تعارف کرادیا جو اُردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کر رہے تھے۔ ان کا مسودہ صاف کرنے کی ذمہ داری مجھے ملی جس سے خاطر خواہ یافت ہوئی اور یہ سلسلہ چل نکلا میں نے ایک کے بعد ایک کئی مقالے صاف کیے کچھ تراجم بھی کیے۔

خالد عابدی نے بھی پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے رجسٹریشن کرایا تھا پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی زیر نگرانی مقالہ کی تیاری شروع کی، قیام بیتول کے دوران زیر تکمیل تھا اسی دوران محکمہ جاتی ٹریننگ کے لئے خالد کو دہلی جانا پڑا بارش کا موسم تھا موسلا دھار بارش کی وجہ سے بیتول میں سیلاب کی صورت حال پیدا ہوگئی اور آکاشوانی کالونی (جہاں خالد رہتے تھے۔) زیر آب ہوگئی بہت سے لوگوں کو نقصان ہوا، لیکن سب سے زیادہ نقصان خالد عابدی کا ہوا کیوں کہ اس حادثے میں ان کا پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کا مقالہ اور بہت سی قیمتی و نادر کتب تلف ہوگئیں۔ وہ سیلاب زدہ مقام تو خشک ہوگیا لیکن خالد عابدی کی آنکھیں آج بھی نم ہیں، خواب میں کتابیں تیرتی نظر آتی ہیں۔

خالد عابدی کی مضمون نگاری یا زبان و بیان پر تو اظہار رائے کا میں اہل نہیں، بس اتنا آپ کو بتانا چاہوں گا کہ مقالہ کی تیاری کے دوران پروفیسر دسنوی صاحب نے خالد سے کہا تھا کہ "مشکل زبان لکھتے ہو تھوڑا آسان لکھا کرو"۔ خالد کے مقالے کا موضوع تھا بیسویں صدی میں "اردو کا مکتوباتی ادب"۔ خالد عابدی اب سے دس سال قبل نو کتابیں اور ان گنت مضامین تحریر کر چکے ہیں۔ ادباء شعرا کی ڈائرکٹری گزشتہ پانچ سال سے زیرِ ترتیب ہے جس کا کام ان کے مطابق اب قریب انجم ہے۔

خالد کی پہلی کتاب "آواز نما" (ریڈیو ڈراموں کا مجموعہ) پر انہیں اتر پردیش اردو اکیڈمی

سے انعام ملا اور ''مضامینِ خالد'' بہار اردو اکیڈمی سے انعام ملا۔ ''پیکرِ آواز'' (ریڈیو اور اسٹیج ڈراموں کا دوسرا مجموعہ) اور زخموں کے دریچے'' (افسانوں کا مجموعہ) پر انہیں فخر الدین علی احمد میموریل اردو کمیٹی لکھنؤ سے اشاعت کے لئے مالی تعاون ملا۔

ہاں ایک بات اور جس سے آپ بھی اتفاق کریں گے کہ وہ جتنا بولتے ہیں اس سے زیادہ کام بھی کرتے ہیں۔ ان کا یہ زیادہ بولنا ریڈیو کے لئے بہت مفید ثابت ہوا۔ جب اچانک کسی فلم، گیت، موسیقار وغیرہ کے فلموں گیتوں کی ضرورت پیش آجاتی تو لائبریری کی طرف دوڑ جانے کے بجائے خالد عابدی کی طرف دوڑنا زیادہ سودمند ہوتا ہے۔ ریڈیو کی لائبریری میں فلموں سے متعلق وہ کتابیں ہیں جو خالد کی کوششوں سے ہی خریدی گئیں لیکن خالد کے پاس اس سے کہیں زیادہ کتابیں ہیں۔ پرانی فلموں کے گیتوں اور قوالیوں کے پروگرام جو میں نے پیش کئے ان کی اہم معلومات اور اسکرپٹ خالد نے ہی فراہم کی تھی۔ بھوپال ریڈیو اسٹیشن کے ڈائرکٹر لکشمیدر چوپڑا نے خالد عابدی کی فلمی معلومات سے متاثر ہو کر ہی انہیں اس کام کے لیے پابند کیا تھا اور دفتر سے ایک باضابطہ حکمنامہ جاری ہوا تھا۔ ان کے تیار کردہ فلمی کوئز بھی بہت کامیاب رہے انہوں نے اسٹیج پر بھی دو بار پروگرام پیش کیے جن کے کوئز ماسٹر وہ خود رہے ہیں۔

میں جب بھی سوچتا ہوں کہ خالد عابدی کسی طرح لوگوں سے ایڈجسٹ کرتا ہے تو عقل حیران رہ جاتی ہے کون شاعر، ادیب کہاں رہتا ہے۔ کہاں اس کی بیٹھک ہے وہ کس گروپ کے مشاعروں میں ٹھیک رہیگا۔ اگر کوئی لڑنے جھگڑنے والا شخص ہے تو وہ اس سے نپٹنا بھی جانتا ہے۔ بُرا ماننے والوں کو منانا، کس کو بھگانا یہ فن وہ خوب جانتا ہے، جو شاعر تحت میں بھی اچھا نہیں پڑھ سکتا وہ ترنم میں پڑھنے کی ضد پر اڑ جائے تو اس کا معالجہ بھی خالد عابدی کے پاس ہے لیکن جتنا وہ ایڈجسٹ کرتا ہے دوسرے کا بوتا نہیں۔ اکثر سرکاری پالیسیوں اور غیر ادبی مضامین کی ضرورت پیش آتی ہے بارہا اس نے لکھ دیئے اور پروگرام او کے ہو گیا۔ کسی صاحب کا مضمون چھوٹا پڑ گیا تو معینہ وقت کی عبارت ہی نہیں صفحے کے صفحے بڑھوا دیئے اور بعض کمیوں کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ مضمون میں فلاں چیز یا واقعہ کا قدرے ذکر کرنا چاہیے تھا۔

خالد عابدی کی طبیعت اور مزاج سے واقف ہوتے ہوئے بھی مجھے ایک بات اکثر چبھتی رہی اور تعجب بھی ہوتا ہے کہ ان کی خدمت کا کہیں اعتراف نہیں کیا گیا بلکہ میں یہ بھی کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ ہمارے شہر میں انہیں نظر انداز کیا جاتا رہا ہے درآں حالانکہ متعدد حضرات جن میں ڈاکٹر پروفیسر پبلیشر اور اہل قلم حضرات کسی نے بھی خالد عابدی کی خدمات اور جذبہ اردو

قابلِ اعتراف نہیں سمجھا ہمیشہ اس ضمن میں اعراض روا رکھا دانستہ نظر انداز کیا جبکہ وہ کسی محاذ پر کسی کو بھی ادبی مدد پہنچانے میں پیچھے نہیں رہے کسی کو انکار کر کے مایوس نہیں کیا بلکہ اس ''..... چکر'' میں مفت محنت کی اور کئی نادر روزگار و کمیاب کتابوں اور مخطوطات سے ہاتھ دھو بیٹھے خالد عابدی کی حق تلفی شاید ہمارے شہر کے مزاج میں داخل ہو گئی ہے۔ میری تمنا اور دعا ہے کہ یہ سرد مہری ختم ہو یہ برف پگھلے اور میرے دوست خالد عابدی کو اس کا جائز مقام ملے اور میں بھی مسرور و شاد ہو سکوں۔

● نصرت فاطمہ ٹونک (راجستھان)

''......آپ اس بات سے بھی مطمئن رہیے گا کہ میں آپ اور آپ کے کتب خانہ کے حوالے کے ساتھ ہی شائق کو شامل کروں گی اور مکتبہ عابدیہ کا حوالہ ضرور دوں گی۔

آپ کی کتاب دو چار روز میں روانہ کر دوں گی۔

میں اور میرے گائیڈ ڈاکٹر عثمانی صاحب (ابوالفیض عثمانی) کی جانب سے شکریہ قبول کیجئے۔''

مکتوب: ۳ر مئی ۱۹۹۸ء

شہر میں ایک دیوانہ

عظیم الدین

عمر عزیز ساری دل ہی کے غم میں گزری
بیماری عاشقی پر کس دن بھلا رہے گا

مجھے شرم آتی ہے۔ بہت شرم آتی ہے جب میں ایک ایسے فنکار سے ملتا ہوں۔ شرم کیوں آتی ہے۔ شرم اس لئے آتی ہے کہ وہ فنکار غلطی سے ہمارے بھوپال میں پیدا ہو گیا۔ جہاں فن کار کی قدر صرف اس کے عہدے سے کی جاتی ہے۔ ملٹن نے اپنی ایک نظم میں کہا ہے کہ اللہ کو انسانوں کی عبادت کی ضرورت نہیں۔ اگر اللہ کو عبادت ہی کروانا ہوتا تو ہزاروں فرشتے اس کی بندگی کے لئے موجود ہیں۔ جو رات دن اس کی عبادت کیا کرتے ہیں۔ خدا انسانوں سے نہ کچھ چاہتا ہے نہ محنت نہ بدلہ جو لوگ صرف سادگی سے خدا کی عبادت کرتے ہیں اور اس کی رحمت کے طالب ہوتے ہیں اللہ انھیں بھی اسی طرح نوازتا ہے۔ جیسے وہ ان لوگوں کو جو رات دن اس کی عبادت میں ڈوبے رہتے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ سچی لگن اور خاموشی سے عبادت کرنے والوں سے خدا بھی راضی ہوتا ہے خوش ہوتا ہے مگر مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہم انسان بڑے ظالم ہیں ایک انسان بڑی سچی لگن سے ادب کی خدمت کر رہا ہے بلکہ یہ کہا جائے کہ ادب کی خدمت میں پاگل ہے اس کی قدر کرنے والا کوئی نہیں۔ جو آدمی پی۔ ایچ۔ ڈی وغیرہ بنا رہا ہے اس کو کوئی نہیں پوچھ رہا ہے وہ پاگل، دیوانہ ادب کا شیدائی ہے محمد خالد عابدی۔ جس کی قسمت میں صرف ادیبوں، شاعروں کی بھلائی اور ادب کی آبیاری کرنے کے لئے ادھر سے اُدھر دوڑنا لکھا ہے۔ کسی نے کہا خالد صاحب فلاں صاحب کے پاس فلاں کتاب ہے وہ ردّی والے کو دینے والے ہیں۔ خالد عابدی دوڑ پڑے کہ بھائی صاحب مجھ سے پیسے لے لیجئے وہ کتاب مجھے دے دیجئے۔ بھلا ایک ایسا دیوانہ کوئی مجھے بتا دے جو اپنی محنت کی کمائی کا ایک بڑا حصّہ صرف کتابوں کی خرید میں لگاتا ہو اور یہ کتابیں کس کے لئے ہیں ہم بھوپالیوں کے لئے خریدی گئی ہیں بڑا افسوس ہوتا ہے اور میں دعوٰی سے کہتا ہوں کہ بھوپال میں کسی صاحب نے کوئی مقالہ لکھا ہو یا کوئی صاحب پی ایچ ڈی کر رہے ہوں یا پھر کوئی کتاب لکھ رہے ہوں خالد عابدی کی لائبریری سے یا خالد عابدی کی بے انتہا قابلیت سے استفادہ نہ کیا ہو۔ مگر

شرم کی بات یہ ہے کہ جب لوگ اپنی کتاب چھپواتے ہیں یا ان کو کسی ٹی وی ریڈیو، سیمینار وغیرہ کے لئے کسی پرانے Refrence کی ضرورت پڑتی ہے تو خالد عابدی کے پاس دوڑتے ہیں اور ان سے فائدہ اُٹھا کر ایسے غائب ہوتے ہیں کہ بس۔ اور انھیں اتنی تک شرم نہیں آتی کہ کم سے کم یہ لکھ دیں کہ بھائی ہم کو اس مضمون کے لئے یا اس کتاب کے لئے خالد عابدی صاحب یا مکتبہ عابدیہ سے مدد ملی ہے۔ اس سے قطع نظر خود خالد عابدی نے نہ جانے کتنے مضامین اور کتابیں تخلیق کی ہیں فلمی ادب میں بھی خالد عابدی کا ایک مقام ہے اگر کسی چیز نے خالد عابدی کو اُبھرنے نہیں دیا تو وہ ان کی سادہ لوحی ہے۔ ہر آدمی سے خلوص سے ملنا، ہر آدمی کے کام آنا اور ہر طرح کی مدد کرنا۔ مجھے کہنا نہیں چاہئے لیکن ایسے قیمتی لوگوں کے لئے لوگ ''ایک لفظ'' استعمال کرتے ہیں۔ کسی نے کہا یار میں ایک مضمون لکھ رہا ہوں مجھے حوالے نہیں مل رہے ہیں تو دوسرے نے کہا ارے یار وہ ہے نہ ایک بے وقوف، ادب کا دیوانہ، خالد عابدی میں اپنی بات اشرف ندیم کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں۔

ملنا تو الگ نامہ و پیغام نہیں ہے
شاید انھیں اب ہم سے کوئی کام نہیں ہے

● آنسہ عائشہ عالم
رامپور (یو۔ پی)

ماہ نامہ ''سب رس'' میں میری گذارش کے تحت جواب دینے کا بہت بہت شکریہ۔ جب کہ آپ نے لکھا ہے کہ ترپشی کمار شاؔد نے پاکٹ بک میں واجدہ تبسم کا انٹرویو شائع کیا تھا جو آپ کے ذخیرہ کتب مکتبہ عابدیہ بھوپال میں موجود ہے۔ براہ کرم اس انٹرویو اور اس کتاب میں واجدہ سے متعلق جو بھی معلومات ہوں اُس کی زیراکس بھجوادیں۔ براہ مہربانی اس کام میں جو کچھ خرچ ہو مجھے ضرور لکھیے گا۔

مکتوب: ۸ جون ۱۹۹۹ء

خالد عابدی: ایک ہوش مند دیوانہ

کوثر صدیقی

زندگی کا کوئی بھی میدان ہو، دیوانگی آدمی کو ہوشیاری عطا کرتی ہے۔ یہ ہوشیاری اس جذبے کا نام ہوتا ہے، جو سود و زیاں کے جذبے سے بے نیاز کر کے وہ دانشمندی عطا کرتی ہے جو اسے انفرادیت اور امتیاز بخشتی ہے۔

ایسے ہی ایک دانشمند اور باہوش دیوانے کا نام ہے خالد عابدی مادی وسائل کے حصول کی دوڑ میں شامل ہو کر زندگی کو خوب سے خوب تر بنانے کی دوڑ میں ہر شخص سرگرداں رہتا ہے۔ مگر مبارک باد اور حوصلہ افزائی کا مستحق وہ شخص ہے جو محنت سے حاصل کیے گئے اکل حلال کو اپنی اور افرادِ خانہ کی ضروریات کو اردو اور اس کے حفظ و بقا کی راہ میں قربان کر دے۔ منقولہ غیر منقولہ زمین جائداد بنانے کے بجائے بھوپال کے قصرِ ادب کو مستحکم کرنے کے لئے وقف کر دے۔

حیدر آباد دکن میں بھی ایک ایسے ہی اردو کے مجاہد حمید الدین غازی تھے جن کا ۲۰۰۳ء میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم کو اردو کے رسائل اور کتابیں خریدنے اور رسائل کی سرپرستی کا دیوانگی کی حد تک شوق تھا ملک کا کوئی ایسا رسالہ نہیں تھا جس کے وہ خریدار نہ ہوں۔ ایک بار خریدار بننے کے بعد بروقت اس کی تجدید کی فکر بھی رکھتے تھے۔ اتنا ہی نہیں وہ اپنے حلقۂ احباب میں بھی سب کو رسائل خریدنے اور پڑھنے کے لئے مجبور کرتے رہتے تھے۔ ان کا یہ شوق رسائل اور کتب کی خرید و مطالعہ تک ہی محدود تھا مگر خالد عابدی میں مزید وصف یہ ہے کہ آپ رسائل / کتب صرفِ خاص سے خرید کر پڑھتے بھی ہیں اور ان کی باقاعدہ جلدیں تیار کر کے لائبریری کی طرز پر سلیقہ مندی سے محفوظ بھی رکھتے ہیں خود تو پڑھتے ہی ہیں اپنے ذاتی کتب خانے سے کتابیں لے کر دوسروں کو بھی مطالعہ اور استفادہ کی ترغیب دیتے رہتے ہیں۔ سیکڑوں طلبا، اساتذہ اور اہلِ ذوق حضرات نے آپ کے کتب خانے سے استفادہ کیا ہے اور کر رہے ہیں۔ درجنوں طلبا نے پی ایچ ڈی کے مقالے کے لیے آپ کی کتابوں اور صلاح و مشورہ کے مطابق کام کر کے ڈاکٹریٹ کیا ہے۔ آپ کے پاس ایسی کتابیں بھی ہیں جو بھوپال میں شاید اب اور کہیں دستیاب نہ ہوں۔ کچھ اہم کتابیں جن کے بعد میں ملنے کی امید نہ ہو یا غائب ہو جانے کا اندیشہ ہو، ان کی دو دو جلدیں بھی خرید کے محفوظ کر لیتے ہیں۔

فی الوقت (یعنی ۲۰۰۶ء) آپ کی لائبریری میں قریب چھ ہزار کتابیں بہ لحاظ اصناف و مضامین موجود ہیں، جن کی مالیت ایک موٹے اندازے کے مطابق آٹھ دس لاکھ روپے کی ہوگی'' کتابیں ہی ہیں مالیات فقیر'' کئی اہم کتابیں بھوپال کے کئی اہم اشخاص نے پڑھنے کے لئے لیں لیکن واپس نہیں کی۔ جو شخص اپنا پیٹ کاٹ کر کتابیں جمع کرتا ہو اس کی کتابوں کا قبضہ بالجبر یا سرقہ بالجبر ہونے پر اس کے دل پر کیا گذرتی ہوگی اسکا اندازہ لگا پانا مشکل ہے۔

خالد عابدی کا دوسرا وصف ان کا کاغذ قلم سے تخلیقی رشتہ ہے جو ابتداء سے آج تک قائم و استوار ہے۔ خالد عابدی کا مزاج عام قلمکاروں سے ہٹ کر کچھ ایسا کام کر گذرنے کا ہے جو انھیں دوسروں سے امتیاز بخشے علیحدہ شناخت عطا کرے۔ آپ نے اپنا تخلیقی سفر شعر و شاعری کی عام روش سے اختیار کیا تھا جسے اپنے مزاج اور جولانئ طبع کے مطابق نہ پا کر جلد ہی ترک کر دیا اور دوسرے ایسے میدانوں میں اپنی جولانئ طبع دکھانے کے لئے منتخب کیا جہاں کچھ نیا کر کے دکھایا جا سکے۔ ادب میں کچھ اضافہ کیا جا سکے۔

آپ کا دائرہ عمل وسیع ہے۔ مشاہیر سے خط و کتابت کرنا ان کے احوال و کوائف قلم بند کر کے محفوظ کرنا بھی آپ کا ایک شوق ہے۔ مراسلاتی انٹرویوز (مصاحبات) بھی آپ کا خاص ذوق ہے۔ آپ نے برصغیر کے شعراء ادبا اور دانشوروں کے مراسلاتی انٹرویوز حاصل کر کے کتابی شکل میں مرتب کئے ہیں جن کی دو کتابیں اردو انٹرویوز (۱۹۹۴) اور اردو مراسلاتی انٹرویوز (۱۹۹۶) میں شائع ہو کر ادب میں اپنا مقام بنا چکی ہیں۔ انٹرویوز پر ہی مزید دو کتابیں ''روبرو'' (بھوپال کے ادباء اور شعراء سے انٹرویوز) اور ''گفتگو'' (ریڈیو سے نشر ہو کر ضخیم کتاب مرتب کی منتظر ہیں ان سب سے ہٹ کر آپ ایک اچھے نثر نگار بھی ہیں۔ معیاری تحقیقی اور ادبی مضامین تحریر کئے ہیں اور کرتے رہتے ہیں جو کتابی شکل میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔ لیکن آپ کا خاص میدان ڈرامہ نگاری ہے۔ آکاش وانی سے ملازماتی وابستگی کی وجہ سے آپ کے ڈرامے عموماً ایسے ہوتے ہیں جنھیں ریڈیو پر آسانی سے پیش کیا جا سکے۔ یا جو ریڈیائی ضرورت کے پیش نظر ہی لکھے گئے ہیں۔ یہ ڈرامے محض سامعین کی تفریح کے لئے نہیں ہوتے بلکہ ان میں کوئی نہ کوئی اخلاقی اور سماجی پہلو بھی ہوتا ہے۔ آواز نما کے عنوان سے آپ کے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ۱۹۷۵ء میں ہی شائع ہو کر مقبول عام ہو چکا ہے۔ ''بیسوی صدی میں اردو کا مکتوباتی ادب'' کے موضوع پر آپ نے عبدالقوی دسنوی کی رہنمائی میں ڈاکٹریٹ کے لئے تحقیقی مقالہ مکمل کر لیا تھا لیکن قبل اس کے کہ صاف اور منضبط ہو کر یونیورسٹی میں پیش کیا جاتا، بیتول کی پوسٹنگ کے زمانے میں سیلاب کا پانی گھر میں داخل ہو گیا اور مقالہ تلف

ہو گیا مقالے کے ساتھ موجود قیمتی کتابیں رسائل اور اہم کاغذات بھی غرق سیلاب ہو گئے۔ اس حادثے نے خالد عابدی کے دل و دماغ کو بہت متاثر کیا۔ دل شکستہ ہو کر دوبارہ لکھنے کی ہمت نہ کر سکے اور ڈاکٹریٹ کا خواب تشنہ تعبیر ہی رہ گیا۔

ابھی تک (فروری ۲۰۰۶ء) آپ کی مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہو کر اہلِ نظر حضرات سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں:۔

(۱) ''آواز نما'' (۱۹۷۵ء) آپ کے تحریر کردہ آٹھ ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ اسٹیج کے ڈراموں اور ریڈیو کے درمیان تکنیک کا فرق ہے۔ اسٹیج ڈرامہ ناظرین کو سامنے رکھ کر لکھا جاتا ہے جب کہ ریڈیائی ڈرامہ سامعین کو مدنظر رکھ کے۔ اسی تکنیکی بنیاد پر ریڈیائی ڈرامہ کا اردو ادب میں ایک الگ مقام متعین کرنے کی غرض سے ہی خالد عابدی نے یہ مجموعہ شائع کیا ہے جو یقیناً اردو ڈرامائی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ اس کتاب پر اتر پردیش اردو اکادمی نے آپ کو انعام سے بھی نوازا ہے۔

(۲) ''باغِ فکر معروف بہ مقطعاتِ نساخ'' (۱۹۷۷ء) عبدالغفور نساخ کے مقطعات پر مشتمل ایک کتابچہ جو نایاب ہو چکا تھا، اسے ایڈٹ کر کے شائع کیا۔ اس کتابچہ کو دوبارہ زندگی دینے کا کارنامہ خالد عابدی نے انجام دیا۔

(۳) ''پیکرِ آواز'' (۱۹۸۳ء) آواز نما کی اشاعت کے بعد ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۲ء کے عہد میں جو ریڈیائی ڈرامے آپ نے تحریر کیے وہی ''پیکرِ آواز'' میں شامل ہیں۔ آواز نما میں ابتدائی ڈرامے تھے وہ اگرچہ بلند معیار کے تھے لیکن بعد میں تحریر کردہ ڈراموں کا انداز تحریر اور پیش کش کا طریقہ زیادہ نکھر جانے سے ''پیکرِ آواز'' کو زیادہ مقبولیت اور پذیرائی حاصل ہوئی۔

(۴) ''زخموں کے دریچے'' (۱۹۸۸ء) اس مجموعے میں ابتدا سے ۱۹۸۶ء تک کی مدت میں تحریر کردہ افسانے ہیں ان میں رومانی موضوعات کے ساتھ سماجی حالات کی عکاسی کرنے والے افسانے بھی ہیں۔ آپ کے افسانوں کی ملک کی مقتدر شخصیتوں نے ناقدانہ نظر سے دیکھنے کے بعد تعریف کی ہے۔

(۵) ''شکایتاً عرض ہے'' (۱۹۹۱ء) یہ طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے سنجیدہ ادب کے مقابلے میں طنز و مزاح پر مبنی ادب تخلیق کرنا ہر اہلِ قلم کے بس کا روگ نہیں ہے۔ خالد عابدی اس دشوار گذار راہ میں بھی کامیاب نظر آتے ہیں۔ آپ کا طنز و مزاح مقصدیت لیے ہوتا ہے لیکن پند خشک نہیں ہوتا۔ اسے قاری پڑھتے وقت ہنستا بھی اور تحریر میں پوشیدہ مقصدیت کی تہہ تک پہنچنے کی

کوشش بھی کرتا ہے۔

(۶) ''اردو انٹرویوز'' (۱۹۹۲ء) اس مجموعے میں ملک کے پانچ نامور ادیبوں اور شاعروں کے مراسلاتی انٹرویوز شامل ہیں۔ بالمشافہ اور مراسلاتی انٹرویوز میں تھوڑا فرق ہوتا ہے لیکن ان مراسلاتی انٹرویوز میں خالد عابدی نے سوالات اس ترتیب سے کیئے ہیں کہ سب انٹرویوز بالمشافہ معلوم ہوتے ہیں اور یہی ان کی خوبی ہے۔

(۷) ''ٹیچر کے بغیر'' (۱۹۹۶) خالد عابدی بنیادی طور پر ڈرامہ نگار ہیں اس لئے انھوں نے بچوں کی ذہنی ساخت وتربیت کے لئے بھی ڈرامہ کا انتخاب کیا اس مجموعے میں بچوں کے لئے چھ ڈرامے ہیں

(۸) ''مضامین خالد'' (۱۹۹۵) یہ خالد عابدی کے تحقیقی وتنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔ ان میں بیشتر مضامین ان شاعروں اور ادیبوں پر لکھے ہیں جن کے حالات زندگی اور ادبی کارنامے اِستداوِ زمانہ کی وجہ سے پردۂ خفا میں چلے گئے تھے۔ ان کی بازیافت کرکے آپ نے ایک اہم کام انجام دیا ہے۔

(۹) ''اردو مراسلاتی انٹرویوز'' (۱۹۹۶) اس کتاب میں پچیس نامور شعراء ادباء اور فلمی ہستیوں کے مراسلاتی انٹرویوز شامل ہیں۔ جن میں اختر الایمان، علامہ جمیل مظہری، جوگیندر پال، خمار بارہ بنکوی، رام لال، شہریار سردار جعفری، عنوان چشتی، گیان چند، وامق جونپوری وغیرہ کے ایسے انٹرویو شامل ہیں جن کی مدد سے قاری کو ان شخصیات کے حالات وکوائف جاننے کے ساتھ ان کے فن کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

مذکورہ بالا مطبوعہ کتابوں کے علاوہ دس کتابوں کے مسودے اشاعت کے لئے تیار ہیں جن میں ''نقطۂ نوگریز'' منی افسانوں کا مجموعہ زیر طبع ہے۔

خالد عابدی میں خدا نے کئی خوبیاں جمع کردی ہیں۔ اگر چہ ان کا ادبی سفر شاعری سے شروع ہوا تھا لیکن انھوں نے جلد ہی تحقیق، تنقید، ڈرامہ نگاری، افسانہ نگاری، طنز ومزاح کا دشوار راستہ اختیار کرلیا اور ہر منزل کی طرف ان کے قدم استحکام سے آگے بڑھتے رہے ہیں کسی بھی راہ میں وہ تھکے ہوئے نظر نہیں آتے۔ تخلیق ادب کے ساتھ آپ نے اپنی ذاتی لائبریری مکتبۂ عابدیہ تیار کی ہے جس میں ہزاروں اہم دستاویزی کتابیں ہیں۔ محدود وسائل والے سرکاری ملازم پیشہ شخص کے لئے اتنی بڑی لائبریری قائم کرنا گھر پھونک کے تماشہ دیکھنے کے مترادف ہے۔ یہ ذاتی لائبریری ہے لیکن عوامی دل چسپی کی چیز ہے اس لئے اس کو منظم لائبریری کی شکل دینے کے لئے عمارت اور فرنیچر کی سخت

ضرورت ہے۔اس کے لئے حکومت اور عوام دونوں کا تعاون ضروری ہے۔

خالد عابدی کی ادبی خدمات کا اعتراف مقامی اہل قلم کے علاوہ ملک کے زیادہ تر دانشوروں اور عظیم شخصیات نے کیا ہے۔ مقامی حضرات میں ابراہیم یوسف، ڈاکٹر سید حامد حسین، عبدالقوی دسنوی، اختر سعید خاں، ڈاکٹر بشیر بدر، تخلص بھوپالی، عشرت قادری، ڈاکٹر محمد نعمان، سید حیدر عباس رضوی، نجیب رامش، ڈاکٹر اخلاق اثر، وغیرہ کچھ خاص نام ہیں۔

بیرون بھوپال کے لوگوں میں پروفیسر عنوان چشتی، ڈاکٹر قمر رئیس، علامہ جمیل مظہری، رفعت سروش نورالحسن ہاشمی، کوثر چاند پوری، جوگیندر پال، رام لعل، یوسف ناظم، سلام سندیلوی، مجاہد حسین حسینی، رام پرکاش راہی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ خالد عابدی کا رخشِ خامہ ابھی رفتار میں ہے اس لیے امید کی جاتی ہے کہ ادب میں ان کی جانب سے قابلِ قدر اضافہ ہوتا رہے گا ان کی کتابوں کا ذخیرہ شعلۂ نور بن کر آنے والی نسلوں کی رہنمائی کرتا رہے گا۔

● پروفیسر آفاق احمد

"۔۔۔۔آپ میں ادب وتحقیق کا جو سچا مذاق ہے اور جو لگن ہے، اس کی اکثر، اپنی طالبات کے سامنے مثال دیتا ہوں۔ خدا کرے یہ کاروبار شوق یوں ہی جاری رہے"۔

مکتوب ۲ر اپریل ۱۹۸۵ء

اردو کا بے لوث خدمت گار: خالد عابدی

محمد انیس انصاری انیسؔ

بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں جو اپنی نیک بختی، نیک سیرت، سادگی صاف گوئی اور ایثار کے میدان میں ایسی چھاپ چھوڑتی ہیں۔ جو قابل تعریف اور قابل مثال ہوتی ہیں۔ ایسی ہی ایک شخصیت کا نام ہے محمد خالد عابدی۔ جن کی فطرت میں ایثار کا جذبہ ہمیشہ موجزن رہتا ہے۔ خدا نے ان کی طبیعت میں ایثار و ہمدردی کا وہ جذبہ دیا ہے کہ جس کی مثال عصر حاضر میں ملنا مشکل ہے۔ ابتداء میں آپ نے شاعری کی مقبول صنف غزل کے گیسو سنوارنے میں چار سال صرف کیے۔ اس درمیان چند نظمیں بھی لکھیں۔ بعد میں اردو نثر نگاری پر توجہ دی اور شاعری تقریباً چھوڑ ہی دی۔ نثر نگاری میں ڈرامہ، افسانہ، شخصی مضامین، طنز و مزاح اور تبصرہ نگاری انٹرویو نگاری پر اپنے قلم کے وہ جوہر دکھائے کہ ملک کے اکثر معیاری رسائل میں آپ کی تخلیقات شائع ہونے لگیں۔

خالد عابدی نے مضامین لکھنے کا آغاز ۱۹۶۰ء سے کیا۔ ابتدائی دور میں وہ چھوٹے چھوٹے مضامین لکھتے رہے۔ ۱۹۶۷ء سے باقاعدہ شعر و ادب، ثقافت اور فلم پر مضامین لکھ رہے ہیں ان کے مضامین کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا ہر مضمون تحقیقی نقطۂ نظر سے بہت جامع اور مفید ہوتا ہے مطالعہ وسیع ہونے کی بناء پر اردو ادب میں ان کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔

خالد عابدی کو کتابیں اور رسائل پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ ان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ کتابیں اور رسائل خرید کر پڑھتے ہیں اور یہ خریداری کا عمل ان کی فطرت میں شامل ہے۔ خدا نے حافظہ بھی موصوف کا بہت قوی بنایا ہے۔ ان کی ذاتی لائبریری میں اردو، ہندی، عربی، فارسی اور انگریزی کی کتابیں اور رسائل کی تعداد بھی تقریباً چھ ہزار پر مشتمل ہوگی۔ کوئی کتاب یا رسالہ بازار میں دستیاب ہو اور خالد عابدی کو ذرا سی بھنک لگی کہ وہ دفتر سے نکلنے کے بعد فوراً بازار جائیں گے اور اپنی ممکنہ چیز خریدیں گے (متعدد پرچوں کے خریدار ہیں۔) اس کے بعد گھر کا رخ کریں گے۔ ملک ہی کیا اکثر پاکستان کے رسائل اور کتب بھی ان کی لائبریری میں خاصی تعداد میں ہیں۔ کتب یا رسائل کی قیمت سے انھیں کبھی کوئی سروکار نہیں رہا۔ بس چیز چاہیے۔ خواہ کسی بھی قیمت پر ہو۔ یادداشت کے معاملے میں اکثر شعر و ادب کے لوگ کتب یا رسائل تلاش کرنے سے پہلے خالد

عابدی سے رابطہ قائم کر کے ان سے کم وقت میں بہت سی معلومات حاصل کر لیتے ہیں اور بے جا تلاش کے عمل سے اپنے آپ کو بچا لیتے ہیں۔ میرے خیال میں خالد عابدی صرف ایک فرد نہیں بلکہ اپنے آپ میں ایک چلتی پھرتی لائبریری یا انجمن کا نام ہے۔ اکثر شہر کے شعراء واد باء، خالد عابدی کی ذہانت اور حافظے سے فیض اٹھاتے رہتے ہیں۔ یہاں میں ان کی یادداشت کی ایک مثال آپ کو بتانا چاہوں گا۔ میں ۱۹۷۷ء میں مدھیہ پردیش اردو اکادمی میں ملازم ہوا اور بھوپال میں ۱۹۹۲ء میں ٹیلی ویژن اسٹیشن قائم ہوا ۱۹۹۳ء میں بھوپال ٹیلی ویژن کے اردو پروگرام ''انجمن'' میں مجھے نظامت کرنے کا موقع ملا۔ تب سے تا حال کئی اردو پروگرام کے اسکرپٹ لکھے اور نظامت بھی کر رہا ہوں۔ خالد صاحب جب بھی مجھ سے ملتے ہیں سب سے پہلا جملہ ان کا یہ ہوتا ہے'' کیوں خاں آج کل کیا کر رہے ہو'' میں آج سے تقریباً سات سال پہلے اردو کے مشہور شاعر فراقؔ گورکھپوری پر ایک ٹی وی پروگرام کی تیاری کر رہا تھا۔ اتفاق سے اتوار کا دن تھا۔ خالد عابدی صاحب میرے غریب خانے پر تشریف لائے سلام ودعا کے بعد حسب عادت پوچھا'' کیوں خاں آج کل کیا کر رہے ہو'' میں نے فوراً جواب دیا۔ آج کل فراقؔ صاحب پر ایک ٹی وی پروگرام کی تیاری کر رہا ہوں جو عنقریب شوٹ ہونے والا ہے۔ فوراً ہی خالد صاحب نے کہا 'نیا دور'' کا خصوصی فراق نمبر۔۔۔ کے والیوم دو کے صفحہ نمبر۔۔۔ پر میرا بھی ایک مضمون ہے وہ پڑھ لو بہت کام آئے گا۔ میں نے فوراً اپنے بستر پر لگا گاؤ تکیہ الگ کیا اور وہ رسالہ نکالا تو اس کے صفحہ نمبر پر خالد صاحب کا مضمون جو ۱۳ سال قبل شائع ہوا تھا وہ اس میں موجود تھا۔ جو شخص یادداشت کا اتنا دھنی ہو تو اس سے ادب پر بات کرنا بہت مشکل ہے۔

آج اردو کے اس ممتاز ڈرامہ نگار، افسانہ نگار، ناقد اور محقق کے علاوہ کئی اصناف ادب پر اپنے گہرے نقوش ثبت کرنے والی شخصیت محمد خالد عابدی نے ملک کے معتبر رسائل کے ذریعے مکتبہ عابدیہ کے قیام اور بھوپال ریڈیو میں اردو پروگرام آفیسر کی حیثیت سے ادبی حلقوں میں اپنی خاصی پہچان بنالی ہے۔ خالد عابدی کے تحقیقی مضامین کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے کئی تاریخی شعراء اور ادباء پر اپنے مضامین قلم بند کیے ہیں۔ مثلاً مضامین خالد میں ''اجین کے ہندو شعراء'' منشی ہیرالال وکیل، منشی پربھو دیال اشہر اجینی، پنڈت چاندنرائن رازداں موتس پنڈت چھچو سنگھ صادق، گوری پرشاد چھلو، بال کشور جھنا گر کشور اجینی، شرون کمار بہار اجینی، رام لال شجاعؔ اور کرشن گوپال خاور کی شاعری پر اپنا بہترین تحقیقی مضمون قلم بند کیا ہے۔ کسی شہر کے مستند شعراء پر تحقیقی کام کرنا اور ان کے سلسلے میں معلومات حاصل کرنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ لیکن خالد عابدی کے لئے ایسے کام کرنا

اور مواد اکٹھا کرنا ان کی تحقیق و تجسس کی دلیل ہے۔

''مضامین خالد'' میں ایک اور مضمون ہے ''فراق کی تحریروں میں شعرائے مدھیہ پردیش'' اس مضمون میں فراق صاحب راجکماری سورج کلا سرور، شہاب اشرف، جاں نثار اختر اور پنالال شریواستو نور، جلیپوری کے شعری سفر کے سلسلے میں ان کی شاعرانہ عظمت کو قبول کرتے ہوئے ان کی انفرادیت پر اپنے دیرینہ جذبات کا اظہار کرتے ہوئے بہت خوبصورت تحریر رقم کی ہے۔ فراق صاحب کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ وہ اچھے اچھے خاں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

خالد عابدی کی تحقیقی نقطۂ نگاہ ہر مقام پر دوسروں سے ذرا ہٹ کر ہے۔ مثلاً انھوں نے ''اردو مراسلاتی انٹرویو'' کے ذریعے ادب میں ایک نئے تحقیقی کام کا آغاز کیا۔

انھوں نے ملک کے کئی نامور دانشوروں، ادیبوں، شاعروں اور فلم سے تعلق رکھنے والی کئی معزز ہستیوں کے انٹرویو حاصل کر کے انھیں کتابی شکل میں شائع کیا۔ اس ذریعے سے ادب کے لوگوں کو اور خاص کر نئے قلم کاروں کو بہت سی معلومات ایک جگہ سے حاصل ہو جاتی ہیں۔ میرے خیال سے اس طرح کا کارنامہ انجام دینے والے وہ واحد شخص ہیں جن کا اس نوعیت کا تحقیقی کام ہے۔

خالد عابدی نے ابتداء میں مدھیہ پردیش بجلی بورڈ میں ملازمت کی وہ اب آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہیں ریڈیو کو ان کی ذات سے بہت سے فائدے ہوئے انھوں نے کئی مضامین ڈرامے، فیچر اور فلم پر نئے نئے پروگرام لکھے اور پیش کئے۔

بھوپال کے بزرگ اور کہنہ مشق شاعر جناب عشرت قادری نے خالد عابدی کے قلم کے اس شوق اور دلچسپی کے بارے میں لکھا ہے ''ہندوستانی فلموں اور فلم سے متعلق ہر ہر گوشے پر تبصرے اور مضامین لکھتے چلے آرہے ہیں۔ فلمی دنیا کے بارے میں ان کی معلومات اور دلچسپی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ انھیں ''فلم انسائیکلوپیڈیا'' تسلیم کر لیا گیا ہے'' فلموں پر انھوں نے بہت لکھا ہے مستقبل میں فلم پر ان کی کتاب بھی شائع ہوگی۔

خالد عابدی کی ابھی تک نو کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہو کر ملک گیر پیمانے پر ادبی حلقوں سے خاصی داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ یہ ساری کی ساری کتابیں نثری تخلیقات پر مبنی ہیں اور ادب کی مختلف اصناف سے ان کا تعلق ہے۔ مثلاً پہلی کتاب ''آواز نما'' ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ دوسری کتاب ''پیکر آواز'' یہ ریڈیائی ڈراموں اور اسٹیج ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ تیسری کتاب ''زخموں کے دریچے'' افسانوں کا مجموعہ ہے۔ چوتھی کتاب ''شکایتاً عرض ہے'' طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ پانچویں اور نویں کتاب ''اردو انٹرویوز'' ''اردو مراسلاتی انٹرویوز'' پر منحصر ہیں۔ چھٹی کتاب بھی

بچوں کے ڈراموں پر مشتمل مجموعہ ہے۔ جس کا نام ''ٹیچر کے بغیر'' ہے ساتویں کتاب جو تحقیقی مضامین پر مشتمل مجموعہ ہے ''مضامین خالد'' کے نام سے ہے۔ اس میں بارہ مضامین ہیں۔ جو تحقیقی نقطۂ نظر سے بہت اہم اور خصوصیت کے حامل ہیں۔ ان مضامین کو فکر کی جو وسعتِ نظر عطا کی گئی اس میں خالد عابدی خاصے کامیاب نظر آتے ہیں۔ ''باغ فکر معروف بہ مقطعات نساخ'' بھی ان کی ایک اہم ترتیب وتدوین ہے۔

خالد عابدی کے ڈراموں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ پلاٹ کا انتخاب کرنے میں اپنی بھرپور صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہیں اور ڈرامے میں کردار ایسے چنتے ہیں جیسے ایک ہنرمند جوہری نگینے جڑتا ہے۔

ان کی ڈرامہ نویسی کی دوسری خوبی یہ ہے کہ ان کے یہاں مکالمہ پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے اور اس فن میں خالد عابدی کی کمال چابکدستی کی داد نہ دینا بے انصافی ہوگی۔ میں یہاں ان کے دو ڈراموں کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہوں گا ''انار کلی کا مقدمہ'' اور ''غالب فلم انڈسٹری میں'' یہ دونوں ڈراموں کو جدیدیت کا جو رنگ دیا ہے اس میں وہ خاصے کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان ڈراموں کے پلاٹ کردار، منظر نامہ اور ڈائیلاگ بہت اچھے اور بہت سلیقے سے لکھے ہیں ڈرامہ پڑھتے وقت ایک ایک منظر سامنے ''ہوتا ہوا'' محسوس ہوتا ہے۔

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے محمد خالد عابدی صاحب جیسی ادب کی باکمال شخصیت کی رہبری اور رہنمائی اور سرپرستی حاصل ہے۔ مجھے ''آئی وٹنیس ویڈیو میگزین'' کے لئے پہلی بار ۲۴ر اکتوبر ۱۹۹۶ء کو ان سے انٹرویو کرنے کا موقع ملا۔ اس انٹرویو میں ادب کے تعلق سے مختلف قسم کے سوالات تھے جن کا خالد صاحب نے بہت صلاحیت اور ذہانت کے ساتھ فکر کی گہرائی کے ساتھ کئی اصناف سخن پر اپنے دیرینہ مفید اور جامع خیالات کا اظہار فرمایا۔ اس انٹرویو کے دوران یہ بات بھی میرے علم میں آئی کہ آپ کو مدھیہ پردیش میں اردو زبان وادب بیسویں صدی میں اردو کا مکتوباتی ادب اور ہندوستانی فلموں کی تاریخ موضوعات پر زبردست علم ہے۔

خالد عابدی کو اردو زبان وادب کی بے لوث خدمات کے اعتراف میں جو اعزاز و اکرام سرکاری یا نیم سرکاری اداروں کی طرف سے دیئے گئے ان کی تفصیل بھی خاصی طویل ہے۔ چند قابل ذکر اس طرح ہیں۔۔۔۔۔

(۱) پہلی کتاب ''آواز تما'' پر اتر دیش اردو اکادمی نے انعام سے نوازا۔

(۲) مدھیہ پردیش فلم جرنلسٹ نے ''فلم سوربھ'' انعام سے نوازا۔

(۳) قلم کاران (اندور) کی جانب سے استقبال اور سپاس نامہ۔

(۴) ''کہکشانِ ادب'' اور گلدستہ تنظیم بھوپال نے حال ہی میں ان کا استقبال کیا تھا اور سپاس نامہ بھی پیش کیا۔ اس کے علاوہ خالد عابدی کا ایک طویل انٹرویو بی بی سے لندن کی اردو سروس سے تین قسطوں میں نشر کیا جا چکا ہے۔

محمد خالد عابدی اردو کے ایک بے لوث اور مخلص ادیب ہیں۔ جنھوں نے بے حد لگن اور محنت سے اردو زبان وادب کی حنابندی کی سعی کی ہے۔ ان کا ادبی سفر کم وبیش چار دہائیوں پر مشتمل ہے۔ اس طرح وہ ایک عرصے سے اردو زبان وادب کی نہایت مستعدی کے ساتھ خدمات انجام دے رہے ہیں۔

مجھے امید ہے اس خصوصی اشاعت کے ذریعے خالد عابدی کے ذہنی رویہ کو سمجھنے میں علم وادب کے باذوق حضرات کو کافی تقویت حاصل ہوگی۔

منظومات

خالد عابدی کے نام

رفعت سروش

وہ نوجوان جسے مُفلسی نے درس دیا
وہ نوجوان جسے درد نے سلیقہ دیا
وہ نوجوان جو ناکامیوں سے لڑتا ہے
کہ ایک دن تو مُرادوں کے پھول جھکیں گے
وہ نوجوان جو خونِ جگر سے سینچتا ہے
ادب کے علم کے اور فکر و فن کے گلشن کو
جبیں پہ جسکی چمکتا ہے نور فردا کا
وہ نوجوان جو عزم و عمل کا پیکر ہے
وہ نوجوان مری شخصیت کا حصّہ ہے
میں اس میں دیکھتا ہوں روپ اپنے ماضی کا

بھوپال ۲ر نومبر ۱۹۹۳ء

نذرِ محمد خالد عابدی

(نظم بصنعتِ توشیح)

رہبر جونپوری

م ح م د خ ا ل د ع ا ب د ی

مزاج اعلیٰ نظر روشن دلِ دردِ آشنا پایا
ہمیشہ ہم نے خالد عابدی کو ہمنوا پایا

حقیقت کی ردا اوڑھے ہوئے پھرتے ہیں شانوں پر
زمیں والے ہیں یہ لیکن نظر ہے آسمانوں پر

منور ہے چراغِ علم و دانش ان کی محفل میں
بہت مخلص ہیں کام آتے ہیں یہ ہر اک کی مشکل میں

دیانت ان کا شیوہ ہے متانت ان کی فطرت ہے
قلم ہی ان کا زیور ہے قلم ہی ان کی زینت ہے

خیال و فکر کی جدت سے انکا ذہن تازہ ہے
بصیرت دل میں ہے چہرے پہ دانائی کا غازہ ہے

ادب پرور ہیں یہ، اردو سے ان کو خاص رغبت ہے
انھیں فلمی ادب، ڈرامہ نگاری سے محبت ہے

لب و لہجہ شمیمِ فکر سے ان کا معطر ہے
ہر اک تحریر ان کی ان کے اُسلوبوں کی مظہر ہے

دیارِ زندگی میں یہ نئے غنچے کھلاتے ہیں
ادب کی رہگذر میں بن کے سورج جگمگاتے ہیں

عطا کرتے ہیں لفظوں کو معانی کے نئے پیکر
یہ تحریروں کو دیتے ہیں ہمیشہ خوشنما تیور

ارادے ان کے مستحکم ہیں جذبے ان کے صادق ہیں
بڑے اردو کے حامی ہیں بڑے اردو کے عاشق ہیں

بصد اخلاص ہر فنکار کی تعظیم کرتے ہیں
جو اُس کے کارنامے ہیں انھیں تسلیم کرتے ہیں

دکھاتے ہیں ادب کے راہرو کو عزم کی مشعل
برستے ہیں سدا کشتِ ادب پر بن کے یہ بادل

یہ خالد عابدی رہبر زمانے سے نرالے ہیں
بڑا ہے مرتبہ ان کا بڑے تقدیر والے ہیں

دل کی آواز

رضاؔ رامپوری

دیکھنے میں یوں تو بس سادہ سا اک انسان ہے
عقل اور فہم و فراست میں مگر ذی شان ہے

پیشۂ علم و ادب کا شیر خالد عابدی
کر سکا کوئی نہ جس کو زیر خالد عابدی

صاحبِ اخلاق، عالی ظرف اور اعلیٰ صفات
جس کی ہر تحریر میں پنہاں رموزِ کائنات

کامیابی نے قدم چومے جہاں جا کر رہے
جل اُٹھے ہر سمت روشن کارناموں کے دیے

اس کی فطرت، اس کی طینت، اس کی خصلت لاجواب
ہے یہ تہذیب و تمدن کا چمکتا ماہتاب

تبصرہ تنقید، افسانہ کہ قلمی اقتباس
کر دیا اس نے ہر اک صنف ادب کو خوش لباس

بیش قیمت ہو کہ ارزاں ہو۔ خریدی ہے کتاب
اس نے تحفے میں نہیں لی آج تک کوئی کتاب

وہ رسائل اور کتابیں جو کہ اب کمیاب ہیں
گھر میں سب موجود اس کے آج جو نایاب ہیں

مدتوں سے خدمتِ اردو کا ہے اس کو جنون
رہ کے مصروفِ عمل دل اس کا پاتا ہے سکون

علم اور دانش کی اک مشعل ہے خالد عابدی
ہو کے تنہا خود ہی اک محفل ہے خالد عابدی

بایوڈاٹا سے ادیبوں کی مرتب اک کتاب
آئیگا اس کی طباعت سے ادب میں انقلاب

چاہیئے سرمایہ وافر جس کا ہے مشکل حصول
یہ کسی مجوری مدد کو کر نہیں سکتے قبول

بیشتر اردو ادارے متفق تو ہیں مگر
منفعت سے اور ضرورت سے بھی ہیں بے خبر

ربِّ اکبر کب کسی بندے کو کرتا ہے ملول
شرط ہے صبر و رضا سے کام لینا ہو اصول

خود مدد اس کی کریگا ایک دن ربِّ کریم
رائیگاں ہوگی نہ محنت کام ہے اتنا عظیم

اے رضاؔ دل کی مرے آواز یہ اشعار ہیں
یہ حقائق بھی تو لیکن قابلِ اظہار ہیں

ہے دعا کہ پائے عمرِ خضر خالد عابدی
ہو ادب کی محفلوں میں ذکر خالد عابدی

اس کی ہر خواہش کی کر تکمیل اے پروردگار
تیرے الطاف و کرم کا ہے رضاؔ امیدوار

گلدستۂ خلوص

(محترم جناب خالد عابدی کی نذر)

ارمانؔ اکبرآبادی

فطرتاً مخلص، متین و منکسر
خوش مزاج و خوشحال و ذی وقار
کیوں نہ ہوں مقبول خاص و عام میں
آپ رکھتے ہیں جُدا اپنا شِعار

☆

دلنشیں آپ کی ہے ہر تحریر
جگمگاتے ہیں فکر کے اَصباغ
بالیقیں محفلِ صحافت میں
آگہی کے جلا رہے ہیں چراغ

☆

بڑی منفرد شخصیت آپ کی ہے
محبِّ قلم اور کتابوں کے عاشق
ہیں وابستہ اس حیثیت سے ادب میں
صحافی، مبصر، مصنف، محقق

تابندہ ستارہ

(نذر بنام جناب خالد عابدی)

وفا صدیقی

سدا چلتا ہے تُو تصنیف اور تالیف لکھنے کو
قلم تو آج چل اس شخص کی توصیف لکھنے کو
اُخوت جسکا شیوہ ہے محبت جسکی عادت ہے
وراثت میں ملی اجداد سے جسکو شرافت ہے
خلوصِ بیکراں کے گفتگو سے پھول کھلتے ہیں
وہ جب احباب سے ملتا ہے یا احباب ملتے ہیں
جو فکرو آگہی شعرو ادب کا اک ادارہ ہے
جہانِ علم و دانش کا جو تابندہ ستارہ ہے
عمل کا جہدِ پیہم کا جو چلتا پھرتا پیکر ہے
عقابی روح ہے جو اس کے شریانوں کے اندر ہے
وفا بتلاؤ یہ سب خوبیاں کس آدمی میں ہیں
بحمد اللہ یہ سب اوصاف خالد عابدی میں ہیں۔

خالد عابدی صاحب کے اعزاز کے موقع پر

منظوم تہنیت

فاروق انجم

کس نے چھیڑے زیست کے نغمات میرے شہر میں
بن گئی رشکِ سحر ہر رات میرے شہر میں

ہر گلی ہر موڑ پر بکھری ہوئی ہے تازگی
چاند تاروں نے لٹا دی آج اپنی روشنی

جام و مینا رقص میں ہیں سرخوشی کا دور ہے
میکشانِ فکر و فن کی میکشی کا دور ہے

آج کی شب کا ہر اک لمحہ سحر انگیز ہے
ہر نظر مخمور ہے ہر لب ترنم ریز ہے

موجزن دل میں تمہارے کس کا جذبِ دید ہے
آخرش فاروق انجم کس کی یہ تمہید ہے

دوستوں کا دوست ہے غمخوار ہے خوددار ہے
شہرِ علم و فن کا جیتا جاگتا کردار ہے
مختلف اصناف میں کرتا ہے وہ مشقِ سخن
وہ سیاست ہو ادب ہو یا کہ فلمی انجمن

جب وہ لکھتا ہے قلم سے اک دکھی دل کی صدا
آخرِ شب جیسے زنداں میں سلاسل کی صدا

جس کا ہر اک حرف ہے دریا کی گہرائی لیے
جس کا اک اک لفظ ہے معنی وگیرائی لیے

جس کے سینے سے لگی رہتی ہے لیلائے ادب
جس کی سانسوں میں بسی رہتی ہے صہبائے ادب

دوستو اس خالدِ شیریں نوا کا جشن ہے
اہلِ دل، اہلِ نظر، اہلِ وفا کا جشن ہے

محفلِ زندہ دلاں میں سب کو جو محبوب ہے
آج کی شب اس مبارک نام سے منسوب ہے

عزیز دوست محمد خالد عابدی کی نذر

شاہد ساگری

وہ اعلیٰ ظرف وہ اعلیٰ نسب وہ اعلیٰ دماغ
چمک رہا ہے کفِ نکتہ چیں پہ مثلِ ایاغ
خدا گواہ، کہ اُردو تری بقا کے لیے
جلا رہا ہے لہو سے وہ فکر و فن کے چراغ

نذرِ خالد عابدی

ایاز قمر

بھولیگا کوئی کیسے بھلا آپ کا خُلوص
رکھینگے یاد سب ہی سدا آپ کا خُلوص
علم و ادب میں آپ صحافت میں بے نظیر
خالد ہے نام سب سے جُدا آپ کا خُلوص

☆☆☆

ناقد مُبصر اور ڈرامہ نگار بھی
دیکھی ہے ہم نے سب میں قلم کی بہار بھی
افسانہ میں، ڈرامہ میں، تنقید میں ایاز
پایا ہے ہم نے زورِ بیاں بھی نکھار بھی

☆☆☆

بامُروت، باہنر، باحوصلہ اور باصفات
کس قدر ہیں خوبیاں خالد میں دیکھو تو ایاز
شاعری میں نثر میں تنقید کی تحریر میں
رفتہ رفتہ منکشِف ہوتے گئے پوشیدہ راز

صنعتِ مشجر ● از قلم۔ صابر ادیب

مضامین

''آوازنما'' کا خالق اور اس کے ڈرامے

ڈاکٹر اخلاق اثر

''آوازنما'' کے مصنف خالد عابدی بھوپال کے ترقی پسند خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس خاندان کے افراد نے بھوپال میں درس وتدریس کے فروغ میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔

خالد عابدی بچپن سے ہی مطالعہ کے شوقین ہیں۔ نہ جانے کس وقت ۔ کس گھڑی ادب وفن کی مقدس آگ نے ان کو چھولیا اور وہ گھر کے سیر وشکار کے ماحول اور خاندانی منافع بخش کاروبار سے دور اپنی دنیا کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے ۔ وہ ایک ایسی ملازمت کو اپنانے کے لیے رضامند ہو گئے جو ان کو مادی آسائش تو نہیں پہنچا سکتی ہاں ادبی ذوق کی پرورش میں معاون ثابت ہو سکتی تھی ۔ مطالعہ کے ساتھ کتب ورسائل جمع کرنے کا شوق بھی پروان چڑھتا رہا۔ جیب خرچ اور انعام واکرام کے روپے بھی کتابوں کی خرید پر خرچ ہونے لگے اور یہ سرمایہ خالد عابدی کے لیے متاع بے بہا ہو گیا۔ میرے سامنے ایسی کئی مثالیں ہیں جب مادی وسائل کی کمی کی بنیاد پر کئی ادیبوں اور شاعروں نے خودکشی کرلی لیکن ایسی کوئی مثال میرے سامنے نہیں جو کسی ادیب نے ادبی سرمایہ کے ضائع ہو جانے پر خودکشی کی کوشش کی ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ خالد عابدی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے ورنہ بھوپال ایک نوجوان اور ابھرتے ہوئے فن کار سے محروم رہ جاتا۔

درمیانہ قد، ڈھکا رنگ، گھنگھریالے بال اور زندہ وجاندار مسکراہٹ والے خالد عابدی اپنے طور پر جذبۂ سادگی اور معصومیت سے ملنے والوں کو جلد اپنے قریب کر لیتے ہیں۔ ادبی شخصیتوں سے ملاقات، ان سے خط وکتابت نئی اور پرانی کتابوں کے تاجروں کی دوکانوں کے طواف، ایم ۔ اے۔ اور پی۔ ایچ ۔ ڈی ڈگری کے لئے لکھے جا رہے تحقیقی مقالوں کی تیاری میں ادبی تعاون ان کے محبوب مشغلے ہیں۔ بھوپال سے شائع ہونے والی بہت سی تحریروں کے پس پشت خالد عابدی کا مسکراتا چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ غالب صدی کے دوران انھوں نے ہائر سکینڈری کے طالب علم کی حیثیت سے غالب کی حیات اور ادبی خدمات پر بڑے معرکے سر کئے ہیں۔ اور قابل قدر سرمایہ یکجا

کیا ہے۔ فلم نقاد کی حیثیت سے خالد عابدی (محمد خالد) کے مراسلوں اور مضامین نے فلم کی دنیا کے بہت سے تاریک گوشے روشن کیے ہیں، اردو اور ہندی میں ان کے چار پانچ سو مضامین فلم اور فلمی دنیا کو سمجھنے میں اور سمجھانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

خالد عابدی نے بچوں کے لئے بھی لکھا ہے اور بڑوں کے لئے بھی۔ ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین افسانے تنقیدی مقالات اور خاکے اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ابتداء روز ناموں سے ہوئی۔ ان کی تخلیقات ندیم، افکار، الحمراء، انقلاب، اردو رپورٹر، آلوک، دینک مدھیہ پردیش وغیرہ میں شائع ہوئیں۔ بعد میں ان کی تخلیقات معیاری رسائل جیسے شاعر بمبئی، صبح امید بمبئی، نیا دور لکھنؤ، سیکولر ڈیموکریسی دہلی، محراب دہلی قہقہہ، دہلی، شگوفہ حیدرآباد، برگ آوارہ حیدرآباد، تشکیل بھوپال، آذر بھوپال، فیروز ناگپور، نگن سہارنپور، رگِ سنگ کانپور ہماری زبان دہلی وغیرہ میں جگہ پانے لگیں۔

ادب و فن کی دوسری اصناف سے بھی اُن کو دلچسپی ہے۔ انھوں نے ڈراما سے خصوصی دلچسپی لی ہے اور ڈراما پر کتابیں یکجا کرنے کے علاوہ ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ اسٹیج ڈراموں میں ''انارکلی کا مقدمہ'' اور ''غالب فلم انڈسٹری میں'' کافی پسند کیے گئے ہیں۔ حیران ہوں کہ دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں'' خاندانی شاعر'' ''خاندانی پہلوان'' محلوں کے خواب''، ''غلط فہمی'' پردہ اٹھنے والا ہے'' ''غبار'' دوسرا جنم'' خطوں کے پتے وغیرہ ریڈیو ڈرامے نشر ہو چکے ہیں انھوں نے ''سلام عید'' گردشیں'' ''شانتی'' بنا سیپ کا موتی'' وغیرہ ریڈیو ڈرامے بھی تحریر کیے ہیں۔

خالد عابدی کے ریڈیو ڈراموں کا پہلا مجموعہ ''آواز نُما'' ہے خوشی کی بات یہ ہے کہ انھوں نے اشاعت کے وقت ریڈیو ڈراموں کے مسودوں میں کوئی تبدیلی نہیں کی ہے۔ ڈراما ایک تخلیقی فن ہے۔ اس کی اپنی ہیئت ہے۔ اصل ڈراما وہ ہے جو اسٹیج پر یا ریڈیو سے پیش کیا جاتا ہے اور ڈراما کی تنقید اسی وقت مکمل اور بھرپور حقیقی ہوتی ہے جب اسٹیج سے مربوط ہوتی ہے۔ آواز نُما کے بیشتر ڈرامے۔ بھوپال، اندور، رائے پور، جبل پور اور گوالیار سے نشر ہو چکے ہیں۔ کچھ ڈرامے'' دوردھ بھارتی'' کے شہرۂ آفاق پروگرام ''ہوا محل'' میں شامل ہو کر ہندوستان کے تمام نشری مراکز سے پیش ہو چکے ہیں۔ اتفاق ہے کہ ریڈیو بھوپال میں ان ڈراموں کی ریکارڈنگ محفوظ نہیں ہے۔ اس لیے ''آواز نُما'' کے بارے میں میری رائے دراصل اس مسودہ کے بارے میں ہے جو ڈراما نگار نے ہدایت کار کو فراہم کیا تھا، اور ہدایت کار نے مختلف فن کاروں کے تعاون اور اشتراک سے اس مسودہ کو ڈرامے کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔

کرتار سنگھ دگل کے اکثر ڈرامے ''گول کمرہ'' میں پیش ہوتے ہیں۔ ابراہیم یوسف کی جگہ

اسپتال ہیں۔ ان کے ڈرامے کے کرداروں میں ڈاکٹر نرس، اور مریض بار بار پیش ہوتے ہیں۔ خالد عابدی کے کرداروں میں عام طور سے قدامت پسند گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ نواب بیگم، مرزا ،شاعر، ادیب اور خان کے ڈراموں میں بار بار پیش ہوتے ہیں بدگمان بیویاں، بیویوں سے نالاں شوہر، قدیم اقدار کو سینہ سے لگائے نواب اور مرزا ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ''دوسرا جنم'' میں مرزا اور بیگم کی اصل کشمکش دونوں کے متضاد مزاج سے وجود میں آتی ہے۔ ''سلام عید'' میں میاں بیوی (اختر اور مہرو) کے درمیان بھی بدگمانی پائی جاتی ہے اور مہرو کے شکی مزاج سے شاہانہ فائدہ اٹھاتی ہے۔ اسی ڈراما میں مرزا کا روایتی کردار ''اللہ کی مرضی کے حکم کے آگے کائنات'' سرنگوں دیکھتا ہے۔ خاندانی پہلوان میں نواب صاحب مرکزی کردار ہیں اور خاندانی پہلوان کی فتح میں اپنے خاندان کی فتح کا خواب دیکھتے ہیں۔ غبار میں گیلی لکڑیوں کو جلانے کی ناکام کوشش کرتی ہوئی بیگم ہیں جو شوہر کی شاعری سے عاجز ہیں۔

''گردشیں'' ہمارے اپنے دور اور مسائل سے متعلق ہے۔ ادیب، راجیندر، بے روزگاری کا شکار ہے۔ اس ڈراما میں دنیادار سادھو ہے او سود کے ذریعہ خون چوسنے والا پٹھان ہے۔ اسی طرح ''خطوں کے پتے'' میں پوسٹ مین ہماری زندگی کا کولمبس ہے۔ اس کے ساتھ سفر سے جھگڑیلو پڑوسیوں، حاسد پڑوسیوں اور دلچسپ کرداروں سے ملاقات ہوتی ہے۔ یہ کردار اپنی، اپنی شخصیت، اپنے اپنے عقائد و تصورات کے بوجھ تلے کچلتے کراہتے، روتے اور ہنستے دکھائی دیتے ہیں۔

''آواز نُما'' میں شامل ڈرامے پندرہ منٹ کی مدت کے لئے لکھے گئے ہیں۔ اس قسم کے ڈرامے ''پربھسن''، ''مزاحیہ جھلکیاں''، ''رنگ ترنگ'' اور ''لہریں'' قسم کے پروگراموں میں نشر کیے جاتے ہیں۔ ان ڈراموں کا مقصد زندگی کے بے ہنگم واقعات و کردار کی جھلک دکھا کر ہنسنے اور ہنسانے کا موقع فراہم کرنا ہے۔ ''آواز نُما'' کے ڈرامے اسی نوعیت کے ہیں۔ ان ڈراموں میں محنت سے تیار کئے گئے نقطۂ عروج کی تلاش فضول ہوگی۔ ان ڈراموں کے پلاٹ مختصر ہیں۔ عام طور سے کرداروں کی تعداد بھی محدود ہے اور واقعات، انجام سے قبل، نیا رخ اختیار کرتے ہیں اور ڈرامے المیہ تاثر کی جگہ فرحت و مسرت کے ماحول میں ختم ہو جاتے ہیں۔ ''دوسرا جنم'' مرزا قریب المرگ ہیں کہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ مذاق کیا گیا ہے۔ ادبی سرمایہ ضائع نہیں ہوا ہے اور محفوظ ہے۔ وہ اپنے اس جنم سے خوش و خرم ہو جاتے ہیں۔ ''پردہ اٹھنے والا ہے'' میں فرحت شوہر کی بیوفائی کے دکھ سے مرنے کے قریب ہے کہ اس پر یہ راز منکشف ہوتا ہے کہ اس کا شوہر اختر، اور نسیم ڈرامے کی ریہرسل کر رہے تھے اور عشق و عاشقی محض مذاق تھا۔ اس طرح سے ان ڈراموں میں

حزن وملال، رنج وخوشی، آنسو اور قہقہے موجود ہیں اور اس خوبی کی بنیاد پر ان ڈراموں کو جذباتی طربیہ کہہ سکتے ہیں جذباتی طربیوں میں مکالماتی جنگ خاص اہمیت رکھتی ہے۔ تیکھے اور تیز مکالمے طنز بھی کرتے ہیں اور تراوٹ بھی پہنچاتے ہیں۔ ریڈیو ڈرامے کے مکالمے میڈیم کی ضرورت کو بھی پورا کرتے ہیں اور ڈرامے کا تاروپود بھی تیار کرتے ہیں۔

خالد عابدی میڈیم کا شعور بھی رکھتے ہیں اور ان کے کردار اپنی حرکت وعمل سے مخاطب ومخاطب کا احساس دلاتے ہیں۔ وحشت اپنی بھابی کو کھانے میں شرکت کی دعوت دیتا ہے۔ جواب میں وہ کہتی ہیں "یہ لیجئے میں بیٹھ گئی" (دوسرا جنم ص ۴۸) کردار ایک دوسرے کا نام لے کر گفتگو کرتے ہیں اور سامع سمجھ لیتا ہے کہ کون کس سے بات کر رہا ہے۔ "خاندانی پہلوان" میں پہلوان آہستہ اور عام طریقہ سے گفتگو کرتا ہے اور یہ انداز گفتگو ریڈیو ڈراما میں معنویت اختیار کر لیتا ہے۔ "آواز نما" میں شامل ڈراموں میں جگہ جگہ مکالمے اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

فرحت:۔ آپ آرام سے لیٹے رہیئے میں پڑوس سے ڈاکٹر شرما کو بُلا لاتی ہوں، وہ بہت اچھے ڈاکٹر ہیں۔ آپ نے سُنا نہیں انھوں نے ایک مردہ کو زندہ کر دیا۔

نسیم:۔ تم پہلے مجھے مرجانے دو بعد کو زندہ کرا لینا۔

نسیم:۔ اختر تم بالکل فکر مت کرو ہماری محبت میں کوئی حائل نہیں ہو سکتا۔

اختر:۔ پلیز نسیم ہنٹر والی مت بنو۔ ذرا شانتی رکھو، میں اپنی بیوی کو آج ہی طلاق دے دیتا ہوں۔

نسیم:۔ (فرط مسرت سے) ہاں اختر ویری گڈ۔ ڈونٹ وری، اختر، ہم دونوں مل کر قسطوں میں اس کا مہر ادا کر دیں گے۔

فرحت میں کہتی ہوں دروازہ کھولتے ہو یا نہیں۔ یہ اندر کیا پیار کا ناٹک ہو رہا ہے؟

اختر:۔ (بہ زعم) ہاں یہ پیار کا ناٹک ہے۔ اس وقت کوئی اسٹیج پر نہیں آ سکتا۔ اس وقت کلائمکس سین ہے۔

فرحت:۔ ارے میں ہوں فرحت تمھاری فرّو۔۔۔ پلیز دروازہ کھولیے!

اختر:۔ کوئی بھی ہو ٹکٹ لو، بالکنی میں بیٹھو۔

فرحت:۔ خیر مت کھولو دروازہ میں مائیکہ جا رہی ہوں۔ ابھی ابا کو پہنچاتی ہوں۔ وہی تمھاری عشق کا بھوت اتاریں گے۔

اختر:۔ میں انتظار کرونگا اس وقت کا۔

فرحت:۔ ہاں جائے میری جوتی۔ میں اپنے جیتے جی یہ شادی نہیں ہونے دونگی۔
اختر:۔ اگر تم جیتے جی یہ شادی نہیں ہونے دوگی تو ہم تمہارے مرنے کے بعد یہ شادی کرینگے۔
(''پردہ اٹھنے والا ہے۔ آواز نما'')
نواب:۔(طنزاً) لیکن شاعرِ اعظم تمہارے مصرعے بحر میں نہیں ہیں۔
شاعر:۔ لیکن حضور بندہ تو قہر میں ہے۔ حضور اس مہنگائی نے سب کے وزن بگاڑ رکھے ہیں۔

(محلوں کے خواب۔ آواز نما)

راجیندر:۔ اچھا بابا یہ بتایئے میری شادی کب ہوگی اور میری قسمت میں کتنے بچے ہیں؟
بابا:۔ رام رام بیٹا! تم ابھی نوکر ہوئے نہیں اور شادی کی ابھی سے چنتا پڑ گئی اور پھر طرہ یہ کہ کتنے بچے ہونگے؟ واہ بھگوان کیا آجکل کے لڑکے ہیں۔ روپیہ نہیں ہے چلر کی ضرورت ابھی سے پڑ گئی۔(گردشیں ر آواز نما)

ادب و فن میں شخصیت کے اظہار'' اور شخصیت سے فرار کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ ''دوسرا جنم'' یوں تو آواز نما کا سب سے اچھا ڈراما نہیں ہے۔ لیکن یہ ڈراما خالد عابدی کی حیات کا بے رحم آئینہ بن گیا ہے۔ مرزا کے کردار میں خالد عابدی نے اپنی زندگی کے ذوق و شوق، افکار و مسائل شامل کر دیئے ہیں اور یہ کردار ان کے خوابوں اور آرزوؤں، محرومیوں اور کامرانیوں کی تصویر بن گیا ہے۔ اس کردار کے مطالعہ سے ان کے داغ و درد کا سراغ لگایا جاسکتا ہے۔ چند مثالیں دیکھئے۔

مرزا:۔ میاں شادی سے پہلے بالکل ایسی ہی یادداشت تھی میری۔(لہجہ میں تاسف) لیکن میاں جب سے شادی ہوئی ہے یادداشت بہت کمزور ہوگئی ہے۔ بعض اوقات تو میں اپنا نام بھول جاتا ہوں اور پھر یہ تمھاری بھابی بیگم بھی کچھ کم نہیں، دن بھر محلے میں میری کتابیں تقسیم کرتی رہتی ہیں۔
میری کتابیں نہ ہوئیں خدا بخش لائبریری ہوگئی۔

مرزا:۔ ہاں وحشت میاں، میں نے دو کتابیں نکال لی ہیں۔ لیکن ایک بات یاد رکھیئے جیسے ہی آپ کا تھیسس (Thesis) تیار ہو جائے آپ فوراً میری کتابیں واپس کر دیجئے یہ کتابیں مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہیں۔
وحشت:۔ تو گویا اپنی بیوی سے بھی زیادہ عزیز؟

مرزا:۔ قطعی! ارے میاں اس ادیب کی گمنامی اور پستی کا باعث یہی محترمہ تو ہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ شادی کے بعد میرے علم وفن میں غضب کی ترقی ہوگی، لیکن یہاں تو یہ حال ہے کہ سال، چھ مہینے میں ایک آدھ کہانی چھپ جائے تو غنیمت جانیے۔

شاداب:۔ یہ تم نے اپنے چاروں طرف کیا سامان پھیلا رکھا ہے؟

بیگم:۔ ''ارے یہی'' ہیں۔ نہ جانے کہاں کہاں کی کتابیں، اخبار، رسالے جمع کر رکھے ہیں۔ دیمک لگ رہی ہے مگر مجال ہے کہ انہیں ردّی میں بیچ دیں۔

شاداب:۔ ارے وہ نہیں تو تم اٹھا کر ردّی میں بیچ دو۔

بیگم:۔ (ڈرتے ہوئے) اللہ میری توبہ۔ وہ غصہ میں آکر میرا زیور بیچ دیں گے۔ اری شاداب، یہ کتابیں تو ان کی جان ہیں۔ نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں، نہ ڈھنگ کے کپڑے پہنتے ہیں۔ تمام تنخواہ ان کتابوں میں خرچ کر دیتے ہیں اور اگر میں کچھ کہوں تو کہتے ہیں ''میں کتابوں کے لئے ہی زندہ ہوں'' جب کہ گھر میں کتابیں رکھنے کو جگہ نہیں ہے۔ (لہجہ میں تبدیلی) دیکھو تو اس مردوئے کی باتیں۔

''دوسرے جنم'' میں مرزا کی کردار نگاری کی بھول بھلیوں میں خالد عابدی نے اپنی شخصیت کا کچھ حصہ اس کردار میں رکھ دیا ہے اور یہ کردار دوسرے ڈراموں کے مرزاؤں سے مختلف ہو گیا ہے۔ یہ مرزا ہوتے ہوئے صرف مرزا نہیں معلوم ہوتا۔

اختر سعید خاں کا ''حیوان ظریف'' اور قمر جمالی کا ''نقشِ قدم'' غالب کی زندگی کے مختلف پہلو پیش کرتے ہیں۔ خالد عابدی کا ریڈیو ڈراما ''غبار'' بھی غالب کی زندگی کے ظریف پہلوؤں کو پیش کرتا ہے۔ ریڈیو بھوپال کے ایک آفیسر کی خواہش پر خالد عابدی نے غیر ضروری تبدیلیاں کر دیں اور موجودہ شکل میں یہ ڈراما کئی الجھنیں پیدا کر دیتا ہے۔

''خاندانی پہلوان'' پلاٹ، کردار، مکالموں، اظہار و اخفا، ایہام اور واقعات کے اظہار میں اچھا ڈراما ہے۔ ''آواز نُما'' میں شامل ڈرامے نہ تو ریڈیو ڈراما کے شاہکار ہیں اور نہ ہی خود خالد عابدی کے ریڈیو ڈراما نگار کا یہ نقشِ اولین ہے اور ہمدردی سے مطالبہ کرتا ہے۔ بلاشبہ ان ڈراموں میں کہیں کہیں زبان و بیان کی خامیاں ہیں تو کہیں مکالمے طویل۔ کہیں کرداروں کی تعداد ضرورت سے زیادہ ہے تو کہیں موضوع کی تکرار۔

اس کے باوجود یہ ڈرامے شاہد ہیں کہ خالد عابدی نے ایک طاقتور میڈیم کو سمجھنے کی کوشش

کی ہے۔ان کے مکالموں کی بناوٹ اور ظرافت متوجہ کرتی ہے۔ مکالمے غیر ضروری ادبی آرائش و زیبا سے پاک ہیں۔ پلاٹ کا شعور ترقی کر رہا ہے ٹائپ کرداروں کے ساتھ ساتھ دوسرے جاندار کردار بھی توجہ کا مرکز بن رہے ہیں۔

خالد عابدی کی کئی تصنیفات و تالیفات زیرِ اشاعت اور زیرِ ترتیب ہیں۔ ''روبرو'' (ڈراما نگاروں سے انٹرویو) ''اعمالنامہ'' (طنز و مزاح نگاروں سے انٹرویو) ''پیکرِ آواز'' ریڈیو ڈراموں کا دوسرا مجموعہ۔ اور ''تاریخ فکر معروف بہ مقطعات نساخ'' اشاعت کے لئے تیار ہیں۔

تخلیق، تنقید اور تحقیق کے لئے جس ادبی ریاضت، ایثار و قربانی، شدتِ احساس، واضح شعور اور دور بین نگاہ کی ضرورت ہے اس کے نقوش خالد عابدی کی شخصیت میں موجود ہیں۔ مجھے یقین کامل ہے کہ خالد عابدی ادب و فن کی دنیا میں بڑا مقام بنائیں گے۔ اردو ادب اور بھوپال کا وقار بڑھائیں گے۔ ایک ایسا وقت آئے گا جب ''آواز نما'' کا مطالعہ ایک بڑے فن کار کے نقشِ اولین کی حیثیت سے کیا جائے گا۔

''آواز نما'' کا ادبی جائزہ

ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی

کسی بھی ادبی تصنیف پر صحافتی انداز میں تبصرہ کرنا ہو تو محض چند گھنٹے درکار ہیں، لیکن فنی نقطۂ نظر سے اسی کتاب کا جائزہ لینے میں دو چار مہینوں کا گذر جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ جناب محمد خالد عابدی صاحب کی کتاب ''آواز نما'' پر اپنی ناچیز رائے پیش کرتے وقت سب سے پہلے یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ محض تبصرہ نہیں بلکہ ''فنی جائزہ'' بھی ہے۔

جیسا کہ کتاب کے نام اور اس کے سرورق سے ظاہر ہوتا ہے کہ ''آواز نما'' دراصل خالد صاحب کے آٹھ ریڈیو ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ یہ نام ہی اپنی جگہ پر بہت بلیغ ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ ریڈیو کا تعلق براہ راست سننے والے کے کان سے ہوتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر، اس عمل میں بولنے والے کی آواز اور سامع کی قوت سماعت کے درمیان فوری رابطہ قائم ہوتا ہے۔ دوسرے تمام حواس اس کے بعد متاثر ہوتے ہیں۔ کتاب کا نام آواز نما۔ جو دو الفاظ سے مل کر بنا ہے اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ صوت وسماعت میں بصارت کو بھی شامل کر لیا گیا ہے، اس عمل کی مدد سے ڈراموں کے خالق اور قاری کے مابین ترسیل وابلاغ کے کچھ نئے اور مضبوط تر رشتے استوار ہو گئے ہیں۔

''آواز نما'' کا پیش لفظ میرے عزیز دوست ڈاکٹر اخلاق آثر صاحب نے لکھا ہے۔ موصوف نے صرف چند صفحات میں ریڈیو ڈراما کی تاریخ کا نہایت عالمانہ انداز میں جائزہ لیا ہے انھوں نے اس سلسلے میں نہ صرف یورپ میں ریڈیو ڈراما کی ابتدا اور ارتقاء کی ضروری تفصیل پیش کی ہے بلکہ مختصر طور پر یہ بھی بتایا ہے کہ اردو میں ریڈیو ڈراما نے کون کون سے ارتقائی مرحلے طے کیے۔ آخر میں جناب خالد عابدی کی شخصیت اور ان کے فن ڈراما نویسی پر بھی کافی حد تک روشنی ڈالی ہے۔

اردو کے مشہور ڈراما نویس اور میرے بزرگ جناب پرنسپل ابراہیم یوسف صاحب نے ''آپ سے ملیے'' کے زیرِ عنوان قارئین سے مصنف کا تعارف کرایا ہے۔ اس تعارف میں خالد عابدی صاحب کی روزمرہ زندگی اور ان کے فن سے بڑے دلچسپ انداز میں بحث کی ہے۔

مذکورہ بالا پیشِ لفظ اور تعارف کے بعد سچ پوچھیے تو رہ ہی کیا جاتا ہے؟ جس پر قلم اٹھایا جائے۔ سوا اس کے کہ قاری کتاب کا مطالعہ کرے اور اس پر ''حال'' یا ''وجد'' کی کیفیت طاری ہو

جائے۔ مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس ''کیفیتِ حال و وجد'' کی کسی حد تک وضاحت کر دوں یعنی کتاب کا ادبی جائزہ لوں۔

خالد صاحب کی قابلِ قدر تصنیف ''آواز نما'' کو بڑی حد تک ''خالد نما'' بھی کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ پس پردہ رہنے کے باوجود وہ اپنی تحریروں کے ایک ایک لفظ کے دریچے سے جھانکتے نظر آتے ہیں۔ کتاب میں کئی مقامات تو ایسے ہیں جہاں مصنف کی شخصیت مکمل کر قاری کے سامنے آ جاتی ہے۔ اپنی اس رائے کے ثبوت میں بہتر ہوگا کہ میں ڈاکٹر اخلاق اثر صاحب کے لکھے ہوئے پیش لفظ سے چند اقتباسات پیش کر دوں فرماتے ہیں۔

''خالد عابدی بچپن سے ہی مطالعہ کے شوقین ہیں۔ مطالعہ کے ساتھ کتب و رسائل جمع کرنے کا شوق بھی پروان چڑھتا رہا۔ جیب خرچ اور انعام و اکرام کے روپے بھی کتابوں کی خرید پر خرچ ہونے لگے اور یہ سرمایہ خالد عابدی کے لئے متاعِ بے بہا ہو گیا''۔[1] اس پیش لفظ میں آگے چل کر ڈاکٹر اخلاق اثر صاحب لکھتے ہیں:۔

''(ڈراما دوسرا جنم) خالد عابدی کی حیات کا بے رحم آئینہ بن گیا ہے۔ مرزا کے کردار میں خالد عابدی نے اپنی زندگی کے ذوق و شوق افکار و مسائل شامل کر دیئے ہیں''۔[2]

ڈراما دوسرا جنم'' کے ہیرو مرزا صاحب کی کمزوری'' کاغذ'' ہے۔ خواہ کاغذ اخبار و رسائل کی شکل میں ہو یا کتاب اور خطوط کی صورت میں لیکن انھیں مرزا صاحب حرزِ جاں بنا کر رکھتے ہیں۔ انگریزی کے کسی شاعر نے کہا تھا'' حسن جہاں کہیں بھی ہے، میرا ہے'' مرزا صاحب کی نظر سے یہ شعر گذرتا تو وہ یقیناً اس میں تصرّف ضرور کرتے کہ کاغذ جہاں کہیں بھی ہے، میرا ہے!

ایک مثل ہے کہ'' چراغ تلے اندھیرا'' اس مثل کا صحیح مفہوم سمجھنا ہو تو مرزا صاحب کے گھر جا کر دیکھئے۔ مرزا صاحب کو کاغذ سے جتنا عشق ہے، ان کی بیگم کو اس بیچارے سے اتنا ہی بیر ہے ذرا دیکھئے تو سہی، اپنی سہیلی شاداب کے ورغلانے پر اپنے میاں کی کمزوریوں کا کس طرح پردہ فاش کرتی ہیں۔

''اری شاداب! یہ کتابیں تو ان کی جان ہیں نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں نہ ڈھنگ کے کپڑے پہنتے ہیں۔ تمام تنخواہ ان کتابوں میں ہی خرچ کر دیتے ہیں اور اگر میں کچھ کہوں تو کہتے ہیں کہ'' میں کتابوں کے لئے ہی زندہ ہوں'' جب کہ گھر میں کتابیں رکھنے کو جگہ نہیں ہے۔۔ اس آدمی کو تو کتابوں کا جنون ہے۔ جب بھی دفتر سے آتے ہیں دو چار کتابیں، اخبار ساتھ لئے ہوئے آتے ہیں۔''[3]

مرزا صاحب کی یہ آپ بیتی کہاں تک خالد عابدی صاحب کی آپ بیتی ہے، اس کا جواب یا تو عابدی صاحب کے گھر والے دے سکیں گے یا ان کے بہت قریبی دوست۔

خالد عابدی کے ڈراموں میں عصری پرچھائیاں'' بطور خاص نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر انھوں نے ''خطوں کے بیچ'' میں موجودہ زمانے کے ایک ''عجوبے'' یعنی تبدیلی جنس پر لطیف طنز کیا ہے۔ پوسٹ مین کسی سلیم بیگ نامی شخص کی رجسٹری لاتا ہے لیکن اسے یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوتا ہے کہ سلیم بیگ مرد نہیں عورت ہے یعنی وہ سلیم بیگ سے سلمیٰ بیگم بن چکا ہے۔ اگر محض بیانیہ انداز میں واقعے کا اظہار کیا جاتا تو شاید اتنا لطف پیدا نہ ہوتا جتنا کہ ان چھوٹے مکالموں کی مدد سے پیدا کیا گیا ہے۔

سلمیٰ:۔ لایئے کس نام کا خط ہے؟

پوسٹ مین:۔ جی خط نہیں۔ ایک رجسٹری ہے۔

سلمیٰ:۔ تو دے دیجیے نا۔

پوسٹ مین:۔ سلیم بیگ صاحب کو بلایئے ان کی رجسٹری انھیں کو دی جائیگی۔

سلمیٰ:۔ مجھے ہی سلیم بیگ سمجھیے۔

پوسٹ مین:۔ آ۔۔۔آ۔۔۔ آپ مجھ سے مذاق کر رہی ہیں؟

سلمیٰ:۔ پوسٹ مین صاحب میں ہی سلیم بیگ ہوں۔

پوسٹ مین:۔ ما۔۔ ما۔۔ مگر۔۔ آ۔۔۔ آ۔۔۔ آپ تو عو۔۔ عو۔۔ عورت ہیں اور یہ سلیم بیگ تو آ۔۔ آ۔۔ آدمی ہے۔

سلمیٰ:۔ میں نے عرض کیا نا کہ میں سلیم بیگ ہی ہوں۔

پوسٹ مین:۔ مجھے ثبوت چاہیے۔

سلمیٰ:۔ پوسٹ مین صاحب۔۔۔ دراصل میرا سیکس چینج ہو گیا ہے، یعنی میری جنس تبدیل ہو گئی ہے۔۔۔ میں سلیم بیگ سے سلمیٰ بیگم ہو گئی ہوں'' [۴]

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ مصنف، عصری حالات و رجحانات سے کتنا باخبر ہے اور اس کی انگلیاں زمانے کی چلتی ہوئی نبض پر ہیں۔

اگر چہ ہم کسی ڈراما نویس سے براہ راست اس امر کی توقع نہیں رکھتے کہ وہ فلسفی بھی ہو گا اور ڈراما جیسی ہلکی پھلکی چیز جس کا بنیادی مقصد تفریح ہوا کرتا ہے فلسفے کی خشکی اور سنجیدگی کی متحمل بھی نہیں ہو سکتی، لیکن فن کار کا کمال یہ ہے کہ وہ نہایت دلنشیں انداز میں کونین کی اس گولی پر شکر چڑھا دے اور قاری یا سامع اسے بخوشی نگلنے پر تیار ہو جائے۔ خالد صاحب کو ہم اس زاویے سے بھی ایک کامیاب فن کار مان سکتے ہیں کہ انھوں نے اپنے نثری ڈراموں میں فلسفیانہ انداز بیان اختیار کرنے کا التزام بھی کیا ہے اور وہ بڑی حد تک اپنی کوشش میں کامیاب رہے ہیں۔

ایک مقام پر دل جلی بیوی، باورچی خانہ سے اپنے چٹورے، پیٹو اور چرب زبان منھ بولے دیور کو (جو شاعر و ادیب بھی ہے) اس طرح کھری کھری سناتی ہے۔

"یہ قلم نہیں ہے کہ آڑی ترچھی لکیریں کھینچ دیں اور سفید کاغذ پر بکھرے ہوئے الفاظ کا نام افسانہ رکھ دیا۔ یہ آگ کا کھیل ہے ہاتھ جل جائے تو داغ پڑ جائے" ۵

مہرو ایک سمجھدار لڑکی ہے جو اپنے شوہر اختر سے نالاں ہے کیوں کہ اختر کو ہر وقت، شعر کہنے کا اور سنانے کا جنون ہے۔ اختر کے خسر مرزا صاحب بھی داماد کی اس دیوانگی سے عاجز ہیں۔ ایک دن، اختر کی عدم موجودگی میں، مہرو ان کا ایک شعر مرزا صاحب کو سناتی ہے۔ مرزا صاحب شعر کی۔ بہت تعریف کرتے ہیں اس موقع پر خالد صاحب نے، باپ بیٹی کے درمیان یہ فلسفیانہ مکالمہ رکھا ہے:۔

مہرو: (خفگی کے انداز میں) واہ ابا جان! کبھی تو آپ شاعری کے لئے انھیں منع کرتے ہیں اور کبھی ذوق کو مہمیز دیتے ہیں۔

مرزا صاحب:۔ نہیں بیٹا یہ بات نہیں ہے میں نے کبھی شاعری کے لئے منع نہیں کیا میں تو کہتا ہوں شاعری کرو لیکن شاعری میں فکر ہو، احساس ہو، خیال میں ندرت ہو، تعمق ہو" ۶

خالد عابدی صاحب، روانی میں اکثر و بیشتر ایسے خوبصورت جملے لکھ جاتے ہیں جن کو پڑھ کر بے پناہ لذتِ کام و دہن حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً شیلا ایک گھریلو عورت ہے وہ پوسٹ مین سے کہتی ہے کہ جب تمھیں میرے پتی شری پی ایل تیواری کے نام کوئی خط آئے تو مجھے دے دینا اس پر پوسٹ مین جواب دیتا ہے۔

پوسٹ مین:۔ اگر کوئی کانفیڈنشل لیٹر ہو تو۔۔۔۔؟

شیلا:۔ ارے یہی تو رونا ہے۔ مجھے ان کانفیڈنشل لیٹرس کا ہی تو انتظار ہے کیونکہ جب سے یہ یہاں ٹرانسفر ہو کر آئے ہیں، کئی کانفیڈنشل لیٹرس آرہے ہیں۔ چار پانچ لیٹرس تو میں پکڑ چکی ہوں وہ چڑیل اسٹینو ٹائپسٹ ہے نا یہاں بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی ہے" ۷

اسی ڈراما میں ایک منشی جی دکھائے جاتے ہیں جو اگلے وقتوں کے ہیں وہ پوسٹ مین کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں:۔

منشی جی:۔ ارے بھئی پھیری والے، ہمارا بھی کوئی خط وغیرہ ہے؟

پوسٹ مین:۔ ارے بڑے میاں، کیا بک رہے ہو؟ میں تمھیں پھیری والا دکھتا ہوں؟

منشی جی:۔ ہاں تو اور کیا؟ میں ابھی ایک گھنٹہ پہلے یہاں سے گذر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ تم اپنے تھیلے میں سے خط نکال نکال کر دے رہے تھے اور ابھی تک یہیں کھڑے ہو۔ ارے بھئی

لیٹر باکس کی طرح ایک جگہ مت کھڑے رہو۔ گھر گھر جا کر ڈاک تقسیم کرو۔ ادھر ادھر خط دینے سے خط صحیح ہاتھوں میں نہیں پہنچتا ہے۔ میاں چلتے پھرتے نظر آؤ۔ ۸

ایک اور موقع پر یہی منشی جی پوسٹ مین سے کہتے ہیں:۔

"یہ۔۔۔یہ۔۔۔یہ تو تقریباً پچاس سالہ پرانا خط ہے۔ واہ، واہ، واہ!! کیا انتظام ہے پوسٹ آفس کا۔ خط لکھا بچپن میں، ملا بڑھاپے میں، ارے میاں اور دیکھو، شاید میرے دادا کی جوانی کے کچھ خط مل جائیں (استہزائیہ کر) واہ میاں واہ خطوں کا تھیلا نہ ہوا گویا آثار قدیمہ کا میوزیم ہو گیا۔ ۹

مذکورہ بالا مکالموں میں زبان کی خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں جو قاری اور سامع کو یکساں مزا دیں گی۔ "آواز نما" کے ڈراموں میں، ظرافت کے "دو اجزائے ترکیبی" طنز و مزاح کا عنصر غالب ہے۔ نشری ڈراموں میں اس عنصر کی موجودگی ناگزیر بھی ہے اور مفید بھی۔ اس سے سامعین کی دلچسپی برقرار رہتی ہے نیز مصنف اپنی بات کو زیادہ بہتر طریقہ پر سمجھا سکتا ہے۔ خالد صاحب کی ظرافت اپنی ندرت و تازگی کی وجہ سے کچھ اور نکھر گئی ہے۔

اس ظرافت کی بنیاد حقائق اور ذاتی مشاہدات پر رکھی گئی ہے ظریفانہ تشبیہ کا لطف اٹھانے کے لئے مرزا صاحب کی بیگم کا یہ جملہ سنیے:۔

"ہماری بیگم صاحبہ جو کچھ کریں کم ہے۔ اب اگر کچھ کہو تو منھ اس طرح پھلا لیں گی گویا ابھی ابھی ان کی ڈاڑھ نکالنے کے لئے انجکشن لگایا گیا ہو۔ ۱۰

ایک دل جلی بیوی کی زبانی، مفلس شاعر کا حلیہ یوں بیان کیا گیا ہے۔

"اب دیکھتی ہوں اس شاعر مفلس وحشت کو، آکر تو دیکھے وہ میرے در پر۔ کیسا ہے موا وحشی۔ پھٹا ہوا کرتا پہنے، منھ میں چوبیس گھنٹے پان دبا ہوا، اپنی بیوی کی چپل پہنے ہوئے چہرہ سے وحشت ٹپکتی ہے" ۱۱

طنز و مزاح کی ملی جلی کیفیت دیکھنا ہو تو مرزا صاحب کا یہ جملہ ملاحظہ فرمائیے:۔

"میاں، شادی سے پہلے بالکل ایسی ہی یادداشت تھی میری (لہجہ میں تاسف) لیکن میاں جب سے شادی ہوئی ہے، یادداشت بہت کمزور ہو گئی ہے۔ بعض اوقات تو میں اپنا نام بھی بھول جاتا ہوں۔ اور پھر یہ تمھاری بھابی بیگم بھی کچھ کم نہیں، دن بھر محلے میں میری کتابیں تقسیم کرتی رہتی ہیں میری کتابیں نہ ہوئیں خدا بخش لائبریری ہو گئی۔ ۱۲

بے ساختہ رعایت لفظی اور تگ پرتگ جواب دلا کر ہنسانے کی کوشش یوں کی ہے:۔

فرحت:۔ آپ آرام سے یہاں لیٹیے۔۔۔ میں پڑوس سے ڈاکٹر شرما کو بلا لاتی ہوں، وہ بہت اچھے ڈاکٹر ہیں۔ آپ نے سنا نہیں انھوں نے ایک مردہ کو زندہ کر دیا۔

اختر:۔ تم پہلے مجھے مرجانے دو۔ بعد کو زندہ کرادینا" ۱۴

نسیم:۔ اختر تم بالکل فکر مت کرو ہماری محبت میں کوئی حائل نہیں ہوسکتا۔

اختر:۔ پلیز نسیم۔ ہٹر والی مت بنو۔ ذرا شانتی رکھو۔ میں اپنی بیوی کو آج طلاق دے دیتا ہوں" ۱۵

ہمارے شعراء کی ذہنی مفلسی کی ہجو ملیح کا نمونہ:۔

مرزا:۔ تو گویا ہماری شاعری آپ کے نزدیک نحوست ہے۔ تمھیں معلوم نہیں کہ الشعراء تلامیذ الرحمٰن، شاعر خدا سے تعلیم یافتہ ہوتا ہے۔

بیگم:۔ بس بس رہنے دیجئے۔ صحیح کلمہ تو یاد نہیں چلے ہیں عربی کا مقولہ پڑھنے" ۱۵

اس میں کوئی شک نہیں کہ "آواز نما" کے ڈرامے، وقت کی پابندی کا لحاظ رکھتے ہوئے لکھے گئے ہیں اور چند لمحات میں فن و ادب کی سبھی باریکیوں پر توجہ نہیں دی جاسکتی لیکن خالد صاحب نے حتیٰ المقدور انھیں پابندیوں میں آزادی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اور بہت سے محاسن کو بیک وقت سمیٹ لیا ہے۔ مثلاً ان کے سبھی زیر غور ڈراموں میں کم و بیش شاعرانہ انداز بیاں پایا جاتا ہے۔ اور بعض اوقات سوچنا پڑتا ہے کہ وہ اچھے ڈراما نگار ہیں یا اچھے شاعر۔ نکہت، اپنے شوہر مرزا صاحب سے الجھ رہی ہے کیوں کہ مرزا نے اس کی سہیلیوں پر چوری کا الزام لگایا ہے۔ نکہت، اس بات پر چراغ پا ہو جاتی ہے اور پوچھتی ہے کہ بتایئے انھوں نے کیا چرایا ہے؟

مرزا صاحب:۔ ہاں تو کھولو اپنے چوہے جیسے کان اور سنو کہ انھوں نے کیا چرایا ہے، میری جوانی کا وہ فوٹو جو میں نے البم میں محفوظ کر رکھا تھا، اور چرایا ہے وہ معصوم دل جو صرف تمھارے لیے دھڑکتا ہے۔ ۱۶

ایک غریب شاعر کسی نواب صاحب کی شان میں قصیدہ خوانی کرتا ہے جب وہ اپنا مدعا بیان کر چکتا ہے تو نواب صاحب فرماتے ہیں:۔

نواب صاحب:۔ (طنزاً) لیکن شاعر اعظم تمھارے مصرعے بحر میں نہیں ہیں۔

شاعر:۔ لیکن حضور بندہ تو قہر میں ہے۔ حضور اس مہنگائی نے سب کے وزن بگاڑ رکھے ہیں"۔ ۱۷

خالد عابدی صاحب کے ڈراموں میں کردار نگاری کی کامیاب مثالیں مل جاتی ہیں۔ کردار نگاری سے میری مراد کردار کی شخصی کمزوریاں اور شہ زوریاں بھی ہیں اور اس کی سماجی حیثیت بھی۔

ایک "رنگے سیار" بابا پاس سے گذرتی ہوئی کسی لڑکی کو آواز دیتے ہیں، وہ ان سنی کر کے چلی جاتی ہے۔ سادھو بابا اس گستاخی پر بہت ناراض ہوتے ہیں اور بڑبڑانے لگتے ہیں۔ اتنے میں

بابا کا ایک بھگت نوجوان، شیام آجاتا ہے اور کہتا ہے:۔

"ارے بابا، آپ کہاں آج کل کی لڑکیوں کے پیچھے پڑے ہیں جب یہ اپنے ماں باپ اور پتی کا کہنا نہیں مانتیں تو آپ کا کہنا کیا مانیں گی؟" ۱۸

یہی بابا ایک نوجوان اہیر، کرشن سے کہتا ہے تم گائے کے دودھ میں پانی ملا کر بیچتے ہو؟ اس پر وہ جواب دیتا ہے

"نہ بابا، میں کرشن ہو کر گائے کے دودھ میں پانی کیوں ملانے لگا؟ بابا میں ایک دم سچ بول رہا ہوں" ۱۹

بابا اور ایک سے باز خان کے بیچ حسب ذیل مکالمہ، سود خور خانوں کی ذہنیت کو بخوبی واضح کرتا ہے۔

بابا:۔ ہاں تو ایسا کرو خان صاحب آج دُوا لگا دو۔۔۔۔۔"

خان:۔ نچے بابا، اگر نمبر پھنس گیا تو تمھیں بھی انعام ملے گا۔

بابا:۔ ارے خان صاحب ہم بیراگیوں کا کیا، آج یہاں تو کل وہاں۔ تم ہمیں کہاں ڈھونڈھے گا؟

خان:۔ نچے اِدر نہیں، اُدر نہیں۔ خدا کے یہاں تو ملے گا۔ اُدر ہی دیکھے گا" ۲۰

مختصر یہ کہ خالد عابدی صاحب کے نشری ڈراموں کا دلکش مجموعہ "آواز نما" نہ صرف صنف ڈراما کے عاشقوں کے لئے بلکہ عام قارئین کے لئے بھی اپنے اندر دلچسپی کا کافی سامان رکھتا ہے۔ ماہر فن ڈراما میرے اس قول سے متفق ہوں گے کہ آواز نما کے ڈرامے، جس طرح آواز کی دنیا میں پسند کئے گئے اسی طرح پڑھنے والوں کے حلقے اور اسٹیج کی دنیا سے بھی داد تحسین حاصل کریں گے۔

حواشی:۔

۱ "آواز نما" ص ۱۸-۱۹
۲ "آواز نما" ص ۲۵
۳ "آواز نما" ص ۴۳-۴۴
۴ "آواز نما" ص ۱۴۷-۱۴۸
۵ "آواز نما" (دوسرا جنم) ص ۳۰
۶ "آواز نما" (سلام عید) ص ۱۷
۷-۸ "آواز نما" (خطوں کے پیچ) ص ۱۴۳-۱۵۴
۹ "آواز نما" (خطوں کے پیچ) ص ۱۳۶
۱۰ "آواز نما" (دوسرا جنم) ص ۳۵
۱۱ "آواز نما" (دوسرا جنم) ص ۳۷
۱۲ "آواز نما" (دوسرا جنم) ص ۳۹
۱۳ "آواز نما" (پردہ اٹھنے والا ہے) ص ۵۷
۱۴ "آواز نما" (پردہ اُٹھنے والا ہے) ص ۵۹
۱۵ "آواز نما" (غبار) ص ۹۷
۱۶ "آواز نما" (دوسرا جنم) ص ۳۸
۱۷ "آواز نما" (محلوں کے خواب) ص ۱۱۵
۱۸ "آواز نما" (گردشیں) ص ۱۳۰
۱۹ "آواز نما" (گردشیں) ص ۱۳۲
۲۰ "آواز نما" (گردشیں) ص ۱۳۴

صرف دو باتیں

تخلص بھوپالی

بقضائے الٰہی جب سے طنز و ظرافت کی دنیا میں آسیب کی شکل اختیار کی ہے تب ہی سے کسی نہ کسی اہل قلم کی کاوشوں کے ساتھ آلائشوں کو بھی "تنقید یانے" کا کام کیا اور لحاظ رکھا کہ اپنی رائے تبصرہ، یا تنقید جو بھی کچھ ہو وہ صحت مند ہو ورنہ دونوں کی صحت پر ناخوشگوار اثر پڑنے کا احتمال ہے۔ چنانچہ تصانیف پڑھیں، جانچیں اور بوجھیں اور مصنف کی توقعات و خوش فہمیوں کا خون نہیں کیا نہایت خوش ذائقہ اور خوشگوار تبصرے سپرد قلم کئے۔ دل پسند تنقیدوں سے نوازا اور اس طرح اپنی جان چھڑالی اور یہ مصلحانہ روش اس لئے اختیار کی کہ شروع شروع ایک صاحب نے اپنی تصنیف جس کو طنز و ظرافت کا نام دے رکھا تھا، مجھے عنایت کی اور میری ناچیز رائے مانگی۔ چنانچہ پڑھا اور بوجھا کتاب ختم کرنے کے بعد اپنے وقت کے ضائع ہونے کا افسوس تو ضرور ہوا لیکن اسی کے ساتھ کتاب سے گلو خلاصی پانے کی خوشی بھی ہوئی۔ دنوں پریشان رہا کہ اس کتاب پر کیا تبصرہ کیا جائے۔ ادھر اہل کتاب صاحب تقاضہ کر رہے تھے۔ بالآخر رائے پیش کر دی۔

جب دنیا میں طنز و ظرافت کی کتاب نصیب نہ ہو تو پیش نظر کتاب کا مطالعہ مفید ہوگا، کیونکہ اس کے پڑھنے سے طنز و ظرافت سے متعلق خوش فہمیاں ختم ہی نہ ہوں گی بلکہ اس مخصوص صنف سے بھی نفرت ہو جائیگی پیش نظر کتاب میں کوئی ہنسنے ہنسانے والی بات نہیں ہے البتہ مصنف کی حوصلہ افزائی کی خاطر کتاب کو پڑھتے وقت مسکرانے اور ہنسنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ کیوں کہ ایک قاری آخر وقت قہقہے لگانے کے لئے تیار رہتا ہے کہ کس وقت اور کہاں ہنسا جائے۔ اور باوجود اس والہانہ خود سپردگی کے کتاب کے "تمت بالخیر" تک آسودہ ہونا ممکن نہیں۔ دل کی بات دل میں ہی رہ جاتی ہے۔ ویسے کتابت وطباعت دیدہ زیب اور اعلیٰ کاغذ اچھا اور دیمک پروف ہے۔ اگر پیش نظر کتاب الماریوں میں بند رہے تو دیمک اسے گزند نہیں پہنچا سکتی۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ مصنف کو یا اس کی کاوشوں کو قبول فرمائے۔

مصنف اپنی کتاب پر یہ تبصرہ دیکھ کر چراغ پا ہو گئے اور تبصرے کو میرے منہ پر مار کر دہاڑے "تخلص صاحب یہ رائے تو اپنے پاس ہی رکھئے میں نے اس کتاب میں جھک نہیں مارا۔" عجیب مسخرہ پن ہے کہ ناسمجھ لوگ مرثیہ نویس سے طنز و ظرافت کی آرزو کرتے ہیں اور طنز و مزاح نگار

سے بین وبکا اور آہ وزاری کو توقع رکھتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں انہیں مایوسی ہوتی ہے۔

برادرم خالد عابدی نے جو "میری آبیت" کے معتقد اور معترف ہیں خواہش ظاہر کی کہ تعلقات دیرینہ کی پاداش میں ان کی تصنیف آواز نما" پر ایک پھڑکتی ہوئی رائے پیش کروں۔ جواباً عرض پرداز ہوا کہ صرف اس شرط پر کہ اس کتاب میں جس قسم کا میٹر ہوگا اسی سے میل کھاتا تبصرہ کروں گا۔ امید کہ آپ چراغ پا ہوں گے نہ غضبناک۔ لیکن اگر آپ سیدھی سچی تو دی پاٹ رائے کے متحمل نہیں ہوسکتے تو پھر آپ خود اپنے قلم سے تبصرہ لکھ کر لے آیئے اور بعدہ، میرے نام شائع کرا دیجئے، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ خالد عابدی بہت ہنسے اور حیقن دیا کہ وہ رائے دیکھنے کے بعد چراغ پا ہوں گے نہ ہی مستقبل میں Villain جیسی رقابت رکھیں گے۔

پہلی بات تو اس خوشگوار ماحول میں اختتام پذیر ہوئی۔ اب سنیئے دوسری بات۔

خالد عابدی کی تصنیف "آواز نما" ان ہلکے پھلکے ڈراموں کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً آل انڈیا ریڈیو بھوپال اور دودھ بھارتی سے نشر کیے گئے اور جن پر معیاری اور پسندیدہ کی چھاپ لگ چکی ہے۔ بھوپال کی سرزمین پر ڈراموں کا دھندا عرصے سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔ کئی تھیٹریکل کمپنیاں اس سرزمین پر ڈرامے کھیل چکی ہیں اور بقول برادرم ابراہیم یوسف، بھوپال کے ذوق تماشا کو آسودہ کیا ہے مگر ایسی ہر تھیٹریکل کمپنی کو بعد میں غیر آسودہ ہونا پڑا اور اپنا ساز و سامان پردے فرنیچر وغیرہ بیچ کر خالی ہاتھ جانا پڑا۔ صرف ایک پارسی تھیٹر کمپنی ایسی تھی جو مع اپنے ساز و سامان کے آبرو بچا کر لے گئی۔ یہ بات ۱۹۲۵ء کے لگ بھگ کی ہے۔ سرائے منشی حسین خان کے نزدیک اس کمپنی نے ڈرامے کئے تھے۔ بڑا شاندار اسٹیج بنایا تھا۔ اداکار بھی منجھے منجھائے تھے۔ اس کمپنی نے زہر عشق، یہودی کی لڑکی، شیریں فرہاد، اور لیلیٰ مجنوں کے ڈراموں کو بڑی کامیابی کے ساتھ اسٹیج کیا تھا۔ اہل بھوپال کے معمر لوگوں کو ابھی تک یاد ہے کہ اس کمپنی میں جو لیلیٰ کا پارٹ کرتی تھی وہ بھوپال ہی کے کسی "مجنوں" سے نکاح کر کے وصل ہوگئی چند دنوں بعد پاگل ہوگئی اور شہر کی سڑکوں پر لیلیٰ کا واقعی پارٹ ادا کرتی دیکھی گئی۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ کہہ یہ رہا تھا کہ ہمیں اس تھیٹر کے ڈراموں کو بغیر ٹکٹ چوری چھپے دیکھنے کا شرف حاصل رہا ہے اور اب اس عمر میں کہ شعور بالغ ہوا تو خالد عابدی کی تصنیف "آواز نما" دیکھی تو اندازہ ہوا کہ ڈراموں کو کتاب میں پڑھنا، ریڈیو پر سننا ایک علیحدہ بات ہے اور کسی ڈرامے کو اسٹیج پر دیکھنا دوسری بات ہے۔

کسی ڈرامے کو ادبی حیثیت سے پرکھنا کتاب کی حد تک تو صحیح ہے۔ لیکن اسٹیج پر ڈراموں کی اداکاری، عمل و حرکت، ایکٹنگ کا مشاہدہ کرنا دراصل ڈرامے کا تقاضا بھی ہے اور جان بھی۔ ڈرامے کے اسٹیج کیے جانے کے دوران جتنے اچھے کردار ہوں گے ڈرامے کا تاثر اتنا ہی گہرا موثر اور کامیاب ہوگا۔ کتاب میں لکھے ہوئے مکالمے جو معمولی دکھائی دیتے ہیں جب اسٹیج پر سنے جاتے ہیں تو بامعنی اور بڑے معیاری

ہو جاتے ہیں، کاغذ یا کتاب میں چھپوانے سے ڈراموں کا مقصد حل نہیں ہوا کرتا بلکہ انہیں تخلیقی عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ ہدایت کاری، اداکاری، ایکٹنگ ڈرامے کی روح ہے۔ اداکاری کے عمل اور نقل و حرکت ان کے شعور اور صلاحیتوں کے مطابق ایک نئی شکل سامنے آجاتی ہے اور دلچسپی کا باعث ہوتی ہے۔

کسی ڈرامے کی کامیابی کا پتہ لگانا ہو تو اس کو اسٹیج پر ہوتے ہوئے دیکھئے۔ یہ اسٹیج کا رہین منت ہے۔ کاغذ یا کتاب کا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک قاری کو اسٹیج پر کھیلا جانے والا ڈراما دیکھنا میسر نہیں ہوتا وہ کتاب پڑھتے وقت اپنے دماغ کے کینوس پر خیالی اسٹیج بنالیتا ہے۔ اداکاروں کی شکلیں بھی خود بنالیتا ہے اور در پردہ جیسے اس ڈرامے کو خود ہدایت کار کی حیثیت سے ڈائرکٹ کرتا ہے۔

خالد عابدی کے تمام ڈرامے ''آوازِ نُما'' میں مقید ہیں جب میں نے انہیں اپنے دماغ کے پردوں پر اسٹیج کر کے جانچا تو ایک رائے قائم کی کہ خالد عابدی کے ڈرامے اگر اسٹیج کر دئے جائیں تو بات بن جائیگی۔ خالد عابدی کے ڈراموں کو پڑھ کر لطف اندوز ہوا۔ کیوں کہ ان ڈراموں کے کرداروں یعنی نواب، بیگم، مرزا، خان، اختر، مہرو وغیرہ کی طرز اداکاری عمل و حرکت اور ایکٹنگ کو اپنے دماغ کے پردوں پر دیکھ رہا تھا۔ قصہ کوتاہ کا کہ عام آدمی ایک ڈرامہ کو اسٹیج پر دیکھ کر ہی رائے قائم کر سکتا ہے۔ جیسے ہملیٹ کی خود کلامی یا انتونی کی جنازے کی تقریر۔ کتاب میں پڑھ کر اس کا مفہوم تو سمجھا جا سکتا ہے لیکن اسٹیج کے ذریعہ اسے پیش ہوتا دیکھنے کا تجربہ ہی کچھ اور ہو سکتا ہے۔

خالد عابدی کے ہاں طنز و ظرافت سبک، نرم اور خوش ذائقہ ہے اور یہی بیشتر اوقات ان کے کرداروں کے گرد گھومتا ہے۔ تشبیہات اور استعارات اور روزمرّہ ان کے ڈراموں کی جان ہیں، جس سے ایک قاری محظوظ ہوتا ہے لطف لیتا ہے۔ اور ان کے مزاح میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کی ظرافت میں میکانیکل مزاح نہیں ملتا۔

خالد عابدی صاحب کے کرداروں سے محبت اور ہمدردی ہو جاتی ہے جو ایک صحیح کردار کی تخلیق کی ضامن ہے۔ لیجئے یہ دوسری بات بھی اختتام کو پہونچی۔ اگر کسی ادبی Villain کو میری رائے سے اتفاق نہیں ہے تو وہ خالد عابدی کا کوئی بھی ڈرامہ اسٹیج کر کے دیکھ لے یا ریڈیو سے سُن لے تو اس کی رقابت اور ویلین گردی ختم ہو جائے گی۔

بہ ہوش و حواس منکہ نے یہ دو باتیں لکھ دیں کہ وقت ضرورت خالد عابدی کے کام آ گئیں۔ چنانچہ حال ہی میں اتر پردیش اردو اکیڈمی نے مبلغ ایک ہزار روپے کا انعام دے کر میرے اس گرانقدر تبصرہ کی لاج رکھ لی۔ خالد عابدی مبارک ہو۔

محمد خالد عابدی اور "آواز نما"

فضل جاوید

بعض صورتیں دیکھنے میں بہت معمولی نظر آتی ہیں۔ ان میں ایسی کوئی خاص بات دکھائی نہیں دیتی جو دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔ لیکن اگر کسی کو ان کے اندر جھانکنے کی بصیرت حاصل ہو تو ان کے ایسے ایسے جوہر سامنے آتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ محمد خالد عابدی کی شخصیت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ وہ بظاہر ایک انتہائی سیدھے سادے، قناعت پسند اور معمولی سے انسان نظر آتے ہیں ۔ اگر چپ سادھ لیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں بولنا آتا ہی نہیں اور اگر بولنے پر آجائیں تو لگتا ہے یہ چپ نہیں ہو سکتے۔ میرے خیال میں وہ جتنا زیادہ بول سکیں اتنا ہی اچھا ہے بلکہ خوب زور و شور سے بولیں تا کہ ان کی پُر اسرار شخصیت پر سے پردے اٹھتے جائیں۔ نوجوان ہیں، جوش اور ولولہ ہے۔ قلم میں روانی ہے اور منہ میں زبان بھی۔ شرط یہ ہے کہ کوئی انہیں بولنے پر آمادہ کرے۔ وہ اپنے آپ شروع ہونے والوں میں سے نہیں۔

خالد عابدی کے عزائم بہت بلند ہیں۔ وہ اگر کسی کام کا بیڑا اٹھائیں تو قلم دوات لے کر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ ادب کی بہت سی اصناف پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ لکھنے لکھانے کا شوق جنون کی حد تک پہنچ چکا ہے۔ آواز نما، روبرو، اعمال نامہ (طنز و مزاح نگاروں سے انٹرویو) پیکرِ آواز اور باغ فکر معروف بہ "مقطعات نساخ" یہ سب تصانیف اسی جنون کا نتیجہ ہیں۔ کچھ اشاعت پذیر ہو چکے ہیں، کچھ ان مرحلوں سے نہیں گزرے۔ انہیں کتابیں خریدنے اور جمع کرنے کا بہت شوق ہے۔ سنا ہے دیمک کے چاٹنے سے پہلے ہی یہ کتابوں کو چاٹ جاتے ہیں۔ مطالعہ کا شوق گھٹی میں پڑا ملا ہے۔ خالد عابدی بھوپال کے ایک ترقی پسند خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس خاندان کے افراد نے درس و تدریس کے فروغ میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ کچھ نامساعد حالات تھے جو خالد عابدی کی تعلیم کا روڑا بن گئے۔ ثانوی تعلیم کے بعد ایک عرصہ تک وہ حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں ایک ایسی ملازمت قبول کرنی پڑی جو ان کی فطرت سے مطابقت نہ رکھتی تھی۔ لیکن غم روزگار کے انتہائی پریشان کن لمحات میں بھی وہ اپنے مطالعہ کے شوق کو دبا نہ سکے۔ نتیجہ میں ڈگریوں کی دوڑ میں آگے نکلتے جا رہے ہیں۔ اگر کسی اردو کے طالب علم

سے ملاقات ہوتو اس سے اس کی تکالیف پوچھنا، جو کتابیں بازار میں دستیاب نہ ہوں انھیں اپنے گھر سے لاکر دینا اور پھر اعزازی طور پر سے پڑھانا یہ سب ان کے محبوب مشاغل میں داخل ہے۔ مستعار لے کر کتابیں پڑھنے سے وہ گریز کرتے ہیں۔ اپنی ضروریات کو پس پشت ڈال کر وہ کتابیں خرید کر پڑھتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے مختصر سے مکان میں کم یاب اور نایاب کتابوں کا ایک اچھا خاصہ ذخیرہ موجود ہے۔ ریسرچ کے طالب علم لائبریریوں سے مایوس ہوکر خالد عابدی کی اپنی لائبریری سے استفادہ کرتے ہیں۔ لکھنے کا شوق مطالعہ کے شوق سے کسی طرح کم نہیں۔ چنانچہ ہر صنف ادب پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ فلمی معلومات بے پناہ ہیں۔ کسی رسالہ میں کوئی غلط خبر شائع ہوتی ہے تو ان کا قلم فوراً احتجاج کرنے لگتا ہے۔ اگر کوئی اپنی غلط معلومات کو صحیح جتانے پر تل جائے تو یہ جذباتی ہو جاتے ہیں۔ مزاح کی طرف طبیعت زیادہ راغب ہے۔ لیکن مزاح کے ساتھ طنز کو خوب صورتی سے استعمال کرتے ہیں۔ کسی سے ناراض ہو جائیں تو اس کے خوب پرزے بھی اڑاتے ہیں۔ شاید آگے چل کر ان کی اس منتقمانہ عادت کو اعتدال آجائے۔

خالد عابدی ریڈیو کے لئے لکھتے رہتے ہیں۔ ریڈیو سے نشر کئے گئے اپنے آٹھ ڈرامے ''آواز نما'' کے نام سے شائع کر چکے ہیں اور حسن اتفاق سمجھئے کہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد انھیں اب ریڈیو کے محکمہ میں ملازمت مل گئی ہے۔ جواں سال خالد عابدی جو ادیب ہے طنز و مزاح نگار ہے ریڈیو ڈراما نگار ہے اور نہ جانے کیا کیا ہے۔ آنے والا وقت ان کی شخصیت پر سے تہیں ہٹاتا جائے گا اور ہر تہہ کے نیچے سے خالد عابدی کا نیا نکھرا ہوا روپ سامنے آتا جائے گا۔

''آواز نما'' یوں تو صرف ان کے آٹھ ہلکے پھلکے مزاحیہ ریڈیو ڈراموں کا مجموعہ ہے جنھیں آل انڈیا ریڈیو بھوپال نے پروڈیوس کیا اور بھوپال کے علاوہ یہ دوسرے اسٹیشنوں اور ہوا محل سے بھی نشر ہو چکے ہیں۔ لیکن اس کی قدر و قیمت میں اضافہ کرنے والا وہ پیش لفظ ہے جسے ڈاکٹر اخلاق اثر نے قلمبند کیا ہے۔ یہ پیش لفظ ڈاکٹر موصوف کا ایک مبسوط مضمون ہے ڈرامے کے فن اس کی تکنیک اور اس کی تاریخ پر اپنا معلوماتی اور پر مغز مقالے پڑھنے کے بعد قارئین آٹھ ڈراموں کو انتہائی دلچسپی سے پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جناب ابراہیم یوسف نے جن کی اردو ڈراموں پر اتنی گہری نظر ہے کہ مصنف کی بال برابر فرد گذاشت بھی ان سے چھپ نہیں سکتی۔ مصنف کا تعارف لکھا ہے۔

یہ سچ ہے کہ ریڈیو ڈراموں کی تکنیک اسٹیج کے ڈراموں سے مختلف ہوتی ہے۔ ریڈیو ڈرامہ کو پڑھنے سے پہلے ریڈیو پر یہ سن لیا جائے تو دوران مطالعہ اس کے صوتی اثرات، مکالموں کا انداز

اور پس منظر موسیقی کی بازگشت ایک دل چسپ تاثر چھوڑتی جاتی ہے ۔ خالد عابدی کے ڈراموں کی یہ خوبی ہے کہ بعض ڈرامے اگر اسی طرح اسٹیج کر دیئے جائیں تو یہ اسٹیج کے ڈراموں کے جملہ تقاضوں کو پورا کرتے ہیں ۔ قاری انھیں پڑھتے ہوئے کرداروں میں کھو جاتا ہے ۔ یہی مصنف کا کمال ہے ۔ موضوعات ہلکے پھلکے ہوتے کے باوجود مکالمے چست اور برجستہ ہیں ۔ کہیں کہیں مکالمے طویل بھی ہو گئے ہیں لیکن اپنا تاثر قائم رکھنے میں کامیاب ہیں ۔ چونکہ یہ ڈرامے خاص طور سے ریڈیو کے لئے لکھے گئے ہیں اور پندرہ منٹ میں سامعین کو ہنسانا اور ان کی تفریح کا سامان مہیا کرنا ان ڈراموں کا مقصد ہوتا ہے اس لئے ان میں تفریح طبع کے علاوہ کسی خاص مقصد کو ڈھونڈھنا بے سود ہے ۔ کہیں کہیں زبان و بیان کی خامیاں نظر آ جاتی ہیں لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ کاتب صاحب کو اچھے بھلے مکالموں میں کہیں کہیں ''تصحیح'' کا موڈ آ گیا ہو ۔ یوں تو اس کتاب کا ہر ڈرامہ تفریحی ہے لیکن ڈرامہ نگار نے خوب صورت مکالموں کے ذریعہ ہنستے ہنستے کبھی کبھی دکھتی رگوں پر بھی ہاتھ رکھا ہے کبھی خود کو نشانہ بنایا ہے تو کبھی سماج کو آڑے ہاتھوں لیا ہے گرانی کا ذکر ''محلوں کے خواب'' میں اس طرح کرتے ہیں ۔ ایک قصیدہ گو شاعر نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی شان میں قصیدہ، پڑھتا ہے ۔ نواب صاحب اس سے کہتے ہیں ۔

نواب صاحب، (طنزاً) لیکن شاعر اعظم تمہارے مصرعے بحر میں نہیں ہیں ۔

شاعر:- لیکن حضور بندہ تو قہر میں ہے حضور اس مہنگائی نے سب کے وزن بگاڑ رکھے ہیں ۔

''آواز نما'' کے ڈراموں میں ''دوسرا جنم'' کو ایک خاص اہمیت ہے وہ اس لئے نہیں کہ یہ ریڈیو ڈرامہ کا شاہکار ہے ۔ بلکہ اس لیے کہ اس میں مصنف کی زندگی کے نشیب و فراز ہیں ۔ دل چسپ مکالموں کے ذریعہ وہ مرزا کے کردار میں سامعین اور قارئین کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ اپنی شخصیت کا کچھ حصہ انھوں نے اس ڈرامہ میں رکھ دیا ہے ۔ ایک مثال ملاحظہ ہو ۔

مرزا: میاں شادی سے پہلے بالکل ایسی ہی یادداشت تھی میری (لہجہ میں تاسف) لیکن میاں جب سے شادی ہوئی ہے یادداشت بہت کمزور ہو گئی ہے ۔ بعض اوقات تو میں اپنا نام بھول جاتا ہوں ۔ اور پھر یہ تمہاری بھابی بیگم بھی کچھ کم نہیں ۔ دن بھر محلے میں میری کتابیں تقسیم کرتی رہتی ہیں ۔ میری کتابیں نہ ہوئیں خدا بخش لائبریری ہو گئی ۔

شاداب: یہ تم نے اپنے چاروں طرف کیا سامان پھیلا رکھا ہے؟

بیگم: ارے ''یہی'' ہیں ۔ نہ جانے کہاں کہاں کی کتابیں، اخبار، رسالے جمع کر رکھے ہیں ۔ دیمک لگ رہی ہے ۔ مگر مجال ہے کہ ردی میں بیچ دیں ۔

شاداب: ارے وہ نہیں تو تم اٹھا کر ردی میں بیچ دو۔

بیگم: (ڈرتے ہوئے) اللہ میری توبہ وہ غصہ میں آکر میرا زیور بیچ دیں گے۔ اری شاداب یہ کتابیں تو ان کی جان ہیں۔ نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں نہ ڈھنگ کے کپڑے پہنتے ہیں۔ تمام تنخواہ ان کتابوں میں ہی خرچ کر دیتے ہیں۔ اور اگر میں کچھ کہوں تو کہتے ہیں۔ ''میں کتابوں کے لئے زندہ ہوں۔'' جبکہ گھر میں کتابیں رکھنے کو جگہ نہیں ہے۔ (لہجہ میں تبدیلی) دیکھو تو اس مردوئے کی باتیں......''

خالد عابدی کو کردار کی مناسبت سے زبان کے استعمال کا سلیقہ خوب آتا ہے۔ مندرجہ بالا مثال میں مردوئے سے زیادہ فصیح لفظ آدمی ہو سکتا تھا۔ لیکن چونکہ مکالمہ عورت نے ادا کیا ہے اس لیے آدمی سے زیادہ مردوئے سے اس کی زبان سے کچھ فطری معلوم ہوتا ہے۔ یوں تو ''آواز نُما'' میں بہت سے ایسے مکالمے ہیں جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں لیکن ایک مختصر مضمون میں اس کا احاطہ ممکن نہیں۔ ریڈیو ڈراموں کا یہ مجموعہ ایک، اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایسے ڈراما نگاروں کے لئے ایک پیغام بھی ہے جن کے ڈرامے ریڈیو پر نشر ہونے کے بعد آواز ہی کی دنیا میں غائب ہو جاتے ہیں۔ اگر انہیں اسی طرح دستاویزی حیثیت حاصل ہو جائے تو سامعین کے ساتھ ساتھ قارئین سے بھی ان کا رشتہ جڑ سکتا ہے۔ آخر میں ''آواز نُما'' کے قارئین کو ڈاکٹر اخلاق اثر کا یہ مشورہ ضرور دوں گا کہ ''ریڈیو ڈرامہ نگار کا یہ نقش اولین ہے اور ہمدردی سے مطالعہ کا مطالبہ کرتا ہے۔''

چند حرف، خالد عابدی کے بارے میں

اختر سعید خاں

اس اعتراف میں کسی کو تامل نہ ہوگا کہ خالد عابدی ہمہ جہت قلم کار ہیں افسانے، ڈرامے، رپورتاژ، خاکے، انٹرویو، تنقیدی اور تحقیقی مضامین غرض ہر موضوع ان کا میدان ہے۔ بیشتر تخلیقات کتابی شکل میں موجود ہیں۔

افسانے کی داد وہ مرحوم کوثر چاند پوری صاحب اور رام لعل صاحب جیسی شخصیتوں سے پا چکے ہیں۔

جناب عشرت قادری نے ''مضامینِ خالد'' کے بارے میں بجا طور پر فرمایا ہے کہ ''مضامینِ خالد'' ان کی تازہ تصنیف ہے جو ان کے ادبی سفر اور ہوش مندانہ تخلیقی گرم روی کی نشان دہی کرتی ہے'' بااین ہمہ خالد صاحب نے ''باغ فکر معروف بہ مقطعات نساخ'' مرتب کرنے میں تلاش و تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے اور اردو زبان کے ایک ایسے شاعر کے نام کو جس کا شمار ماضی کے بزرگ شعراء میں ہوتا ہے عصر حاضر کے شعری ادب میں گم ہونے سے بچا لیا ہے۔ ''نقوش'' کے ''آپ بیتی نمبر'' میں سید مقیت الحسن صاحب نے نساخ کے حالات ان کی خود نوشت سے لیے ہیں مگر اس اعتراف کے ساتھ کہ یہ خود نوشت ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

خالد صاحب نے نساخ کے حالات کو مقیت الحسن صاحب کے بیان تک محدود نہیں رکھا۔ انھوں نے ہر اس گوشے کو تلاش کیا ہے جہاں سے انھیں نساخ کے بارے میں کچھ مل سکتا تھا۔ انھوں نے جن کتب و رسائل کے حوالے نساخ کے حالات اور اشعار نقل کیے ہیں ان کی فہرست بھی شامل کر دی ہے۔

خدا جانے کتنے شعراء اور ادباء کی تخلیقات شائع نہ ہونے کے سبب سے ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی ہیں۔ اگر اتفاق سے ان شعراء اور ادباء کی تخلیقات نظر آ جاتی ہیں تو ہمیں اپنے ادب میں ایک نیا روشن ستارہ نظر آنے لگتا ہے۔

نساخ بھوپال آئے ہوں یا نہ آئے ہوں ان کے بڑے بھائی مولوی عبداللطیف خاں ڈیڑھ سو سال پہلے بھوپال میں وزیر ریاست کے عہدہ پر رہ چکے ہیں اور اس تعلق کے باعث پرانے بھوپال والوں کے دلوں میں نساخ سے ایک رشتہ سا ضرور محسوس ہوتا ہے خالد صاحب کو اس رشتے کی خوشبو اتنی بھائی کہ کتاب مرتب کر لی اور صاحبان فکر و نظر کو نذر کر دی۔ خالد اگر کچھ اور نہ لکھیں تو بھی ''باغ فکر'' ان کے دامن فکر کو پھولوں سے بھرا رکھے گی۔

سرگرم خود شناسی، محمد خالد عابدی

ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی

اللہ کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں نے اللہ کو نگاہوں سے کبھی نہیں دیکھا لیکن بہر حال اس وحدہٗ لاشریک لہٗ پر ایمان رکھتا ہوں۔

بلا تشبیہ یہی بات میں اللہ کے نیک بندے برادرم جناب محمد خالد عابدی صاحب کے بارے میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ میں نے انھیں کبھی نہیں دیکھا لیکن موصوف کی ذات وصفات پر ایمان ضرور رکھتا ہوں۔

عابدی صاحب سے پہلے پہل اس وقت تعارف ہوا تھا جب ۱۹۷۵ء میں (غالباً میرے دوست جناب عبدالواحد صاحب، واحد پریمی مصنف گلِ نو کی تحریک پر) عابدی صاحب نے اپنے ریڈیو ڈراموں کا مجموعہ ''آواز نما'' ہدیتاً میرے پاس بھجوایا تھا۔ مجھے بخوبی یاد ہے کہ میں نے انھیں خط لکھ کر اظہار تشکر کیا تھا اس کے بعد مراسلت کم ہی رہی یہاں تک کہ ۱۹۷۷ء میں عابدی صاحب نے ایک بار پھر مجھ پر کرم فرمایا اور اپنی تحقیقی کاوش۔ ''باغ فکر معروف بہ مقطعات نساخ'' کے مطالعہ کا شرف بخشا۔ اس زمانے میں اپنی اہلیہ کی شدید علالت کی وجہ سے بے حد پریشان تھا اس پریشانی کا دور ۱۹۹۰ء تک قائم رہا جب میری شریک حیات کا انتقال ہو گیا بہت سی قیمتی کتابیں دیمک کی نذر ہو گئیں انھیں میں باغ فکر بھی تھی۔ اس نقصان عظیم کا صدمہ نا قابل بیان ہے۔

عابدی صاحب سے آج تک ملاقات تو نہ ہو سکی لیکن ان کے مختصر خیریت نامے اکثر آتے رہے۔ میں بھی باقاعدگی سے جواب لکھتا رہا۔ اس کے علاوہ ہفت روزہ ہماری زبان نیز دوسرے اخبار و رسائل میں موصوف کے مضامین بھی میرے زیر مطالعہ رہے۔ اواخر ۲۰۰۲ء میں خوش قسمتی سے عابدی صاحب کی فرستادہ دو وقیع تصانیف (باغ فکر اور مضامین خالد) مجھ تک پہنچیں۔ ان کا بالاستیعاب مطالعہ کر کے مجھے مسرت بھی حاصل ہوئی اور بصیرت بھی۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ ''باغ فکر معروف بہ مقطعات نساخ'' ایک اعلیٰ درجہ کا تحقیقی کارنامہ ہے جبکہ ''مضامین خالد''، ''محمد خالد عابدی صاحب کے مختلف النوع تحقیقی وتنقیدی مضامین کا دلکش وفکر انگیز مجموعہ ہے۔

مذکورۂ بالا کتابوں اور اخبار و رسائل میں وقتاً فوقتاً شائع شدہ مضامین کے مطالعے سے مجھ

پر کچھ عجیب وغریب راز منکشف ہوئے جن کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

(الف) خالد عابدی بحیثیت طالب علم

میری نظر میں جناب محمد خالد عابدی کی شخصیت میں پائی جانے والی سب سے پہلی اور نمایاں صفت یہ ہے کہ وہ ایک سچے طالب علم ہیں۔ وہ ہمیشہ سرگرم خود شناسی" رہتے ہیں اور حصول علم میں شب وروز منہمک رہتے ہیں۔ ان کے حسب ذیل جملے میرے اس قول کی صداقت کے امین ہیں:

"میں نے نساخ پر زیادہ سے زیادہ مواد جمع کرلیا تھا۔ جس قسم کا مواد درکار تھا وہ دستیاب نہیں ہو رہا تھا چنانچہ اس کوشش کے پیش نظر میں فرداً فرداً خطوط لکھ کر قلمی معاونت کی درخواست کر رہا تھا"[1]

"میرا ہمیشہ یہ شیوہ رہا ہے کہ مجھے کچھ معلوم کرنا ہوتا ہے تو میں بلا جھجک کسی سے بھی معلوم کر لیتا ہوں بیرونی شعراء وادباء کو خط لکھ کر معلوم کرنے کی بھی کوشش کرتا ہوں۔ ایک بار مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ اکثر قدیم اور قدیم ترین اردو کتابوں میں کسی عبارت کے آخر میں حواشی اور فٹ نوٹ کے آخر میں بارہ (۱۲) کا ہندسہ لکھا ہوتا ہے۔ یہ کس ضرورت، غرض سے لکھا ہوتا ہے۔ یہ کس بات کی علامت ہے؟"[2]

(ب) خالد عابدی بحیثیت کامیاب محقق:۔

جناب خالد عابدی کی علمی وادبی تحریروں کو دیکھ کر ہم یہ ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ وہ ایک باخبر، جفاکش، محتاط اور حق گو محقق ہیں۔ ان کی تنقیدی صلاحیتیں قابل تعریف اور لائق ستائش ہیں مثلاً یہ چند نمونے: "میرے نزدیک دیباچہ، تقریظ، پیش لفظ یا مقدمہ وغیرہ اس وقت پر خلوص اور قابل افتخار تحریر ہے جبکہ لکھنے والا پہلی کوشش میں ہی لکھنے پر تیار ہو جائے یا لکھنے والے کے دل میں مسودہ دیکھ کر خود کچھ لکھنے کی آرزو پیدا ہو جائے"[3]

"نازش صاحب کی ہندوستان سے محبت، یہاں کے رسم ورواج اور یہاں کے ہندو مسلم تہواروں میں ان کی ذہنی طور پر شمولیت کو پیش نظر رکھ کر دیکھیں تو ہمیں علی جواد زیدی کا وہ جملہ یاد آتا ہے کہ ایسی بھرپور وطن دوستی اکا دکا شاعروں میں ہی نظر آئے گی خواہ وہ کسی زبان کے کیوں نہ ہوں۔ حیرت ہے کہ علی جواد زیدی صاحب نے اپنی گراں قدر تالیف "اردو میں قومی شاعری کے سو سال" میں نازش پرتاپ گڑھی کو کس بناء پر شامل نہیں کیا؟"[4]

"میں پروفیسر جاوید نہال ہاشمی صاحب سے بدظن تھا، ان کا ذکر مجھے مشتعل کرتا تھا چنانچہ میں نے غصہ کے عالم میں مالک رام صاحب کو لکھ دیا کہ جاوید نہال ہاشمی جس شخص کا نام ہے وہ یا تو ہمہ تن مصروف ہے یا سراپا مغرور"[5]

(ج) خالد عابدی بحیثیت طنز و مزاح نگار:۔

بعض حضرات، جو خالد عابدی صاحب کی اُفتادِ مزاج سے واقف نہیں ہیں وہ اپنے مقام پر یہ غلط اور گمراہ کن رائے قائم کر لیتے ہیں کہ خالد صاحب خدانخواستہ ایک زاہدِ خشک، آدم بیزار، اکل کھرے اور منہ پھٹ باغی انسان ہوں گے۔ ایسا ہرگز ہرگز نہیں ہے۔ جیسا کہ میں نے لوگوں کی زبانی سنا ہے کہ وہ ایک ظریف طبع، خوش مزاج، ملنسار، سوشل اور دلچسپ انسان بھی ہیں۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں چند مثالیں پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

''گذشتہ دو برسوں میں مجھے کچھ پرانی کتابیں دیکھنے اور خریدنے کا اتفاق ہوا۔ زرِ خرید کتب میں ایک کتاب (کتابچہ) ''باغِ فکر معروف بہ مقطعات نساخ'' بھی دستیاب ہوئی۔ بھوپال میں جب سے دیوانِ غالبؔ کوڑیوں کے مول بکا ہے اور اس کے بعد اس کا لاکھوں کا ویاپار ہوا۔ اب یہاں کتب کے تاجروں کے نزدیک ہر پُرانی کتاب، دیوانِ غالبؔ کا قلمی نسخہ ہے''۔[۷]

''ایک صاحب عشق فرمایا کرتے تھے۔ محبوبہ نے کسی مقام پر اُن سے ملنے کا وعدہ کیا۔ وہ صاحب فرمانے لگے:

میری جان، دنیا کی کوئی طاقت مجھے تم سے ملنے سے نہیں روک سکتی۔ تمام پہروں کو توڑ کر میں تم سے ملنے آؤں گا۔ لیکن ایک شرط ہے۔ محبوبہ نے سنجیدہ ہو کر پوچھا: وہ کیا؟

انھوں نے کہا: اگر بارش ہوئی تو نہیں آسکوں گا۔''

(د) شدید جذبۂ حب الوطنی:۔

خالد عابدی صاحب کو اپنے وطن، ہندوستان جنت نشان سے دلی اور والہانہ محبت ہے۔ وہ ہندو مسلم سکھ عیسائی بھائی چارہ کے حامی ہیں اور غیر مذہبی (Secular) نظریات کے پر جوش مبلغ اور وکیل ہیں۔ انھیں اپنے وطن کی سیاست سے بھی دلچسپی ہے لیکن بس وہی سیاست جو تعمیری ہو۔ جس میں فرقہ وارانہ تنگ نظری، صوبائی اور لسانی عصبیت نہ ہو۔ جو ہمارے اذہان کو غلامی کے بجائے آزادیِ فکر، آزادیِ رائے اور آزادیِ عمل دے سکے۔ چند جملے غور طلب ہیں:

''آج جب کہ کلکتہ اپنی تاسیس کا تین سو سالہ جشن منا رہا ہے تو بھوپال کا کلکتہ سے جغرافیائی فاصلہ کوسوں دور سہی تاہم کلکتہ کی باشندہ اور فن کارہ شرمیلا ٹیگور عرف عائشہ سلطان نے بھوپال کی بہو بیگم ہو کر ان فاصلوں کو دلوں کی شاہراہوں سے جوڑ دیا ہے۔[۸]

نازشؔ کا تصور آزادی محض بدیسی راج سے چھٹکارا حاصل کر لینے تک محدود نہیں تھا۔ ان کے نزدیک آزادی اس وقت مکمل ہوتی ہے جب غلامی کے ساتھ ساتھ اہلِ وطن سماجی اور اخلاقی عیوب

سے چھٹکارا پا جائیں اور صالح اخلاقی اقدار پر مبنی ایک صاف ستھرا معاشرہ معرض وجود میں آ جائے"۔ [9]
مذکورہ بالا تخلیقات کے علاوہ ہمیں خالد عابدی صاحب کے یہاں گہرا اخلاقی شعور تاریخی معلومات، تذکرہ نگاری اور خطوط نویسی کے بھی عمدہ نمونے ملتے ہیں آل انڈیا ریڈیو سے طویل وابستگی۔ ریڈیو ڈرامے سے دلچسپی اور فلم انڈسٹری سے عملی تعلق نے محمد خالد عابدی کو مدھیہ پردیش ہی کیا بلکہ پورے ہندوستان کا قابل فخر سپوت بنا دیا ہے۔

حواشی

1. باغ فکر معروف بہ مقطعات نساخ۔ بار اول ۱۹۷۷ء ص ۴۷
2. ہفت روزہ ہماری زبان نئی دہلی ڈاکٹر ابو محمد سحر نمبر یکم تا ۱۳ مارچ ۲۰۰۵ صفحہ ۱۰
3. مضامین خالد (مضمون فراق کی تحریروں میں شعرا مدھیہ پردیش) ۱۹۹۵ء ص ۲۹
4. مضامین خالد (مضمون ناز پرتاپگڑھی کی شاعری میں قومی یک جہتی) ص ۱۴۸۔۱۴۷
5. باغ فکر معروف بہ مقطعات نساخ ص ۵۳
6. باغ فکر معروف بہ مقطعات نساخ (مقدمہ) ص ۴۵
7. مضامین خالد (مضمون رضا نقوی واہی) ص ۱۰۳
8. مضامین خالد (مضمون نواب شاہجہاں بیگم) ص ۹۵
9. مضامین خالد (مضمون نازش پرتاپگڑھی) ص ۱۴

محمد خالد عابدی۔ ایک معتبر محقق

نورالہدیٰ

علم وادب کی دنیا میں قلم کا سفر بھی عجیب وغریب ہے۔ یہ دو نادیدہ مسافر کو اتنا قریب کر دیتا ہے کہ برسوں کی رفاقت کا احساس ہو۔ محمد خالد عابدی ایسے ہی لوگوں میں سے ایک ہیں۔ میں نے اُن کی تخلیقات کے وسیلے سے جاننے کی کوشش کی ہے اور ان کے فکر وفن کا محاسبہ حتی الوسع کیا ہے۔ ان کے تصویری قیافہ اور تحریری فراست (فراست الید) سے ان کے کردار وعمل کی خوبیاں ظاہر ہوتی ہیں اور تلاش وتحقیق کی راہ میں ان کے عزم واستقلال اور ذوق وشوق کا پتہ چلتا ہے۔

عابدی صاحب کا تحریری کینواس بہت وسیع اور مختلف الجہات ہے۔ نثر کے ایسے ایسے موضوعات پر انھوں نے خامہ فرسائی کی ہے جو اپنے مزاج، مواد اور فکر وفن کے اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہیں" مضامین خالد" کے تنوع کا یہ عالم ہے کہ ایک ہی کتاب میں ڈرامہ نگاری، قدیم رسائل کے جائزے، شعراء کے تذکرے، خطوط ومراسلات، شخصیات وشاعری، سفرنامہ، طنز ومزاح، افسانہ اور لوک گیت جیسے اصناف ادب شامل ہیں ایسے تمام مضامین کے مطالعے سے موصوف کے تبحرعلمی اور عالمانہ انداز فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جبکہ علم کی حدیں اتنی وسیع نہیں تھیں تو ایک ہی صاحب قلم بہت سارے علم پر قدرت رکھتا تھا لیکن آج کے ترقی یافتہ دور میں ایسی مثالیں کم دیکھنے میں آتی ہیں۔

مذکور بالا تمام اصناف نثر میں جو قدر مشترک ہے وہ تحقیق یا ریسرچ ہے۔ ہر مضمون تحقیقی عمل کا نتیجہ ہے۔ اور تحقیق نہایت دیانت داری اور تلاش وجستجو کی زحمتوں سے گذرنے کے بعد منظر شہود پر آئی ہے۔ عابدی صاحب کا علمی وتحقیقی سفر (۷۰) ستر کی دہائیوں سے شروع ہوتا ہے۔ اس لئے ان کی تحقیق کا عمل بھی نہایت عالمانہ اور مدبرانہ ہے ورنہ آج کے تحقیق نگار جس سہل پسندی کے شکار ہیں اور اس فن کے جس طرح ایک کاٹج انڈسٹری کی شکل اختیار کرلی ہے اسے زبان وادب کی بدنصیبی سمجھنا چاہئے۔

محمد خالد عابدی کی دو چھوٹی چھوٹی کتابیں راقم السطور کے مطالعہ میں رہی ہیں۔ کہنے کو تو یہ چھوٹی ہیں لیکن ان میں علم وفن کا بڑا بھاری ذخیرہ موجود ہے۔ دونوں میں اور بجنل، تحقیق کا نہایت

عمدہ نمونہ ہیں۔ یہ کتابیں ہیں "مضامین خالد" اور "باغ فکر معروف بہ مقطعات نساخ"۔

مضامین خالد میں کل بارہ مضامین ہیں اور ہر مضمون اپنے Nascent State میں ہے مراد یہ کہ تحقیقی اعتبار سے ان میں انفرادیت اور ندرت ہے اور قبل ایسے عنوانات پر توجہ نہیں کی گئی۔ اگر علم و ادب کی دنیا میں دیانت داری کوئی چیز ہے اور علمی معاملات میں اخلاقی ضابطوں سے پرہیز کیا جائے تو قبول کرنے میں قطعی عار نہیں ہونا چاہیے کہ ان مضامین کو پڑھ کر قاری کی علمی معلومات میں اضافہ ہی نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ انھیں Inspire بھی کرتا ہے۔ اوجین کے اردو شعراء۔ آغا حشر پر تعزیتی رپورٹ۔ فصیح الملک ایک قدیم رسالہ۔ نواب شاہ جہاں بیگم، بہزاد لکھنوی کے خطوط اور سید علی شائق دہلوی جیسے مضامین اس زمرے میں آئے ہیں مذکورہ مضامین اور دوسرے باقی مضامین کے بنیادی عناصر حقیقی تحقیق ہیں تحقیقی فن کا ایک تقاضہ یہ بھی ہے کہ کم سے کم الفاظ استعمال کیے جائیں اور حقائق کے اظہار میں حاشیہ آرائی سے پرہیز کیا جائے۔ یہ خوبیاں عابدی صاحب کے یہاں موجود ہیں۔ وہ حقائق کو ان کے صحیح اور جامع تناظر میں پیش کرتے ہیں۔

"مضامین خالد" کی ایک ندرت یہ ہے کہ ہر مضمون کا شان نزول اور اس کے جمع و خرج کی تفصیل بیان کی گئی ہے جو بذات خود عابدی صاحب کی تحقیقی بصیرت پر دلالت کرتی ہے اور اس بات پر بھی کہ ع

خون رگ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر

چند اقتباسات نذر قارئین ہیں پہلا مضمون اوجین کے ہندو شعراء کی اردو خدمات پر ہے۔

یہ ہمارے اس تحقیقی سلسلے کا ایک حصہ ہے جو کہ میں ایک عرصہ سے مدھیہ پردیش میں اردو زبان و ادب کے موضوع پر یکجا کر رہا ہوں چمنستان خلیل ریاست ٹونک (راجستھان) سے ۱۹۰۰ء میں شائع ہو رہا تھا۔ ریوا میں دوران ملازمت (آل انڈیا ریڈیو) حافظ محمد فیضان خاں حافظ نظامی ریوانی کا ذخیرہ کتب دیکھنے کا اتفاق ہوا "چمنستان خلیل" انھیں کی ملک ہے" وغیرہ۔

محمد خالد عابدی کا دوسرا تحقیقی کارنامہ "باغ فکر معروف بہ مقطعات نساخ" ہے۔ اس کتاب کو انھوں نے بنگال کے معروف اردو دوست اور محقق شانتی رنجن مرحوم کی نذر کی ہے اور اپنی تحقیقی جدوجہد میں وہ ان سے متاثر بھی ہیں شانتی رنجن بنگال کے چند اچھے محققوں میں سے تھے اور اردو زبان پر عالمانہ دسترس کے فقدان کے باوجود جو خدمتیں انھوں نے اردو کے لئے انجام دی ہیں وہ اردو تحقیق میں اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آنے والے دنوں ہندوستان کے اردو دانوں کے لیے علم کے بعض شعبے میں ان کی کتابیں ریفرنس کے طور پر استعمال ہوں گی۔

سید لطیف الرحمٰن مرحوم مدرسہ عالیہ کلکتہ میں تقریباً پندرہ سال تک راقم التحریر کے رفیق درس و تدریس رہے انھیں اپنی کتاب ''نساخ سے وحشت تک پر بڑا فخر تھا اور بلا شبہ اس کے وہ مستحق بھی تھے لیکن ''باغ فکر'' کے حوالے سے محمد خالد عابدی نے عبدالغفور نساخ حیات و خدمات کا جو تعارف کرایا ہے نسبتاً زیادہ جامع ہے ''باغ فکر'' کی تلاش و جستجو میں موصوف نے جتنی عرق ریزی کی ہے اور ضبط و تحمل کو راہ دی اس سے ان کی تحقیقی ژرف نگاہی کا ثبوت ملتا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے تقریباً چالیس پچاس مشاہیر علم و فن سے راہداری پیدا کی اور مراسلات و استفسارات کی بے شمار زحمتوں سے گذرے۔ اکثر انھیں بعض شاعر و ادیب کی نازک مزاجیاں بھی برداشت کرنا پڑیں لیکن ان باتوں سے عابدی صاحب کے استقلال اور تحقیقی لگن میں رخنہ نہیں پڑا۔ ''عرض مرتب'' کے عنوان سے انھوں نے ایک طویل فہرست ان مربیان عصر کی دی ہے جن کی فراہم کردہ معلومات سے انھوں نے استفادہ کیا ہے ان میں مولانا امتیاز علی عرشی، جوش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد، رشید احمد صدیقی۔ ظ انصاری، قاضی عبدالودود، علی سردار جعفری، عطا کاکوی ڈاکٹر گیان چند، نثار احمد فاروقی مکیش اکبرآبادی، ڈاکٹر نورالحسن اور دوسرے اکابر قلم ہیں۔

عابدی صاحب اپنے تحقیقی سفر میں کتنے پیچ و خم سے گذرے ہیں اس کا اندازہ ''باغ فکر'' پر لکھے ہوئے مقدمہ کو پڑھ کر ہوتا ہے۔ موصوف کا تحقیقی فن کسی مسئلے کو ادھورا نہیں چھوڑتا ہے بلکہ مسئلے کو حتمی فیصلے تک پہونچاتا ہے۔ اس کتاب میں نساخ کی شخصیت، تصانیف اور تالیفات کا محاسبہ جس جامعیت کے ساتھ کیا گیا ہے وہ دوسری کتابوں میں نہیں ملتا۔ نساخ کی کتابوں کی فہرست اور ہر کتاب کے بعض موضوع کی وضاحت انھوں نے نہایت تشفی بخش طور پر کی ہے۔ اس مقدمہ میں عابدی صاحب کی تنقیدی صلاحیتیں بھی سامنے آتی ہیں۔ لازماً تحقیقی کام سنجیدہ تنقید کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ ''مقطعات نساخ'' پر تبصرہ و تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''باغ فکر'' میں فن ہے فکر نہیں۔ باغ فکر کی شاعری سادگی اور سلاست کا نمونہ ہے۔ اور معاملہ بندی کا اثر بھی قبول کئے ہوئے ہے۔ بلندی خیال پر گرفت کمزور ہے۔ اس لئے کلام میں باریکی بھی خال خال ہے۔ باوجود چند معمولی کمزوریوں کے باغ فکر کا اردو ادب میں ایک خاص درجہ ہے۔

نساخ کی شاعری (باغ فکر کے حوالے سے) سے متعلق خالد عابدی کا یہ تنقیدی جائزہ نہایت متوازن ہے نساخ کی خدمات زبان و ادب اور معراج فکر و فن سے قطع نظر ان کی شاعری کے بارے میں مشاہیر علم بہت اونچی رائے نہیں رکھتے تھے۔ ڈاکٹر گیان چند رقمطراز ہیں۔ ''نساخ یا کسی دوئم وسوئم درجے کے ادیب کے بارے میں یکجا معلومات نہیں مل سکتیں ۔۔۔'' گیان چند کے محاسبے

کے پس منظر میں عابدی صاحب کی تنقید حقیقت سے قریب ہے۔ تنقید کے معیار اور تخلیق کے معیار میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ تخلیق اگر اعلیٰ پائے کی ہو تو تنقید کا معیار بھی بلند ہوتا ہے۔ بلاشبہ تنقید کے کچھ بنیادی اصول وضوابط ہیں لیکن یہ کوئی جامد اور غیر متحرک فن نہیں ہے۔ تخلیق کی جمالیات تنقیدی عمل کو متاثر کرتی ہے۔ اس کی روشنی میں تنقید نگار مروجہ اصولوں سے قطع نظر فن تنقید کے نئے اور نادر نکتے تلاش کر لیتا ہے۔

عابدی صاحب جبلی طور پر ایک محقق کا دل و دماغ رکھتے ہیں۔ اس کا اندازہ کتابوں کی اس فہرست سے بھی ہوتا ہے جس کی اشاعت متوقع ہے۔ (ممکن ہے ان میں سے بعض شائع بھی ہو چکی ہوں) اکیس (۲۱) کتابوں میں سے بیشتر کا تعلق تحقیق و تنقید سے ہے۔ مدھیہ پردیش میں امیر مینائی داغ دہلوی مضطر خیر آبادی سیماب اکبر آبادی احسن مارہروی کے تلامذہ کی تلاش اور ان کا تذکرہ ایک تحقیقی جہاد سے کم نہیں ہے ان کے علاوہ مدھیہ پردیش کے حوالے سے افسانہ نگاری، طنز ومزاح، خواتین قلم کار، ہندو شعراء و ادباء لوک گیت کا فن۔ اخبار و رسائل وغیرہ ایسے موضوعات میں کلی طور پر تحقیق و جستجو سے تعلق رکھتے ہیں۔

ایک ایسے دور میں جبکہ اردو کی دنیا کمٹی جا رہی ہے اور صف اول کے ادیب و شاعر کا حلقہ محدود ہوتا جا رہا ہے۔ محمد خالد عابدی کی تحقیقی و علمی سرگرمیاں نہایت محترم اور قابل ستائش ہیں۔

محمد خالد عابدی: ایک جفاکش محقق اور نقّاد

ڈاکٹر رضیہ حامد

خالد عابدی نے بھوپال کی پہاڑیوں اور جھیلوں کی سختی اور نرمی کے درمیان زندگی کے نشیب وفراز طے کیے اس سے ان کے مزاج میں نرمی، انکساری تو آنا لازمی تھا ہی مگر کسی کام کو بہتر طور پر انجام کرنے کی لگن، تڑپ مستعدی جفاکشی بھی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ وہ کام کے دھنی ہیں جس سمت چل دیں راستہ بناتے جاتے ہیں۔ اس کا ایک ثبوت ان کی لائبریری مکتبہ عابدیہ ہے۔ بھوپال کے فرماں رواؤں کو جب بھی جنگ وجدل سے راحت ملی انھوں نے علم وعالم کی تلاش اس کے فروغ کی کوشش کی۔ اور ریاست بھوپال کے اہل علم اور صاحب ذوق حضرات کو اس وقت کتب تقسیم کی جاتی تھیں جس سے گھروں میں کتابیں رکھنے کا چلن عام ہوا اور لوگوں کی دلچسپی کتاب کے تئیں بیدار ہوئی کئی پرانی اور نایاب کتب کو بھوپال کے فرماں رواؤں نے دوبارہ مرتب کروایا اور طبع کیا۔ خالد عابدی کے کتابوں جمع کرنے کے شوق کی وجہ سے ایک کتابچہ ''باغ فکر معروف بہ مقطعات نساخ'' پر نظر پڑی اور انھوں نے اس کو بصد شوق خرید لیا۔ تحقیق وجستجو خالد عابدی کے مزاج کا حصہ ہے اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ان کو اندازہ ہوا کہ یہ کوئی معمولی کتاب نہیں۔ نساخ کی اس کتاب ''باغ فکر معروف بہ مقطعات نساخ'' کے متعلق انھوں نے جہاں سے بھی مواد ملا جو بھی ملا جمع کرنا شروع کر دیا۔ لوگوں کو خطوط لکھے اتنے لکھے کہ صاحب مکتوب کو جواب دینا دوبھر ہو گیا مگر خالد تھک کر نہیں بیٹھے۔ نساخ پر کام کرنے والے بڑے بڑے دانشوروں نے اس بارے میں لاعلمی اور کم علمی کا اعتراف کیا۔ کہ ان کی نظر سے نساخ کی یہ کتاب نہیں گذری یا پھر میری معلومات آپ کی معلومات سے بدرجہا کم ہیں، خالد عابدی نے ہندوستان کی بڑی بڑی لائبریریوں سے معلومات حاصل کیں ان سب کا جواب کہ نساخ کی یہ کتاب لائبریری میں موجود نہیں ہے، موصول ہوئے۔ سب سے آخر میں انھوں نے انڈیا آفس لائبریری لندن سے رجوع کیا وہاں سے بھی اس کی عدم موجودگی کی خبر ملی۔ وہیں اس طویل عرصہ مطالعہ اور تلاش سے ان کو نساخ پر لکھنے والوں کی لاعلمی لاپرواہی اور غلطیوں کا احساس ہوا ان تمام خط وکتابت اور کتاب کی عدم دستیابی نے خالد عابدی کے شوق کو مہمیز کیا کہ وہ اس کتابچہ باغ فکر معروف بہ مقطعات نساخ'' کو مرتب کریں۔

خالد عابدی نے مختلف کتب اور رسالہ کی مدد سے عبدالغفور نساخ کی سوانح اور ادبی خدمت پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ نساخ کا تعارف کراتے ہوئے خالد عابدی لکھتے ہیں۔

"بنگال کی سرزمین بجا طور پر فخر کر سکتی ہے کہ عبدالغفور نساخ ایسا شاعر اور مسلم الثبوت استاد نے اس کے یہاں جنم لیا۔ نساخ بیک وقت ایک شاعر ایک اچھے نثر نگار، بہترین تذکرہ نگار، تاریخ گو اور فن عروض کے ماہر تھے۔"

نساخ کے تعلقات اپنے ہم عصر شعراء اور اہل دانش سے قائم تھے خالد عابدی نے ان سے غالب کی ملاقات ان کو دفتر بے مثال بھیجنے اور غالب کے انتقال پر تاریخ کہے جانے کا ذکر کیا ہے۔ غالب نے کتاب کے جواب میں جو خط تحریر کیا ہے تم دانائی رموز اردو زبان ہو۔ سرمایہ نازش قلم و ہندوستان ہو (ص ۳۱) نساخ نے غالب کے انتقال کی دو تاریخیں کہیں تھیں ایک اردو میں اور دوسری بنگلہ میں۔ اردو تاریخ۔

کیونکر نہ ہو الم دل ہر درد کو میرے	غالب کے غم میں کرتی ہے یک خلق ہائے ہائے
نساخ سال فوت کی مجھ کو ہوئی جو فکر	بولی خرد وہ شنبہ ذیقعدہ وائے وائے (ص ۳۲)
	۱۲۸۵

نساخ کی علمی و ادبی کاوشوں کا اعتراف کرتے ہوئے خالد عابدی لکھتے ہیں۔

"نساخ نے بنگال میں اردو کی جو خدمت کی ہے اسے تنگ نظر مورخ بھی فراموش نہیں کر سکے گا۔ اور یہ دعویٰ ہے کہ بنگال کی اردو تاریخ نساخ کے بغیر نامکمل تصور کی جائے گی انھوں نے اپنے پیچھے اردو ادب کا ایک کثیر سرمایہ چھوڑا ہے جو اس بات کا غماز ہے کہ نساخ باوجود ہمہ تن مصروف رہنے کے اپنے لکھنے پڑھنے کا وقت نکال لیا کرتے تھے۔ نساخ کو ان کی یہ محنت اور کاوش نہ صرف بنگال میں بلکہ تمام اردو دنیا میں بلاشبہ ہمیشہ زندہ رکھیں گی"۔ (ص۔۴۰)

ایک جگہ اور خالد عابدی نے نساخ کی عظمت اور ان کے کام کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہاں خالد عابدی صداقت اور راستی کے علم بردار نظر آتے ہیں ان کا انداز تحریر پختہ اور پُر اعتماد ہے وہ لکھتے ہیں:۔

"نساخ کی اور تصانیف کے ساتھ ان کا شاہکار تذکرہ "سخن الشعراء" نیز ان کے فن و شخصیت کو پڑھ کر ہی ہم کلکتہ اور بنگال میں اردو کا جائزہ لے سکیں گے۔ خواہ کتنا ہی تنگ نظر مورخ کیوں نہ ہو نساخ کے تذکرے سے انحراف کرنے پر اسے ٹھوکریں لگ سکتی ہیں۔ اگر وہ ایمانداری سے نساخ کا حق ادا کرتا ہے تو وہ تاریخ ادب اردو کی کئی زنگ آلود کڑیاں صاف کر سکے گا

ورنہ وہ خود پابہ زنجیر ہو جائے گا"۔(ص ۲۶)

خالد عابدی نے اپنے پیش روؤں کے نساخ پر کیے کاموں میں اضافہ کیا ہے انھوں نے عبدالغفور نساخ کی ۴۳ کتب کا تعارف پیش کیا ہے خالد عابدی نے ان اغلاط کی نشاندہی بھی کی ہے جو کسی نہ کسی سبب سے نساخ کی کتب سے منسوب ہو گئیں۔

خالد عابدی بتاتے ہیں کہ۔

"قطعہ منتخب" کو جو نساخ کا تالیف کردہ تذکرہ ہے۔ پروفیسر جاوید نہال ہاشمی نے انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب" میں اسکا نام قطعہ منتخبہ، لکھا ہے جو غلط ہے۔ خالد عابدی نے بڑی کاوش و دیدہ ریزی سے مختلف لوگوں کے نساخ پر کیے کاموں کا جائزہ لیا اور موازنہ کیا ہے۔

"چشمہ فیض" کے متعلق در آئی غلطی کی نشاندہی کرتے ہوئے اپنی بات کو دلیل و ثبوت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ جاوید نہال ہاشمی پند نامہ، اور" چشمہ فیض" کو دو الگ الگ کتابیں لکھا ہے جبکہ وہ ایک ہی کتاب ہے۔ پروفیسر جاوید نہال ہاشمی نے اسکو ۴۸ صفحات پر مشتمل بتایا ہے حقیقتاً اس کے ۳۹ صفحات ہیں۔ خالد عابدی آگے لکھتے ہیں۔" چشمہ فیض" دراصل فارسی کے مشہور شاعر فریدالدین عطار کے 'پند نامہ' کا اردو ترجمہ ہے۔ اور صنف کے طور پر یہ مثنوی ہے۔ نساخ نے تتمہ پر تاریخی قطعہ خود لکھا ہے۔

پند نامہ شیخ عطار کا ترجمہ نساخ جو میں نے کیا
دھیان آیا یک بیک تاریخ کا خوب زیبا ترجمہ دل نے کیا
۱۲۷۶ھ (ص ۲۹)

خالد عابدی نے بہت عمیق نظر سے نساخ کی تصانیف کو دیکھا اور پرکھا ہے لوگوں نے اکثر جگہ تاریخ طباعت غلط تحریر کر دی ہے خالد عابدی نے ان کی نشاندہی کی ہے۔

ارمغان (۱) اس کے سن اشاعت میں اختلاف ہے (ص ۳۰)

۲۔ پروفیسر اقبال عظیم پروفیسر جاوید نہال ہاشمی اور سید لطیف الرحمن نے اپنی کتابوں میں سنہ اشاعت ۱۲۹۲ھ لکھا ہے جبکہ پروفیسر حسن عظیم آبادی نے اپنے مضمون "نساخ کے ایک ناقد" میں سال ترتیب ۱۲۹۲ھ اور سال طباعت ۱۲۹۴ھ نظامی پریس آگرہ لکھا ہے (حاشیہ ص ۳۰)

دفتر بے مثال ۱:۔ دفتر بے مثال، کی ترتیب اور اشاعت میں شدید اختلاف ہے

۲:۔ نساخ سے وحشت تک" میں مؤلف سید لطیف الرحمن نے تاریخ اشاعت ۱۲۷۶ھ درج کی ہے اور اپنے مضمون" نساخ اور اس کے کارنامے" (نوائے ادب بمبئی ماہ اکتوبر ۱۹۶۰ء میں

تاریخ اشاعت ۱۲۷۲ھ لکھی ہے۔ نیز پروفیسر جاوید نہال ہاشمی نے ۱۲۷۶ھ لکھی ہے اور پروفیسر حسن عظیم آبادی ''نساخ کے ایک ناقد'' ص ۴۸

سہ ماہی خرام چاٹگام جلد ۱ شمارہ ۱ ص ۲۱) میں لکھتے ہیں کہ دفتر بے مثال مظہر العجائب پریس کلکتہ سے ۱۲۸۰ھ میں اور دوسری بار نول کشور پریس سے ۱۲۹۱ھ میں چھپا (حاشیہ ۳) کتابچہ باغ فکر کے تعارف میں خالد عابدی لکھتے ہیں۔

نساخ کی یہ تصنیف بہت کم لوگوں کے علم میں ہے اس تصنیف کا پورا نام ''باغ فکر معروف بہ مقطعات نساخ'' ہے۔ اس کتاب کے تعارف میں پروفیسر اقبال عظیم رقم طراز ہیں کہ۔

''باغ فکران کی (نساخ) سوانح حیات اور قطعات پر مشتمل ایک کتابچہ ہے''۔

لیکن باغ فکر میں سوانح حیات نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ صرف نساخ کے قطعات پر مشتمل ۴۴ صفحات کا ایک کتابچہ ہے جو ان کے انتقال سے دو سال قبل طبع ہوا تھا اس کے آخر میں یہ اندراج ہے۔

''مطبع نامی لکھنؤ ابوالحسنات قطب الدین احمد کے اہتمام سے بار اول ماہ رمضان المبارک ۱۳۰۴ھ مطابق ماہ جون ۱۸۸۷ء میں طبع ہوا'' اور ابتداء حسب ذیل قطعہ سے ہوتی ہے۔

ورد رکھ نساخ تو ہر وقت نام اللہ کا   مشکلیں جتنی ہیں ہو جائیں گی آساں سر بسر

گوش جان و دل سے سن ہر دم کلام اللہ کا   آتشِ دوزخ بھی تجھ پر حشر میں ہوگی حرام

(ص ۳۸)

نساخ کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے خالد عابدی لکھتے ہیں۔

''نساخ نے زیادہ سے زیادہ کہنے اور طویل سے طویل غزل کے زعم میں اپنی غزلوں میں ہر وہ قافیہ بھی استعمال کرلیا ہے جو اس ذیل میں آسکتے تھے انھوں نے منتخبہ قوافی سے ہٹ کر بھرتی کے قوافی استعمال کئے اور یہ نقص غزل کے مزاج پر بار گراں ثابت ہوا'' ص ۴۰۔

خالد عابدی نے بتایا ہے کہ نساخ کی تمام کتابوں کے نام تاریخی ہیں اس لئے باغ فکر نام بھی تاریخی ہے جس کے اعداد ۱۳۰۳ ہوتے ہیں کتاب چھپتے وقت ۱۳۰۴ میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کے ۴۴ صفحات ہیں اختتام اس شعر پر ہوتا ہے۔

جوہر ہیں اس میں ایسے کہ ہر دلعزیز ہے   سب عاشقوں کو خنجر قاتل عزیز ہے

باغ فکر صفحہ ۴۴ پر ہی ختم ہوتا ہے اور اسی صفحہ پر اس کا ترقیمہ بھی ہے ملاحظہ فرمائیے۔

مطبع نامی لکھنؤ ابوالحسنات قطب الدین احمد کے اہتمام سے بار اول ماہ رمضان المبارک ۱۳۰۴ھ

مطابق ماہ جون ۱۸۸۳ء میں طبع ہوا۔ (ص ۵۹)

باغ فکر کی شاعری پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے خالد عابدی لکھتے ہیں باغ فکر میں "فن" ہے فکر نہیں۔ فکری شاعری کے لئے شدید توجہ اور انہماک ضروری ہوتا ہے ہاں جذباتی شاعری کی گدگداہٹ "باغ فکر" میں ضرور ملے گی۔ "باغ فکر" کی شاعری سادگی اور سلاست کا نمونہ ہے اور معاملہ بندی کا بھی اثر قبول کئے ہوئے ہے۔ بلند خیال پر گرفت کمزور ہے۔ اس طرح کلام میں "باریکی" بھی خال خال ہے لیکن کلام میں شدید تڑپ کی ٹیس محسوس کی جاسکتی ہے"۔ (ص ۶۷)

خالد عابدی نے باغ فکر مرتب کر کے شائع کروایا ان کا یہ کام اردو ادب کے خزانے میں بڑا اضافہ ہے۔ خالد عابدی کی لگن اور محنت نے نساخ کے کلام کو ضائع ہونے سے بچالیا۔ یہ ان کا تنقیدی شعور، محققانہ فکر اپنی روایات اور قیمتی اثاثہ کی حفاظت کا جذبہ ہے۔ جو علم و ادب کے میدان میں کئی منزلیں طے کرنے کے لئے اکسا تا رہتا ہے ان کے نقد و تحقیق کے اگلے شاہکار کا انتظار ہے۔

باغ فکر معروف بہ مقطعات نسّاخ۔ ایک تدوین

ڈاکٹر انیس سلطان

تدوین بڑی پتہ ماری کا کام ہے اس کے لئے ذوقِ سلیم کے ساتھ ساتھ کرم خوردہ کتابوں کا الف سے یٰ تک مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ گاہے گاہے کسی اہم کتاب کے اگر ایک سے زیادہ نسخے (مطبوعہ یا غیر مطبوعہ) دستیاب ہیں تو ان کا دقت نظر سے جائزہ لے کر صحیح متن کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ کبھی صحیح وغلط کا حتمی فیصلہ نہ کر سکنے کی صورت میں فنی دشواریاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔

یہ ساری محنت اسی وقت بار آور ہو سکتی ہے جب کوئی قدیمی نسخہ اس ادبی اہمیت کا حامل ہو۔ کبھی وہ ادب کی تاریخ متعین کرنے میں معاون ہو سکتا ہے تو کبھی اس عہد کے رنگ اور مزاج یا کسی خاص نظریے کو سمجھنے میں اس کی ضرورت ہوتی ہے۔

ادبی تحقیق میں متن کے صحیح وغلط ہونے سے بعض اہم نتائج بھی سامنے آسکتے ہیں کتب خانوں کا اس ضمن میں اہم حصہ رہا ہے۔

خالد عابدی ایک ایسا ہی نام ہے انھیں کثرت مطالعہ سے شغف بھی ہے اور قدیم کتابوں کی اہمیت سے واقف بھی ہیں۔ ان کی نجی لائبریری اس ذوق کی گواہ ہے۔ "باغ فکر" کی تدوین انھوں نے اس عمر میں کی جب ایسے سنجیدہ علمی کام کی توقع بہت کم کی جا سکتی ہے۔ ایشاٹک سوسائٹی آف بنگال میں باغ فکر کا ایک نسخہ محفوظ تھا۔ نساخ کی تصنیف "باغ فکر معروف بہ مقطعات نساخ" ۱۸۷۷ء میں مختصر دیباچہ کے ساتھ شائع ہوئی۔ پروفیسر اقبال عظیم نے "مشرقی بنگال میں اردو" میں باغ فکر کو نساخ کی سوانح حیات اور قطعات پر مشتمل کتابچہ بتایا تھا۔ خالد عابدی کے بیان کے مطابق یہ نساخ کے قطعات پر مشتمل ۴۴ صفحات پر مشتمل ایک کتابچہ ہے جو ان کے انتقال سے دو سال قبل شائع ہوا تھا!

تدوین نو کے علاوہ نساخ کی نثر، نظم، تحقیقی و تنقیدی کاوشوں کا سرسری جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ نساخ کو مشاہیر کے کلام پر اعتراض کرنے کی دھن تھی اور چونکہ اس موضوع پر پہلے سے سید لطیف الرحمن کی کتاب 'عبدالغفور کے معرکے' اور رضا علی وحشت کلکتوی کا مضمون "عبدالغفور نساخ" لکھے جا چکے تھے۔ اس لئے آپ نے اس موضوع پر لکھنے سے گریز کیا ہے۔ نساخ کی

شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے مختصر فقروں کے ذریعے نفس مضمون تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں اور بعض اہم نتائج اخذ کرتے ہیں۔ مثلاً نساخ کی شاعری میں فلسفیانہ خیالات کی کمی، ان کا میدان غزل اور تاریخ گوئی قرار دیتے ہیں اس کے علاوہ رباعی بھی لکھی ہے فن میں پختگی تھی اور کئی معرکے سر کر چکے تھے اس لئے مزاج میں تعلی کی صورت پیدا ہو گئی تھی۔

''نساخ کی شہرت تذکرہ نگار کی حیثیت سے زیادہ ہے۔ بنگال میں آپ نے اردو کی اہم خدمت انجام دی ہے۔''[۲]

تذکرہ سخن شعراء میں بنگال اور بہار کے غیر معروف شعراء بھی منظر عام پر آگئے ہیں اس لئے آپ بجا طور پر یہ لکھنے کے مجاز ہیں۔ ''یہ دعویٰ ہے کہ بنگال کی اردو تاریخ نساخ کے بغیر نامکمل تصور کی جائیگی۔'' نساخ کی تمام تخلیقات کا مختصر تعارف پیش کیا ہے ۱۹۷۵ء میں ''باغ فکر'' دریافت ہوئی۔ دو سال تک ضروری شواہد بہم پہنچانے میں کوشاں رہے اور ۱۹۷۷ء میں باغ فکر کی تدوین نو ایک معتبر تبصرہ کے ساتھ عمل میں آئی۔

نساخ ابتدائی عہد میں مجبور تخلص رکھتے تھے۔ باغ فکر آخری عہد کی کاوش ہے اور بقول خالد عابدی:

''باغ فکر میں فن ہے فکر نہیں فکری شاعری کے لئے شدید توجہ اور انہماک ضروری ہوتا ہے۔ لیکن جذباتی شاعری کی ''گدگداہٹ'' ''باغ فکر'' میں ضرور ملے گی۔ یہ شاعری ''سادگی اور سلاست'' کا نمونہ ہے اور معاملہ بندی کا اثر بھی قبول کئے ہوئے ہے۔ ''بلندی خیال'' پر گرفت کمزور ہے کلام میں باریکی بھی خال خال ہے۔''[۳]

موجودہ ترتیب و تدوین میں سرورق کی اصل ہیئت کو عکسی تصویر کے ذریعہ برقرار رکھا گیا ہے۔ سرورق پر باغ فکر کا سنہ اشاعت ۱۳۰۳ھ درج ہے اور اسے معروف بہ ''مقطعات نساخ'' کہا گیا ہے مصنف کا نام اور خطابات کے علاوہ باریک حروف میں تمام دیگر تصانیف کے نام بھی درج ہیں۔ ان مقطعات میں صرف حسن و عشق کے موضوعات نہیں ہیں۔ اس امر کی طرف بھی اشارہ ہونا چاہئے تھا کہ یہ مقطعات، ردیف وار، ہیں زیادہ تر مقطعات دو اشعار کے ہیں۔ ردیف واؤ میں پچیس اشعار کا ثنائیہ قطعہ بھی ہے۔

یائے تحتانی کی ردیف میں ۱۱۵ اشعار کا ایک قطعہ ہے جس میں فن قصیدہ کی بے اعتدالیوں کا لطیف انداز میں ذکر کیا گیا ہے خالد عابدی کی اس رائے سے کہ ''فن ہے'' ''فکر نہیں'' یہ قطعہ مستثنیٰ ہے۔ اس میں فکر و فن کے ساتھ لب و لہجہ کی شوخی اور طنز کی کاٹ مستزاد ہے۔

قصیدہ ایک وہ اخبار میں نظر آیا   کہ جس سے جوش میں آئی روح حیوانی

قصیدہ وہ کہ تفاخر ہے شیفتہ اس پر　　قصیدہ وہ کہ ہے تحسید جس پہ دیوانی!

بعض قطعات میں صنائع کا التزام ہے کہیں صنعت توشیح ہے کہیں ذوبحرین اور خود نساخ نے صنف توشیح کی نہ صرف یہ کہ وضاحت کی ہے بلکہ ان قطعات کی نشاندہی بھی کی ہے جن میں مختلف طریقوں سے صنعت توشیح کا استعمال کیا ہے۔ فاضل مرتب نے نساخ کی اس جدت طرازی کی طرف بھی اشارہ نہیں کیا ہے۔ بہرحال ایک گمنام مجموعہ کو منظر عام پر لانا بذات خود بہت بڑا کارنامہ ہے۔

حواشی:۔

۱۔ باغ فکر۔ معروف بہ مقطعات نساخ ۱۳۰۳ھ، صفحہ ۲۸

۲۔ باغ فکر معروف بہ مقطعات نساخ ۱۳۰۳ھ صفحہ ۲۶

۳۔ باغ فکر معروف بہ مقطعات نساخ ۱۳۰۳ھ صفحہ ۲۸

محمد خالد عابدی اور ان کا علمی انہماک و تحقیقی ذوق و شوق

ڈاکٹر محمد انصار الحق

زندگی کے سفر میں کبھی کبھی کسی ایسی شخصیت سے ہمکنار ہونے کا موقع نصیب میں آتا ہے جس سے مل کر ایک علمی لگاؤ و خیالات کی ترجمانی کا غنیمت وقت میسر ہو جاتا ہے اور پھر لگتا ہے کہ مل کر باہمی مسرت و شادمانی کے احساسات غالب نظر آتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا جب میں جناب محمد خالد عابدی سے ریڈیو بھوپال کے توسط سے متعارف ہوا تھا۔ موصوف جب بھی ملتے تو یہ ضرور عرض کرتے کہ بھوپال کی تاریخ و تمدن کا ایک علمی سرمایہ نیشنل آرکائیوز میں محفوظ ہے۔ آپ ذرا دلچسپی لیکر بیگمات بھوپال کے سماجی، علمی و ادبی خدمات، بھوپال کے قدیمی پریس، بھوپال کے قدیم دروازے، بھوپال میں واقع تاج محل، تاج المساجد، سر راس مسعود کے قیام بھوپال اور انکی وزارت تعلیم سے متعلق کاغذات، علامہ اقبال اور بھوپال وغیرہ وغیرہ موضوعات پر خصوصی مطالعہ کریں اور دستاویزی شواہد سے ہمیں بھی باخبر کریں۔

خالد عابدی جب بھی مجھے ریڈیو تقریر کے لئے مدعو کرتے ہیں تو ان کے موضوعات ایسے ہوتے ہیں جنھیں تیار کرنے میں تحقیق کے دشوار گزار مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ مجھے بہت پہلے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ موصوف ایک ایسے پروگرام آفیسر ہیں جنھیں علم دوست کہا جا سکتا ہے۔ ساتھ ہی ان کا تحقیق سے گہرا لگاؤ ہے اس کا احساس بھی نمایاں رہا۔ رابطے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ اردو ادب و تحقیق سے بے حد دلچسپی رکھتے ہیں اور وہ لکھتے بھی ہیں، ان کی لکھی ہوئی کتابیں بھی ہیں۔ ساتھ ہی موصوف کو کتابوں ادبی رسالوں کو حاصل کرنے اور انھیں اپنے ذاتی کتب خانے "مکتبہ عابدیہ" میں محفوظ کرنے کا خداداد شوق ہے۔ انھوں نے اپنی سچی لگن اور اردو دوستی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے صرف اردو ادب ہی نہیں بلکہ مختلف موضوعات کی بے شمار کتابیں جمع کی ہیں۔ جو قابل تحسین و صد آفریں ہے۔ دور حاضر میں ایسے لوگ کم ہی نظر آتے ہیں۔ ایک متوسط درجہ کا سرکاری افسر اپنی جائز تنخواہ میں سے کچھ بچا کر کتابیں خریدنے کی مسلسل جرأت کر سکتا ہے یقیناً وہ اس کام کے لئے ایک

دردمند دل رکھتا ہوگا۔ متذکرہ بالا کتب خانہ کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ عابدی صاحب اس تاریخی وتہذیبی شہر بھوپال میں دور حاضر کے ایک عظیم سپوت ہیں جنھیں اللہ تبارک تعالیٰ نے ادبی ذوق وشوق سے معمور کیا ہے۔ وہ کسی تامل کے بغیر حلقۂ علم ودانش واحباب کو اپنے ذاتی کتب خانے کے ملاحظے کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ پھر آپ کی آمد پر مہمان نوازی بھی خوش دلی سے کرتے ہیں۔

آج جبکہ بھوپال میں میرے قیام کو ایک عرصہ گذر چکا ہے کئی ادبی محفلوں، نشستوں، مشاعروں اور دیگر تقریبات میں بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور عابدی صاحب کے بارے میں احباب زمانہ کے خیالات سننے کا بھی موقع ملا۔ آج کے اس مشینی، معروف ترین اور انتشار سے بھری زندگی میں کسی شخص کا اپنے ذاتی مصارف سے کتب خانہ قائم کرنا، رسائل وکتب اور جریدے خریدنا، ان کی جلد بندی وتحفظاتی مسائل سے دوچار ہونا اور متعلقہ اخراجات برداشت کرنا ان کے لئے کس طرح ممکن ہوتا ہوگا۔ ان سب امور کو حسن وخوبی کے ساتھ وہی شخص انجام دے سکتا ہے جس میں مسلسل لگن ومعماروں جیسا جذبۂ دلی ہو۔ ان کا مکتبہ عابدیہ کافی حد تک اردو ریسرچ کی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ کاش شہر کے ادبی ادارے اور شہر کی ممتاز ادبی شخصیتیں ان سے مزید تعاون کریں تو مکتبہ عابدیہ ایک اچھے تحقیقی مرکز کی شکل میں نمودار ہو سکتا ہے۔

موصوف کے متعلق ایک اہم بات یہ ہے کہ ان میں تحقیق، تلاش اور جستجو کی زبردست حس ہے۔ وہ اکثر میرے پاس نیشنل آرکائیوز میں آئے ہیں۔ بھوپال سے متعلق بہت دشوار مشکل مسائل پر ان کا تحقیق کا شوق دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور افسوس اس بات پر کہ انھیں جس معیار کے تحقیقی مواد کی ضرورت ہے وہ ہم مہیا نہیں کر سکے۔ مثلاً وہ ایسے دستاویزات کی تلاش میں سرگرم نظر آئے کہ حفیظ جالندھری کو بھوپال ریاست سے وظیفہ کا اعلان ہوا تھا اس سلسلہ میں انھیں کوئی تحریری ثبوت مہیا ہو جائے۔ مرزا غالب اور شیفتہ کے بھوپال سے روابط پر انھیں دستاویز کی تلاش تھی۔ اور بھی کئی دوسرے دلچسپ موضوعات پر انھیں تحقیقی مواد کی تلاش وجستجو ہے لیکن ہمارے یہاں ایسا کوئی مواد یا دستاویز موجود نہیں تھا۔

موصوف کی ایک ذاتی فائل مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ان کی متوقع کتب اور متوقع مضامین کی فہرست دیکھ کر یہ کہنے میں ذرا بھی تذبذب نہیں ہے کہ آخر یہ شخص تن تنہا اس طرح کا جامع ادبی کام کیسے کر لینا چاہتا ہے۔ یہ سب تو ایک بڑا پروجیکٹ ہے اور ایسے تحقیقی بڑے کام تو بڑا ادارہ، اکادمی ریسرچ سینٹر اور ریاستی ومرکزی حکومت کے فعال اداروں اور اردو سے وابستہ لوگ ہی کر سکتے ہیں۔ موصوف کا موضوع ایسے مشاہیر اردو ادب ہیں جن کے تلامذہ صوبۂ مدھیہ پردیش کے باشندہ

ہوں یا ان تلامذہ کا مدھیہ پردیش میں قیام رہا ہو۔ امیر مینائی، داغ دہلوی، مضطر خیر آبادی، مولانا احسن مارہروی، سیماب اکبر آبادی وغیرہ کے تلامذہ کے بارے میں انھوں نے تقریباً نایاب معلومات فراہم کر رکھی ہیں۔ خصوصاً مدھیہ پردیش میں افسانہ، ڈراما، شاعری اور صحافت وطنز و مزاح جیسے فنون کے فن کاروں کو اور ان کی علمی و ادبی خدمات کی تلاش، ان کی تلاش کا موضوع ہیں۔ علامہ راشد الخیری، مولانا حالی، شیفتہ اور حکیم اجمل خاں سے بھوپال سے روابط پر بھی انھوں نے کافی ادبی مواد تلاش کیا ہے۔ بھوپال کے قدیم پریس اور ان کی شائع کردہ کتابیں اور مدھیہ پردیش کے گمنام تذکرے (گلزار سخن و چمنستان سخن) پر بھی وہ عرصے سے کام کر رہے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ ان موضوعات پر مواد جمع کرنے و ترتیب پر ان کے خاصے مصارف آچکے ہیں۔ متذکرہ فائل سے یہ بات بھی علم میں آتی ہے کہ وہ ذاتی طور پر جو اسکالرس یونیورسٹی سطح پر ایم۔ اے۔ ایم فل، پی۔ ایچ ڈی اور ڈی لٹ کے لئے اردو میں تحقیقی مقالے اور ڈزیٹیشن لکھ رہے ہیں انھیں اپنے مفید اور کارآمد مشوروں سے روشناس کرانا اور تعاون دینا بھی عابدی صاحب نے اپنے اولین فرائض میں شامل کر رکھا ہے۔ ملک کی مشہور ادیبہ قرۃ العین حیدر کے ایک اقتباس سے ان کے اس جذبے کی تائید ہوتی ہے۔

"مجھے علم نہیں کہ یلدرم نے مہاراجا اندور یا نواب باندہ کو خط لکھے تھے۔ ساری زندگی یلدرم نے جو خط دوسرے لوگوں کو بھیجے ان کے متعلق کس طرح معلوم ہو سکتا ہے۔ البتہ نواب باندہ کے نام جو خط آپ نے دیکھا ہے اس کی مکمل نقل (اور فوٹو کاپی اگر ممکن ہو) تو مجھے بذریعہ رجسٹری بھیجدیں۔ ممنون ہوں گی اور کتاب میں آپ کا شکریہ ادا کروں گی"۔

(مکتوب: ۲۹ مارچ ۱۹۹۳ء)

اسی طرح شہر بھوپال کے پروفیسر آفاق احمد صاحب کا ایک خط مورخہ ۲۵ را پریل ۱۹۸۵ء بھی عابدی صاحب کے ادبی شوق کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"۔۔۔آپ میں ادب و تحقیق کا جو سچا مذاق ہے اور جو لگن ہے، اس کی اکثر، اپنی طالبات کے سامنے مثال دیتا ہوں۔ خدا کرے یہ کاروبار شوق یوں ہی جاری رہے۔"

اس کے علاوہ خالد عابدی صاحب نے اپنے متعدد خطوط میں راحت اندوری صاحب جو مشاعروں کا میاب اور مقبول شاعر ہیں انھیں مشاعروں سے متعلق دس بارہ صفحات پر مشتمل معلومات فراہم کی ہے۔ یہ معلوماتی مکتوبات ہم عصر زمانہ میں مشاعروں کی اہمیت، ان کی تاریخی اہمیت وغیرہ وغیرہ نکات پر بھرپور روشنی ڈالتے ہیں۔

اردو زبان و ادب کے نامور قلم کار ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب کی اس تحریر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ۔

"۔۔۔سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اردو زبان و ادب کی تاریخ اور اردو کے سرمائے سے انھیں عشق ہے انھوں نے ادبی و علمی کتابوں کا جو ذخیرہ جمع کیا ہے وہ دوسروں کے لیے مثال کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ لوگ جو ادب کو منافع کا کاروبار سمجھتے ہیں ان کو محمد خالد عابدی کی زندگی سے سبق لینا چاہیئے"۔ دورِ حاضر میں اردو زبان و ادب سے سچی دوستی و لگاؤ رکھنے والے عاشقین کی تعداد سال بہ سال کم ہوتی ہوئی نظر آرہی ہے۔ اور جب واقعی کسی ایسی شخصیت کی کارگذاریاں گنائی جائیں تو علامہ اقبال کا یہ شعر صادق نظر آتا ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

خالد عابدی: اُس کے افسانے روشن مستقبل کی نشاندہی کرتے ہیں

کوثر چاندپوری

محمد خالد عابدی کا پہلا مختصر مجموعہ ایک ایسے نوجوان سے روشناس کراتا ہے جو افسانہ نگاری کے میدان میں نووارد ہے، لیکن اس کے افسانے روشن مستقبل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ عابدی نے اکثر سماجی اور رومانی موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور ان کا مواد آس پاس کے ماحول ہی سے سمیٹا ہے۔

زبان میں پاکیزگی ہے اور سماجی افسانوں میں انسانوں کا دکھ درد اور ان کی سچی داستان حیات ہے۔

عابدی زبان کے معاملے میں محتاط ہیں۔ بے راہ روی سے بچنے کی شعوری کوشش کرتے ہیں۔ اگر وہ اسی طرح لکھتے رہے اور اس صنف ادب سے یہی لگاؤ رہا تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ آنے والے زمانے میں اپنی جگہ ممتاز فن کاروں کی صف میں محفوظ کرا لیں گے۔

عابدی کے افسانے رسائل میں بھی شائع ہو چکے ہیں اور ریڈیو سے بھی نشر ہو چکے ہیں۔ وہ آگے بڑھنے کا عزم اور حوصلہ رکھتے ہیں۔ اس مجموعے میں افسانوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے انہوں نے کم ہی لکھا ہے اس کے باوجود ارباب ذوق نے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

مجھے عابدی کے مستقبل سے بہت سی توقعات ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب وہ افسانوں کے اور مجموعے بھی پیش کرینگے۔ اور صاحبان نظر انہیں تحسین و ستائش کا مستحق خیال کریں گے۔

خالد عابدی: ایک نوجوان افسانہ نگار

رام لعل

اُردو افسانے کا ایک بڑا وصف ابلاغ ہے۔ یوں بھی داستان، روئیداد یا کہانی اپنے آغاز سفر ہی سے انسانی جذبات، ولولوں، محرومیوں، خوشیوں وغیرہ کی ترجمان بنی رہی ہے اور اسی کے ذریعے سے انسان نے اپنے بیشتر سماجی رویوں کی مسلسل تعمیر و تشکیل کی ہے اور وہ ان میں ہر دور میں تبدیلیاں بھی کرتا رہا ہے لیکن ان ساری خوبیوں سے بالاتر اس کی سب سے بڑی خوبی وہی ترسیل وابلاغ کی ہے۔ جس کی وجہ سے ہم دنیا کی کسی بھی زبان کی کہانی کے ذریعے سے ایک دوسرے تک آناً فاناً پہنچ جاتے ہیں۔

محمد خالد عابدی کے شعور نے ایک ایسے دور میں آنکھ کھولی ہے۔ جس میں جملہ فنون لطیفہ میں اسلوب، اظہار اور فن کی سطحوں پر کئی تجربے کئے جا رہے ہیں۔ ہمارے اردو افسانے میں فکر و نظر کی بھی نئی نئی جہتیں سامنے آ رہی ہیں جس سے سراسیمہ ہو کر بعض نئے لکھنے والے یا تو یاسیت اور کنفیوژن کا شکار ہو جاتے ہیں اور ابہام نگاری کی طرف مائل ہو جاتے ہیں یا پھر لکھنے کے ہمت ہی ہار بیٹھے ہیں۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ محمد خالدی عابدی ایسے نوجوان افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں جس نے نہ تو کنفیوژن کو اپنے یہاں جگہ دی ہے اور نہ ہی تخلیقی سطح پر بے دلی دکھائی ہے۔ اس کے افسانے نہ صرف یہ کہ ابلاغ کی شرط کو پورا کرتے ہیں بلکہ اپنے پڑھنے والوں کو ایک ایسی دنیا میں لے جاتے ہیں جو ہمارے آس پاس کی ہوتی ہے۔ لیکن اس میں رہنے والوں کے رویے مختلف ہوتے ہیں۔ مسائل بھی نئے ہوتے ہیں اور ان کو برتنے اور ان سے نپٹنے کے لئے کچھ راحت بھی مل جاتی ہے۔

کسی بھی نئے لکھنے والے کے لئے ادب ہمیشہ پھولوں کا بستر نہیں ہو سکتا ذمہ دار ادیبوں کے لئے یہ آگے چل کر کانٹوں ہی کا بستر ثابت ہوتا ہے اس لئے کہ ادیب اپنے لکھے ہوئے ایک ایک لفظ کے لئے ذمہ دار ہوتا ہے اور اس ذمہ داری پر اس کے قارئین کی گہری نظر ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ محمد خالد عابدی کو اپنی ذمہ داری کا پورا پورا احساس ہے اور وہ اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اپنے اندر بڑی صلاحیتیں رکھتا ہے۔

میری ناقص رائے

یوسف ناظم

محمد خالد عابدی، آکاشوانی سے منسلک ہیں۔ دھرتی سے ان کا تعلق بوجہ مجبوری ہے۔ وہ بھوپال میں رہتے بھی ہیں تو ہوائکل، روڈ پر۔ یہ نیم اور کریلے کا معاملہ یا سونے اور سہاگے کا؟ اس کا اندازہ آپ کو اس وقت ہوگا جب آپ ان کے مضامین پڑھیں گے۔

محمد خالد عابدی کو آکاش اور ''ہوائکل'' سے جو نسبت رہی ہے، اس کے نتیجے میں ان کا مزاح نگار بن جانا ایک لازمی امر تھا۔ اسی قسم کے واقعات کو ''اتفاقات ہیں زمانے کے'' کہا جاتا ہے۔

ایک زمانے میں ہمارا یہ ''آکاش وانی'' بڑے بڑے ادیبوں کی بیٹھک رہا ہے۔ یہ سلسلہ غیر منقسم ہندوستان کے آل انڈیا ریڈیو سے چلا آرہا ہے۔ اور اب بھی کسی نہ کسی ڈھنگ سے برقرار ہے۔ محمد خالد عابدی اسی سلسلے کی (جسے میں سلسلۂ نشر گاہی کہوں گا) ایک کڑی ہیں۔ قلم سے اُن کا رشتہ پیشہ ورانہ بھی ہے اور تیشہ ورانہ بھی (تیشہ سے مراد وہ تیشہ نہیں جو فرہاد نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے استعمال کیا تھا) محمد خالد عابدی نے دفتر میں جو کچھ لکھا ہوگا وہ صرف ان کے لئے مفید ہوگا۔ دفتر کے باہر جو کچھ ان کے قلم سے برآمد ہوا وہ سب کے لئے سعید ہے۔ اس لئے کہ اس میں مزاح کی چاشنی ہے۔ حالیؔ نے مزاح کو ہوا کا جھونکا کہا ہے اور یہ کیفیت ان کی تحریروں میں ملتی ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ان کے یہاں ہوا کے جھونکوں کی بہتات ہے۔ (زمانہ بھی تو الکٹریکل گڈس کا ہے) نہایت ہی سبک مزاح ان کا خاص الخاص نسخہ ہے۔ انگریزی میں شاید اسے اسپشلیٹی کہتے ہیں ۔لیکن اس کی پرواہ مت کیجئے کہ انگریزی میں اسے کیا کہا جاتا ہے۔ (انگریزی کو بھی بہت جلد اردو کی طرح دیس نکالا ملنے والا ہے)۔

محمد خالد عابدی خالص اردو لکھتے ہیں حتی الامکان (انگریزی الفاظ کے استعمال سے گریز کرتے ہیں۔ کیوں کہ وہ شاید جانتے ہیں کہ اردو زبان خود کفیل ہے اور اس میں اتنی صلاحیت موجود ہے کہ وہ ان کے نازک سے نازک اور وزنی سے وزنی خیال کو خوبصورت لباس میں عطا کردے۔

ان کا مزاح افسانوی بلکہ ''الف لیلوی'' ہے۔ ہر مضمون میں کہانی پن ضرور ڈال دیتے ہیں۔ حالانکہ اب تو کہانیوں میں بھی ''کہانی پن'' کا ہونا ممنوع ہوگیا ہے۔ (یہ اپنے اپنے مزاج کی

بات ہے) مکالمات کا انہیں شوق ہے، شدید شوق، (یہ شدید شوق کیا ہوتا ہے کم لوگوں کو اس کا علم ہے مجھے بھی نہیں ہے) ایک مکالمہ (جوان کی اپنی گمشدہ "شیروانی" کے سلسلہ کا مکالمہ ہے) آپ بھی سنیئے۔

"ایک عرصہ بعد اتفاق سے ایسے بازار سے گزرا جہاں مال مسروقہ ارزاں بکتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ میری شیروانی بھی ایک کھونٹی پر اس طرح جھول رہی ہے گویا اسے کسی جرم کی پاداش میں پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا ہو۔ میں نے دوکان دار سے اس شیروانی کی قیمت دریافت کی:
"اسی روپیہ"...... دوکاندار نے ایک اور شیروانی، اس شیروانی کے پیچھے ہینگر پر لٹکاتے ہوئے کہا۔
کیا اس میں کچھ رعایت کی گنجائش ہے؟ میں نے سبزی ترکاری کا جیسا مول بھاؤ کیا۔
میاں ایسا ہے کہ اگلے پندرہ روز میں بھوپال میں آل انڈیا مشاعرہ ہونے والا ہے۔ اس مشاعرے کی خصوصیت اور شرط ہی شیروانی ہوتی ہے۔ یہ ہاتھوں ہاتھ بک جائیگی"۔

محمد خالد عابدی کے موضوعات ہماری روز مرہ زندگی کے واقعات او سانحے ہیں۔ سانحوں میں کتابوں کی دردناک داستان اور کرائے کا مکان حاصل کرنے کی اندوہناک تفصیل بھی شامل ہے۔ مکان حاصل کرنے کی کوشش میں ان کی شادی بھی ہوگئی اور ایسی خاتون سے جو دلہن سے زیادہ، دلہن کی والدہ تھیں، بیوہ تھیں اور مال اور اولاد کے معاملہ میں کافی فیاض تھیں۔

واقعاتی اور مکالماتی مزاح میں دو تین چیزیں یک مشت حاصل ہو جاتی ہیں۔ انشائیہ کا انشائیہ، افسانے کا افسانہ۔ اور ڈرامے کا ڈرامہ۔ یہ ترکیب آج کل کھانوں کے معاملہ میں بھی زیادہ مستعمل ہے۔ الگ سے پراٹھے پکانے اور الگ سے آلو کی ترکاری بنانے میں کیوں وقت ضائع کیا جائے، آلو پراٹھا ہی کیوں نہ بنالیا جائے؟

مزاحیہ کتابوں کے مطالعہ میں قناعت کے اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے۔ خوشی کے چند لمحے یا ایک ہلکی سی جھلک بھی نعمت ہوتی ہے۔ اس لئے جوش ملیح آبادی نے کہا تھا" یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے"۔

میں نے شروع ہی میں خواہ مخواہ (ان مضامین میں ایک مضمون "خواہ مخواہ " بھی شامل ہے) آپ کو بتا دیا کہ محمد خالد عابدی کا تعلق آکاش وانی سے ہے۔ اس بات کا اندازہ تو آپ کو ان مضامین کے مطالعے سے بھی ہو جاتا۔ اب مضامین بھی بولنے لگے ہیں نثر نے کتنی ترقی کر لی ہے!"

''شکایتاً عرض ہے'' میرے تاثرات

وجاہت علی سندیلوی

چند سال ہوئے ماہنامہ ''شگوفہ'' حیدرآباد نے اپنے ہندوستانی مزاح نمبر میں ہندوستان میں اردو کے طنز و مزاح کے متعلق اپنے ایک سوال نامے کے جواب میں کچھ نقادوں اور مبصروں کے ارشادات شائع کئے تھے۔ ان ارشادات میں بعض واقعی ایسے ہیں جو مزاح نگاری کے مرض میں مبتلا حضرات کے لئے تریاق اور مومیائی کا کام دے سکتے ہیں، لیکن بیشتر سبق آموز ہونے کے بجائے صرف مرغوب کن ہیں لیکن کچھ حد درجہ بے سر و پا اور مضحک ہیں اور ''سخن فہمی عالم بالا معلوم شد'' کی غمازی کرتے ہیں۔

ایک بین الاقوامی شہرت کے مالک پروفیسر صاحب فرماتے ہیں ''مستثنیات سے قطع نظر طنزیہ اور مزاحیہ ادب کم و بیش ہر زبان میں ادبی اقدار کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر آتا ہے''۔ غالباً اگر کوئی طالبعلم یہ بات کہتا تو امتحان میں ضرور ہی فیل کر دیا جاتا۔ اول تو سنجیدہ اور مزاحیہ ادب کی تخصیص ہی محض ایک مفروضہ ہے۔ دوئم یہ کہ اگر برنارڈ شا چسٹرٹن، وڈ ہاؤس لی کاک، چیخوف اور اپنے یہاں غالب، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، مشتاق احمد یوسفی وغیرہ کی تخلیقات کو دوسرے نمبر پر رکھ دیا جائے گا تو یقیناً ہمارے فاضل پروفیسر صاحب کی تخلیقات کو ضرور پہلے نمبر رکھنا پڑیگا۔

کئی دانشوروں نے اظہار خیال کیا ہے کہ چونکہ پطرس بخاری اور رشید احمد صدیقی کے بعد ان جیسا کوئی پیدا نہیں ہوا لہذا ہندوستان کی مزاح نگاری کو رو بہ زوال سمجھنا چاہیے۔ کتنی کڑی کمان کے تیر والی منطق ہے۔ چونکہ ملٹن اور شیکسپیئر جیسی قد آور ادبی شخصیتیں سترھویں صدی کے بعد نہیں ہوئیں لہذا صدیوں سے انگریزی ادب کو مائل بہ زوال ہی کہنا چاہیے۔ میر و غالب کے بعد اردو شاعری کو بھی مائل بہ انحطاط ہی سمجھنا چاہیے۔

ایک دانشور رقمطراز ہیں ''ہمارے مزاح نگار خود کو سرکس کے مسخرے یا مغل کے لطیفہ گو کی طرح پیش کرنا پسند کرتے ہیں۔ اس سے ہٹتے ہیں تو ایک طرف بھونڈا پن ہے اور دوسری طرف پند و موعظت'' یہ صاحب قطعاً قابل معافی ہیں۔ انھوں نے اردو مزاحیہ ادب کو پڑھا ہی نہیں اور اگر پڑھا بھی ہے تو ان کا مطالعہ بہت سرسری اور محدود ہے۔ انھوں نے لعنت بھیجنے کی رسم ادا کرنے کے لئے خود اپنے شیطان تصنیف کر لئے ہیں۔

میں اپنے گرامی قدر نقادوں اور مبصروں کو اگر کوئی مشورہ دوں تو وہ آفتاب کو چراغ دکھانے کے مرادف ہوگا۔ البتہ تنقید کے بعض اصولوں کے متعلق میرا نقطۂ نظر یہ ہے۔

تنقید میں اپنے موضوع سے دلچسپی اور ہمدردی ضرور رکھنا چاہئے ورنہ وہ ایک معاندانہ کوشش ہو جاتی ہے۔ اپنے موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے اس کے متعلق بہت گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کر لینا چاہئے۔ بہت تاسف کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اردو طنز و مزاح پر بیشتر لکھنے والوں کا مطالعہ بہت ہی محدود اور ایک طرفہ ہوتا ہے اور وہ زیادہ تر نہیں معلوم کب کے گھسے پٹے۔ پرانے لکھے ہوئے تنقیدی مضامین ہی سے اپنی رائے اخذ کرتے ہیں جن میں نہ کوئی ندرت ہوتی ہے اور نہ جدت۔ اچھے مزاح نگاروں کی فہرست پیش کرنے میں لاعلمی کی وجہ سے یہ بخل سے بھی کام لیتے ہیں اور ذاتی تعلقات اور تعصبات سے بھی۔ مزاحیہ ادب پر تنقید کرنے والوں کی حسِ مزاح اور شعور ظرافت بھی بڑا تربیت یافتہ، دراک اور سریع الحس ہونا چاہئے۔ بغیر اس کے انہیں اس وادیٔ پُر خار میں قدم نہ رکھنا چاہئے۔ ورنہ جیسی کہ اوپر مثالیں دی جا چکی ہیں وہ خود مضحک بن جاتے ہیں۔

اوپر جو عرض کیا گیا اس کی حیثیت یوں تو ایک جملہ معترضہ کی سی ہے لیکن اس سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ ہمارا اردو طنز و مزاح مانا کہ ان توقعات کو پورا نہ کر رہا ہو (اور کون صنف ادب کر رہی ہے) جو کہ اس کے بھی خواہاں وابستہ کئے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ غالباً حسِ مزاح اور شعور ظرافت کی عام کمیابی کی وجہ سے ہمارے بیشتر نقاد اور مبصر اس کی نہ صرف خاطر خواہ پذیرائی نہیں کر رہے ہیں بلکہ خود ان کے ذہنوں میں بھی اس کے متعلق کافی انتشار ہے جس کی وجہ سے صرف بے اعتنائی، بخل انگاری اور محدود مطالعہ ہی ہو سکتا ہے۔

نکاح کی طرح مزاح میں بھی بنیادی چیز ایجاب و قبول ہوتا ہے۔ یعنی مزاح نگار اور اس کے قاری کے درمیان ظرافت، زندہ دلی اور ذہانت کی ہم آہنگی اور یک رنگی۔ قاضی ہی کی طرح نقاد کی موجودگی صرف ایک رسمی خانہ پری سمجھی جاتی ہے کیونکہ مزاح تو ایک ایسی ذہنی کیفیت پیدا کرتا ہے جو صرف محسوس کی جا سکتی ہے اسے سمجھایا نہیں جا سکتا۔ مختلف لوگوں کے مختلف تاثرات کے ماتحت مزاح کے معیار اور اقسام بھی مختلف ہوتے ہیں اور ان کی سطح اور نوعیت بھی جداگانہ ہو سکتی ہے۔ مثلاً ایک انگریزی مثل ہے کہ ایک آدمی کی غذا دوسرے کے لئے زہر ثابت ہو سکتی ہے بالکل اسی طرح ہو سکتا ہے جس بات کو ایک شخص مزاح سمجھے دوسرا اسے محض بے تکا پن سمجھے۔ ... غالب ... بھی "باغِ فکر" ان ... کہاں میخانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ

پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

غالب کے اس مشہور زمانہ شعر کے متعلق بارہا بحث ہونے کے باوجود میرے ایک بزرگ عزیز کی جو محکمہ تعلیم کے بڑے عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ یہی اٹل رائے ہے کہ اس میں کوئی مزاح کا پہلو نہیں ہے۔ معمولی سی بات ہے کہ جیسے ہی غالب نکل رہے تھے واعظ، میخانے میں وعظ دینے جارہا تھا۔

موضوع کے انتخاب کے بعد اعلیٰ مزاح نگاری کی جان اس کا لطف بیان ہوتا ہے جو بلاغت، رمز و کنایہ، برجستگی، نکتہ رسی اور الفاظ و محاوروں کے خلاقانہ استعمال سے بنایا جاتا ہے اور سنوارا جاتا ہے۔ اس میں عصری حسیت اور آفاقیت کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ یہ بڑے ریاض اور پتے ماری کا کام ہے اور بالکل صحیح کہا گیا ہے کہ دوسرے کو ہنسانے کی کوشش میں خود رونا پڑتا ہے۔ الفاظ کے استعمال میں جس ربط اور ضبط کی ضرورت مزاحیہ ادب میں ہوتی ہے تراجم کے علاوہ کسی دوسری تخلیق میں غالباً نہیں ہوتی۔ میں یہاں صرف ایک ایک مثال پیش کرونگا۔

مزاح نگاری میں پطرس کا جو مرتبہ ہے وہ محتاج بیان نہیں مضامین پطرس ہمارے اردو ادب کی مقبول ترین کتابوں میں سے ہے۔ اس سلسلے میں ایک موقر نقاد کی رائے ہے کہ کتاب سے زیادہ شاہکار اس کا دیباچہ ہے جو بلاغت اور ظرافت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ اب کتاب کے دیباچہ کی شروع ہی کی تین سطریں ملاحظہ کیجئے۔

''اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے۔ اگر آپ نے کہیں سے چرائی ہے تو آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں، اپنے پیسوں سے خریدی ہے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے، اب بہتر یہی ہے کہ آپ اس کتاب کو اچھا سمجھ کر اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کریں۔''

ہمارے دوست عبدالحق صاحب اکسائز کمشنر کی حسِ مزاح بڑی تیز اور پختہ ہے۔ انہوں نے اس عبارت کو سنتے ہی فرمایا ''پطرس نے یہاں دو لفظ بڑی لاپرواہی سے استعمال کر دیے ہیں جو مذاق سلیم پر گراں گذرتے ہیں ''اگر آپ نے کہیں سے چرائی ہے'' میں چرائی، کا لفظ ناگوار معلوم ہوتا ہے اسی طرح اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کریں میں 'حماقت' قاری کے لیے توہین آمیز ہے۔ پوچھا گیا آپ کی رائے میں ان الفاظ کا بدل کس طرح پیش کیا جاتا؟ کہنے لگے ''بہت آسانی سے، چرائی کے بجائے دستِ غیب سے حاصل کی ہے لکھا جاسکتا تھا، اسی طرح 'اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کریں' کو اور زیادہ پر لطف یوں بنایا جاسکتا تھا 'میرے لئے دعائے خیر میں شریک ہوجائیں'۔

مزاح شناس مزاح پاروں کے ایک ایک لفظ کو جواہرات کی طرح رتی ماشوں، میں تولتے ہیں۔ رشید احمد صدیقی نے پطرس کے لئے ایک بڑی دلچسپ بات یہ کہی ہے کہ اگر پطرس کو سر کا خطاب مل جائے یا وہ جیل چلے جائیں تو وہ غالباً صحیح اردو لکھنے لگیں گے۔

"مجھے شکایتاً عرض ہے" پر اپنے تاثرات لکھتے تھے اور میں نے شکایتاً معلوم نہیں کیا کیا کچھ کہہ ڈالا لیکن دونوں باتیں ایک دوسرے سے اتنی بے تعلق نہیں ہیں جتنی کہ بادی النظر میں دکھائی پڑتی ہیں۔ مجھے مزاحیہ ادب کی عظمت کا احساس ہے لہٰذا اگر ایک مزاحیہ تخلیق پر اظہار خیال سے پہلے میں نے ان بے اعتنائیوں کا ذکر کر دیا جو عام طور سے ہمارے نقاد اور مبصرین مزاحیہ ادب کے ساتھ برتتے ہیں تو شاید میں اپنے موضوع سے کچھ زیادہ ہٹا نہیں ہوں۔ مزاحیہ ادب کی ناقدری اور اس کے ساتھ ساتھ ایک طرح کے سوتیلے پن کا برتاؤ بھی اس کی قدرتی نشوونما ایک رکاوٹ ثابت ہو رہی ہے۔ میں یہ ہرگز نہیں کہتا کہ اس وقت ہندوستان میں، اردو زبان میں جو مزاحیہ ادب تخلیق کیا جا رہا ہے وہ سب کا سب قدر اوّل کا ہے، میں تو اس کے ایک معتد بہ حصّہ کو دوم کا بھی نہیں مانتا، لیکن اس کے باوجود میں بہت سے ناقدوں او مبصروں کی طرح اس سے مایوس نہیں ہوں۔ مجھے اس کے امکانات تابناک دکھائی پڑتے ہیں، اور ہندی کے ان ادیبوں سے متفق ہوں جو اعتراف کرتے ہیں کہ انگریزی کو چھوڑ کر ہندوستان کی باقی تمام زبانوں کے مزاحیہ ادب میں اردو کا مزاحیہ ادب سب سے اعلیٰ اور افضل ہے۔

"شکایتاً عرض ہے" محمد خالد عابدی صاحب کے بارہ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین اس سے قبل وقتاً فوقتاً ملک کے معتبر رسالوں میں شائع ہو کر داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ جو حضرات علاحدہ علاحدہ کچھ مضامین سے لطف اندوز ہو چکے ہیں ان کے لئے یکجا مجموعی اشاعت ایک قابل قدر تحفہ ثابت ہوگی۔ مختلف پھولوں کو گلدستہ کی شکل میں پیش کیا جائے تو گلدستے کی خوشنمائی کے ماسوا ہر پھول کے حُسن میں بھی اضافہ محسوس ہوتا ہے۔

عابدی صاحب کو زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ وہ اپنی بات سیدھے اور صاف انداز میں کہتے ہیں لیکن اس ماورائے سخن جو ایک بات ہوتی ہے یعنی لطف بیان وہ ہر حال میں شامل رہتا ہے۔ ان کی 'آمد' میں 'آورد' کا شائبہ تک نہیں ملتا۔ وہ اپنے قاری کو ایک لمحہ کے لئے بھی جمود کا شکار نہیں ہونے دیتے بلکہ اپنے یکے بعد دیگرے پر لطف جملوں سے اس کے تجسس اور اشتیاق میں اضافہ ہی کرتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے گرد و پیش کی عام زندگی سے اپنے طنز و مزاح کا مواد حاصل کرتے ہیں۔ ان کا شعور ظرافت بڑا زود حس ہے اور سماج کے مضحک پہلوؤں پر ان کی نظر فوراً پڑ جاتی ہے جو ایک اچھے اور پختہ مزاح نگار کا خاصہ ہوتی ہے۔ ان کے بیشتر مضامین کی اساس روز مرہ کے ان چھوٹے چھوٹے دلچسپ اور پر لطف واقعات پر ہے جو خود "واحد متکلم" پر گزرتے ہیں یا جن میں اسے خواہ مخواہ شامل ہو جانا پڑتا ہے۔ ان میں بے ساختگی بھی برجستگی بھی ہے اور تنوع بھی۔

پہلا مضمون ریڈیو اناؤنسر بہت ہی دلچسپ اور پُر لطف ہے اور ریڈیو کے پورے ادارے پر ایک بھر پور طنز۔ خود آپ فرمائیے آپ پر کیا گزرے گی اگر آپ یہ سُن رہے ہیں۔ ''سب سے پہلے آپ روئی کے پھوہے (پھریری) سے کان صاف کر لیں۔'' اور پھر اس کے بعد فوراً ہی یہ سنیں ''اب آپ پانچ کلو سرسوں کا تیل ڈال دیجئے''۔ اس مضمون کا سب سے قہقہہ بردوش حصہ اس کا اختتام ہے۔ مصنف اپنی شکایتوں کی ایک طویل فہرست محکمے کو لکھ کر بھیجتا ہے۔ وہاں سے محکمے کی ٹھیل ہندی میں یہ جواب آتا ہے'' یہ جان کر بہوت پرسنتا ہوئی کی آپ کو ہمارے کاریہ کرم بہوت پسند آئے۔ آشا ہے کہ آپ بھوش میں بھی آکاش واڑین سے اپنی رُچی کے کاریہ کرم سنتے رہیں گے۔'' سوال از آسماں وجواب از ریسما۔ آج ہر سرکاری محکمے میں یہی اندھیر مچا ہے۔ عابدی صاحب نے ایک بڑی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی ہے۔

ریڈیو کے پروگرام کے خلط ملط ہو جانے کے متعلق شفیق الرحمٰن کا بھی ایک بہت اچھا ہے لیکن عابدی صاحب کے مضمون کا تانا بانا اس سے مختلف ہے۔

گم شدہ شیروانی، دوسرا مضمون کافی ہنسانے والا ہے۔ لیکن اس میں عابدی صاحب نے کہیں کہیں گلگلوں میں زیادہ گُو دیا ہے یعنی صاحب شیروانی کے ردعمل کے رنگوں کو بہت شوخ کر دیا ہے لیکن ہلکے پھلکے موضوع کے لحاظ سے یہ مبالغہ مذاق سلیم کو کچھ ایسا گراں نہیں گزرتا۔

سالانہ خریداری، تیسرے مضمون میں ان رسالوں کی بددیانتی بیان کی گی ہے جو چندہ ہضم کر جاتے ہیں اور رسالہ نہیں بھیجتے ہیں اور خواہ نخواہ چوتھے مضمون میں ادبی حاسدوں کے ہتھکنڈے بیان کئے گئے ہیں ہمارے معاشرے میں ان سے کہیں زیادہ مہلک بیماریاں ہمیں گھیرے ہوئے ہیں بہر کیف ان بیماریوں کے وجود سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

'صاحب مکان' پانچواں مضمون مکان کی کمیابی پر ایک طنزیہ ہے جسے پر لطف واقعات سے بہت دلچسپ بنایا گیا ہے۔ زبان و بیان کی روانی ہر جگہ موجود ہے البتہ انجام رقت انگیز حد تک غیر فطری ہو گیا ہے۔ میرا اپنا ذاتی نظریہ ہے کہ ایک مزاحیہ مضمون کو حتی الوسع شگفتہ اور فراخ دل ہی رہنا چاہیے۔ جن محترمہ سے شادی کر کے مصنف صاحب مکان ہوا اگر وہ سن رسیدہ بدصورت بیوہ اور نصف درجن بچوں کی ماں واقعی ہوتیں بھی تو اس سے چشم پوشی کرنا ہی زیادہ مناسب تھا کیونکہ اس فرد جرم میں کسی بھی جرم کی محترمہ براہ راست خود ذمہ دار نہیں تھیں۔ قاری کی ہمدردی اگر محترمہ کے ساتھ ہو جاتی ہے تو پھر مصنف کی مظلومیت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ فراق گورکھپوری اپنی بیوی کی بدصورتی اور گنوار پن کی تشہیر کر کے اپنی بیوی کا تو کچھ نہیں بگاڑ پائے البتہ اپنے پیر میں کلہاڑی

مار کر بحیثیت انسان نے اپنے قد کو بہت چھوٹا کر لیا۔

'نام' اور 'عہد' اچھے بیانیہ مضامین ہیں جن میں پُر لطف واقعات کو ہر لڑی میں خوبصورتی سے پرویا گیا ہے۔ عابدی صاحب کے انداز بیان کی لطافت ہر جگہ نمایاں ہے۔ 'نام' (جو چھٹا مضمون ہے) میں کچھ تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ اس میں توسیع کی بڑی گنجائش تھی۔ خصوصاً اگر کتابوں کے نام جو عجیب سے عجیب تر ہوتے جاتے ہیں، بھی شامل کر لئے جاتے۔

'فلمی انسائیکلو پیڈیا' آٹھواں مضمون مقابلتاً دوسرے مضامین سے طویل ہے اور ہمارے اوپر جو فلمی کلچر مسلط ہو گیا ہے اس پر گہرا طنز ہے خوابوں کی دنیا نے کس طرح ہماری حقیقی زندگی کو کس طرح متاثر کیا ہے یہ یقیناً فکر انگیز مسئلہ بن گیا ہے۔ مزاحیہ انداز میں اس پر دلچسپ انگشت نمائی کی گئی ہے۔

خوش نویسی ایک دلچسپ مزاح پارہ ہے۔ عام بد خطی کے اس دور میں مصنف کی خوشنویسی اس کے لئے کیسے وبال جان بن گئی اس کو دلچسپ واقعات کے ذریعہ واضح کیا گیا ہے۔ دسواں مضمون حوالہ جات، بعض ادبی بہروپیوں پر گہرا طنز ہے بہت دل پسند انداز میں دکھایا گیا ہے کہ بعض ادبی شخصیتوں کی علمیت کیسے محض حوالہ جات کی بیساکھیوں کے سہارے چلتی ہے۔

'اکسیر نسخہ' میں مصنف نے ایک محترمہ کی کتاب مانگ کر پڑھنے کی عادت کا یہ علاج تجویز کیا ہے کہ ان سے پڑھنے کے لئے فحش کتابیں دینا شروع کر دیں۔ اس طرح آگ پر تیل چھڑکنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ بقول مصنف ''وہ کسی ڈرائیور سے معاشقے میں پکڑی گئیں'' یہ گیارھویں مضمون واقعات حیثیت سے تو دلچسپ کہا جا سکتا ہے لیکن اس میں مزاح کے عناصر بہت کم ہیں اور یہ مذاق سلیم پر گراں گذرتا ہے۔

بارھواں اور آخری مضمون ''جب کسی کو ٹالنا ہو تو میرے ہتھکنڈے آزمایئے'' ہے اس کا عنوان کچھ الیکشن مینی فیسٹو قسم کا ہے۔ اسے مختصر ہونا چاہیئے جیسے ٹالنے کی ترکیبیں وغیرہ چیزیں مانگنے کا مرض یقیناً برا ہے لیکن اس کے علاج میں بھی کچھ ہمدردی کا دخل ہونا چاہیئے۔

اچھے مزاح میں انتقام یا کدورت اور کینے کے عناصر ابھر کر سامنے نہیں آنا چاہیئے۔

مزاح کی بنیاد ہمدردی، فراخ دلی اور انسان دوستی پر ہوتی ہے۔ یہ مضمون دلچسپ ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ دلچسپ اور پر مزاح ہوتا اگر بار بار کے تلخ تجربوں کے بعد واحد متکلم اپنی سادہ لوحی سے مانگنے والوں کے ہتھکنڈوں کا شکار ہوتا رہتا ہے۔ خیر یہ تو نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی کی بات ہے مضمون جیسا ہے دلچسپ ہے۔

میں نے اس مجموعے کے مضامین کا بہت سرسری جائزہ پیش کیا ہے۔ قارئین اس میں اپنی دلچسپی کے بہت سے نئے پہلو اور سامان تلاش کر سکتے ہیں۔ ایک خاص بات جو اس مجموعے کی داد طلب ہے وہ اس کا تنوع اور بوقلمونی ہے۔ عابدی صاحب نے ایک وسیع کینوس پر اپنی جولانی طبع کے جوہر دکھائے ہیں اور قاری کہیں بھی یک رنگی کا شکار نہیں ہوتا۔ مجھے توقع ہے کہ یہ مجموعہ اردو کے مزاحیہ ادب میں ایک خوشگوار اضافہ ثابت ہوگا۔

مخلص بھوپالی

[illegible] سے
[illegible] کے ساتھ [illegible] تنقید نے [illegible] کرا دی
[illegible] مجموعہ [illegible] دونوں کی صحت پر ناخوشگوار اثر پڑنے کا احتمال
[illegible] مصنف کی توقعات و خوش فہمیوں کا خون نہیں کیا
[illegible] خوشگوار [illegible] دل پسند تنقیدوں سے نوازا اور اس طرح اپنی
[illegible] ایک صاحب نے اپنی تصنیف
[illegible] کی اور میری ناچیز رائے [illegible] چنانچہ [illegible]
[illegible] کتاب کے شائع ہونے کا افسوس تو ضرور ہوا لیکن اسی کے ساتھ
کتاب سے [illegible] پانے کی خوشی بھی ہوئی۔ [illegible] دنوں پریشان رہا کہ اس کتاب پر کیا تبصرہ کیا
جائے۔ ادھر اہل کتاب صاحب تقاضہ کر رہے تھے۔ بالآخر رائے پیش کر دی۔

"جب دنیا میں طنز و ظرافت کی کتاب نصیب نہ ہو تو پیش نظر کتاب کا مطالعہ مفید ہوگا، کیونکہ اس کے پڑھنے سے طنز و ظرافت سے متعلق خوش فہمیاں ختم ہی نہ ہوں گی بلکہ اس مخصوص صنف سے بھی نفرت ہو جائیگی۔ پیش نظر کتاب میں کوئی ہنسنے ہنسانے والی بات نہیں ہے البتہ مصنف کی حوصلہ افزائی کی خاطر کتاب کو پڑھتے وقت مسکرانے اور ہنسنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ کیوں کہ ایک قاری آخر وقت قہقہے لگانے کے لئے تیار رہتا ہے کہ کس وقت اور کہاں ہنسا جائے۔ اور باوجود اس والہانہ خود سپردگی کے کتاب کے "تحت اللفظ" معنی آسودہ ہونا ممکن نہیں۔ دل کی بات دل میں ہی رہ جاتی ہے۔ ویسے کتابت طباعت دیدہ زیب اور [illegible] کاغذ اچھا اور ورکنگ پروف ہے۔ اگر پیش نظر کتاب الماریوں میں بند رہے تو کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ مصنف کو یا اس کی کاوشوں کو قبول فرمائے۔"

مصنف اپنی کتاب پر یہ تبصرہ دیکھ کر چراغ پا ہو گئے اور تبصرے کو میرے منہ پر مار کر بولے "نفیس صاحب یہ اپنے پاس ہی رکھئے میں نے اس کتاب میں جھک نہیں ماری۔"

غضب [illegible] ہے کہ آج لوگ مرثیہ نویسی سے طنز و ظرافت کی آرزو کرتے ہیں اور طنز و مزاح نگار

محمد خالد عابدی کی انٹرویو نگاری

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

محمد خالد عابدی کئی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ پہلی حیثیت ڈراما نگار کی ہے۔ اس صنف میں ان کی دو کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ دوسری حیثیت افسانہ نگار کی ہے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ''زخموں کے دریچے'' زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔

تیسری حیثیت طنز و مزاح نگار کی ہے۔ اس صنف میں ان کی کتاب ''شگفتہ عرض ہے'' قارئین کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے۔ اور اب انٹرویو نگار کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں۔ ان کی کتاب ''اردو انٹرویوز'' میں بالترتیب احسن رضوی داناپوری، اظہر افسر، اسلم واحدی، پریم وار برٹنی، تیج ناتھ زار، جرم محمد آبادی، جمیل شیدائی، خواجہ عبدالغفور، رام لعل نابھوی، رضا مظہری، ستیہ پرکاش سنگر شیم جے پوری، ضیا فتح آبادی، قیصر عثمانی اور نریندر لوتھر کے مراسلاتی انٹرویوز شامل ہیں۔

محمد خالد عابدی نے سوالات کی بنیاد پر شخصیت اور کارنامے سے متعلق مصدقہ معلومات حاصل کی ہیں اور زاویۂ نظر کو اجاگر کیا ہے۔

سوال:۔ آپ نے سب سے پہلا ڈرامہ کب لکھا اور کیا وہ شائع ہوا؟

جواب:۔ میں نے سب سے پہلا ڈرامہ ریڈیو کی فرمائش پر ۲۷ر نومبر ۳۵ء کو لکھا جو آل انڈیا ریڈیو بمبئی سے شام ساڑھے پانچ بجے نشر ہوا۔

سوال:۔ کیا یہ خیال درست ہے کہ اسٹیج ڈرامہ کی ترقی یافتہ شکل فلم ہے؟

جواب:۔ اسٹیج ڈرامہ کی ترقی یافتہ شکل فلم نہیں ہے۔ فلم ایک الگ صنف ہے۔ جس طرح غزل اور مثنوی جدا جدا ہیں، بالکل الگ ہیں، بالکل اسی طرح اسٹیج اور فلم ہیں۔ اسٹیج کے تلازمات الگ اور فلم کی ضروریات بالکل الگ ہیں۔ دونوں اصناف میں زمین آسمان کا نہ سہی تو زمین اور خلا کا فرق ضرور ہے۔

(اظہر افسر سے انٹرویو)

سوال:۔ آپ طنز و مزاح کی طرف ہی کیوں مائل ہوئے؟

جواب:۔ جب سیاسیات اور نفسیات پر انگریزی میں لکھتے لکھتے تھک گیا تو اپنے بچپن کے پسندیدہ

مضمون یعنی طنز و مزاح کی طرف قدرتاً مائل ہو گیا اور آج تک اسی کے مزے اٹھا رہا ہوں۔ دوسروں کو اس سے لطف اندوز ہوتے دیکھ کر اور بھی ہمت بڑھتی ہے۔

سوال:۔ کیا قہقہہ سماج کا تادیبی ہتھیار ہے؟

جواب:۔ ہنسی کی سینکڑوں اصناف ہیں جیسے زیرِ لب، آنکھوں کی چمک، گلو گیر ہنسی، خندہ استہزا وغیرہ لیکن قہقہہ کھلے دل اور روشن ضمیری کی علامت ہے اور سب سے اچھا قہقہہ ہے جو اپنے آپ پر لگایا جا سکے۔ دوسروں پر قہقہہ تادیبی نہیں بلکہ دل آزاری کی علامت ہوتا ہے۔ حقیقی کمال یہ ہے کہ وہ دوسروں پر نہیں اپنے آپ پر ہنسے دوسروں کی عیب جوئی کو ہنسی کا باعث نہ بنائیے۔ دوسروں کی خامیوں کو چھپا کر انھیں یہ محسوس کرائیے کہ یہ تو ہوتا ہی ہے۔ اپنے آپ کو دوسروں سے ممیز بنانے کے لئے اس سے گریز کریں۔ (خواجہ عبدالغفور سے انٹرویو)

محمد خالد عابدی نے جن شخصیتوں سے انٹرویو لئے ہیں ان کی زندگی کی جھلک، ان کے فن پر تفصیل رنگ آمیزی اور خاص مطالعہ کو اجاگر کیا ہے۔

عابدی:۔ آپ کی ادبی زندگی کا آغاز کب ہوا اور آپ کا ادبی رہنما کون ہے؟

سینگر:۔ ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۵ء تک میں دوآبہ کالج جالندھر میں پروفیسر تھا وہاں چند احباب نے مل کر ہندوستانی سبھا کو تشکیل دی جس کی ہفتے میں ایک میٹنگ ہوتی تھی وہاں میں بھی کبھی کبھی کوئی اور مضمون یا افسانہ پڑھتا تھا۔ کسی حد تک میں کنہیا لال کپور کو اپنا ادبی رہنما تسلیم کرتا ہوں۔

عابدی:۔ انگریزی، بنگالی، مرہٹی اور ہندی ڈرامہ کے سامنے اردو ڈرامے کی کیا اہمیت و حیثیت ہے؟

سینگر:۔ کم۔ دوسری زبانوں میں ڈرامانویسی میں بے حد ترقی ہوئی ہے۔ (سیتہ پرکاش سینگر سے انٹرویو)

عابدی:۔ اردو ادب میں مشاعرے کی کیا اہمیت ہے؟

شمیم:۔ مشاعروں سے ہمارے تہذیب و تمدن کو ہمارے معاشرے کو تقویت ملتی ہے ہمارے علم، ہماری زبان میں جلا پیدا ہوتی تھی۔ لوگوں میں ذوق لطیف پیدا ہوتا تھا۔

عابدی:۔ آج کل جو مشاعرے منعقد ہو رہے ہیں اُن کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

شمیم:۔ چونکہ خود مشاعروں میں شرکت پر مجبور ہوں اس لئے روشنی ڈالنا خلاف مصلحت ہے۔ صرف اتنا عرض کرونگا کہ ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ آج کا مشاعرہ محض چند متشاعر اور

خوش گلو تنگ بندوں کا اکھاڑا کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

(شمیم جے پوری سے انٹرویو)

زندگی جتنی سخت، کٹھن اور مصروف ہوتی ہے اتنی ہی طرح کی ایجادات کی ضرورتیں بڑھتی جاتی ہیں۔ انٹرویو، ادب وصحافت کی دنیا میں مفید اور کارآمد صنف ہے۔ یہ خود نوشت کی نئی شکل ہے۔ محمد خالد عابدی نے اپنے انٹرویو میں INTERVIEWEE کی یادداشت، شخصیت نگاری اور خود نوشت کی آمیزش کو سامنے رکھا ہے اور بات چیت کے انداز میں کردار کی خصوصیات کی تحقیق وتفتیش کی ہے۔

خالد عابدی کے مختصر ڈرامے

ابراھیم یوسف

''ٹیچر کے بغیر'' محمد خالد عابدی کے چھ مختصر ڈراموں کا مجموعہ ہے جس میں ایک ریڈیو ڈراما، ایک ہندی ڈراما بخط اردو اور چار دیگر ڈرامے شامل ہیں۔ بنیادی طور پر یہ سب ڈرامے بچوں کے لئے لکھے گئے ہیں۔ بچوں کے لئے اردو میں بہت کم لکھا جاتا ہے۔ اس کی اور جو وجہیں ہوں ایک وجہ یہ ہے کہ بچوں کے لئے لکھنا آسان نہیں۔ اول تو بچوں کی نفسیات کو سمجھنا دوسرے ان کے ماحول کو پیش کرنا مشکل ہوتا ہے۔ مصنف کی ذرا سی لغزش بچوں کی نفسیات پر منفی اثر ڈال سکتی ہے۔ بچوں کے لئے بالعموم ایک ایسا ادب تخلیق کیا جاتا ہے جس میں بچے کی قوت تخیل کی زیادہ سے زیادہ تربیت ہو سکے۔ اور ان کی قوت عمل کو بیدار کیا جا سکے۔ پریوں کی تصوراتی دنیا اور مہماتی کہانیاں ان کے پسندیدہ موضوعات ہوتے ہیں جن میں وہ بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ ان نکات کو ہمارے بزرگوں نے بہت پہلے سمجھ لیا تھا چنانچہ نانی اماں کی کہانیاں، شہزادیوں اور پریوں کی تصوراتی دنیا سے متعلق ہوتی ہیں۔ شہزادے کسی کام کا بیڑا اٹھاتے ہیں مشکلات سے دو چار ہوتے ہیں اور آخر میں کامیاب ہوتے ہیں۔ پریوں کی کہانی میں پریاں بچوں کی دوست ہوتی ہیں ان کے ساتھ کھیلتے ہیں، ہنستی ہنساتی ہیں اور ماحول میں پھول کھلتے ہیں اور ہر طرف خوشی کا ماحول ہوتا ہے۔ ایک تیسرا موضوع بچوں کی معصوم شرارتوں کا ہے جو ان کی ذہانت اور قوتِ تخیل پر مبنی ہوتا ہے اس قسم کی کہانیوں میں مصنف اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ ایسی شرارت جو پُر لطف ہو مگر اس سے نہ تو کسی کو نقصان پہنچے اور نہ کسی کے لئے باعث تکلیف ہو اور یہی موضوع بالعموم بچوں کے ڈراموں کا ہوتا ہے۔

خالد عابدی ریڈیو سے وابستہ ہیں اس لئے ان کے ان مختصر ڈراموں میں ریڈیو کی تمام خوبیاں اور خامیاں موجود ہیں۔ ریڈیو ڈرامے، مکالمے، آوازوں اور مقصد پر زور دیتے ہیں جو ان ڈراموں میں موجود ہے مگر ڈراما کہیں کھو گیا ہے اور اکثر ڈرامے مقصدی مکالمے بن کر رہ گئے ہیں۔ ان ڈراموں میں سب سے اچھا اور مقصدی ڈراما ''ٹیچر کے بغیر'' جو آج کے ٹیچروں پر اچھا طنز ہے۔ آج کے ٹیچروں کے پیش نظر ڈاکٹروں کی طرح صرف روپیہ کمانا ہے جس طرح ڈاکٹر اپنے

فرض منصبی سے غفلت برت کر صرف پرائیوٹ پریکٹس کرنا چاہتے ہیں اسی طرح ٹیچر کلاس روم ٹیچنگ کو نظر انداز کر کے پرائیویٹ ٹیوشن کے لئے طلباء کو مجبور کرتے ہیں یہ اپنے فرض کے ساتھ نہ صرف گھناؤنا عمل ہے بلکہ کم حیثیت اور غریب طالب علموں کی زندگیوں کے ساتھ کھلواڑ ہے۔ اس ڈرامے میں ایک ایسے ہی ٹیچر کو نشانہ بنایا گیا ہے جو بڑی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔ ایک دوسرے ڈرامے ''توبہ توبہ'' میں ایک بد دماغ لڑکے کو اس کے والدین اس وقت تک معاف نہیں کرتے جب تک وہ گھر کے بزرگ نوکر سے معافی نہیں مانگ لیتا جسے اس نے طمانچہ مار دیا تھا۔ ''کہانی چور'' میں پڑھنے کے ساتھ لکھنے کی بھی ترغیب دی گئی ہے ''پرانا اسکول'' مشکل ہی سے بچوں کا ڈراما کہا جا سکتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ انگریزی میڈیم اسکولوں کے مقابلے دیسی اسکول بعض لحاظ سے بہتر ہیں کہ یہ اپنی تہذیب اور کلچر کی نمائندگی کرتے ہیں اور اپنے طالب علموں کو ایسی تعلیم دیتے ہیں جو اپنی قومی شناخت پیدا کرتے ہیں۔

غرض خالد عابدی کے یہ مختصر ڈرامے اپنے مقصد میں کامیاب ہیں امید کہ خالد عابدی اپنے آئندہ ڈراموں میں مقصد کے ساتھ ساتھ ڈرامائیت پر دھیان دیں گے۔ اردو میں بچوں کے ایسے ڈراموں کی بہت کمی ہے۔ جنہیں چھوٹے بچے اسٹیج کر سکیں۔ اگر خالد عابدی ایسے ڈرامے لکھیں تو یہ اردو کی بڑی خدمت ہوگی۔

خالد عابدی کی ڈراما نگاری

ڈاکٹر سید حامد حسین

"نیچر کے بغیر" خالد عابدی کے ڈراموں کا تیسرا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل "آواز نُما" اور "پیکرِ آواز" کے عنوان سے اُن کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "آواز نُما" کو اُتر پردیش اردو اکیڈمی کا انعام بھی ملا ہے۔ پیشِ نظر مجموعے میں اُن کے چھ ڈرامے ہیں جو کہ ریڈیو اور اسٹیج کے لئے لکھے گئے ہیں۔ ان ڈراموں کا مرکزی موضوع بچّوں کی تعلیم و تربیت ہے۔ بیشتر ڈراموں میں ان کی مقصدی نوعیت واضح طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ گو کہ ڈراما نگار نے اپنی تخلیقات سے کسی خاص نظریے کی تبلیغ کا کام نہیں لیا ہے، پھر بھی ان کی نظریاتی جہت کو شناخت کرنے میں زیادہ دُشواری نہیں ہوتی۔ یہ جہت بچّوں کے اندر ایسے رجحان کو فروغ دینے پر مشتمل ہے جو انہیں ایک اچھا فرد اور ایک اچھا شہری بنانے میں ممد و معاون ہو۔

ان ڈراموں میں خالد عابدی کی مخاطبت بچّوں اور ان کے سرپرستوں دونوں سے ہے۔ اس لئے یہ ڈرامے اہم سوال تو اٹھاتے ہیں لیکن ان کی فضا سیدھی سادی اور نظریاتی بوجھل پن سے خالی ہے۔ واقعاتی سطح پر یہ ڈرامے تجرباتی زندگی کے متوازی اور بڑھتے اور پھیلتے ہیں۔ موضوعاتی ڈرامے ہونے کے سبب ان میں کہانی کی کرو ٹیں تو نہیں لیکن ان میں سامع یا ناظر یا موجودہ شکل میں قاری کے ذہن کو سلسلۂ خیال میں لپیٹ کر اپنے ساتھ رکھنے کی صلاحیت ہے۔ خالد صاحب نے مکالموں کو حسبِ حال بنانے پر خصوصی توجہ دی ہے اور دوسری زبانوں کے الفاظ کو بھی اس طرح داخل کرنے کی کوشش کی ہے کہ بیان کی بیساختگی متاثر نہ ہو۔

بچّوں کی شرارتوں، آپس کی چھیڑ چھاڑ اور ان کے عملی مذاق کے وسیلے سے ڈراما نگار نے ڈراموں کو پُر لطف بنانے میں مدد لی ہے۔ ڈراموں کی فضا شدید تناؤ کی تو متحمل نہیں لیکن ضروری ڈرامائیت ہلکی نوک جھونک کی شکل میں داخل ہوئی ہے۔ اس کے لئے ڈراما نگار نے منفرد کرداروں کے انتخاب اور ان کے درمیان تکرار یا بچّوں اور استاد کے درمیان تیکھے سوال جواب یا بچّوں میں ایک دوسرے کو تنگ کرنے یا چھیڑنے کے رجحان سے ڈراما نگار نے ایک دلچسپ صورتِ حال تیار کی ہے۔

خالد عابدی کی ڈراما نگاری ان کے ادبی شغل کا صرف ایک پہلو ہے در اصل ان کی ادبی دلچسپیاں کئی مختلف جہتوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ انہوں نے کہانیاں بھی لکھی ہیں اور ان کے افسانوں کا

مجموعہ ''زخموں کے دریچے'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ انہیں طنز و مزاحیہ اور انشائیہ اسلوب پر بھی قدرت ہے جس کی نمائندگی ان کے مجموعے ''شکایتاً عرض ہے'' کے مضامین کرتے ہیں۔ لیکن ان کا خاص رجحان ادبی تحقیق کی جانب ہے اور اس کا سلسلہ تحقیقی اہمیت کی کتب، رسائل، اخبارات و تصاویر کی تلاش، خریداری اور ذخیرے سے لے کر ان کی سلسلہ وار ترتیب، اشاریہ سازی اور تحقیقی مقالات کی تیاری تک پھیلا ہوا ہے۔ نادر کتب کی بازیافت کے بعد ان کی اشاعت بھی ان کی کوششوں کا ایک حصہ ہے۔ نساخ کے ''باغ فکر معروف بہ مقطعات نساخ'' کی اشاعت اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

مدھیہ پردیش کے ادب و صحافت پر روشنی ڈالنے والے مواد کی بازیافت اور یہاں کے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کے متعلق معلومات حاصل کرتے اور انہیں ترتیب دینے میں بھی خالد عابدی ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔ دورِ حاضر کی مطبوعات اور جراید کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر حاصل کرنے کا شوق عشق کی سرگردانیوں کی یاد دلاتا ہے۔ اردو ادیبوں اور شاعروں سے قلمی انٹرویو حاصل کرنے کا سلسلہ بھی انھوں نے جاری رکھا ہے اور ''اردو انٹرویوز'' کے عنوان سے ایک مجموعہ شائع بھی ہو چکا ہے۔ اس وقت اردو میں مکتوب نگاری ان کی تحقیقی توجہ کا خاص مرکز ہے۔

ہندوستانی فلموں کی تاریخ اور فلمی شخصیتوں کے بارے میں معلومات بھی خالد عابدی کی دلچسپی کا ایک اہم پہلو ہے۔ اور اس سلسلے میں بھی ان کے پاس کارآمد ذخیرہ ہے۔ آل انڈیا ریڈیو سے وابستگی نے انہیں اردو ادب کی خدمت کے لئے ایک اور میدان فراہم کیا ہے اور اردو کے معیاری پروگرام تیار کرنے کے علاوہ انہوں نے اردو میں نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی میں بھی قابلِ قدر تعاون دیا ہے۔ دوسری زبانیں بولنے والے ایسے دوستوں کی رہنمائی میں بھی انہیں خاصی دلچسپی رہی ہے۔ جو اردو سیکھنا چاہتے ہیں۔

خالد صاحب کی اصل جائداد ان کی کتابوں اور رسائل کا بیش قیمتی ذخیرہ ہے جسے انہوں نے اپنی ضرورت کو پس پشت رکھ کر تیار کیا ہے اور جس میں وہ برابر اضافہ کر رہے ہیں۔ لیکن جب کہ ایک عام فرد اپنی معمولی کتابوں کو مستعار دینے میں پس و پیش کرتا ہے، خالد صاحب ایسے افراد کو سنجیدگی کے ساتھ ادبی تحقیق و تخلیق میں لگے ہوئے ہیں۔ اپنے ذخیرے میں سے نادر کتب و رسائل خود ان افراد کے گھر پر فراہم کرنے سے گریز نہیں کرتے۔

ادب کے ساتھ خالد صاحب کا معاملہ خلوص کا ہے اسی خلوص اور سنجیدگی کی جھلک ان کی تحریرات میں نظر آتی ہے۔ اور خالد صاحب کی تحریرات کی قدر و قیمت ان کی موضوع کے ساتھ مخلصانہ وابستگی اور ان کی لگن سے متعین ہوتی ہے کہ ان کے ڈراموں کا یہ مجموعہ اور ان کی آنے والی تصانیف یقیناً خزینۂ ادب میں ایک قابل قدر اضافے کی حیثیت رکھیں گی۔

ادبی سفر

عشرت قادری

محمد خالد عابدی نے ساتویں دہائی میں قلم اور کاغذ سے اپنا رشتہ استوار کر کے باقاعدہ علم و ادب پر لکھنے کا آغاز کیا۔ اس سے پہلے وہ ہندوستانی فلموں اور فلم سے متعلق ہر ہر گوشے پر تبصرے اور مضامین لکھتے چلے آ رہے تھے۔ فلمی دنیا کے بارے میں ان کی معلومات اور دلچسپی اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ انھیں ''فلم انسائیکلو پیڈیا'' تسلیم کر لیا گیا تھا۔ پھر جب ''آواز نما'' کے نام سے ان کے لکھے ہوئے اردو ڈراموں کی کتاب شائع ہوئی اور ریڈیو سے ان کے ڈرامے نشر ہوئے اور اسٹیج بھی کیے جانے لگے تو ان کے قارئین کا حلقہ نہ صرف وسیع ہوا بلکہ اس میں سامعین اور ناظرین نے بھی آگے بڑھ کر ان کی پذیرائی کی۔

محمد خالد عابدی اردو نثر کی مختلف اصناف اور موضوعات پر اپنی متعدد تصانیف علمی اور ادبی خاندان کو پیش کر چکے ہیں اور اب پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے ان کا تحقیقی مقالہ بھی تکمیل کے آخری مرحلے میں ہے۔

''مضامین خالد'' ان کی تازہ تصنیف ہے جو ان کے ادبی سفر اور ہوشمندانہ تخلیقی گرم روی کی نشاندہی کرتی ہے۔

۲۷ر ستمبر ۱۹۹۵ء

مضامینِ خالد: ایک جائزہ

ڈاکٹر سیّد شاہد اقبال

مضامینِ خالد، محمد خالد عابدی کے تحقیقی تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس میں مختلف النوع بارہ مضامین شامل ہیں۔ اس کتاب میں شائع شدہ اعلان کے مطابق اب تک (۱۹۹۵ء تک) خالد عابدی کی نو کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور متوقع کتب اکیس ہیں جو اشاعت کی منتظر ہیں۔ اس میں زیادہ تر کتابیں مدھیہ پردیش میں اردو زبان و ادب سے متعلق ہیں اس فہرست میں امیر مینائی، داغ دھلوی، مضطر خیر آبادی سیماب اکبر آبادی اور مولانا احسن مارہروی وغیرہ کے تلامذہ ہیں، جنھوں نے بھوپال اور مدھیہ پردیش کے مختلف علمی و ادبی مراکز میں اردو شعر و ادب کے چراغ جلائے ہیں۔ جب بھی ان نامور اساتذہ سخن کے تلامذہ کی مکمل فہرست مرتب کی جائیگی ان کا نام سنہرے حرفوں سے لکھا جائے گا۔

مضامینِ خالد، کا پہلا مضمون اوجین کے ہندو شعراء کا تذکرہ ہے یہ ایک تحقیقی مقالہ کا حصہ ہے اس میں شہر اوجین کی تاریخ بھی بیان کی گئی ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ اوجین کس زمانے میں زلزلے کے باعث بالکل تباہ ہو گیا تھا اور قدیم شہر زمین دوز ہو گیا تھا۔ اوجین شہر دریائے شپرا کے کنارے دوبارہ آباد ہوا۔ سلطان شمس الدین التمش نے ۱۲۳۵ء میں اوجین پر قبضہ کیا اور سلطنت دہلی کا حصہ بنایا۔ سب سے؟ پہلے بزرگ جو اوجین، پہنچے وہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے خلیفہ مولانا مغیث الدین چشتی اور ان کے برادر خورد مولانا وحید الدین چشتی تھے۔ جنھوں نے دریائے شپرا کے کنارے قیام فرمایا اور اشاعت اسلام کا کام کیا اسی شہر اوجین میں دریائے شپرا کے کنارے مندروں کے بیچ آپ کا روضہ ہے۔ ان کے مزار شریف پر ہندو اور مسلمان دونوں کا مجمع رہتا ہے۔ غرض کہ اس مضمون میں اوجین کے نو ہندو شعرا کا احوال مع نمونہ کلام درج ہے۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں (۱) منشی ہیرا لال وکیل، (۲) منشی پربھودیال اشہر (۳) پنڈت چاند نرائن رازداں مونس (۴) پنڈت چھجو سنگھ صادق (۵) گوری پرشاد کچلو (۶) بالکشور بھٹناگر کشور (۷) شرون کمار بہار (۸) رام لال شجاع اور (۹) کرشن گوپال خاور۔

دوسرا مضمون فراق گورکھپوری سے متعلق ہے۔ فراق نے اپنے اس مضمون میں شہاب اشرف اور جان نثار اختر کے قیام بھوپال کا حال لکھا ہے جبکہ پنالال نور جلپوری کا فراق نے ان کی شاعری کا بھی جائزہ لیا ہے۔

تیسرا مضمون رفعت سروش کے ڈراما نگاری سے متعلق ہے اس پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے ان کے مجموعے (۱) تاریخ کے آنچل میں (۲) میری صدا کا غبار (۳) اسی دیوار کے سایے میں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

چوتھا مضمون آغا حشر کشمیری سے متعلق ہے۔ آغا حشر کشمیری کا انتقال ۲۸؍اپریل ۱۹۳۵ء کو لاہور میں ہوا۔ لیکن تعزیتی جلسہ لاہور سے پہلے اجمیر شریف میں ہوا۔ یہ جلسہ اجمیر شریف میں ۱۶؍جون ۱۹۳۵ء کو ہوا جب لاہور میں تعزیاتی جلسہ ۳۰؍جون ۱۹۳۵ء کو ہوا۔ اس جلسہ کے لئے اپیل کرنے والوں میں علامہ اقبال، سید امتیاز علی تاج، مولانا ظفر علی خاں اور حفیظ جالندھری کے نام شامل تھے۔ خالد عابدی نے اس کی تفصیلات بہم پہنچائے ہیں۔

پانچواں اور چھٹے مضمون میں گلدستہ کا تعارف ہے۔

ایک رسالہ فصیح الملک لاہور (مئی ۱۹۰۵ء) اور ایک گلدستہ چمنستان خلیل (اکتوبر ۱۹۰۰ء ٹونک) کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔

ساتواں مضمون بھوپال کی نواب شاہ جہاں بیگم کے سفر کلکتہ کے بارے میں ہے ان کا سفر کلکتہ ۱۸۶۸ء، ۱۸۷۵ء، ۱۸۸۲ء، ۱۸۸۶ء میں چار بار ہوا تھا۔ بظاہر اس سفر کا مقصد بھوپال کے تعلیمی اداروں کا کلکتہ یونیورسٹی سے الحاق کرانے کا تھا جس میں انھیں کامیابی بھی ملی۔ لیکن انھوں نے اس سفر میں سیر و سیاحت حکمرانوں اور والیانِ ریاست سے ملاقات بھی کی کلکتہ جو اس زمانے میں مشرق کا لندن London Of the East تھا۔ یہاں پہنچ کر انھوں نے انگریز گورنر اور لارڈ اور لیڈی ڈفرن سے ملاقات کی، یہ ان کے سفر کا خوشگوار لمحہ تھا۔

آٹھواں مضمون رضا نقوی واہی اور ان کے منظوم خطوط پر ہے رضا نقوی واہی کا کلام آج بھی لوگوں کو ہنسا رہا ہے، ملاحظہ فرمائیں۔

بھائی نگار شوق سے پھر ڈاک بھیجیے — جی کھول کے مزاح کا اسٹاک بھیجیے
ہڑتال کر رہے ہیں یہاں نرس اور ڈاکٹر — ہرگز ابھی نہ سینہ صد چاک بھیجیے
بیگل کو اب پسند نہیں دھن نکیش کی — مہدی حسن کے گانوں کا اسٹاک بھیجیے
آنکھیں ترس رہی ہیں رسالوں کی دید کو — ارباب ذوق کے لئے خوراک بھیجیے
یعنی نقوش و ساقی اوراق وسیپ کو — بوروں میں بھر کے تھاک کے بس تھاک بھیجیے

(ص۔ ۹۹)

نواں مضمون ''بہزاد لکھنوی'' کے خطوط پر ہے، یہ خطوط نشتر اندوری کے نام لکھے گئے تھے۔ اس میں بہزاد لکھنوی کا مختصر تعارف بھی کرایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ ''بہزاد لکھنوی کے

دو صاحبزادے تھے، انور بہزاد اور افسر بہزاد اتفاقاً دونوں آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت میں تھے یہ لوگ تقسیم ملک کے بعد پاکستان چلے گئے تھے۔ انور بہزاد، نیوز ریڈر تھے اور افسر بہزاد کوئٹہ اسٹیشن میں تعینات تھے۔ ایک بار افسر بہزاد نیوز شروع ہونے سے پہلے بہزاد لکھنوی کا کلام نشر کر رہے تھے، اور نیوز کا وقت ہونے جا رہا تھا افسر بہزاد نے نشریہ روک کر کہا۔ ابھی آپ اباجان سے ان کا کلام سن رہے تھے۔

اب آپ بھائی جان سے خبریں سنیئے!!

دسواں مضمون شائق دھلوی کی حیات اور ادبی خدمات پر ہے شائق دہلوی ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد تلاش معاش میں دہلی سے ہجرت کر کے مدھیہ پردیش کے مختلف شہروں میں گھومتے رہے، بالآخر اجمیر شریف پہنچے جہاں ۱۹ر نومبر ۱۹۲۰ء کو انتقال کیا۔

شائق کے کلام میں خواجہ میر درد کا عکس جھلکتا ہے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

بیٹھے بٹھلائے الٰہی دل کو یہ کیا ہو گیا ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ اک نظر دیکھے تھے وہ گیسو کہ سودا ہو گیا

برسنا بھول جائے اپنا تو اے ابر تر شاید ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ برستا ہجر میں دیکھے جو اشک چشم گریاں کا

مہندی لگائے بیٹھا ہے پاؤں میں رشک گل ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ بے سود اس کے آنے کا انتظار ہے آج

دیا نامہ بر نے میرا خط جو اس کو ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ نہ کھولا نہ دیکھا جلا ڈالا جل کر

گیارھواں مضمون ''درسی کتب میں مولانا ابوالکلام آزاد'' سے متعلق ہے اس میں مدھیہ پردیش کے اسکول میں نصابی کتابوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

بارھواں مضمون نازش پرتاپ گڑھی کی شاعری میں ''قومی یک جہتی'' پر ہے اس میں ان کا نمونہ کلام بھی درج ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

اک الجھی زلف کو سلجھاؤ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ اک منموہن کو اپناؤ

اک مرکز پر سب آجاؤ

اے چاند ستارو، ایک رہو ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ بھارت کے پیارو ایک رہو

مجھے خوشی ہے کہ خالد عابدی کا وطن بھوپال ہے اور انھوں نے ملازمت کا زیادہ تر حصہ مدھیہ پردیش اور راجستھان میں گذارا شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں مدھیہ پردیش اور راجستھان کے شہروں اور قصبوں میں اردو کی جڑیں تلاش کرتی ہیں۔ ان کا مقصد حیات بھی یہی ہے کہ اردو کی گم شدہ کڑیوں کو منظر شہود پر لایا جائے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ جب بھی اردو ادب کی مکمل تاریخ لکھی جائے گی خالد عابدی کی ان تحریری کاوشوں سے بھرپور استفادہ کیا جائیگا۔

❖❖❖

ادبی شخصیات کی تفہیم اور خالد عابدی

رفعت سروش

خالد عابدی بہت ہی ذہین اور طباع شخص ہیں اور ان کا جدت پسند ذہن، ادب و اظہار کے نئے نئے، زاویے تلاش کرتا رہتا ہے "ادبی انٹرویوز" میں انھوں نے ایک نیا طرز ایجاد کیا ہے جس کا مقصد اہم ادبی شخصیات کی تفہیم ہے۔ ان کے سوالنامے اس قدر جامع ہوتے ہیں کہ ادیب و شاعر اپنی ادبی شخصیت کا کوئی پہلو چھپانا بھی چاہیں تو وہ کسی نہ کسی گوشے سے آشکارا ہو ہی جاتا ہے سوالناموں میں وہ برجستگی ہے کہ اگر یہ خود نہ بتاتے کہ یہ تحریری انٹرویوز" ہیں تو یہی گمان گزرتا کہ یہ انٹرویو بالمشافہ گفتگو کے ٹکڑے ہیں جنھیں پہلے ٹیپ ریکارڈ کرلیا گیا اور پھر ضابطہ تحریر میں لے آیا گیا۔

ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ کتاب کسی ایک نقطۂ نظر ایک ادبی تحریک یا کسی ایک شعبۂ ادب تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کی اصل خوبی اس کا تنوع ہے۔ شاعری افسانہ، تنقید، فلم، ہر میدان کے قابل ذکر اشخاص سے گفتگو اس کتاب میں موجود ہے جو اس بات کی بھی دلیل ہے کہ یہ انٹرویوز ترتیب دینے والے خالد عابدی زندگی اور علم وفن کے مختلف شعبوں پر نظر رکھتے ہیں اور فن کاروں سے مراسلاتی انداز سے ہم کلام ہونے کی صلاحیت کے مالک ہیں۔ شخصیات کی تفہیم کا یہ طریقہ کار اس پہلو سے بہت اہم ہے کہ فن کار کو اپنے بارے میں سوچ سمجھ کر اظہار خیال کرنے کا موقع حاصل ہوتا ہے۔

ایک دستاویزی اہمیت

ڈاکٹر حامد حسین

"اردو مراسلاتی انٹرویوز" پچیس شاعروں، ادیبوں اور فلمی ہستیوں کے ساتھ تحریری مکالمات کا ایک نادر مجموعہ ہے۔ حالانکہ خالد عابدی نے یہ سلسلہ فلمی ہستیوں سے شروع کیا تھا، لیکن رفتہ رفتہ اس سلسلے کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اور جیسا کہ ان انٹرویوز کے مطالعے کے بعد آپ محسوس کریں گے کہ فلمی دنیا سے وابستہ ہستیوں کے ساتھ انٹرویوز بھی محض فلمی مسائل وموضوعات تک محدود نہیں رہے۔ موجودہ حالت میں خالد عابدی کے اس نگار خانے کے کرداروں میں فلمی شخصیتوں کے علاوہ متعدد منفرد شاعر، افسانہ نگار، ڈراما نویس، ناقد، معلم اور مفکر نظر آتے ہیں۔ ایک جانب جہاں آپ کو اختر الایمان، علی سردار جعفری، خمار بارہ بنکوی، وامق جونپوری اور ندا فاضلی جیسے شعراء سے تعارف حاصل ہوگا۔ تو دوسری جانب گیان چند جین، سید نور الحسن ہاشمی، کوثر چاند پوری اور رام لال جیسے نثر نگاروں سے واقفیت حاصل کرنے کا موقع ملے گا۔ جہاں آپ کو صفدر آہ ساگر سرحدی اور منجو قمر کی ڈرامے کے ساتھ وابستگی کی داستان سننے کو ملے گی۔ وہیں رضا نقوی واہی اور وجاہت علی سندیلوی جیسے مزاح نگاروں کی زندگی کے ساتھ سنجیدہ معاملے کی روداد پڑھنے کا موقع حاصل ہوگا۔ یہ مراسلاتی انٹرویوز جہاں اہم شخصیتوں کی زندگی کی تفصیلات کے بارے میں ہمارے فطری تجسس کو آسودہ کرتے ہیں، وہیں وہ ایک دستاویزی اہمیت کے مالک ہیں کیوں کہ وہ خود فنکار کی زبان یا قلم سے ان کے حالات زندگی اور ان کے نظریات وتاثرات کا ایک مستند ومعتبر ریکارڈ پیش کرتے ہیں۔ خالد عابدی نے بڑی خوبی سے ایسے سوالات قائم کیے ہیں جن سے انٹرویو کیے گئے حضرات کی زندگی کے بہت سے چھپے ہوئے پہلوؤں پر سے پردہ اٹھا ہے اور یہ شخصیات اپنی رنگا رنگ انفرادیت کے ساتھ ابھر کر سامنے آئی ہیں۔

اوریجنل استعداد کا نشّار: خالد عابدی

نجیب رامش

خالد عابدی بھوپال کے ان فنکاروں میں ہے جس کی صلاحیت تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی تینوں قسم کی ہے اور جنھوں نے تخلیق، تنقید اور تحقیق تینوں میدانوں میں اپنی صلاحیت کو منوایا ہے۔ اس کا بیّن ثبوت خالد کی کتب ہیں ان تصنیفات کا نفس مضمون ایک طرف تو ادبی، فلمی تنقید ترتیب و تدوین اور تحقیق کا فن ہے تو دوسری طرف ریڈیو اور اسٹیج ڈرامے طنزیہ ومزاحیہ مضامین پر مشتمل کتابیں ہیں۔ خالد عابدی نے خدا کا شکر ہے کہ شاعری کی سمت رخ نہیں کیا اگر ایسا ہوتا تو بھوپال ایک اچھا پڑھا لکھا، صاف ستھرا سوچنے والا شاعر تو مل جاتا لیکن اوریجنل استعداد کا نشار بھوپال سے چھن جاتا۔

خالد کی شخصیت کا ایک پہلو ہے تلاش اور تلاش سے آگہی حاصل کرنا تلاش کے ذیل میں خالد نے ایک سائنس داں کی طرح خود کو وقف کر دیا ہے اور اس تلاش سے ملنے والی آگہی کے ذیل میں خالد کو تنگیٔ دامن کی شکایت کبھی نہیں ہوگی۔ خالد کو جو معلوم نہیں تھا اس کو انھوں نے اکتساب سے حاصل کیا ہے اور جو معلوم تھا اس کی صداقت پر آنکھ بند کر کے یقین نہیں کیا ہے بلکہ اس کی صداقت کا لیبوریٹری ٹیسٹ دے کر پرکھا ہے۔ جو کچھ اکتساب سے حاصل کیا ہے اس کا بھی اعتراف کیا ہے اور جو کچھ پرکھ کر بیچ جانا ہے اس کا بھی اعتراف کیا ہے ایک ایسا ادیب جس کو ''تخلیق'' فطری ودیعت ہوتی ہے اپنے اعمال افعال اقوال اور تحریر میں اتنا ہی سچا ہوتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ خالد عابدی کی یہ کتاب جہاں کچھ لوگوں کی شخصیات سے نقاب کشائی کرے گی، کچھ ادبی مسائل کا حل پیش کرے گی وہیں خالد کی شخصیت کا وہ پہلو بھی ابھارے گی جس کی نشاندہی اوپر کردی گئی ہے۔

بات خالد عابدی کی

پروفیسر عبدالقوی دسنوی

شعبۂ اردو سیفیہ کالج میں آج سے کئی سال قبل سولہ سترہ سال کا سیفیہ ہائیر سکنڈری اسکول کا ایک طالب علم داخل ہوتا ہے۔ مجھے سلام کرتا ہے اور میرے کہنے پر سامنے والی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ میں نے آنے کی وجہ دریافت کی تو اس نے مجھ سے مجلّہ سیفیہ کے تازہ شمارے کی فرمائش کی۔ اس کی اس فرمائش پر میں حیرت زدہ رہ گیا، لیکن مجھے حیرت سے زیادہ خوشی ہوئی۔ حیرت اس بات کی تھی کہ آج جہاں اچھی کتابوں اور رسائل کا ماحول عام طور سے ختم ہو رہا ہے اردو کے ایسے بے شمار اساتذہ یہاں وہاں مل جاتے ہیں جنھیں یہ نہیں معلوم کہ رسالہ کہاں سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کا مدیر کون ہے اسکے مقاصد کیا ہیں۔ انہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ آج کل بازار میں کونسی کونسی نئی کتابیں شائع ہو کر آئی ہیں۔ کن کن مصنفین کی کتابیں ہاتھوں ہاتھ لی جا رہی ہیں وہاں ایک اسکول کا طالبعلم ادب کا ایسا رسیا ہے کہ مجلّہ کی ایک جلد حاصل کرنے کے لئے میرے سامنے مجسم سوال بنا ہوا ہے۔ اسی حیرت نے مجھے اس سے چند سوالات کرائے تو معلوم ہوا کہ یہ حضرت اپنے شوق کے چند رسائل بھی خریدتے ہیں کتابیں خریدنے کا شوق بھی رکھتے ہیں۔ مطالعہ سے بھی انہیں خاص دلچسپی ہے۔ اور سب شوق اپنی نوعمری میں چھوٹی کمائی سے پورے کر رہے ہیں۔ یعنی پڑھ بھی رہے ہیں، کتابیں رسائل بھی خرید رہے ہیں، مطالعے کے لئے وقت بھی نکال رہے ہیں، اور والدین کی خدمت بھی کر رہے ہیں۔ تو میری حیرت خوشی میں بدل گئی میری اجنبیت مانوسیت میں تبدیل ہو گئی نام دریافت کیا تو معلوم ہوا خالد عابدی ہیں میں نے انھیں حسب فرمائش مجلّہ سیفیہ کا شمارہ دیا تو بہت خوش ہوئے اور اس کے بعد مجھ سے اکثر و بیشتر ملتے رہے اور تعلق کو مضبوط سے مضبوط تر بناتے رہے کتابوں اور رسائل کا خریدنا، انھیں پڑھنا اور سنبھال کر رکھنا پھر لوگوں کی ضرورت کے مطابق انھیں کتابیں اور رسائل مہیا کرنا ان کا خاص مشغلہ بنتا گیا اس دوران میں انھوں نے ہائر سیکنڈری اسکول کے امتحان میں کامیابی حاصل کی، افسانے، ڈرامے اور مضامین لکھنے شروع کئے جو شائع ہوتے رہے۔ بی اے کیا فلموں سے بھی دلچسپی لی، ملازمت تبدیل کی آل انڈیا ریڈیو سے متعلق ہوئے اسی کے ساتھ ان کی یہ چار کتابیں آواز نما ۱۹۷۵ء، باغ فکر معروف بہ مقطعات نساخ،

۱۹۷۷ء پیکر آواز (۱۹۸۳ء) اور زخموں کے دریچے (۱۹۸۸ء) شائع ہوئیں۔

اسی دوران میں انھوں نے مصنفین سے خط و کتابت کے ذریعہ سے تعلقات پیدا کیے ادھر بھوپال کے ادیبوں سے انٹرویو لینا شروع کیا۔ تاج بھوپالی، تخلص بھوپالی، ابراہیم یوسف، واحد پریمی اور علی عباس امید سے لئے گئے انٹرویو کتاب نما دہلی، شاعر بمبئی اور تشکیل بھوپال وغیرہ میں شائع ہوئے۔

پھر انھیں خیال آیا کہ خطوط کے ذریعہ باہر کے ادیبوں سے انٹرویو لئے جائیں، چنانچہ مختلف وقتوں میں مختلف ادیبوں کے خطوط کے ذریعہ انٹرویو لئے۔ اور انھیں اردو کے اہم رسائل میں شائع کرانا شروع کئے تو اچھا نتیجہ یہ نکلا کہ اس طرح کے انٹرویو کو لوگوں نے پسند کیا جس سے خالد عابدی کا حوصلہ بلند ہوا اور یہ سلسلہ دراز ہوا۔

اس دوران میں انھوں نے اندور یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کا امتحان دیا اور درجہ اول سے کامیابی حاصل کی اور اب پی۔ ایچ۔ ڈی کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔

خطوط کے ذریعہ لئے گئے ''انٹرویو'' کی مقبولیت اور اہمیت کے پیش نظر انھوں نے انھیں کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ کرلیا ہے۔ خیال اچھا ہے۔ اس طرح چند مصنفین کے متعلق مفید معلومات یکجا ہو جائیں گی۔ جن کی روشنی میں ان مصنفین پر کام کرنے والوں کے لیے راستے کھلیں گے۔ اور اچھے نتائج برآمد ہوں گے۔ اس لئے کہ انٹرویو کے ذریعہ بہت سی باتیں بھی دریافت کی جاتی ہیں جن سے عام طور سے واقفیت نہیں ہوتی یا جن پر شکوک کے پردے پڑے ہوتے ہیں یا جو امتداد زمانہ کی وجہ سے ذہنوں سے محو ہو جاتے ہیں۔ انٹرویو کے ذریعہ انٹرویو لینے والا کسی شخص سے اس کے متعلق مختلف انداز سے سوالات کے ذریعہ بہت سی معلومات فراہم کرتا ہے اور انہیں قلمبند کرتا جاتا ہے۔ عام طور سے سوالات اس کی ذات، حیات، اس کے خاندان ماحول، اس کے تجربات نظریات اس کی پسند و ناپسند کے متعلق کئے جاتے ہیں۔ اس طرح کے انٹرویو لینے والے کو نہایت ذہین سنجیدہ اور صبر و ضبط سے کام لینے والا ہونا چاہئے اس لئے کہ کبھی کبھی انٹرویو دینے والا جھنجلا جاتا ہے یا جوابات، سوالات کے مطابق نہیں دیتا۔ یہ انٹرویو لینے والے کا اپنا سلیقہ ہوتا ہے کہ وہ بات اس انداز سے دریافت کرے کہ انٹرویو دینے والا اس کی خواہش کے مطابق جواب دے دے۔ انٹرویو لینے والے کو اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہئے کہ وہ کس شخص سے انٹرویو لینے جا رہا ہے؟ اس کا مزاج کیا ہے، اس کی دلچسپیاں کیا ہیں؟

اس کی تعلیم کیا ہے، اس کی مصروفیات کیا ہیں، اسی لحاظ سے اس سے سوالات کئے جانا

چاہئے لیکن اس طرح کے انٹرویو میں ایک خرابی یہ ہوتی ہے کہ کبھی کبھی انٹرویو چھپنے کے بعد انٹرویو دینے والا انٹرویو کے بعض حصے سے اختلاف کرتا ہے اور صاف صاف کہہ دیتا ہے کہ اس نے ایسا نہیں کہا۔ ایسی صورت سے بچنے کے لئے انٹرویو لینے والے کو چاہئے کہ وہ انٹرویو دینے والے کو انٹرویو، دکھا دے اور اس پر دستخط لے لے تا کہ بعد میں انکار کی گنجائش باقی نہ رہے لیکن دکھانے اور دستخط لینے والی بات ہمیشہ ممکن نہیں ہوتی۔ خاص طور سے سیاستدانوں سے انٹرویو لینے میں اس طرح کی مشکلات اکثر پیدا ہو جاتی ہیں لیکن ادیبوں سے انٹرویو لینے میں یہ ممکن ہے کہ اسے دکھلا دیا جائے اور دستخط لے لیا جائے۔

خالد عابدی نے بھوپال سے باہر کے ادیبوں کے جتنے انٹرویو لئے وہ تحریری صورت میں لئے ہیں۔ اس لئے یہ تمام انٹرویو اس لحاظ سے نہایت اہم ہیں کہ خود انٹرویو دینے والے کی تحریر میں محفوظ ہو گئے ہیں اس لئے نہ تو غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے نہ ہی انکار کی گنجائش باقی رہتی ہے بلکہ یہ سارے انٹرویو سند کی صورت اختیار کر گئے ہیں ان کی خوبی یہ بھی ہے کہ ساری باتیں سوچ سمجھ کر نہایت اطمینان کے ساتھ قلمبند کی گئی ہیں اس لئے اس طرح کے انٹرویو دینے والوں کو کسی قسم کی شکایت یا بے اطمینانی کے اظہار کا حق نہیں رہتا۔

میں نے مختلف ادیبوں سے لئے گئے ان کے انٹرویو کا مطالعہ کیا ہے مجھے ان کے مطالعہ میں کافی لطف آیا اور میری معلومات میں اضافہ ہوا۔ خالد عابدی نے بعض سوالات اس طرح کیے ہیں جن کی وجہ سے ہر انٹرویو کے بعض حصے خودنوشت کی صورت اختیار کر گئے ہیں اور ادیبوں سے متعلق بعض ایسی سچائیاں تحریر میں آ گئی ہیں جن کا آنا کسی دوسری صورت میں ممکن نہ تھا۔ ان میں بعض سوالات ایک جیسے سب سے کئے گئے ہیں لیکن ان کے جوابات ان مصنفین پر کام کرنے والوں کے لئے اہم ہیں۔ اسی طرح سے بعض سوالات مصنفین سے ان کی دلچسپیوں یا پسندیدہ موضوعات سے متعلق کئے گئے ہیں جن کے جوابات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ خاص طور سے ترقی پسند ادب، خط نگاری، انٹرویو، مشاعرے کی اہمیت، فلم اور اردو، شاعری میں نئے تجربات، آغا حشر کے ڈرامے، ڈرامہ نگاری، طنز و مزاح۔ پریم چند اور فلم وغیرہ کے متعلق جوابات نہایت اہم ہیں۔ ان کے علاوہ مصنفین سے، ان کے تلامذہ کے بارے میں، ان کے اساتذہ سے متعلق، ان کے تخلص کے تعلق سے سوالات اور جوابات دلچسپ اور معلومات افزا ہیں مجھے یقین ہے کہ خالد عابدی کے اس کام سے نہ صرف اردو کے ادبی سرمایہ میں اضافہ ہوگا۔ بلکہ تحقیقی کام کرنے والوں کی رہنمائی ہوگی اور ادبی ذوق رکھنے والوں کو تسکین بھی حاصل ہوگی اور ان میں لکھنے پڑھنے کا جذبہ بھی بیدار ہوگا۔

خالد عابدی چونکہ نہایت محنتی ہیں۔ ان میں کام کرنے کا سلیقہ ہے اور ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں اس لئے یقین ہے کہ وہ اس طرح کے کام کرنے کا سلسلہ نہ صرف جاری رکھیں گے بلکہ اپنی نئی نئی مطبوعات سے اردو والوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے رہیں گے اور اپنی قدر و قیمت میں اضافہ کرتے رہیں گے۔ انہیں صفات کی وجہ سے خالد عابدی مجھے بہت عزیز ہیں۔ ان کی کامیاب زندگی کے لئے میرے دل سے ہمیشہ دعائیں نکلتی ہیں۔

محمد خالد عابدی کے افسانچوں کی بنت کاری

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

محمد خالد عابدی کے منی افسانچوں کو پڑھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ موجودہ سماجی مسائل سے متعلق بہت کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

محمد خالد عابدی کے افسانچے اپنی اثر پذیری کی وجہ سے متاثر کرتے ہیں موضوع کی نوک پر تھرتھراہٹ، بے کلی اور بے بسی سے بھرے ان افسانچوں میں تیکھاپن دیکھا جاسکتا ہے۔

محمد خالد عابدی جب افسانچوں کی بنت کاری کرتے تب الفاظ ان پر فخر کرتے ہیں جن کی دھمک محسوس کی جاسکتی ہے۔ سوچ کی اعلیٰ سطح سے پہچان دینے والے افسانچے اپنی مٹی کے لمس میں پیوست ہیں جو اپنا راستہ تلاشتے ہیں اور کلاسکیت اور جدیدیت کے مابین پُل کا کام کرتے ہیں۔

شخص اور سماج کے مزاج و ماحول اور صورت حال کا منظر نامہ دیکھئے۔

"کچھ دنوں سے اس بستی میں گھاسلیٹ کی افراط ہوگئی تھی۔ جھونپڑیوں میں دیوالی اُتر آئی تھی۔ راشن کی مُٹھی کھل گئی تھی۔ نلوں سے تیز دھار میں پانی بہنے لگا تھا۔ زندگی کی تعریف بدل گئی تھی۔ شاید ان بستیوں میں خدا اتر آیا تھا اور دیواریں الیکشن کے پوسٹر پہنے ہوئے تھیں۔" (دھوپ کا موسم)

ایک اور سچائی دیکھئے۔ انسان کی زندگی ایسی حقیقت ہے جو اس کے الگ حصوں میں منقسم ہے اور جسے خالد عابدی نے قریب سے محسوس کیا ہے۔

"جب خاص بازار میں، ہیرا بائی کو اپنا دھندہ ٹھپ ہوتا نظر آیا تو وہ بمبئی بازار کی اندھیری گلی میں ایک کھولی لے کر رہنے لگی آہستہ آہستہ یہاں ہیرا بائی کا دھندہ چل نکلا۔

جب ایک نئے گاہک نے اس گلی میں قدم رکھا تو ایک سپاہی سے اس کا سامنا ہوگیا۔ سپاہی کو دیکھ کر وہ ٹھٹک سا گیا۔ سپاہی نہایت بے اعتنائی سے اپنا ڈنڈا غیر ضروری طور پر ہوا میں لہراتا ہوا، اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا قریب سے گزر گیا۔

جیسے ہی ہیرا بائی کے کمرے کا دروازہ بند ہوا تو کچھ وقفے کے بعد دروازے پر ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ یہ دھماکہ سپاہی کے ڈنڈے اور اس کی لات کا بھرپور غصہ تھا۔

ہیرا بائی نے جیسے ہی دروازہ کھولا۔ سپاہی نے اس سے ایک سانس میں وہ وہ گالیاں جو شاید اس گلی کے پیشہ ور بھی نہیں بکتے تھے۔ سپاہی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

''ہاں وہ دن اوپر چڑھ گئے ہیں۔'' ہیرا بائی نے بیچارگی سے کہا۔

ہیرا بائی نے ابھی تک اپنا ہفتہ نہیں پہنچایا تھا۔ (ہفتہ)

محمد خالد عابدی کے پیش نظر انسانی رشتے ہیں، جذبے ہیں اور احترام آدمیت کی اہمیت ہے ۔وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ آج ہر طرف دہشت کی حکمرانی ہے۔ عصبیت ،فرقہ واریت اور خوف و ہراس کے بیچ لوگ جینے پر مجبور ہیں۔ سماجی اور مذہبی انتشار نے انسان کی سرشت وفطرت کے معنی ہی بدل ڈالے ہیں۔

''گلی کوچے سڑک اور بازار سناٹوں کا شہر تھا۔ خوف وہراس نے لوگوں کو گھروں میں پابہ زنجیر کردیا تھا۔ کلکاریاں ممتا کی آغوش میں دفن تھیں۔ وحشی اپنے ہاتھوں میں مہندی رچائے ہوئے تھے۔'' (شہرنامہ)

نفسیاتی الجھن اور پیچیدگی کو افسانچوں میں تہہ دار انداز میں پیش کرنے اور نقابوں سے جھانکنے والے اخلاقی اور تہذیبی اقدار کو محمد خالد عابدی نے نئے وجود کا حصہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ فکر کی ہمہ گیری اور اثر انگیزی الفاظ کے جامے میں دیکھئے۔

''اب نہ جانے رسموں اور موسموں میں وہ دلکشی کیوں نہیں رہی۔ شاید اس لئے کہ رسمیں، قسمیں ہی ہوگئی ہیں کہ بہر حال نبھانا ہی پڑتی ہیں۔ رسمیں تو ایسی کلیوں کی طرح ہیں جنہیں، نسیم وصبا گدگدا کر مسکرانے پر مجبور کرتی ہیں اور ایک لمس سے وہ قہقہہ پھوٹ پڑتا ہے کہ کائنات جھومنے لگتی ہے۔

وہ دونوں جب اپنے ایک دوست کے یہاں جانے کے لئے گھر سے نکلے تو اس کی بیوی نے پھر بحث وتکرار شروع کردی۔ وہ بالعموم فرائض اور ذمہ داری سے فرار چاہتی تھی۔

''کیا دیکھ رہے ہو اسے اتنی غور سے؟''

ایک نئی دلہن جس کی مہندی تازہ تھی اور مہاور کا رنگ بھی ہلکا نہ ہوا تھا اپنے شوہر مزدور کے ساتھ، ہاتھ ٹھیلے پر لدا بوجھ ڈھو رہی تھی۔ (پسینے کی مہندی)

محمد خالد عابدی کے سوچنے کا انداز روایتی نہیں ہے۔ وہ کسی بھی واقعہ کو منطقی انداز سے ایک واضح سمت دینا چاہتے ہیں جس کے عمل میں تسلسل ہے اور متحرک رکھنے کا ضامن بھی ہے۔

''جب وہ نظر سے اوجھل ہونے لگا تو اس کے ہم سفر کی جدائی کے سائے اپنی باہوں میں جکڑنے لگے۔ لیکن وہ ان خوفناک اندھیروں میں آشاؤں کے چراغ روشن کرتی رہی۔

آج جب وہ کالج جانے لگی تو اس کی نظر قفس میں پھڑ پھڑاتے طوطے پر پڑی۔ طوطا نہایت سنجیدہ تھا۔ لیکن اس نے طوطے کی ذات وفطرت پر بھروسا نہیں کیا۔ کسی قیدی پر نظر سا سلوک کرتی ہوئی وہ اپنے کمرے سے تیزی سے نکل گئی۔

کالج سے واپسی پر اس کی نظر پنجرے پر پڑی۔ طوطا غائب تھا وہ ٹھٹک گئی۔ طوطا پنجرے سے نکل کر منڈیر پر جا بیٹھا تھا۔ لیکن اسے دیکھ کر واپس پنجرے میں آ گیا تھا۔

طوطے کے نہ تو پر کٹے تھے اور نہ ہی اس کی پرواز سلب ہوئی تھی۔ لڑکی کا جہاں آباد تھا۔
(سچا جھوٹ اور جھوٹا سچ)

محمد خالد عابدی اجتماعی زندگی کے تمام نشیب وفراز سے دوچار ہوتے ہیں اور اس تصادم وکشاکش کو فن کی صورت میں افسانچوں کا روپ دیتے ہیں۔ اکیسویں صدی کی ایک سچائی کو انہوں نے یوں اُجاگر کیا ہے۔

''شکیل ایک ذہین طالب علم تھا۔ اعلیٰ تعلیم کی سند لے کر وہ جب نوکری کی تلاش میں نکلنے لگا تو اس نے اپنے بزرگوں سے مشورہ کیا۔ اس کے سامنے آرمی کی نوکری تھی۔ بینک، بیمہ کمپنی اور ریڈیو، ٹی وی، کی نوکریاں تھیں۔ ان محکمہ جات میں اعلیٰ افسر کی نوکری گویا دست بستہ کھڑی تھی۔ اور بھی ملازمتیں تھیں۔

کسی نے کہا ''بزنس کرو''

''کالج میں پروفیسری۔۔۔۔۔''

''نہیں نہیں ریلوے جوائن کرو''

خاندان کا ایک فرد جو کافی دیر سے خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ گویا ہوا

''بیٹے تمہارے باپ پر بہت قرض ہے۔ پولس میں نوکری کرو۔۔''

اس جہاندیدہ شخص نے ایک جُملے میں ٹکسال کھول دی۔ (مٹی میں سونا)

محمد خالد عابدی کی شخصیت کی تعمیر طنز، انا اور ذہانت کے عناصر ثلاثہ سے ہوئی ہے۔ ذہانت نے ان کے افسانچوں میں وسعت فکر پیدا کی ہے اور انا نے بانکپن بخشا ہے۔ طنز سے بے ساختگی آئی ہے۔ ایک مثال ملاحظہ کیجیے۔

''بھوپال میں اقبال سیمینار منعقد کیا جا رہا تھا۔ تقریب میں گنگا جمنی تہذیب کے درشن ہو رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ اقبال نے گائیتری منتر کا بھی ترجمہ کیا تھا۔ رام اور گرونانک کو دل سے خراج عقیدت پیش کیا تھا۔ اقبال میں حب الوطنی کا جذبہ کسی طرح بھی کم نہ تھا۔ وہ اپنے معاصرین

جے شنکر پرساد، منشی پریم چند، درگا سہائے سرورؔ، چکبستؔ اور تلوک چند محرومؔ سے ہوا ہی وطن سے محبت اور اخوت کا ثبوت دے رہے تھے۔

لیکن اخبار کا نمائندہ پوچھ رہا تھا۔

"اقبال، پاکستان کیوں چلے گئے تھے"؟

محمد خالد عابدی کے افسانچے گلہائے رنگا رنگ کے گلدستے ہیں، جن میں انفرادیت ہے، جلوہ افروزی ہے اجتماعی زندگی کے نشیب و فراز ہیں۔ لطف اندوز ہونے کی کیفیت ہے، فکر کی نئی تلاش ہے، طنز کا عمل دخل ہے، عصری حسیت کی تیز آنچ ہے، فنکارانہ جودت و فطرت کی جولانیاں ہیں اور زبان کی تطہیر کی حرمت ہے۔

(ماہنامہ فنون اورنگ آباد (مہاراشٹر) دسمبر ۲۰۰۶ء ص ۴۳۔۴۴)

خالد عابدی "نقطۂ نو گریز" کے دائرے میں

ڈاکٹر عظیم راہی

مختصر افسانہ، آج جس طرح مقبولیت کی بلندیوں کو چھو رہا ہے۔ اسی طرح منی افسانہ/ افسانچہ مزید مختصر بلکہ مختصر ترین شکل میں ٹکنالوجی اور دور جدید کا ترجمان بن کر مقبولیت کی نئی حدیں پار کرتے ہوئے وقت کی ضرورت بن گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس صنف میں اکثر لکھنے والوں نے خوب شدت سے طبع آزمائی کرتے ہوئے اپنا نام اور اس نئی صنف کو قبولیت کا درجہ عطا کرنے میں اپنا نمایاں رول ادا کیا ہے۔ یہاں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان میں زیادہ تر نئی نسل کے لکھنے والے بڑی تعداد میں شامل ہیں کہ یہ نسل زیادہ ذہین اور تیز گام ہیں جو وقت کی ضرورت کو سمجھ کر وقت کے ساتھ چلنے کے ہنر سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ دراصل اس نسل نے اسے اپنے دور سے ہم آہنگ کرکے اس صنف کو دوسری اہم اصناف کے مقابل کھڑا کرنے کا اہم فریضہ انجام دیا ہے۔ ایسے ہی لکھنے والوں میں بھوپال کے خالد عابدی کا نام بھی شامل ہے۔

خالد عابدی ایک عرصے سے اپنی ان مختصر تحریروں سے میڈیا پرور دور کے قارئین کو جو ناظرین زیادہ ہیں، متوجہ کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ خالد عابدی کے افسانچے معاشرتی اور تہذیبی زندگی کے نت نئے مسائل کی جہاں بڑی خوبصورت عکاسی کرتے ہیں وہیں سماج میں پھیلی نابرابری، ناانصافی، تعصب اور فرقہ پرستی کی بنیادی وجہ یعنی اس مرض کی نبض کو پکڑنے میں کامیاب ہیں۔ اس تشخیصی عمل تخلیق میں ان کی بے باکی اور بے ساختگی دیدنی ہے۔ ساتھ ہی طنز کا انداز اس موضوع کی شدت تاثر کو اور سوا کرتا ہے۔ تعصب کی اس گھنی فضا سازی کو انھوں نے "جاں نثارانِ ہند" اور "ذہنی بلندی" جیسے افسانچوں میں بے نقاب کیا ہے تو "قومی ایکتا" "صلیب بردوش" "جغرافیہ کا شہر" "شہر نامہ" میں ملک کے فسادات کا گہرا عکس بھی ہے۔ اس سچائی کا بے رحمانہ اظہار اور سفاکانہ اقرار بھی ہے۔ دیگر موضوعات پر لکھے افسانچوں میں "زندگی نامہ"، "دھوپ کا موسم"، "جہیز"، "آدمی کا زہر"، "معاوضہ"، "آخری خواہش" اور "مٹی میں سونا" وغیرہ میں وہ زندگی کے کئی جیتے جاگتے روپ کو بڑے اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ جو قاری کو متاثر کن کیفیت میں پہنچا دیتے ہیں۔ زندگی کے ان مختلف رنگوں کی مختصر کہانیاں پڑھنے والے کے ذہن میں پھیل کر مسلسل

گردش کرتی رہتی ہیں۔ان کے اسلوب میں موجود انفرادیت اسی امتزاج میں پنہاں ہے کہ آغاز اور انجام، ان چھوٹی چھوٹی کہانیوں میں بڑی جامعیت کے ساتھ نمایاں طور پر نظر آتے ہیں جو ان افسانچوں میں نقطۂ عروج پر پہنچ کر زبردست تحیر اور تذبذب کے ساتھ تجسس کا ایک ایسا سماں پیدا کرتے ہیں کہ پڑھنے والے پر یکا یک چونکا دینے والی کیفیت طاری ہو جاتی ہے یہ بہر حال کسی بھی افسانچہ نگار کے لیے کامیابی کی دلیل ہوتی ہے وہیں فن افسانچہ کے لیے لازمی جز قرار پاتی ہے۔

بہر کیف اختصار کے باوصف ان افسانچوں میں افسانہ کے دیگر اجزائے ترکیبی کی بہتر انداز میں موجودگی، نمائندگی اور نقطۂ عروج کو چونکا دینے والی ڈرامائی کیفیت (جو تاثر کی شدت پیدا کرتی ہے) جیسی خوبیاں خالد عابدی کو ان افسانچہ نگاروں کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے جن سے مستقبل میں مزید بہتر افسانچوں کی امید کی جاسکتی ہے اور جس سے صنف افسانچہ کا مستقبل اور بھی تابناک بن سکتا ہے۔اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا اور نہ ہی اسے قبل از وقت پیش قیاسی سے تعبیر کیا جائے گا۔میری نیک تمنائیں خالد عابدی کے ساتھ ہیں۔انھیں ''نقطۂ نوگریز'' کا یہ خوبصورت گلدستہ حیات مبارک ہو۔

تبصرے، رائے، تاثرات

(الف) آواز نما : (ریڈیو ڈراموں کا مجموعہ/۱۹۷۵ء)

● ڈاکٹر ہارون ایوب

''آواز نما'' محمد خالد عابدی کے ۸ ریڈیو ڈراموں کا مجموعہ ہے جو (ریڈیو اور اسٹیج ڈرامے ۱۹۸۳ء) کیا اب سب ہی نشر ہو چکے ہیں۔ ریڈیو ڈرامے، اسٹیج کی تکنیک سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ اس میں قوتِ سامعہ کی مدد سے اسٹیج کا منظر اپنے ذہن میں پیدا کرنا پڑتا ہے۔ ساتھ ہی مکالمے، موسیقی اور مختلف صوتی اثرات منظر کو ذہن میں اُبھرنے میں مدد دیتے ہیں۔ لیکن خالد عابدی کے یہ ڈرامے قاری کو مطالعے کے دوران پورا لطف دیتے ہیں او اسٹیج کی کیفیت اور منظر کھل کر سامنے آجاتا ہے، کیوں کہ ان ڈراموں میں اسٹیج ڈراموں کی بھی ساری خصوصیات ملتی ہیں۔

'آواز نما' کے سب ہی ڈراموں میں تعمیری پلاٹ ہیں جس سے مصنف کا شعور ترقی کرتا ہُوا محسوس ہوتا ہے۔ موضوعات ہلکے پھلکے ہیں لیکن مکالمے برجستہ اور ظرافت کی ہلکی چاشنی لیے ہوئے ہیں، جو قاری کو برابر اپنی طرف متوجہ کیے رہتے ہیں۔ کردار جاندار ہیں اور سوسائٹی کے جیتے جاگتے افراد معلوم ہوتے ہیں زبان و اندازِ بیان موضوع اور کرداروں کا برابر ساتھ دیتا ہے۔ ماحول کی عکاسی اور واقعات کے اظہار میں بھی خالد عابدی کا قلم اپنے شباب پر نظر آتا ہے۔

الغرض یہ ڈرامے فنی تراش خراش کے ساتھ خالد عابدی کے فن کے ارتقاء اور ان کے روشن مستقبل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ بھوپال کے اس ابھرتے ہوئے فنکار کا تعارف اردو کے مشہور ڈراما نگار ابراہیم یوسف نے لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

ان ڈراموں کو دیکھنے کے بعد خالد عابدی صاحب کی اس فن پر گرفت کا ثبوت ملتا ہے۔ خالد صاحب کے اس مجموعے ''آواز نما'' کے بارے میں چند سطور لکھ کر مجھے خوشی ہو رہی ہے۔ اردو میں ڈراموں اور ریڈیو ڈراموں کے مجموعے کم ہیں۔ اس لحاظ سے ''آواز نما'' اردو میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ ان ڈراموں کو پڑھ کر کہیں گے کہ خالد صاحب آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی اور یقیناً یہ خوشی نہ تکلفاً ہوگی اور نہ رسماً بلکہ حقیقی ہوگی''۔

(ماہنامہ شاعر بمبئی نومبر ۱۹۷۵ء۔ صفحہ ۴۹۔ نومبر دسمبر مشترکہ شمارہ)

- علاؤالدین جیناؔ بڑے

''آواز نما'' محمد خالد عابدی کے آٹھ ریڈیو ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ ہلکے پھلکے ریڈیو ڈراموں کی ایک خاص تکنیک ہوتی ہے اور محمد خالد عابدی اس پر کافی عبور رکھتے ہیں۔ ڈرامے کے تین اجزاء تصادم، کشمکش اور عمل ہیں جن کی عکاسی کے لئے ریڈیو ڈراما نگار کو صرف آواز کی لہروں سے کام لینا پڑتا ہے۔ بلکہ اسٹیج کی آرائش کو بھی جس سے مقام اور وقت ظاہر ہوتا ہے اور جس سے کردار اور قصے کی وضاحت ہوتی ہے صرف الفاظ میں ادا کرنا ہوتا ہے۔

ریڈیو ڈرامے اکثر مختصر ہوتے ہیں، جیسے کہ خالد عابدی کے زیر تبصرہ ڈرامے ہیں۔ اور یہ زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ کی مختصر مدت میں براڈکاسٹ ہوتے ہیں۔ اگر مکالمے شگفتہ و برجستہ نہ ہوں اور پلاٹ دلچسپ نہ ہو تو سامعین بہت جلد ریڈیو کے کان مروڑ کر اسے خاموش کر دیتے ہیں یا کسی دوسرے اسٹیشن پر گھما دیتے ہیں۔

''آواز نما'' میں خالد عابدی کے دلچسپ اور کامیاب تفریحی ڈراموں پر ڈاکٹر اخلاق اثر نے پیش لفظ لکھا ہے۔ جس میں ریڈیو ڈراما نویسی کی مختصر تاریخ پیش کی ہے اور اس صنف کو اردو میں برتنے والوں کی تخلیقات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ پیش لفظ کافی وقیع ہے اور اس کے ساتھ ہی جناب ابراہیم یوسف نے محمد خالد عابدی کا مختصر تعارف پیش کیا ہے جو کافی دلچسپ ہے۔

یہ مجلد کتاب جس کی لکھائی اور چھپائی اغلاط سے پاک ہے۔ مکتبہ شرقیہ ابراہیم پورہ بھوپال، نیز بھوپال بک ڈپو بدھوارہ بھوپال سے صرف ساڑھے پانچ روپیہ میں مل سکتی ہے۔

(پندرہ روزہ قومی راج، بمبئی

۱۶ر مارچ ۱۹۷۶ء ص۔ ۳۳)

- عشرت ظہیر

''آواز نما'' خالد عابدی کے آٹھ ریڈیو ڈرامے کا مجموعہ ہے جس پر ابھی ابھی یو۔ پی اردو اکیڈمی نے انھیں ایک ہزار روپے کے انعام سے نوازا ہے۔

''آپ سے ملیے'' کے زیر عنوان ابراہیم یوسف نے تعارف تحریر فرمایا ہے اور اخلاق اثر کا تحریر کردہ پیش لفظ پورے پچیس صفحات پر محیط ہے۔ جس کے ابتدائی صفحات میں ریڈیو ڈراما کے ''شان نزول'' سے متعلق بحث ہے اس کے بعد خالد عابدی کے بارے میں ان کی ادبی دلچسپیوں کے بارے میں ''انکشافات'' ہیں پھر ''آواز نما'' میں شامل ڈراموں کے ایسے ۳۶ چھوٹے بڑے

مکالے نقل کئے گئے ہیں جو اپنی طرف (اخلاق اثر کو) متوجہ کرتے ہیں۔ آخر میں خالد عابدی کی تالیفات وتصنیفات زیرِ اشاعت وزیرِ ترتیب کے ذکر کے بعد یہ جملہ تحریر ہے۔

''ایک ایسا وقت آئے گا جب ''آوازنُما'' کا مطالعہ ایک بڑے فنکار کے ''نقشِ اولین'' کی حیثیت سے کیا جائے گا۔''

مذکورہ الفاظ کو پیشِ نظر رکھ کر اگر ''آوازنُما'' مطالعہ کیا جائے تو شاید مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے۔ خالد عابدی نے اپنے ڈراموں میں واقعات وماحول کا جو تانا بانا بُنا ہے وہ ایک مقصد کے تحت ہے جو پُر اثر بھی ہے اور لائق ستائش بھی۔

اُن کے ڈرامے کی خاص بات یہ ہے کہ اُن میں کم از کم کردار لائے گئے ہیں اُنھوں نے اپنے ڈرامے ''محلوں کے خواب میں'' گیارہ کرداروں سے کہانی بنائی ہے جو دوسرے تمام ڈراموں کے کردار سے بہت زیادہ ہیں۔ انہوں نے کم سے کم چار کرداروں کا سہارا لیا ہے۔ ایسے دو ڈرامے اس مجموعہ میں شامل ہیں۔

خالد عابدی لگن سے لکھتے رہے تو یقیناً اس صنف کو کچھ دے پائیں گے۔

ماہنامہ آہنگ، گیا

ماہ اپریل مئی ۱۹۷۶ء ص ۵۵-۵۶

● رام پرکاش راہی

زیرِ نظر کتاب جناب خالد عابدی کے آٹھ ریڈیو ڈراموں کا مجموعہ ہے جن میں سے بیشتر وقتاً فوقتاً آل انڈیا ریڈیو کے مختلف اسٹیشنوں سے نشر ہو چکے ہیں۔ کتاب کا پیش لفظ جناب اخلاق اثر کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اخلاق صاحب نے بڑی خوبی کے ساتھ ریڈیو ڈرامے کی تاریخ اور ارتقاء پر روشنی ڈالی ہے اور اس فنِ تخلیق وتحریر کے ان گنت مشاہیر اور ان کے برگزیدہ فن پاروں کا جامع طور پر ذکر خیر کیا ہے۔ جس سے وہ پس منظر واضح طور پر سامنے آجاتا ہے جس کی بدولت ہم ان ڈراموں کو نقد ونظر کے صحیح زاویے سے دیکھ اور پرکھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنے موضوع کے ساتھ خاطر خواہ انصاف کیا ہے۔ یہاں تک کہ مضمون بذاتِ خود اس قسم کے ڈراموں کے طالبعلم کے لئے جانکاری کا ذخیرہ اور مشعلِ راہ ہے۔

نشریاتی شکل میں ان ڈراموں کا قبولِ عام کافی سطح پر پہونچ اور ان کا کتابی صورت میں

منظرِ عام پر آنا دو مختلف چیزیں ہیں۔ لہٰذا زیرِ نظر کتاب کو ساخت پرداخت کتابت اور طباعت، زبان اور بیان لوازمات پیش کش جیسے اہم پہلوؤں سے دیکھنے کی اشد ضرورت ہے۔ یہ چھوٹی سی کتاب ہلکے آسمانی رنگ کی جلد میں ملبوس ایک سادہ مگر برجستہ تزئین کی حامل ہے۔ بظاہر زبان و بیان کے اس سہل ممتنع کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کا ہونا اس اسلوب کے لیے ناگزیر ہے۔ جو خصوصاً ریڈیو ڈراموں کی روحِ رواں ہوتا ہے لیکن ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ زیادہ تر کتابت کی کمزوری اور کسی حد تک مصنف موصوف کی زبان و بیان کی طرف بے خیالی ان فن پاروں کی خد و خال سنوارنے میں حائل سی رہی ہے۔ کوشش اوّل کی اوٹ بھی اتنی شفاف نہیں ہونی چاہیے کہ مواد کی بے مائیگی اور معاملات کی معمولیت خود بخود سطح پر تیرتی نظر آئے۔

جس طرح ناول کا مکمل تکنیکی اور تخلیقی کردار کہانی اور افسانے کے حصے میں نہیں آیا اسی طرح ریڈیو ڈرامہ بھی Full Fledge ڈرامے کی جملہ جہات اور نوک پلک کو اپنے محدود حلقے میں نہیں سمو سکتا پھر بھی اس صنفِ تحریر میں تخلیقی ریاض اور عشق کی بدولت اپنے محدود دائرے میں بھی کیف و تاثر کا وہ ماحول پیدا کر سکتا ہے۔ جس میں صوت و صدا اور موسیقی سے ترسیل و ابلاغ کے منھ بولتے نقوش ابھارے جائیں۔ لہٰذا ڈراما نگار کا تخلیقی عمل اس قابل ضرور ہو کہ وہ زندگی کے کسی واقعہ کو خیالی تنوع میں رنگ کر یا خود کسی تاریخ واقعہ کو فنی چستی کے ساتھ عجیب و غریب ملبوس دیکر ایک ڈرامائی کلائمکس تک پہنچادے اور اس کے بعد اسے تعریفی حسنِ اسلوب کے خوش انجام یا غیر خوشی انجام Cakasloraphe پر چھوڑ دے، جو سننے والوں کے لئے تفریح طبع کا سامان بن سکے۔ خالد عابدی کے یہاں یہ کوشش بنیادی طور پر موجود ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے ڈرامے ''ہو امحل'' اور دیگر پروگراموں میں پسند کئے گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس بنیادی کوشش کی پنہائیوں میں جاری و ساری، فنی تراش خراش کے عمل کی روشنی میں اس اکتساب اور ارتقاء کی نشاندہی بھی ملتی ہے جو موصوف کے فن کی روشن مستقبل کی ضامن ہے۔

ان ڈراموں کو جہاں کتابی صورت دینے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے وہاں مناسب ریڈیائی لوازمات کو لفظ و جملہ کی بدولت صفحۂ قرطاس پر رکھنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ کیوں کہ یہ ڈرامے میرے خیال میں صرف پڑھ کر ہی لطف اندوز ہونے کے لئے نہیں ہیں بلکہ اس مقصد کے لئے بھی ہیں کہ اسکول یا کالج کے طلباء انھیں اپنے ماحول میں پیش کر سکیں۔ بہت سے ڈراموں کی ابتدا ان علامات اور نشانات سے مبرا ہے۔ جو محل وقوع کہ نقشہ کشی اور منظر کی صوتیاتی پیش کش کے لیے ضروری ہے۔

جناب خالد عابدی ایک ابھرتے ہوئے ادیب ہیں۔ان کی ادبی وقتی کاوشیں ان کے لیے مناسب مقام پیدا کرنے کے درپے ہیں۔ان کے اکتساب وارتقاد کی صورت حال اس مصرعہ میں مختصراً پیش کرنا بے جانہ ہوگا۔

ابتدائے شوق ہے آئینہ دار انتہا

ہفت روزہ "ہماری زبان" ۲۲۔ مئی ۱۹۷۶ء۔ص ۱۰

● شمیم احمد صدیقی

"آواز نما" محمد خالد عابدی (بھوپال) کے آٹھ ریڈیو ڈراموں کا مختصر سا مجموعہ ہے۔اردو میں ریڈیو ڈراما کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے لیکن موجودہ دور میں ریڈیو ہی اردو ڈراموں کی بقاء کا موثر ذریعہ بنا ہوا ہے۔فلموں کی مقبولیت کے ساتھ ہی اسٹیج کے امکانات کم سے کم تر ہوگیے۔اسٹیج ڈراموں کی سست رفتار بھی رکاوٹ بنی، ریڈیو ڈراموں کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ یہاں فلم کے مقابلہ کی کوئی بات نہیں۔سست رفتاری کی شکایت بھی بہت حد تک دور ہو جاتی ہے۔

یہ ڈرامے ہلکے پھلکے، ہنسے ہنسانے والے عام طور پر طربیہ ہوتے ہیں اس لیے عوام میں بے حد مقبول ہوتے ہیں۔اردو میں ریڈیو ڈرامہ لکھنے والوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ان میں سے بہت سے فنکاروں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔"آواز نما" ان مجموعوں میں ایک نیا مجموعہ ہے مگر کسی بھی اعتبار سے اضافہ ہرگز نہیں۔

آواز نما کے سارے ڈرامے ہلکے پھلکے مزاحیہ ہیں یہ سب ڈرامے عام طور پر قدامت پرست گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔نواب، بیگم، مرزا، شاعر، ادیب، خان وغیرہ کے کردار بار بار سامنے آتے ہیں۔بدگمان بیویوں سے نالاں شوہر، قدیم یادوں کو سینے سے لگائے ہوئے نواب اور مرزا کی حرکتیں اور باتیں، ہنسانے کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ان میں ڈراموں میں گہرائی وسعت، ڈرامائیت اور نقطہ عروج کی تلاش عبث ہے بس اتنی سی بات ہے کہ یہ ہلکے پھلکے ڈرامے ہیں اور کرداروں کی فنکاری ان میں سامعین کے لئے (قارئین کے لئے نہیں) لطف و دلچسپی پیدا کر سکتی ہے۔

سہ ماہی زبان وادب پٹنہ
ماہ جولائی ۱۹۷۶ء صفحہ ۱۰۹

● عزیز اندوری

خالد عابدی مدھیہ پردیش کے جواں سال ڈراما نویس ہیں۔ جو ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھنے کی جانب گزشتہ چند برسوں سے متوجہ ہیں۔ ریڈیو ڈرامے عام طور پر پھیلے ہوئے کینواس سے محروم ہوتے ہیں اسی لئے عابدی کے ڈراموں میں بھی پھیلاؤ کی گنجائش کو تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ انہوں نے اپنے ان آٹھ ڈراموں میں اپنے موضوعات کو پھیلانے میں کسی حد تک چابک دستی کا ثبوت ضرور دیا ہے۔ لیکن چونکہ ابراہیم یوسف نے ریڈیو ڈرامے کو، ڈرامے کا اصل روپ تسلیم کرنے میں جس تذبذب کا اظہار کیا ہے اس کے پیش نظر عابدی کے ان ڈراموں کا تجزیہ کرنے میں واقعی بڑی دشواری ہوتی ہے۔ اس لئے بھی کہ ان سارے ڈراموں کے موضوعات محض تفریحی انداز پر مبنی ہیں۔ عابدی ریڈیو پر ۱۵ منٹ کے لئے چند کرداروں کی زبان سے تفریحی مکالمے ادا کرنے میں کامیاب تو ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان میں کسی خاص نتیجہ کو تلاش کرنا بے سود سا نظر آتا ہے۔ ہر چند عابدی بعض بعض مکالموں اور کردار کے ذریعہ اچھے نتائج پیش کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ لیکن انہیں ریڈیو ڈرامے کے مختصر سے وقت کا خیال ابھی زیادہ کامیاب نہیں ہونے دیتا۔ پھر بھی ان کے ڈراموں میں ایسے چبھتے ہوئے مکالمے مل جاتے ہیں۔

بیگم: یہ ظلم نہیں کہ آڑی ترچھی لکیریں کھینچ دیں اور سفید کاغذ پر بکھرے ہوئے الفاظ کا نام افسانہ رکھ دیا۔ یہ آگ کا کھیل ہے ہاتھ جل جائے تو داغ پڑ جائے۔" (دوسرا جنم)

اختر:۔ مگر عقلمند تمہیں معلوم ہونا چاہیے میں شادی شدہ آدمی ہوں۔ میں تم سے کسی طرح شادی کر لوں میری بیوی میرے ساتھ ساتھ تمہیں بھی جلی روٹیاں، باسی ترکاری، بغیر دودھ کی چائے دیا کرے گی کیا میں یہ ظلم برداشت کر سکتا ہوں، نہیں کبھی نہیں۔ (پردہ اٹھنے والا ہے)۔

مرزا:۔ ہاں یاد آیا بیگم اگر مالک مکان آئے تو اس سے کہنا کہ میاں جس دن شہر میں دو گھنٹے بارش ہوتی ہے اس روز ہمارے گھر میں چار گھنٹے بارش ہوتی ہے۔"

نواب:۔ (طنزاً) لیکن شاعر اعظم تمہارے مصرعے بحر میں نہیں ہیں۔
شاعر:۔ لیکن حضور بندہ تو قہر میں ہے۔ حضور اس مہنگائی نے سب کے وزن بگاڑ رکھے ہیں۔

پیش لفظ میں ڈاکٹر اخلاق اثر نے ڈراما کے پس منظر اور تاریخی حقائق پر بھرپور روشنی ڈال کر اردو ڈرامے کے بتدریج ارتقاء کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اسی طرح ابراہیم یوسف نے آپ سے ملیئے" میں تعارف کرانے کے تکنیکوں کو بڑے ہی ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے اور

ریڈیو ڈرامے پر مختصر روشنی ڈالی ہے۔

ماہنامہ۔کتاب نما۔دہلی، ماہ ستمبر۔۱۹۷۶ء۔ص ۴۹ (شہر خوباں میں)

• کوثر چاند پوری

عابدی کے ریڈیو ڈراموں کا مجموعہ آواز نما شائع ہوا ہے۔ انھوں نے ایک جلد عنایت کی ۸۱ صفحات کو محیط ہے ۲۴ صفحات کا پیش لفظ اخلاق اثر نے بڑی کاوش اور جستجو سے لکھا ہے آپ سے ملیے کے عنوان سے ممتاز ڈرامہ نگار ابراہیم یوسف نے تعارف قلمبند کیا ہے عابدی کے مستقبل پر ان کی پیش گوئی سنجیدہ اور تجربہ کار ادیب کے دل سے نکلی ہوئی آواز ہے عابدی نوجوان فنکار ہیں اتنی سی عمر میں بچوں پر بھی لکھا ہے ریڈیو ڈراموں کی تکنیک بالکل الگ ہے۔ ان کی اپیل آنکھوں سے نہیں کانوں سے ہوتی ہے اور براہ راست شعور سے ٹکراتی ہے۔ اخلاق اثر کا پیش لفظ تحقیقی رنگ کا ہے۔ ڈرامہ ان کا خاص موضوع ہے۔ عابدی کتابیں اور مضامین اس موضوع پر لکھ چکے ہیں۔ ریڈیو ڈرامہ کی تاریخ ۴۸ صفحات کا مختصر کتابچہ ہے اس میں گہرا تحقیقی رنگ ہے بھوپال کے ریڈیو ڈراموں کے ذیل میں بہت سے فنکاروں کے نام شمار کرائے ہیں مگر میرا نام نہیں ہے۔ بھوپال کے ریڈیو اسٹیشن سے میرے تین چار ڈرامے نشر ہو چکے ہیں بعض کو دوردھ بھارتی سے بار بار پیش کیا جاتا رہا ہے۔ عابدی کے اسلوب کو انھوں نے سراہا ہے آئندہ آنے والی کتابوں کی فہرست درج کی ہے اور عابدی کی ادبی شخصیت سے اچھی توقعات وابستہ کی ہیں۔ ان سے مجھے اتفاق ہے مجموعہ میں آٹھ ڈرامے ہیں ان سے فن پر لکھنے والوں کی گرفت کا اندازہ ہوتا ہے۔

روزنامہ افکار، بھوپال

۶ رفروری ۱۹۷۷ء

• مجید مرزا تاباں

محمد خالد عابدی کے ہلکے پھلکے ریڈیائی ڈرامے، جن میں تفریح طبع کا سامان تو ہے لیکن زندگی کی بصیرت کم تر ہے۔ آواز نما میں یکجا کئے گئے ہیں۔ ریڈیو ڈراما لکھنا ایک مشکل کام ہے۔ خالد عابدی اس مشکل سے بہ سلامت روی گزرے ہیں۔ ریڈیائی ڈرامہ کی تہہ میں لپٹا ہوا کوئی نہ کوئی سماجی پہلو بھی ہونا چاہیے تاکہ لوگوں تک پہنچنے کے اس میڈیم کو زیادہ موثر اور سودمند بنایا جا سکے۔

تفریح بھی زندگی کی ضرورت ہے۔ لیکن اولین اور تنہا ضرورت نہیں۔ ریڈیو ڈرامہ تفنن طبع کے ساتھ ساتھ غیر محسوس انداز میں عوام کے ذہنوں کی تعمیر کرنے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر اخلاق اثر کا پیشِ لفظ ایک گرانقدر مضمون ہے، جس میں انہوں نے اردو میں ریڈیائی ڈرامہ کے ارتقاء کے مراحل اور مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔

• ماہنامہ سو برس دہلی۔ فروری ۱۹۷۷ء۔ ص ۸۴

● نظام احمد قریشی

ڈرامے سے مجھے کبھی کوئی زیادہ دلچسپی نہیں رہی اس لئے ڈراموں پر کتابیں بھی میں نے بہت کم ہی پڑھیں ہیں شوکت تھانوی کے ریڈیو ڈراموں کے علاوہ غالباً ایک دو کتابیں اور دیکھی ہوں گی لیکن محض تفریح طبع کی خاطر لیکن خالد عابدی کی یہ کتاب آواز نما مجھے مجبوراً پڑھنا پڑی ایک فوری وجہ سے کہ اس پر انھیں اردو اکادمی یو۔پی۔ کی طرف سے ایک ہزار روپے کا انعام ملا اور دوسرے اس وجہ سے کہ انھوں نے یہ کتاب مجھے بڑے خلوص سے پیش کی تھی اور اگر میں اس کو نہ پڑھتا تو گویا ان کے اس خلوص کی توہین ہوتی۔ پڑھنے کے بعد اظہار خیال بھی یوں ضروری سمجھا کہ خالد صاحب کی ہنرمندی اور کوتاہیوں کی نشان دہی کر کے ان کے آئندہ کے بڑھتے ہوئے اور ترقی کرتے ہوئے قدموں کو ممکن ہے اس سے کچھ تقویت پہنچے۔

"آواز نما" آٹھ ریڈیو ڈراموں پر مشتمل ایک مختصر سی کتاب ہے ریڈیو ڈرامے عام ڈرامے کی صنف سے ہٹ کر ایک بالکل مختلف چیز ہے جس میں سب سے اہم چیز وقت کا تعین ہے پندرہ منٹ، بیس منٹ یا زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹہ اسی مدت میں ڈرامے کو آغاز سے انتہا کو پہنچنا ہوتا ہے اور سسپنس اور کلائمکس جو چیزیں بھی ڈرامے کی دلچسپی کو قائم رکھنے اور ڈرامے کو آگے بڑھانے میں معاون ہوتی ہیں سب اسی محدود مدت میں آکر ختم ہو جانا چاہئے تاکہ ڈرامے کا انجام خواہ ٹریجڈی ہو یا کمیڈی سامنے آجائے اس لحاظ سے یہ ایک مشکل فن ہے اور وہی لوگ اس میں کامیابی حاصل کر سکتے ہیں جو ریڈیو ڈرامے کی تکنیک سے واقف ہوں، اس میں کامیابی حاصل ہوتی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خالد عابدی ریڈیو ڈرامے کی تکنیک سے خوب واقف ہیں ان کے کردار ان کے مکالمے اس لحاظ سے اپنے اندر بڑی موزونیت رکھتے ہیں۔

ریڈیو ڈرامے کا مقصد تھوڑی دیر کے لئے ایک تفریح اور ہنسی کا سامان مہیا کرنا ہوتا ہے اس لئے اس کا بنیادی پہلو طنز اور مزاحیہ ہے خواہ وہ مکالموں کے ذریعہ پیدا کیا جائے یا کردار مزاحیہ رکھے جائیں آواز نما میں ہمیں دونوں چیزیں ملتی ہیں بعض جگہ چبھتے ہوئے فقرے ہیں اور بعض جگہ کردار مزاحیہ ہیں خالد عابدی دونوں طرح سے کامیاب ہیں لیکن مجھے جو چیز ان کے ڈراموں میں

گراں گذری وہ یہ کہ بیشتر ڈراموں کے کردار انھوں نے آج کے سماج سے نہیں لئے پھر یہ کہ مکالموں میں زبان کئی جگہ آج کی استعمال کی ہے مثال کے طور پر نواب صاحب مرزا بیگم یہ کردار پرانے جاگیردارانہ نظام اور لکھنوی تہذیب کو ظاہر کرتے ہیں اس دور اور اس سماج میں ایسے کردار اجنبی سے لگتے ہیں ایک زمانہ تھا کہ لوگ ان کی سادہ لوحی سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے لیکن آج کے زمانے میں تو دیہاتی لوگ بھی سادہ لوح نہیں رہے چہ جائیکہ شہر میں رہنے والے ڈرامہ محلوں کے خواب میں ایک نواب صاحب باوجود ایک خان صاحب کے سو روپیہ کے قرض دار ہونے کے اپنے کو پہلے ہی جیسا نواب خیال کرتے ہیں ان کے حضور میں ایک وزیر اعظم بھی ہیں جو ان کی ہر غلط بات کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں ایک شاعر بھی ہیں جو قصیدہ خوانی کے لئے آتے ہیں ایک مظلومہ نصیب بن بھی ہے جو فریاد کے لئے دہائی دیتی ہے ظاہر ہے کہ یہ نواب صاحب بالکل قدیم تہذیب کا ایک مرقع ہیں پھر ان کے منھ سے یہ کلمات کہ خاموش وزیر اعظم Suspend ہونا چاہتے ہو بالکل خلاف وضع اور کانوں کو بار معلوم ہوتے ہیں لیکن اس قسم کی کوتاہیاں معدود چند ہیں جس سے ان کے وقار پر کوئی آنچ نہیں آتی جہاں تک مزاج کا تعلق ہے وہ پوری طرح برقرار رہتا ہے بعض جگہ ان کے مکالمے بڑے برجستہ چبھتے ہوئے اور بے ساختہ ہیں جن سے بڑا لطف پیدا ہو گیا ہے مثلاً "سلام عید" میں سلطانہ اور شاہانہ کے دولہا بھائی اختر میاں جب عید کا سامان لے کر گھر میں داخل ہو رہے ہوتے ہیں تو یہ دونوں لڑکیاں مارے خوشی کے ان کو دروازے پر ہی روک کر پوچھتی ہیں شاداب۔ دولھا بھائی ہمارا وہ کام۔۔۔۔ سلطانہ کی بات کاٹ کر اور دولھا بھائی ہماری مہندی ان سوالوں کے جواب میں اختر میاں دولھا بھائی کا جواب بڑا برجستہ اور پر لطف ہے سنیے۔

اختر کانپتے ہوئے ارے بھائی مجھے گھر میں تو داخل ہونے دو تم تو ڈگانہ رو کے کھڑی ہو (سلام عید صفحہ ۳۷) یا اسی ڈرامے "سلام عید میں" ایک اور مکالمہ بڑا اچھتا ہے اختر میاں جب سارا سامان لے آتے ہیں تو بیوی کو سامان کی فہرست دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

اختر تو تمھاری فہرست اور۔۔۔۔ یہ فہرست کے مطابق سودا سلف اور سلطانہ یہ تمھاری مہندی۔ اب تو خوش اس پر سلطانہ ان کی سالی فرط مسرت سے کہتی ہے میرے اچھے دولہا بھائی اختر فوراً جواب دیتے ہیں کاش اس محبت سے تمھاری باجی جان پیش آتیں یہ فقرہ طنزیہ اور مزاحیہ دونوں انداز میں اس طرح سے کامیاب ہے اس طرح "پردہ اٹھنے والا ہے" کہ یہ فقرے اپنے اندر بڑی شگفتگی اور تیکھا پن رکھتے ہیں پلیز نسیم ہنٹر والی مت بنو ذرا شانتی رکھو میں آج ہی اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہوں" یا فرحت اپنے شوہر سے کہتی ہے۔ جو کمرے کے اندر ڈرامے کی ریہرسل میں

مشغول ہے "ارے میں ہوں فرحت۔ تمھاری فرو پلیز دروازہ کھولیے!"

اختر کوئی بھی ہو ٹکٹ لو بالکنی میں بیٹھو (پردہ اٹھنے والا ہے صفحہ ۶۰)

آواز نما کے ڈراموں میں ایک اور چیز جو میں نے محسوس کی وہ مقامی رنگ کی جھلک ہے۔ یعنی خالد عابدی کے بھوپالی ہونے کا اندازہ ان کے پیش کردہ ماحول سے بھی ہوتا ہے اور گفتار سے بھی مثلاً "سلام عید میں" اختر میاں بیوی اختر میاں کو بازار جانے پر اور سامان لانے پر مجبور کرتی ہیں اور اختر میاں ٹالنے کے لیے طرح طرح کے عذر کرتے ہیں زیادہ رات ہو جانے کا بہانہ کرتے ہیں اس پر ان کی بیوی کہتی ہیں۔ اب بہانہ مت تلاش کریئے۔ آج رات تو وہ دوکانیں بھی کھل گئی ہوں گی ایک عرصے سے مقفل ہونگی۔" یہاں بھوپال کا ماحول صاف جھلکتا ہے۔ جہاں چاندرات کے دن ساری رات بازار کھلا رہتا ہے۔ اسی مکالے اور گفتگو میں بھوپالی لب ولہجہ کو کسی طرح فراموش نہیں کیا جاسکتا مثلاً

اختر۔۔۔ ارے بھئی پوسٹ مین کیوں لڑ رہے ہو؟

پوسٹ مین۔۔۔ ارے صاحب دیکھئے تا بلاوجہ جھوم رہا ہے کہتا ہے تمھارے پاس میرا منی آرڈر ہے۔ (خطوط کے پتے صفحہ ۱۳۱) لفظ "جھوم رہا ہے" میں بحیثیت بھوپالی انداز ہے۔ اسی ڈرامے میں ایک اور مکالمہ دیکھئے۔

شیلا (کسی بلند جگہ سے) اے بھیا پوسٹ مین۔۔۔ او بھیا پوسٹ مین کیا ہماری کوئی چھٹی ہے؟ پوسٹ مین (بلند آواز میں) ارے بھائی ذرا نیچے آکر پوچھو صاف سنائی نہیں دے رہا ہے کیا کہہ رہی ہو؟ "ارے بائی" خالص بھوپالی لہجہ ہے اسی طرح شترگربہ کا استعمال اب میں دیکھتی ہوں۔ اگر میرے بچوں کی عید نہیں ہوئی تو سال بھر تم سے محرم منواؤں گی اور اب یہاں آپ کا کوئی دوست آکر تو دیکھئے "امجد بھائی" آپ لوگ چھپ کر ان کی دوسری شادی تو نہیں کرا رہے ہو دیکھو کمرے میں بند ہیں نہ تو خود باہر نکلتے ہیں اور نہ ہی اندر داخل ہونے دیتے ہیں۔ اور اس چڑیل کو بھی اندر چھپا رکھا ہے" آپ کے ساتھ "ہو" کا استعمال بھوپال ہی کا لہجہ ہے کسی دوسری جگہ اس طرح نہیں بولا جاتا۔

خالد عابدی نے ان ڈراموں میں ان مشہور زمانہ لطائف کو بھی محفوظ کرلیا ہے جو زبان زد خاص عام ہیں۔ مثلاً نواب صاحب کے شکار کے لطیفے جو "محلوں کے خواب میں ہیں"

آواز نما کے بارے میں زیادہ کچھ لکھنا اس سے مناسب نہیں کہ ڈاکٹر اخلاق اثر نے ایک مبسوط پیش لفظ جو اس کتاب میں شامل ہے ریڈیو ڈرامے کی تاریخ کے ساتھ ساتھ اس کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور اس کے محاسن سے بھی روشناس کرایا ہے۔ جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے۔ ہلکے پھلکے مذاق اور وقتی تفریح طبع کے لئے یہ ڈرامے ایک اچھی اور کامیاب کوشش ہے اور میں ابراہیم

یوسف صاحب کے اس قول کی تعریف کے ساتھ ساتھ تائید بھی کرنا چاہتا ہوں کہ 'خالد عابدی صاحب نے اس قدر محفوظ فن کو اپنا کر اپنی بالغ نظری کا ثبوت دیا ہے"

● روزنامہ ندیم بھوپال۔ ۶، ستمبر ۱۹۷۷ء

● ساغر مہدی

"آواز نما" خالد عابدی صاحب کے آٹھ ریڈیو ڈراموں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اردو میں ریڈیو ڈراموں کی تاریخ بہت مختصر ہے۔ یہی صورت حال ایک آدھ سال کے فرق سے انگریزی ریڈیو ڈراموں کے بارے میں بھی ہے۔ یعنی اردو انگریزی دونوں ہی زبانوں میں ریڈیائی ڈراموں کی تاریخ کم وبیش ہم عمر کہی جا سکتی ہے۔

اردو میں ریڈیو ڈراموں کا پہلا مجموعہ کرشن چندر کا دروازہ تھا جس کے بیشتر ڈرامے ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۱ء کے درمیان آل انڈیا ریڈیو نے نشر کیے۔ اس کے بعد ریڈیو ڈراموں کے مجموعوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ جن میں مرزا ادیب، اپندر ناتھ اشک، شوکت تھانوی منٹو، راجیندر سنگھ بیدی، انتصار حسین، یوسف ظفر، ممتاز مفتی، ڈاکٹر محمد حسن، چودھری سلطان، رفعت سروش، اقبال مجید، اظہر افسر، ولایت جعفری اور قیصر قلندر کے نام قابل ذکر ہیں (یہاں صرف ان ریڈیو ڈرامہ نگاروں کا ذکر کیا گیا ہے جن کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں)

بھوپال کی علمی، ادبی، فنی اور شعری مرکزیت کی افادیت واہمیت سے بہر حال انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ڈرامہ بھی ادب کی ایک صنف ہونے کی بنا پر یہاں کافی مقبول رہا ہے۔ مختلف ڈرامہ کمپنیوں نے آمد ورفت کے دوران یہاں ٹھہر کر ڈرامے اسٹیج کئے اور ذوق کے بقول تماشا کو آسودگی بخشی۔ اس طرح بھوپال کے مزاج میں ڈرامہ ادب کی دوسری اصناف کی طرح رچ بس گیا۔ غالباً اسی بنا پر بھوپال میں ڈرامہ نگاروں کی خاصی لمبی فہرست نظر آتی ہے۔ مثلاً ابراہیم یوسف، صولت جہانگیر، فضل تابش، شمیم احمد، جہانقدر چغتائی، قمر جمالی، شفیقہ فرحت، تاج بھوپالی، اختر سعید خاں، علی عباس امید، اور عظیم الدین وغیرہ۔ بھوپال کے اس باوقار، خوبصورت ادبی پس منظر میں آنکھیں کھولنے والے فنکاروں میں خالد عابدی بھی ہیں" آواز نما" ان کے ڈراموں کا پہلا مجموعہ ہے۔ جن کے خون میں گہری شعری اور ادبی روایات شامل ہیں۔ یقین ہے کہ خالد عابدی کے ریڈیو ڈراموں کا مجموعہ ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا کیوں کہ ان کے ان ڈراموں کے کردار ہماری مٹتی ہوئی تہذیب اور روایت کے افراد ہیں جواب ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔

کہیں کہیں زبان وبیان کا جھول گراں گزرتا ہے، مکالموں کی طوالت اور کرداروں کی فراوانی بھی

ذہن پر خوشگوار اثر نہیں چھوڑتی۔ پھر بھی خالد عابدی کا یہ نقشِ اولین ان کے بہتر مستقبل کی بشارت ہے۔
کتاب نہایت سادہ گیٹ اپ کے ساتھ تسلی بخش کاغذ پر چھپی ہے۔ کتاب وطباعت گوارا ہے۔

• ماہنامہ نیادور لکھنؤ۔ ستمبر ۱۹۷۸ء۔ ص ۴۸۔ ۴۷

• ادارۂ صبح ادب لکھنؤ

خالد عابدی بھوپال کے ایک ترقی پسند خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس خاندان کے افراد نے بھوپال میں درس وتدریس کے فروغ میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔

خالد عابدی کو ڈراموں سے شروع سے دلچسپی رہی ہے۔ 'آواز نما' ان کے ریڈیو ڈراموں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس کے بعد بھی امید ہے کہ کئی ایک مجموعے سامنے آئیں گے۔

'آواز نما' میں آٹھ ڈرامے ہیں اور بیشتر اس قابل ہیں کہ آسانی سے اسٹیج کئے جا سکتے ہیں۔ ان کے کئی ڈرامے بھوپال ریڈیو سے نشر ہو چکے ہیں۔

ڈراموں کی مناسبت سے 'آواز نما' مجموعہ کا نام نہ صرف مناسب بلکہ خالد عابدی کے ادیبانہ شعور کا عکاس بھی ہے۔

کتاب کے شروع میں ڈاکٹر اخلاق اثر کا ایک مفصل مضمون ڈراموں سے متعلق ہے جس سے بہت سی معلومات ہاتھ آجاتی ہیں۔ اس کے بعد ابراہیم یوسف کا ایک تعارف ہے جس سے خالد عابدی کی شخصیت پہچانی جا سکتی ہے۔

• ماہنامہ صبح ادب لکھنؤ۔ ماہ اگست ۱۹۷۹ء ص ۴۹

• اقبال مسعود

'آواز نما' بقول محمد خالد عابدی کے ریڈیو ڈراموں کا مجموعہ ہے اس بحث سے قطع نظر کہ ریڈیو ڈرامہ، ہوتا بھی ہے یا نہیں۔ نیز یہ کہ ڈرامہ کی مختلف تعریفوں کو اس مجموعے پر چسپاں کرنے کی مدرسانہ تنقید کو چھوڑ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ خالد عابدی کو مکالمہ لکھنا اور اس کے ذریعہ اپنی بات کہنے کا ڈھنگ آتا ہے۔

ریڈیو نشریات کے اپنے مسائل ہیں کچھ پابندیاں ہیں اور ان سب کے بیچ رہ کر اس طرح کی تخلیق کرنا کہ وہ عوامی سطح پر ابلاغ کو مکمل کر سکے ایک فن ہے اور خالد عابدی اس فن سے کما حقہ، واقف ہیں۔ اسی لئے انہوں نے اپنے ریڈیو مسودوں میں کوئی کمی بیشی نہیں کی انہوں نے اپنی ان

تخلیقات کے ذریعے ہنسنے ہنسانے کا منصب سنبھالا ہے اور زندگی کے بے ہنگم واقعات اور کرداروں کے تضاد سے ہنسنے کے مواقع فراہم کیے ہیں اس کے لئے کبھی وہ چاپلوس دوستوں کو سامنے لاتے ہیں کبھی مرزا اور ان کی بیگم کی نوک جھونک سناتے ہیں۔ ان کی تخلیقات میں ہمیں کلیم ملتا ہے جو بظاہر پاگل ہے، سلمیٰ جس کی جنس تبدیل ہوگئی ہے نواب صاحب اور ان کا استحصال کرنے والے افراد، خان جیسے سٹہ کھیلنے والے اور راجندر جیسے بے روزگار جو جینے اور اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشات اور آرزوؤں کے لئے زندگی سے دست و گریباں ہیں۔ یہاں ہر قہقہے کے پیچھے آنسو چھپے ہیں اور خوشی کے پردے میں غم کی گلکاری ہے، مگر انجام سب کا طربیہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جس پروگرام (لہریں پر بلسن رنگ ترنگ) کے تحت نشر ہوئے ان کا مقصد تفریح ہی رہا ہے اور خالد عابدی نے اس نقطۂ نظر سے ریڈیو میڈیم کو استعمال بھی کیا ہے۔ خطوں کے بیچ میں یہ استعمال اور نکھر کر سامنے آیا ہے۔

''آواز نما'' کی تخلیقات میں نقطۂ عروج کی تلاش فضول ہے۔ کردار نگاری میں کوئی بھی نیا پن نہیں ہے۔ البتہ ''دوسرا جنم'' کے مرزا میں نیا پن موجود تھا مگر روایتی نام نے اس کو بھی مکمل نہ ہونے دیا مکالمے ضرور جاندار ہیں۔ ان کی شگفتگی، تازگی اور رسیلے پن کی وجہ سے ان تخلیقات میں زندگی رواں دواں ہے کتاب کا گٹ اپ سادہ اور کتابت دوسرے درجے کی ہے۔ ابراہیم یوسف صاحب نے ''آپ سے ملئے'' کے عنوان کے تحت بڑے شگفتہ انداز کا تعارف کرایا ہے۔ مجموعی طور سے۔

سفر کی یہ ہے منزل اولین

شناخت بھوپال جلد ۱ شمارہ ۱۹۷۹ء ص ۱۰۷

● ڈاکٹر سید حامد حسین

مرض، موت اور مایوسیوں کے سائے میں لپٹی ہوئی اس دنیا میں مسکراہٹ ایک سنہرا تنکا ہے جسے ہر انسان زندگی کے اندھیرے میں ڈوبنے سے اپنے آپ کو بچائے رکھنے کے لئے، اپنی مٹھی میں بھینچ لینا چاہتا ہے۔ خالد عابدی نے مسکراہٹیں بانٹنے کے اسی مقدس فرض کو اپنا فن بنایا ہے اور اس کے لئے ریڈیو جیسے مقبول اور ہمہ گیر وسیلے کا انتخاب کیا ہے۔ آواز نما میں شامل ان کے ریڈیو ڈرامے ایک مانوس ماحول کے پس منظر سے ابھرتے ہیں اور اپنے بے تکلف انداز بیساختہ لہجے اور سادہ بیان سے اپنے قاری اور سامع کو اپنا بنا لیتے ہیں۔ خالد عابدی نے ہمارے احساس لطیف کو ایسے مقامات پر چھیڑا ہے جہاں ہم سب یکساں انداز سے لطف لینے کیلئے تیار ہیں وہ مزاح کی

نعت کو تقسیم کرنے کے لئے مذاق و معیار کی جھوٹی دیواریں کھڑی نہیں کرتے۔ ان کے مزاحیہ ڈرامے، سورج کی روشنی اور چاند کی چمک کی طرح سب کے لئے یکساں سامانِ لطف فراہم کرتے ہیں۔ ''آواز نما'' خالد عابدی کے ریڈیو ڈراموں کا پہلا مجموعہ ہے اس میں شامل تخلیقات ان کے مائل بہ ترقی شعور کی نشاندہی کرتی ہیں۔ یہ توقع غلط نہ ہوگی کہ مستقبل میں وہ ریڈیو جیسے عوامی ترسیل کے وسیلے کو اپنی مزاحیہ تخلیقات کے ذریعے زیادہ بہتر، مفید اور کارآمد بنانے میں مدد دیں گے۔ خود خالد عابدی ایک لطیف مزاحیہ حس کے مالک ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ ان کی آئندہ تخلیقات میں ان کی اس حس میں اور نکھار پیدا ہوگا۔ (غیر مطبوعہ)

• ڈاکٹر سلام سندیلوی

'آواز نما' جناب محمد خالد عابدی صاحب کے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں دوسرا جنم، پردہ اٹھنے والا ہے، سلام عید، خاندانی پہلوان، غبار، محلوں کے خواب، گردشیں اور خطوں کے پتے ڈرامے شامل ہیں۔ یہ سارے ڈرامے نہایت دلچسپ ہیں۔ ان ڈراموں نے ریڈیو سننے والوں کو مسحور کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ریڈیائی ڈرامے سننے کے لئے ہیں اس لئے ان کا لطف بذریعہ گوش حاصل کیا جاسکتا ہے۔

یہ ڈرامے پڑھنے والوں کے لئے بھی دلچسپی کا سامان رکھتے ہیں۔ ان ڈراموں میں کہیں ظرافت کے پھول ہیں اور کہیں طنز کے کانٹے۔ بہر حال 'آواز نما' ایک گلشن ہے جس کی تشکیل گل و خار سے ہوتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ 'آواز نما' کے ڈرامے اردو حلقوں میں کافی پسند کیے جائیں گے۔ کیوں کہ یہ ریڈیائی تکنیک پر پورے اترتے ہیں اور ساتھ ہی عام دلچسپی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ (غیر مطبوعہ)

• ڈاکٹر محمد نعمان خاں

محمد خالد عابدی نے تحقیقی و تنقیدی مضامین کے علاوہ ریڈیو ڈرامے بھی تحریر کیے ہیں۔ ان کے ڈراموں کا مجموعہ ''آواز نما'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔

''حیران ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں''، ''خاندانی شاعر''، ''خاندانی پہلوان''، ''محلوں کے خواب''، ''غلط فہمی''، ''پردہ اٹھنے والا ہے''، ''غبار''، ''دوسرا جنم'' اور ''خطوں کے پتے'' وغیرہ ڈرامے ریڈیو سے نشر ہو چکے ہیں۔

اس طرح "آواز نما" میں شامل بیشتر ڈرامے آکاش وانی بھوپال، رائے پور، اندور، جبل پور، گوالیار کے علاوہ کچھ ڈرامے دوردھ بھارتی کے ہواجل پروگرام میں بھی نشر ہو چکے ہیں۔

خالد عابدی کے ڈراموں کے بیشتر کرداروں کا تعلق قدیم خاندانوں اور ان کی مخصوص تہذیب سے ہے چنانچہ ان کے ڈراموں میں نواب، بیگم، مرزا، شاعر، ادیب وغیرہ کا ذکر بار بار اور ایک خاص انداز میں ہوتا ہے۔ "دوسرا جنم"، "سلام عید"، میں اگر میاں بیوی کی باہمی کشمکش اور بدگمانیوں کو موضوع بنایا گیا ہے تو "خاندانی پہلوان" میں نواب صاحب اور بیگم کے کردار کو ان کے مخصوص ماحول میں پیش کیا گیا ہے۔ "غبار" میں غالب کی زندگی کے پہلوؤں کو ظریفانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ "گردشیں" میں بے روزگاری کے مسئلہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ "خطوں کے پیچ" میں پوسٹ مین کی الجھنوں اور پڑوسیوں کے جھگڑوں کو دل چسپ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

"آواز نما" کے ڈرامے خاص طور سے ریڈیو کیلئے تحریر کیے ہیں اور ان کا مقصد محض ہنسنا ہنسانا اور دلچسپی پیدا کرنا ہے اس وجہ سے وہ نہ صرف مختصر ہیں بلکہ ان میں کسی قسم کی گہرائی یا فکری بلندی یا جامعیت نہیں پائی جاتی۔ ان میں ہماری زندگی اور سماج کی ناہمواریوں اور بے ہنگم واقعات کو موضوع ضرور بنایا گیا ہے لیکن محض ہنسنے ہنسانے کی خاطر اس طرح ان ڈراموں کا پلاٹ، دائرہ، کرداروں کی تعداد اور مقاصد محدود و مختصر ہے جس کے سبب انھیں پڑھ کر یا سن کر تا دیر تاثر قائم نہیں رہتا بلکہ یہ ڈرامے وقتی لطف و انبساط فراہم کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کا انجام بھی طربیہ ہوتا ہے۔ البتہ ان ڈراموں کے مکالمے خاصے دلچسپ، تیکھے اور تیز ہیں اور ان کے ذریعہ ریڈیو ڈرامے کی ضروریات و تقاضوں کو ملحوظ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً:-

نواب:- (طنزاً) لیکن شاعر اعظم تمہارے مصرے بحر میں نہیں ہیں۔

شاعر:- لیکن حضور بندہ تو قہر میں ہے۔ حضور اس مہنگائی نے سب کے وزن بگاڑ رکھے ہیں۔

('محلوں کے خواب' آواز نما)

فرحت:- آپ آرام سے لیٹیے میں پڑوس سے ڈاکٹر شرما کو بلا لاتی ہوں وہ بہت اچھے ڈاکٹر ہیں۔ آپ نے سنا نہیں انھوں نے ایک مردے کو زندہ کر دیا۔

اختر:- تم پہلے مجھے مرجانے دو بعد کو زندہ کرا لینا۔ ('پردہ اٹھنے والا ہے' آواز نما)

اس طرح 'آواز نما' کے ڈرامے ایک ابھرتے ہوئے نئے ڈراما نگار کا تعارف ضرور کراتے ہیں لیکن ان کے مطالعے سے اس ڈراما نگار کے قد میں یا انفرادیت میں کوئی خاص اضافہ

ہوتا نظر نہیں آتا۔ بقول ڈاکٹر اخلاق اثر:۔

''آواز نما'' میں شامل ڈرامے نہ تو ریڈیو ڈراما کے شاہکار ہیں اور نہ ہی خود خالد عابدی کے۔ ریڈیو ڈراما نگاری کا یہ نقش اولین ہے اور ہمدردی سے مطالعہ کا مطالبہ کرتا ہے۔ بلاشبہ ان ڈراموں میں کہیں کہیں زبان وبیان کی خامیاں ہیں تو کہیں مکالمے طویل۔ کہیں کرداروں کی تعداد ضرورت سے زیادہ ہے تو کہیں موضوع کی تکرار۔ اس کے باوجود یہ ڈرامے شاہد ہیں کہ خالد عابدی نے ایک طاقتور میڈیم کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

مجھے یقین کامل ہے کہ خالد عابدی ادب وفن کی دنیا میں بڑا مقام بنائیں گے۔ اردو ادب اور بھوپال کا وقار بڑھائیں گے۔ ایک ایسا وقت آئے گا جب 'آواز نما' کا مطالعہ ایک بڑے فنکار کے نقش اولین کی حیثیت سے کیا جائے گا۔''

(بھوپال میں اردو انعام کے بعد)

"آواز نما" پر مشاہیر کی آراء

• ڈاکٹر انصار اللہ نظر

"آپ نے مختلف کرداروں کے ماحول کی بہت صحیح عکاسی کی ہے پڑھتے ہوئے لطف آیا۔ جن مقامات پر پچھلے زمانے کے بگڑے ہوئے روساء کے انداز کا جو خاکہ ہے وہ بھی واقعی اور خوب ہے اللہ تعالیٰ آپ کے قلم کو اسی طرح مزید جولانیاں دکھانے کا موقع عطا کرے۔ کتاب ظاہری اعتبار سے بھی بہت اچھی ہے۔ یہ کتاب مجھے بعض اعتبار سے زیادہ پسند آئی، بالخصوص قدیم تہذیب جسے اب بھی ہمارے جیسے از کار رفتہ لوگ سینے سے لگائے ہوئے ہیں، اس کی ترجمانی خوب کی گئی ہے اس سلسلے میں طنز کی جو کیفیت ہے وہ نہایت مؤثر ہے"۔

۲۲ر نومبر ۱۹۷۵ء

• علامہ (پروفیسر) جمیل مظہری

اگرچہ میں ادبی اور ریڈیو ڈراموں کا اصولاً مخالف ہوں کیونکہ ڈرامے کی یہ دونوں قسمیں ڈرامے کی "علت غائی" کو پورا نہیں کرتیں۔ لیکن جب میں نے آپ کے لکھے ڈراموں کو دیکھا تو مجھے آپ کی ڈراما نگاری کی صلاحیت کا معترف ہونا پڑا۔ خدا نے آپ کو شاید اسی فن کے لئے بنایا ہے۔ لیکن آپ کی "خردہ کاری" آپ کی صلاحیتِ فن کے ساتھ انصاف نہیں کر رہی ہے۔ میری رائے اگر سنیئے تو ایک مکمل ڈراما حیات امروز کے کسی مسئلہ خاص پر لکھیئے مجھے امید ہے کہ اس سلسلے میں آپ کی پہلی ہی کوشش آپ کو ڈراما نگاری میں وہ مقام دلوا دے گی جس کے آپ مستحق ہیں۔ انشاء اللہ۔

• جوگیندر پال

"آواز نما" موصول ہوئی شکریہ! میں نے آپ کے ریڈیو ڈرامے بڑی دلچسپی سے پڑھے ہیں۔ مکالمہ دلآویز سبک پن سے عیاں ہے کہ ان کی ریڈیو پروڈکشن نہایت کامیاب رہی ہوگی۔ اس کے علاوہ بیشتر کرداروں کی نشان دہی میں بھی آپ کی چابک دستی کارفرما ہے۔ خدا کرے۔ آپ کی ڈھن بنی رہے۔

• ڈاکٹر رضا نقوی واہی

ریڈیو ڈراما نگاری ایک مشکل فن ہے۔ لیکن آپ کے قلم نے اسے بڑی خوبی سے اپنایا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اپنے ہم عصر ڈراما نگاروں میں آپ کا ایک اہم مقام ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

۲۷/جولائی ۱۹۷۶ء

• ڈاکٹر صفدر آہ

"آواز نما" میں نے بڑی دلچسپی سے پڑھ ڈالا۔ ماشاءاللہ آپ کے قلم میں بڑی شگفتگی، رنگینی، اور برجستگی ہے۔ کردار بھی آپ نے بہت اچھے پیدا کیے ہیں۔ یہ ڈرامے پڑھنے کی نہیں سننے کی چیز ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ریڈیو کے سامعین نے انھیں پسند کیا ہوگا۔ معلوم نہیں جب آپ کو سننے والوں کا اتنا بڑا حلقہ مل چکا ہے تو پھر آپ نے اس گرانی طباعت کے زمانے میں اس کتاب کی اشاعت کیوں ضروری سمجھی۔

میرے پاس بیس سال سے ریڈیو نہیں رہتا۔ میں ریڈیو ڈراما اور اس کے فن سے قریب قریب نابلد ہوں۔ ڈاکٹر اخلاق اثر کے پیش لفظ نے میری معلومات کافی بڑھائی اور میں ان کا شکرگذار ہوں۔

میری دلی تمنا ہے کہ آپ کی کتاب "آواز نما" کو بھرپور کامیابی ملے۔

۲۵/دسمبر ۱۹۷۵ء

• ڈاکٹر قمر رئیس

یہ آپ نے بہت نیک کام کیا کہ اپنے نشری ڈراموں کا مجموعہ شائع کروایا۔ ہمارے ادیب، نہ جانے کیوں ریڈیو کے لئے لکھی ہوئی تحریروں اور تمثیلوں کو شائع کرانے سے کتراتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ نئے اور نوجوان ادیب جب ریڈیو کے لئے کچھ لکھنا چاہتے ہیں تو ان کے سامنے اچھے نمونے نہیں ہوتے۔

- ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی

''آواز نما'' کے ڈرامے دلچسپ ہیں مگر ابھی بڑی ترقی کی گنجائش ہے۔ اس طرح لکھیے کہ یہ نہ معلوم ہو کہ آپ نے بہت سوچ سوچ کر لکھا ہے۔ مکالمات میں بول چال کی زبان کا زیادہ لحاظ رکھیے۔ دیگر زبانوں میں جو اچھے ریڈیو ڈرامے نشر ہوتے ہیں یا شائع ہوتے ہیں ان سے بھی استفادہ کیجیے۔

۲۷/ستمبر ۱۹۷۶ء

- ڈاکٹر سید محمد حسنین

''پیش لفظ'' اور ''آپ سے ملیئے'' ہر دو تحریر آپ کی شخصیت اور فن کی موثر ترجمان ہے۔ ''غبار'' ''خطوں کے پتے'' ''سلام عید'' پڑھ کر لطف آیا۔ آپ کا مزاج اور قلم دونوں جاندار ہیں، انھیں آسودہ اور توانا رکھیے۔

۱۶/ستمبر ۱۹۷۶ء

(ب) باغِ فکر معروف بہ مقطعاتِ نسّاخ

ترتیب و تدوین (۱۹۷۷ء)

- ادارہ ماہنامہ حریم لکھنؤ

عبدالغفور نسّاخ سرزمین بنگال میں پیدا ہوئے تھے ان کا شمار اُستادوں میں ہوتا تھا۔ باغِ فکر معروف بہ مقطعات نسّاخ کے نام سے ایک کتاب جون ۱۸۸۷ء میں شائع ہوئی تھی جو اب نایاب ہے۔ مؤلف نے اس کا نسخہ حاصل کر کے نسّاخ کی ادبی خدمات اور مقدمہ کے عنوان سے دو مضامین شامل کر کے کتابی شکل میں شائع کر کے ایک اہم ادبی خدمات انجام دی ہے۔

عرصہ ہوا سید لطیف الرحمٰن صاحب نے ایک کتاب ''نسّاخ سے وحشت'' تک نام کی لکھی تھی جو شائع ہو چکی ہے اس میں نسّاخ کے ساتھ بنگال کے تین اور شعراء کا بھی تذکرہ ہے لیکن نسّاخ کی سوانح حیات اس کتاب میں اس تفصیل کے ساتھ درج نہیں ہے۔ جس تفصیل سے زیر تبصرہ کتاب میں ہیں۔ نسّاخ شاعر ہی نہیں ایک ادیب بھی تھے۔ ان کی کافی تصانیف چھپ چکی ہیں لیکن باغ فکر کا علم کم تر ہی لوگوں کو ہوگا جو ان کے مقطعات کا مجموعہ ہے۔

مؤلف نے اصل کتاب کا سرورق ہو بہو ویسا ہی شائع کیا ہے جیسا قدیم نسخہ میں ملتا ہے۔ افسوس کہ کتابت و طباعت زیادہ اچھی نہیں، لیکن بھوپال سے ایسی کتاب شائع ہونا بھی اس دور میں جب کہ اچھے کاتب اور اچھے پریس عنقا ہیں، ایک کارنامہ ہے۔

(ماہنامہ حریم لکھنؤ، اپریل ۱۹۷۸ء۔ ص۔ ۲)

- ڈاکٹر محمد انصار اللہ نظر

رسماً اسلاف کا نام لینا عام ہے لیکن ان کا صحیح طور پر احترام اور ان کے کام کی اہمیت کا کما حقہ اعتراف عام نہیں ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ علم و دانش کے قافلہ کا صحیح خطوں پر آگے بڑھنا سابقین کی شمعِ حیات سے کسب نور کیے بغیر ممکن نہیں۔ چنانچہ تواریخ کو اہلِ مطالعہ نے علم کی باضابطہ شاخ کی حیثیت دے کر اس کی اہمیت کو تسلیم کر لیا ہے۔ ادبیات کا مطالعہ بھی تواریخ کی کمک کے بغیر ناقص رہتا ہے۔

پچھلے چند برسوں میں سابقین کے علمی کارناموں اور ان علمی کارناموں کی افہام و تفہیم کے لیے ان کے حالات اور معمولات کی تلاش و جستجو کا مذاق عام ہوا ہے لیکن اس عمومیت کے سبب ''آبروئے

شیوۂ اہل ہنر'' کو اکثر خطرات بھی لاحق ہوئے ہیں۔ یوں بھی تحقیق و تدوین کی راہیں انتہائی دشوار گذار ہیں، طرہ یہ ہے کہ ان راہوں کی پیچیدگیوں کا اندازہ کر لینا اس شخص کے لئے ممکن نہیں ہو سکتا جسے ادھر ہو کر گذرنے کی کبھی توفیق نہ ہوئی ہو۔ چنانچہ یہی نہیں ہے کہ مردانِ کارگوان کو حوصلے اور عزم کی داد نہیں ملتی بلکہ اکثر لوگ اپنی کم نظری کے سبب ان کے کارناموں کی تحقیر کے بھی مرتکب ہوتے ہیں ایسے لوگوں کی بھی بہت کمی ہے جو تمام موانعات سے بے نیاز رہ کر علم و دانش کے قافلے کو ماضی کی تابناکیوں سے روشنی بخشتے رہتے ہوں۔ محمد خالد عابدی صاحب جواں عمر جواں ہمت شخص ہیں۔ اپنی زندگی میں انھوں نے اکثر حوصلہ مندی کا ثبوت دیا ہے، جہاں تک مجھے معلوم ہے ان کے حالات خالص علمی اور تحقیقی کاموں کے لئے نہ مناسب ہیں اور نہ سازگار اس کے باوجود انھوں نے ڈپٹی عبدالغفور خاں نساخ جیسے دقت پسند مصنف کے حالات اور ان کی تخلیقات کے مطالعے سے شغف پیدا کیا اس انتخاب سے ان کے حوصلے کا اندازہ کیا جانا چاہیے۔ اپنے مطالعہ کے دوران انھیں کتنی کھکھیڑ اٹھانا پڑی اور کیسے کیسے حوصلہ شکن معاملوں سے دوچار ہونا پڑا اس کی تفصیل ''باغ فکر'' کے ''مقدمہ'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔

''باغ فکر معروف بہ مقطعات نساخ'' ڈپٹی عبدالغفور خاں نساخ کی آخری عمر کی تصانیف میں سے ایک ہے اور'' یہ ان کے قطعات پر مشتمل ۴۴ صفحات کا ایک کتابچہ ہے''

لیکن اس مختصر سے کتابچے کو جب اشاعت کے لئے عابدی صاحب نے تیار کیا تو ضخامت میں یہ تین گنا ہو گیا۔ اضافہ کی یہ صورت قابل قدر ہے بالخصوص اس لئے کہ اپنی اہمیت کے باوجود نساخ ان لوگوں میں سے ہیں جن کو بوجوہ عام طور سے نظر انداز کیا جاتا رہا ہے کتاب کے شروع میں عابدی صاحب نے ''عبدالغفور نساخ اور ان کی ادبی'' خدمات'' کے عنوان سے جو مقالہ شامل کیا ہے بہت معلومات افزا ہے۔ یہ مقالہ اگرچہ ابتدائی نوعیت کا ہے اور اس پر بہت کچھ اضافے کی گنجائش ہے اس کے باوجود آئندہ کام کرنے والوں کے لئے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس موقع پر یہ ذکر غالباً بے محل نہ سمجھا جائے کہ نساخ سے متعلق ان کے عہد کے اخباروں مثلاً اودھ اخبار وغیرہ کا مطالعہ بہت ضروری ہے نساخ کے اہل لکھنؤ سے معرکوں کے سلسلے میں کتابی صورت میں شائع ہونے والی بعض تصانیف کو شہرت حاصل ہوئی لیکن کتنی ہی تحریریں ایسی بھی تھیں جو مشہور نہ ہو سکیں، ان کی تلاش اور بازیافت بھی ضروری ہے۔

آج قدیم متون کی حفاظت کی ضرورت کا احساس عام ہو چکا ہے اور اس احساس نے محمد خالد عابدی صاحب کو ''باغ فکر'' کے شائع کر دینے پر آمادہ کیا۔ انھوں نے نہایت خلوص اور شوق کے ساتھ اس کتابچے کے متن کو خاتمہ کی عبارت تک اولین اشاعت کے مطابق کتابت کروایا۔ اس

باب میں انھوں نے اتنا اہتمام کیا کہ قدیم ایڈیشن کے سرورق کے عکس کو بھی اپنی ترتیب میں پیش کر دیا۔ اس خلوص اور اس شوق کی بہت زیادہ قدر کی جانی چاہیے۔

کتاب کے آخر میں انھوں نے کتابیات" کے تحت اپنے ماخذ کی فہرست بھی شامل کی ہے جو مطبوعہ کتابوں کے علاوہ رسالوں کے مضامین پر بھی مشتمل ہے اس طرح یہ کتاب نساخ اور ان کی علمی خدمات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے مفید سے مفید تر ہو گئی ہے۔ توقع کی جاتی ہے کہ اس کمیاب متن کو محفوظ کر دینے کے لئے علمی حلقوں میں عام طور سے محمد خالد عابدی کے لئے ممنونیت کا اظہار کیا جائیگا۔

۵؍ اگست ۱۹۷۸ء

● ڈاکٹر مختار شمیم

خالد عابدی اردو کے ان نوجوان ادیبوں میں سے ہیں جو صاف ستھرا ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ ادب میں انھیں افسانہ ڈراما اور تحقیق سے بطور خاص شغف رہا ہے۔ باغ فکر معروف بہ مقطعات نساخ، ان کی تلاش و تحقیق کا نتیجہ ہے۔

نساخ کا شمار اردو کے اساتذہ میں ہوتا ہے لیکن ہماری کم مائیگی کے سبب اب تک ان پر کوئی محتشم تحقیقی کام نہ ہو سکا۔ ان کے جن شاندار کارناموں کو وقت نے گم نامی کے پردوں میں چھپا لیا تھا۔ ان میں سے "باغ فکر" بھی ہے لیکن خالد عابدی نے کم از کم باغ فکر کو قعر گمنامی سے نکال لیا ہے۔ انھوں نے بڑی تلاش و تحقیق کے بعد "مقطعات نساخ" کو ترتیب دے کر اور اسے ادبی دنیا میں پیش کر کے واقعی ایک نمایاں کام انجام دیا ہے۔

"باغ فکر" معروف بہ مقطعات نساخ، میں ان کا تقریباً ۶۵ صفحات پر مشتمل وقیع مقدمہ بھی شامل ہے۔ نساخ اور ان کی ادبی خدمات کے جائزہ کے ساتھ ہی ساتھ انھوں نے مستند حوالوں اور دلیلوں سے بعض نئے حقائق کو بھی پیش کیا ہے۔ خالد عابدی نے جس قدر تحقیقی مواد اپنے مقالہ میں فراہم کیا ہے وہ ان کی محنت و فراست پر دال ہے۔

حیرت اور تعجب کی بات یہ ہے کہ سرزمین بنگال کے محققین خود اپنے ہم وطن ادیب و شاعر نساخ کے کارناموں سے سرسری گذر گئے ہیں۔ خالد عابدی یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے "باغ فکر" کے ذریعے نساخ سے متعلق بعض نئے تحقیقی گوشوں پر روشنی ڈالی ہے امید کہ ادبی حلقوں میں ان کی اس کاوش کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

● ماہنامہ کتاب نما دہلی اپریل۔ مئی ۱۹۸۰ء۔ ص۔ ۱۲

● ڈاکٹر محمد نعمان خاں

محمد خالد عابدی بنیادی طور پر اگرچہ ریڈیو ڈرامے کے آدمی ہیں لیکن انھوں نے کچھ تحقیقی، تنقیدی مضامین بھی قلمبند کئے ہیں۔ چنانچہ "باغ فکر (معروف بہ مقطعات نساخ" کی ترتیب ان کے اسی ذوق وشوق کا نتیجہ ہے۔

عبدالغفور نساخ شاعر، نثر نگار، تاریخ نویس، تذکرہ نگار ہونے کے علاوہ فن عروض، فن خطاطی اور علم رمل میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ مختلف موضوعات واصناف پر ان کی تقریباً ۲۳ کتابیں ملتی ہیں جن میں سے ایک "باغ فکر معروف بہ مقطعات نساخ" بھی ہے لیکن اردو کے بیشتر محققین و ناقدین نے نساخ اور باغ فکر کے متعلق اپنی لاعلمی کا اظہار کیا ہے اور جن لوگوں نے نساخ پر مضامین تحریر کئے ہیں انھوں نے بھی ان کے قطعات کا مجموعہ "باغ فکر" کو نظر انداز کیا ہے۔

محمد خالد عابدی نے اس پرانی اور کمیاب کتاب کے سلسلہ میں بہت سی نئی معلومات کے ساتھ اس کے خالق عبدالغفور نساخ کی سوانح عمری اور شاعری سے متعلق تحقیقی مواد یکجا کر کے کتابی صورت میں مرتب کر دیا اور اپنے مقدمے میں اس عام غلط فہمی کا بھی ازالہ کر دیا ہے کہ

"مقطعات اردو" اور مقطعات نساخ ایک نہیں بلکہ دو علیحدہ علیحدہ کتابیں ہیں۔"

اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں۔

"باغ فکر معروف بہ مقطعات نساخ" ایک نہایت کمیاب اور کسی قدر نایاب کتابچہ ہے۔ اکثر و بیشتر محققین سے سہواً کوئی دوسری کتاب اس کتاب سے منسوب ہو گئی ہے۔ لہذا اب اس کتاب کا منظر عام پر آنا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ آئندہ نہ تو نساخ کے ساتھ ناانصافی ہو سکے اور نہ ہی اس کتاب کو کسی دوسری کتاب سے منسوب کرنے کے مواقع مل سکیں"۔

اس طرح خالد عابدی نے اس کتاب میں عبدالغفور نساخ کے حالات زندگی اور ادبی خدمات پر تفصیلی طور پر اظہار خیال کرتے ہوئے نساخ کی ایک ایسی تصنیف کو متعارف کرایا ہے جسے ہمارے بیشتر محققین و ناقدین یا تو فراموش کر چکے تھے یا اسے کسی اور کتاب سے منسوب کر رہے تھے۔

خالد عابدی کی مرتب کردہ اس کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں ادبی تحقیق کا اچھا سلیقہ ہے۔

● بھوپال میں اردو انضمام کے بعد

(ج) پیکرِ آواز : (ریڈیو اور اسٹیج ڈراموں کا مجموعہ ۱۹۸۳ء)

● ادارہ ماہنامہ کتاب نما دہلی

سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے ادب کو بھی فروغ بخشا ہے۔ ریڈیو اور ٹی۔ وی۔ کے پروگرام اپنے سامعین و ناظرین کی دلچسپی کے لیے روز بروز بدلتے رہتے ہیں زیادہ سے زیادہ تعداد کو فیض پہونچانے کا منصوبہ بنایا جاتا ہے۔

آج کل ڈرامہ پسند کیا جارہا ہے۔ اس لیے ریڈیو کے ڈرامے لکھے جارہے ہیں۔ ان ڈراموں سے رسائل و جرائد کے صفحات بھی زینت پاتے ہیں اور پھر ڈرامے کی کتابیں قارئین تک پہنچتی ہیں۔

خالد عابدی نے ڈرامے کی صنف پر توجہ کی ہے۔ ان کے لکھے ہوئے ریڈیو اور اسٹیج ڈرامے کتابی شکل میں چھپ گئے ہیں اور پیکر آواز کے نام سے اشاعت ہوئی ہے۔ اس کی اشاعت میں فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی نے مالی اشتراک کیا ہے۔

ان ڈراموں کی فہرست میں ۸ ڈرامے، بعض آئے ایسے پڑوسی سے، خاندانی شاعر، غلط فہمی، حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں، بنا سیپ کا موتی، پرائشچت، انارکلی کا مقدمہ، غالب فلم انڈسٹری میں، شامل ہیں۔ ساتواں اور آٹھواں اسٹیج ڈراما ہے۔

جرنلسٹ نے غالب کا انٹرویو لیا ہے وہ دلچسپ ہے غالب اس کے سوال کا جواب اپنے شعر میں دیتے ہیں۔ ذوقؔ اور غالبؔ کی معاصرانہ شعری چشمک، فلم میں بھی رنگ لاتی ہے۔ انارکلی کا مقدمہ، قدرے طویل ہے، مگر اس میں بھی ملک کی موجودہ اقتصادی اور سماجی حالت کا نقشہ ہے۔ لومیرج جیل، ویزا، پاسپورٹ اور ہنی مون وغیرہ کو اکبر سلیم اور انارکلی کے کرداروں کے ذریعہ دکھایا ہے۔ دوسرے ڈراموں میں ہندوستانی سماج کی بعض کمزوریوں کو دکھایا ہے۔ بعض گھریلو زندگی کے مسائل ہیں چھوٹی چھوٹی لغزشیں یا عادتیں ہیں جو ازدواجی زندگی کو جہنم بنا دیتی ہیں۔ اس کے ساتھ ثقافتی خوبیاں بھی ہیں۔ کتاب عمدہ چھپی ہے۔

● اکتوبر ۱۹۸۳ء صفحہ نمبر ۷۶

● ڈاکٹر عنوان چشتی

'پیکرِ آواز' کو فوراً ادھر ادھر سے دیکھا۔ جی خوش ہو گیا آپ نے اچھا کیا جو ڈرامے کو اپنے

ذہنی تجربوں کے اظہار کا وسیلہ بنایا اردو میں ڈراما ایک ''مظلوم'' صنف ادب ہے۔ اس کی طرف کم توجہ کی گئی ہے۔ لیکن اس صنف میں نشو و نما کے امکانات بہت ہیں۔ ابھی تک ان امکانات کی تلاش نہیں کی گئی ہے۔ آپ جی لگا کر ڈرامے لکھئے اور اسی کو اپنا میدانِ خاص بنا لیجئے۔

''پیکر آواز'' میں بعض ایسی نشانیاں نظر آتی ہیں، جو آپ کی ڈراما نگاری کے خوش آئند مستقبل کا پتہ دیتی ہیں۔ امید ہے کہ خوب سے خوب تر کا فنی ادبی اور جمالیاتی سفر جاری رہے گا۔ میری طرف سے مبارک باد قبول کیجئے۔

● ۲۹ر دسمبر ۱۹۸۳ء مکتوب

● ڈاکٹر شمیم حنفی

آپ کا تعلق پیشہ ورانہ سطح پر بھی عوامی ذرائع ابلاغ سے ہے، پھر آپ اپنی بات کہنے کا سلیقہ بھی رکھتے ہیں۔ ڈرامے کے لئے یہ دونوں پہلو مفید ہوں گے۔ اب ذرا طویل تر ڈرامے بھی لکھئے۔ کینوس بہت مختصر ہو یا Skits ہوں تو ان میں ایک شعر کا جادو یقیناً پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر ذرا وسیع منظر نامہ ہو تو لکھنے والے کو بھی کھل کر اپنے اظہار کا موقع ملتا ہے۔

● ۳۱ر دسمبر ۱۹۸۳ء

● روزنامہ انقلاب ممبئی (م۔ر)

آٹھ ڈراموں کی یہ کتاب جو طباعت سے قطع نظر گٹ اپ کے لحاظ سے خوبصورت ہے اہل ذوق حضرات کے لئے طمانیت کا باعث ہوگی۔ اس اعتبار سے بھی کہ اردو میں فی الواقعی ڈراموں کی بے حد کمی ہے۔ ویسے مکالموں کی صورت میں لکھے جانے والے ڈرامے آئے دن مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں جن میں کوئی نیا پن محسوس نہیں ہوتا۔ ستھرے انداز و اسلوب میں معمولی خامیوں کے باوجود ان ڈراموں میں مزاح کی چاشنی تخلیقی شان کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ ''خاندانی شاعر'' ''غلط فہمی'' اور انارکلی کا مقدمہ ایسے ڈرامے ہیں جن کے کردار میں مجھوکی تو نہیں ملتی بلکہ ایسی بے اعتدالی ملتی ہے جن سے ظرافت کا پہلو پیدا کرنے میں خالد عابدی کامیاب نظر آتے ہیں۔ ''بنا سیپ کا موتی'' میں رئیس (غریب کلرک) کا کردار اپنے نئے طرز میں جیتا جاگتا کردار ہے۔ خاص طور پر یہ ڈراما خالد عابدی کے سماجی شعور کا آئینہ دار ہے۔ دیگر ڈراموں میں کردار کی افتادِ طبع اور خصائل کا احاطہ دلکش انداز میں کئے جانے کی وجہ جدت پسندی ابھر کر سامنے آتی ہے۔

پلاٹ کے منظم خاکے کی خانہ پُری میں ماحول کشی سلیس اور سادہ نثر میں بغیر کسی دوہراؤ کے ہر ڈرامے میں نمایاں نظر آتی ہے، جس سے مستقبل میں مزید نکھار کی امید کی جاسکتی ہے۔ مثلاً غالب فلم انڈسٹری میں "غالب فلمی گیت کار کی حیثیت سے یوں گویا ہیں:۔

"تانسین جی جب تک حلق تر نہیں ہوگا، بھلا گیت کیسے طلوع ہوگا۔ مشہور ہے کہ جب شراب اندر جاتی ہے تو ذہانت باہر آتی ہے۔ تو آپ کچھ سمجھے"۔ یا

پروڈیوسر رومیو کا یہ انداز بیان "ویل تانسین تم ایسا کرو آج مسٹر غالب کو اور سوچنے کا ٹائم دو" (غالب سے) "ویل غالب کیا تم دودھ بھارتی اور سیلون نہیں سنتے؟ وہاں سے کتنے سویٹ سانگس آتے ہیں تم ٹرائی کرو اچھے گیت لکھ سکتے ہو"۔

اس قسم کے لطیف طنز کی چبھن ہر ڈرامے میں زیادہ ہی محسوس ہوگی۔ تجسس و تحیّر کی کیفیت پر ختم ہونے والے ڈراموں کی روایت ان ڈراموں میں نہیں ملتی، نہ ہی بوالعجبیوں اور غیر فطری پن کا احساس ہوتا ہے۔ ان خوبیوں کے اعتبار سے "پیکرِ آواز" خالد عابدی کی ایسی کوشش ہے جو قدر کی نگاہ سے دیکھی جائیگی اور بقول علامہ جمیل مظہری "ڈراما نگاری کی دنیا میں وہ مقام دلوادے گی جس کے وہ مستحق ہیں"۔

(۱۲ر فروری ۱۹۸۴ء)

● ڈاکٹر شمس بدایونی

پیکرِ آواز محمد خالد عابدی کے چند ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ہے جو ڈراما نگاری کی موجودہ تیز رفتاری سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہیں۔ عموماً ریڈیائی ادب کی صفحات پر خاطر خواہ پذیرائی نہیں ہوتی، اور ہونی بھی نہیں چاہیے کیوں کہ ریڈیائی ادب صرف سننے کے لیے تخلیق کیا جاتا ہے، پڑھنے کے لئے نہیں۔ خالد عابدی چونکہ خود ریڈیو سروس میں ہیں لہذا انھیں یہ معلوم ہے کہ ان کے سامع کون ہیں۔ بس انھوں نے اس عام مذاق کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے یہ ڈرامے لکھے جو مختلف اوقات میں نشر ہوئے۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں صرف آٹھ ڈرامے ہیں جو دلچسپ ہیں۔ کتابت وطباعت غنیمت ہے قیمت بھی مناسب ہے۔ ریڈیائی ادب سے ذوق رکھنے والوں کے لئے یہ ڈرامے دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں۔

● سہ ماہی روشن بدایوں جلد ۸ شمارہ ۱ ۱۹۸۵ء

● ڈاکٹر ریحانہ پروین،

یہ خالد عابدی صاحب کے ریڈیو ڈراموں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے ایک مجموعہ ''آواز نما'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتاتی چلوں کہ آپ ایک لمبے عرصے سے ریڈیو سے وابستہ ہیں اور برابر ریڈیو کے لئے ڈرامے لکھ رہے ہیں۔ اسی وجہ سے آپ کے ڈراموں میں کہانی پن کے ساتھ دلچسپ زبان اور اندازِ بیان کو خاصہ دخل حاصل ہے یہی آپ کے ڈراموں کی خصوصیت ہے۔

آپ کے ڈرامے مختلف موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں کسی بھی چھوٹے سے واقعہ یا عام سے کردار سے، ہلکے سے احساس سے آپ ڈراموں کا خاکہ بُن لیتے ہیں۔ آپ نہ تو بندھے ٹکے اصول کے پابند ہیں اور نہ ہی فلسفیانہ خیالات کے بس زندگی کی چھیڑ چھاڑ، پیار، خلوص اور اکثر طنز و مزاح کا ثبوت دے کر آپ کے ڈرامے ختم ہو جاتے ہیں۔

آپ نے اکثر ریڈیو ڈراموں کے ذریعہ زندگی کے چہرے پر سے بدنما داغوں کو کھرچنے کی کوشش کی ہے مگر کبھی آپ نے اپنے قاری کا امتحان لینے یا اسے الجھن میں ڈالنے کی کوشش نہیں کی ہے۔

خالد عابدی خوبصورت، پر امن اور مکمل زندگی کے خواہاں ہیں جیسا کہ ان کے پہلے ڈرامے ''باز آئے ایسے پڑوسی سے'' ظاہر ہے۔ ریڈیو ڈرامے کے فن پر آپ کی گرفت خاص مضبوط ہے کیونکہ آپ ریڈیو ڈراموں کے سفر سے وابستہ ہیں۔ کتابت و طباعت صاف ستھری ہے مطالعہ کی دعوت دیتی ہے۔ کیونکہ سب ہی ڈرامے مزاحیہ ہیں اس لئے ایک بار کتاب ہاتھ میں آجائے تو پھر ختم کر کے ہی انسان دم لیتا ہے۔ قیمت مناسب ہے۔

● ماہنامہ پاسبان چنڈی گڑھ، جنوری ۱۹۸۵ء ص ۴۰

● اکرم فاروقی

یہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہر انسان اس کا ایک کردار ہے اور اس کی ساری زندگی ڈرامہ اور اداکاری کی نذر ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ اداکار جو نئے نظریات، نئی تہذیب، نئی اقدار اور نئے واقعات کے ساتھ اسٹیج پر آتا ہے اس پر ناظرین کی نگاہیں مرکوز ہو جانا ایک فطری امر ہے۔

خالد عابدی کے ڈرامے جہاں زندگی کی گوناں گوں تصویریں پیش کرتے ہیں وہیں ان افراد کو گلے لگانے کے لئے دل و دماغ کو بھی تیار کرتے ہیں جن کی آج کے پر آشوب دور میں ضرورت ہے۔

''پیکر آواز'' کا ہر ڈرامہ اپنی جگہ جامع، مکمل اور اثر انگریز ہے ڈراموں کے تمام عناصر ان ڈراموں میں بہ درجہ اتم موجود ہیں۔ بلاشبہ خالد عابدی اپنی جودتِ طبع کے لئے کے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ علامہ جمیل مظہری صاحب نے بھی خالد عابدی صاحب کی ڈرامہ نگاری کی صلاحیت کا اعتراف کیا ہے اور موصوف کو مشورہ دیا ہے کہ وہ ایک مکمل ڈرامہ حیات امروز کے کسی خاص مسئلہ پر لکھیں تا کہ انھیں ڈرامہ نگاری کی دنیا میں وہ مقام حاصل ہو جائے جس کے وہ مستحق ہیں۔ احقر کا خیال ہے کہ پیکر آواز میں شامل تمام ڈرامے حیات امروز کے کسی نہ کسی خاص مسئلہ سے متعلق ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ پیکر آواز کو ادبی حلقوں میں سراہا جائے گا۔

● ماہنامہ نیا دور۔ اپریل ۱۹۹۸ء ص ۴۷۔۴۸

● **سید احمد قادری**

ایک زمانہ تھا، جب اسٹیج ڈراموں کی دھوم تھی، اور یہ دھوم فلموں کے آگے مدھم ہوتے ہوتے ختم ہوگئی بعض لوگوں نے ''ڈراموں'' کے خاتمے تک کا اعلان کر دیا لیکن ڈراما نگاروں نے سپر نہیں ڈالی، بلکہ نئے زمانے اور نئے عہد سے سمجھوتہ کرتے ہوئے ڈراموں کو نئی تکنیک اور نئے انداز سے شروع کیا۔

خالد عابدی ایک ذہین اور باصلاحیت ڈرامہ نگار ہیں۔ عصر حاضر کے مسائل پر ان کی گہری نظر ہے جن کا اظہار وہ ڈراموں میں مختلف حیثیتوں سے کرتے ہیں اور خاص بات یہ ہے کہ مزاح کا Sugar coat کر کے خالد عابدی، ملک، سماج، معاشرے اور سوسائیٹی کی نفرت انگیزیوں پر بھرپور طنز کرتے ہیں خالد عابدی یقینی طور پر ایک حساس ڈرامہ نگار ہیں۔ انھیں آج کی غربت، مفلسی، مجبوری، بے بسی، ظلم استحصال کا بڑا شدید احساس ہے۔

''منی:۔ ابا جی! ماسٹر صاحب کہتے ہیں دو مہینے کی فیس جمع کرو ورنہ کلاس میں نہیں بیٹھنا اور ابا جی ہمیں تین دن سے کلاس سے نکال دیا ہے۔ کلاس ٹیچر کہتی ہیں جب تک تم یونیفارم پہن کر نہیں آؤ گی، تمھیں کلاس میں نہیں بیٹھنے دیں گے۔ ابا جی ہمیں یونیفارم بنوا دیجئے نا''

''بیٹی میں تمہارے پیٹ کی آگ بجھاؤں یا یونیفارم کے کفن کا انتظام کروں (دعا کرتے ہوئے) یا اللہ تو ہی میری مدد کر''

خالد عابدی سے مستقبل میں ''پیکر آواز'' میں شامل ''غلط فہمی'' ''حیران ہوں کہ۔۔۔۔'' پرائیویٹ وغیرہ ڈراموں سے مزید اچھے ڈراموں کی توقع کی جاسکتی ہے۔ خالد عابدی ڈراما نگاری کے فن اور تکنیک پر مکمل عبور رکھتے ہیں۔ موضوعات کا انتخاب بھی اہمیت رکھتا ہے۔ کتاب کی

کتابت، طباعت وغیرہ مناسب ہے۔

● ماہنامہ مزیج پٹنہ جولائی دسمبر ۱۹۹۸ء ص ۶۷۔۶۱

● اقبال حسین

''پیکر آواز'' خالد عابدی کے اُن آٹھ ڈراموں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ریڈیو اور اسٹیج کے لئے لکھے ہیں۔ یہ ڈرامے مختلف مسائل پر مزاحیہ انداز میں لکھے گئے ہیں۔ ڈراموں کی فضا میں سنجیدگی کا فقدان ہے تاہم یہ ڈرامے بے حد دلچسپ ہیں۔

خالد عابدی نے اپنے ڈراموں کے ذریعہ عہد حاضر کے مسائل کو ایک صحت مند زاویے سے دیکھا ہے اور ہلکے پھلکے انداز میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ خالد عابدی کے اندر تخلیقی صلاحیت ہے جس کا پتہ ان ڈراموں سے چلتا ہے۔ یہ ڈرامے ہر اعتبار سے اوریجنل ہیں۔

کتاب میں جمیل مظہری کی رائے بھی ہے جس میں خالد عابدی کی ڈرامہ نگاری کی صلاحیت کا اعتراف کیا گیا ہے۔ دراصل ڈرامے کا فن زبان وبیان کا سب سے مشکل فن ہے۔ خالد عابدی نے اس مشکل فن کو ایک موڑ دینے کی کوشش کی ہے۔

میں قارئین سے ان ڈراموں کے مطالعہ کی سفارش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ خالد عابدی آئندہ بھی اچھے ڈرامے لکھیں گے اور ڈرامائی ادب میں اپنا مقام پائیں گے۔

یہ کتاب فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے مالی اشتراک سے شائع ہوئی ہے اور دس روپیے میں خالد عابدی، ۵۳ ہوٹل روڈ بھوپال سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

● سہ ماہی اندیشہ بھاگلپور، جولائی تا دسمبر ۱۹۸۶ء۔ ص ۱۰۸

● مناظر عاشق ہرگانوی

کسی مقصد یا نصب العین کو حاصل کرنے کا سب سے بڑا محرک اس مقصد یا نصب العین سے جذباتی لگن ہے۔ خالد عابدی ریڈیو سے وابستہ ہیں اور خود بھی فنکار ہیں۔ اس لئے ڈرامے کی طرف ان کا جذباتی لگاؤ سمجھ میں آتا ہے۔ ''پیکر آواز'' میں شامل آٹھ ریڈیو اور اسٹیج ڈرامے ہیں۔ ڈرامے کی صنف میں اسٹیج اور ریڈیو کے لئے لکھتے وقت الگ تقاضوں اور باریکیوں پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔ خالد عابدی کو ان باریکیوں پر پکڑ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے تجربات زندگی کے آئینہ میں

اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ خالد عابدی کے ڈراموں کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ وہ سماجی و معاشرتی حالات و معاملات اور ان کی خامیوں و کمزوریوں کی نشاندہی بھرپور طور پر کرتے ہیں اور کھوکھلے پن کو اجاگر کرنے کے لئے سیاسی و سماجی نظام میں پھیلی ہوئی بدعنوانیوں اور بداعمالیوں کو بڑے ہی لطیف انداز میں بے نقاب کرتے ہیں۔

''باز آئے ایسے پڑوسی سے'' ''خاندانی شاعر'' ''غلط فہمی'' ''حیران ہوں دل کو روؤں کہ پیٹیوں جگر کو میں'' ''ماں باپ کا موتی''، ''پرچھائیں''، ''انار کلی کا مقدمہ'' اور ''غالب فلم انڈسٹری میں'' سبھی ڈراموں میں طنز کی زیریں لہریں محسوس کی جا سکتی ہیں۔ اردو میں آج کل ڈرامے کم لکھے جا رہے ہیں۔ ایسے میں ''پیکر آواز'' خوش گوار اضافہ ہے۔ کتاب خوبصورت چھپی ہے۔

● سہ ماہی توازن مالیگاؤں سلسلہ ۹، ۱۹۸۶ء ص ۱۸۷

● پرکاش چندر

● **Dear, Mr. Khalid**

I have seen a written by you PAIKAR-E-AWAZ in naya dour of U.P. Govt. magazin in urdu could I possibly have two copies for review as we deal with urdu book in one Sunday Edition the times of India.

THE TIMES OF INDIA. LUCKNOW. SUNDAY. MARCH 1987

PAIKAR-E-AWAZ: Is the collection of Khalid Abidi's stage and radio dramas. Urdu literature abounded in such type of dramas but this is also the tragedy of this language that drama could not become a forceful medium as it is in other Indian. languages like Bengali Gujrat. Marathi and Kannada.

It was totally neglected in , Urdu and most of the good work was done in poetry and fiction. It is confined to some dramas

of IPTA and Parsi theatre. However in recent years somedramas have been written and staged. This is encouraging and Khalid Abidi's effort is a step forward in the right direction.

● عادل صدیقی

محمد خالد عابدی کی کتاب "پیکرِ آواز" ۸ ڈراموں پر مشتمل ہے ان ڈراموں میں سے کچھ ریڈیو پر نشر ہو چکے ہیں اور کچھ اسٹیج کو مدنظر رکھ کر لکھے گئے ہیں۔

ڈرامہ کی تخلیق میں نہ صرف کردار، مکالمے یا پلاٹ کی چستی کی ضرورت پڑتی ہے، بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ اسٹیج کو بھی مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔ اگر ڈرامہ نگار اسٹیج کی باریکیوں سے نابلد ہو تو وہ ایک اچھا ڈرامہ نگار نہیں بن سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اسٹیج کے سامنے سامعین کی بڑی تعداد موجود رہتی ہے اور ان کی دلچسپی بھی برقرار رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے تا کہ سامعین ڈرامہ دیکھتے ہوئے بے کیف نہ ہونے لگیں۔ یہ وہ بنیادی عناصر ہیں جن پر ڈرامہ نگار کو کھرا اترنا چاہیئے یہی باتیں ڈرامہ نگاری کی کامیابی کی ضمانت ہیں۔

اس نظریہ سے جب ہم خالد عابدی کی کتاب "پیکرِ آواز" دیکھتے ہیں تو وہ بڑی حد تک اپنے فن پر پورا اُترتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے مصنف قاری کو (کیونکہ یہ ابھی صرف پڑھا جا رہا ہے) اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہیں۔ انھوں نے کردار کم سے کم استعمال کئے ہیں اور ان کے ساتھ پورا پورا انصاف بھی کیا ہے۔ یک بابی ڈرامے کی وجہ سے پلاٹ میں زیادہ پھیلاؤ نہیں ہے اور نہ بڑے ماحول کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس لئے اسے اسٹیج پر پیش کرنے میں بھی زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی اور کم وقفہ میں ڈرامے کی تیاری بھی ہو سکتی ہے۔

ویسے تو اس مجموعے کے تمام ڈرامے اچھے ہیں لیکن "انارکلی کا مقدمہ" اور "غالب فلم انڈسٹری میں" بہت اچھے ہیں اور پڑھتے ہوئے ہونٹوں پر تبسم رقصاں رہتا ہے۔ اس کے مکالمے اگر کرداروں کے ذریعہ پیش کئے جائیں تو ہنسی کے فوارے ضرور پھوٹیں گے۔ باقی ڈرامے بھی اپنی طرف راغب کرتے ہیں بین السطور میں آج کی موسیقی اور سنگیت کے بارے میں بہت سے چبھتے ہوئے جملے کہے گئے ہیں ان سے آج کے دور کی گائیکی پر بھرپور طنز کیا گیا ہے۔

علامہ جمیل مظہری صاحب نے بھی ڈرامہ نگاری کے فن میں آپ کی صلاحیت کا اعتراف کیا ہے اور یہ رائے بھی دی کہ ایک مکمل ڈرامہ حیات امروز کے کسی خاص مسئلہ پر لکھیے۔ یہ رائے فی الواقعی قابل توجہ ہے۔

کتاب کی کتابت تو اچھی ہے لیکن طباعت اتنی اچھی نہیں ہو سکی ہے اس کی وجہ کتاب کی قیمت ہے جو صرف دس روپیہ ہے اور یہ قیمت اس حساب سے بہت کم ہے کہ آج کے ماحول میں انسان کو مسکراہٹ بہت کم نصیب ہوتی ہے۔ اگر یہ کتاب ہمیں کچھ دیر مسکرانے پر مجبور کر سکتی ہے تو یہی اس کی کامیابی کی دلیل ہے۔

(د) زخموں کے دریچے :(افسانوں کا مجموعہ/۱۹۸۸ء)

● انور حسین خاں

تقریباً ۱۲۸ صفحات پر مشتمل محمد خالد عابدی کا پہلا افسانوی مجموعہ "زخموں کے دریچے" پیش نظر ہے۔ بہ قول مصنف یہ مجموعہ ان کے ابتدائی افکار پر مشتمل ہے جو زیور طبع سے آراستہ ہو کر "زخموں کے دریچے" کی شکل میں منظر عام پر آیا ہے۔

کوثر چاند پوری اور رام لعل جیسے ممتاز افسانہ نگاروں کے تاثرات بھی اس مجموعہ کی زینت ہیں۔ ساتھ ہی "میں اور میرے افسانے" کے تحت خود مصنف نے اپنے فن کے متعلق قاری کو روشناس کیا ہے زیرِ نظر مجموعہ میں کُل دس افسانے ہیں، جو سب کے سب مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔

محمد خالد عابدی کے افسانے انسانی زندگی کے نشیب و فراز و اور دکھ درد سے عبارت ہیں، جو قاری کو مثبت اور اصلاحی زاویۂ نظر سے سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اُن کے افسانوں میں سماجی و عصری مسائل کے ساتھ ساتھ رومانیت کی بھی جھلک ملتی ہے۔ ان کے یہاں افسانوں کے کردار غیر مانوس نہیں ہوتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنے افسانوں میں سماجی برائیوں کو اجاگر کیا ہے اور ان کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کی ہے انہوں نے اپنے افسانوں میں قومی یک جہتی، بھائی چارگی اور انسان دوستی کا پیغام دیا ہے۔ زخموں کے دریچے احساس کا زخم، کانٹے کی خوشبو اور سڑاندھ جیسے افسانوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ افسانوی زبان اور تکنیک سے خواب واقف ہیں۔ ان کے افسانوں کے پلاٹ، کردار اور زبان وغیرہ پر بھر پور قدرت حاصل ہے اور یہی ان کے روشن مستقبل کی ضمانت ہے۔

زیرِ نظر مجموعے کی کتابت و طباعت معمولی ہے لیکن گٹ اپ مناسب ہے۔

● ماہنامہ نیا دور لکھنؤ دسمبر ۱۹۸۸ء ص ۴۸

● ادارہ ماہ نامہ تعمیر ہریانہ

خالد عابدی کا تعلق مردم خیز علاقہ اور مرکزی شہر بھوپال سے ہے آپ کا شمار اُبھرتے ہوئے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے "زخموں کے دریچے" میں خالد عابدی کے وہ افسانے ہیں جو انھوں نے ابتدائی دور میں لکھے تھے اور جو مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے افسانوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے جناب رام لعل صاحب فرماتے ہیں کہ "ادیب اپنے لکھے ہوئے ایک ایک لفظ کے لئے ذمہ داری ہوتا ہے اور اس ذمہ داری پر اس کے قارئین کی گہری نظر ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ محمد خالد عابدی کو اپنی ذمہ دار کا پورا احساس ہے اور اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اپنے اندر بڑی صلاحیت رکھتے ہیں"

اس اُبھرتے ہوئے افسانہ نگار کے لئے ایک کہنہ مشق افسانہ نگار کی رائے بہت معنی رکھتی ہے۔ جناب رام لعل نے چند جملوں میں وہ سب کچھ کہہ دیا جس کے لئے صفحات درکار ہوتے ہیں۔ اس رائے سے آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جناب محمد خالد عابدی کس قدر صلاحیتوں کے مالک ہیں ان کا یہ افسانوی مجموعہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ابھی فنکار بہت کچھ لکھے گا۔ کتابت اور طباعت پر کم توجہ دی گئی ہے۔ مجھے امید ہے کہ افسانوی ادب سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کو یہ مجموعہ پسند آئے گا۔

● ماہنامہ تعمیر ہریانہ ستمبر ۱۹۹۰ ص ۳۹

● ڈاکٹر محمد نعمان خاں

"زخموں کے دریچے" محمد خالد عابدی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے جس میں دس افسانے شامل ہیں۔ یہ مجموعہ فخر الدین میموریل کمیٹی لکھنؤ کے مالی تعاون سے شائع ہوا ہے محمد خالد عابدی کا نام اہل بھوپال کے لئے اس وجہ سے نیا نہیں ہے کہ ان کے متعدد تنقیدی تاثراتی اور فلمی مضامین اور انٹرویو مختلف رسائل اور اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں ایک تحقیقی تنقیدی کتاب "باغ فکر معروف بہ مقطعات تناسخ" اور ریڈیو ڈرامے کے دو مجموعے "آواز نما" اور "پیکر آواز" شائع ہو کر منظر عام پر آچکے ہیں۔

زیر نظر افسانوی مجموعہ زخموں کے دریچے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ افسانے، افسانہ نگار کے ابتدائی افکار کا نتیجہ ہیں۔ بیشتر افسانے سماجی اور رومانی موضوعات پر لکھے گئے ہیں۔ افسانہ نگار نے اطراف کے حالات سے اثر قبول کر کے اپنے تجربات و مشاہدات کو سادہ و سلیس

زبان میں افسانہ کے قالب میں ڈھالا ہے۔ ہلکے پھلکے موضوعات پر مبنی ان افسانوں سے عام قاری پورے طور پر لطف اندوز ہوسکتا ہے کیونکہ ان افسانوں میں کسی بھی قسم کی پیچیدگی نہیں ہے۔ بقول رام لعل:۔

"مجھے خوشی ہے کہ محمد خالد عابدی ایسے نوجوان افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں جس نے نہ تو کنفیوژن کو اپنے یہاں جگہ دی ہے اور نہ ہی تخلیقی سطح پر بے دلی دکھائی ہے اس کے افسانے نہ صرف یہ کہ ابلاغ کی شرط کو پورا کرتے ہیں بلکہ اپنے پڑھنے والوں کو ایک ایسی دنیا میں لے جاتے ہیں جو ہمارے آس پاس کی ہوتی ہے لیکن اس میں رہنے والوں کے رویئے مختلف ہوتے ہیں، مسائل بھی نئے ہوتے ہیں اور ان کو برتنے اور اُن سے نپٹنے کے لئے کچھ راحت بھی مل جاتی ہے"

محمد خالد عابدی کے افسانوں کی زبان اگر چہ پختہ اور رواں دواں ہے لیکن نقش اول کی حیثیت رکھنے کے باعث اس میں کہیں کہیں فنی کمزوریاں بھی نظر آتی ہیں لیکن محمد خالد عابدی سے یہ امید وابستہ کی جاسکتی ہے کہ اگر انھوں نے افسانہ نگاری کا سلسلہ جاری رکھا تو ان کے افسانوں کا نقش ثانی، نقش اول سے یقیناً بہتر ثابت ہوگا۔

• بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو بھوپال

---

(۵) شکایتاً عرض ہے :(طنزیہ ومزاحیہ مضامین کا مجموعہ ۱۹۹۱ء)

● فوزیہ کمال

خالد عابدی کے کئی روپ ہیں وہ ناقد بھی ہیں اور محقق بھی، افسانہ نگار بھی ہیں ڈرامہ نگار بھی وہ آکاش وانی سے منسلک ہیں۔ وہ اردو میں نظموں کی تاریخ بھی لکھ رہے ہیں۔ خالد عابدی کیونکہ بنیادی طور پر مزاح یا طنز نگار نہیں ہیں اس لئے ان کے مضامین میں مجھے وہ بات نہیں ملی جس کی مجھے تلاش تھی لیکن خالد عابدی کی شخصیت کے بارے میں جب میں نے اُن کے ایک اُستاد سے معلومات حاصل کی تو انھوں نے خالد عابدی کے بارے میں جو کچھ مجھے بتایا سُن کر میری نظر میں ایک ایسے ادیب کی شکل میں ان کی شخصیت اُبھری جن کا ادبی قد اُن کے اصل قد سے بڑا لگنے لگا۔ خالد عابدی کو اگر میں اردو کا دیوانہ کہوں تو شاید انھیں بُرا نہیں لگنا چاہیے۔

"شکایتاً عرض ہے" میں یوسف ناظم رقم طراز ہیں۔

"محمد خالد عابدی خالص اُردو لکھتے ہیں۔ حتیٰ الامکان انگریزی الفاظ کے استعمال سے گریز کرتے ہیں کیونکہ وہ شاید جانتے ہیں کہ اردو زبان خود کفیل ہے اور اس میں اتنی صلاحیت موجود ہے کہ وہ ان کے نازک سے نازک اور وزنی سے وزنی خیال کو خوبصورت لباس عطا کردے"

خالد عابدی نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اور جس طرح اردگرد کا ماحول بھی ان کی علمی پیاس کے لئے سازگار نہ تھا لیکن انھوں نے اس مجلک اور دھندلی فضا سے کس طرح ہاتھ پاؤں مار کر آج جہاں تک پہنچے ہیں ایسا بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ خالد عابدی کے استاد کہتے ہیں۔ ان کے استاد نے نام ظاہر کرنے کو منع کیا ہے پھر بھی میں نام ظاہر کر رہی ہوں وہ ہیں جانے پہچانے جناب جہانقدر چغتائی صاحب۔

ایک بچہ جس کے تعلیم حاصل کرنے کے لئے کچھ بھی نہ ہو اور جو پڑھے لکھے لوگوں کے آس پاس گھوم کر یہاں تک پہنچا ہو اور کئی کتابیں شائع ہو چکی ہوں اور جو آج بھی کسی ہوٹل میں داخل ہونے سے پہلے کہیں کوئی اردو کی کام کی کتاب بکتی دیکھے اور اس کو خرید کر بھوکا اپنے دفتر چلا جائے جس کے پاس رکھنے کو الماری نہ ہو لیکن نایاب کتابیں ضرور ہوں ایسا ہی ایک شخص خالد عابدی مجھے لگا ان کے استاد کی باتیں سن کر مجھے ایسا لگا کہ جس کو اپنے کام سے عشق ہو اس کے لئے راستے میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی۔

خالد عابدی صاحب کی کئی کتابیں شائع ہو کر منظر عام پر آچکی ہیں "آواز نما" ریڈیو ڈرامے کا مجموعہ ۱۹۷۵ء، "باغ فکر معروف قطعات ناسخ" (تدوین) ۱۹۷۷ء، "پیکر آواز" (ریڈیو اسٹیج ڈراموں کا مجموعہ ۱۹۸۳ء، "زخموں کے دریچے" (افسانوں کا مجموعہ) ۱۹۸۸ء، "شکایتاً عرض ہے" (طنز و مزاح) ۱۹۹۱ء۔

''شکایتاً عرض ہے'' میں ۱۲ مضامین شامل ہیں۔ پہلا مضمون ''ریڈیو اناؤنسر میں'' ریڈیو کے پورے ادارے پر بھرپور طنز ہے۔ ''گم شدہ شیروانی'' دوسرا مضمون ہے یہ مزاحیہ ہے ''سالانہ خریداری'' میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جو لوگ رسالہ کی رقم تو منگوا لیتے ہیں اور رسالہ نہیں بھیجتے۔ ''اکسیر نسخہ'' میں کتابیں مانگ کر پڑھنے والوں کا ذکر بہت دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ جب کسی کو ٹالنا ہو تو میرے ہتھکنڈے آزمایئے'' میں خالد عابدی نے یہ بتایا ہے کہ کسی کو کس طرح ٹالا جاتا ہے۔

ایک جگہ لکھتے ہیں۔

میرا یہ دعویٰ ہے کہ اگر دُنیا میں ہر چیز بالکل سستی کر دیجائے تو اس وقت بھی مہذب فقیروں کی عادت وفطرت میں کوئی خاطر خواہ فرق نہیں آئیگا۔ آپ گویا ہوں گے کہ حضرات یہ مہذب فقیر کون ہوتے ہیں۔؟'' تو میرا جواب یہ ہوگا کہ ''مہذب فقیر اس مخلوق کا نام ہے جو بڑی تنخواہیں پاتے ہیں لیکن ''اخبار'' مانگ کر پڑھتے ہیں۔ رسائل مانگ کر پڑھتے ہیں اور کتابیں مانگ کر بلا وجہ اپنے آپ کو ''پڑھا کو'' ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں

اپنے ایک مضمون ''قلم انسائیکلو پیڈیا'' میں رقم طراز ہیں۔

''عیدالضحیٰ کے موقع پر قربانی سے پیشتر جانور کو دانہ پانی دکھاتے ہیں۔ شائقین سے انتظار مزید برداشت نہیں ہو رہا تھا چنانچہ ان کے ظرف کا پیمانہ چھلک گیا جم غفیر میں سے کسی حضرت نے صور اسرافیل پھونکا''۔

وجاہت علی سندیلوی لکھتے ہیں۔

''وہ اپنے گرد و پیش کی عام زندگی سے اپنے طنز و مزاح کا مواد حاصل کرتے ہیں ان کا شعور ظرافت بڑا زود حس اور سماج کے مضحک پہلوؤں پر ان کی نظر فوراً پڑ جاتی ہے جو ایک اچھے اور پختہ مزاح نگار کا خاصہ ہوتی ہے''

خالد عابدی کا مزاح مکالموں کی ادائیگی جملوں کی ساخت اور ماحول سے پیدا ہوتا ہے اور ایک زیر لب تبسم کی کیفیت پیدا کرتا ہے وہ بات سے بات پیدا کرنے کے ہنر سے آگاہ ہیں اور انشائیوں کو پھیلانے اور وسیع کرنے کے لئے واقعہ اس خوبصورتی سے انشائیہ میں ضم کرتے ہیں کہ لطف آجاتا ہے۔

''بھوپال میں اُردو طنز و مزاح نثری تخلیقات کے آئینہ میں''

(فوزیہ کمال ایم اے ۹۹۔ ۱۹۹۸ء)

ڈاکٹر محمد نعمان خاں

کتاب ''شکایتاً عرض ہے'' محمد خالد عابدی کے طنزیہ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ عام طور سے ادب میں طنز و مزاح کو دوسرے درجے کی تحریر سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ بات بعض دیگر اصناف کے لئے بھی کہی جاتی رہی ہے۔ موضوعاتی یا صنفی اعتبار سے ادب کو تقسیم کیا جاسکتا ہے، لیکن اس طرح سے خانوں میں منقسم کرنا، اس وجہ سے مناسب نہیں ہے کہ کسی بھی فن پارے کے معیاری یا غیر معیاری ہونے کا انحصار ہونا فنکار کی تخلیقی صلاحیتوں پر ہوتا ہے۔

''شکایتاً عرض ہے'' فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اتر پردیش کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے ۱۲۸ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں جناب یوسف ناظم اور جناب وجاہت علی سندیلوی کے تاثرات کے علاوہ بارہ طنزیہ مزاحیہ مضامین شامل ہیں۔

اگر چہ مذکورہ بالا کتاب میں شامل سبھی مضامین معیاری نہیں ہیں، لیکن بیشتر مضامین دلچسپ اور پُر لطف ہیں، ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کا اصل مقصد قاری کو ذہنی تفریح بہم پہنچانا ہے لیکن ان مضامین میں ایسی معنویت اور نشتریت بھی پوشیدہ ہے جو قاری کو ہنسنے ہنسانے کے ساتھ ساتھ غور و خوض کرنے پر بھی مجبور کرتی ہے، اکثر جگہ مصنف کا مشاہدہ قاری کا تجربہ بنتا ہے محسوس ہوتا ہے۔

محمد خالد عابدی بنیادی طور ر ڈراما نگار ہیں لیکن انہوں نے تحقیقی، تنقیدی اور فلمی مضامین کے علاوہ انٹرویوز، انشائیے اور افسانے بھی تحریر کیے ہیں۔ ان کی تحریریں مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اور ڈرامے آل انڈیا ریڈیو سے نشر کئے جا چکے ہیں۔ ان کی تصانیف میں مذکورہ بالا کتاب کے علاوہ ریڈیو ڈراموں کے دو مجموعے ''آواز نما'' اور ''پیکرِ آواز'' افسانوں کا مجموعہ ''زخموں کے دریچے'' تحقیقی کتاب ''باغ فکر معروف بہ مقطعات نساخ'' شائع ہو چکی ہیں اور مختلف موضوعات سے متعلق کئی کتابیں زیر طبع ہیں۔

خالد عابدی کے ڈراموں اور افسانوں کی طرح مذکورہ بالا کتاب کے مضامین کا مواد بھی روزمرہ کی زندگی کے واقعات اور سماج کے بعض مضحک پہلوؤں سے حاصل کیا گیا ہے۔

ان میں متوسط طبقہ کے حالات اور مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ بیشتر مضامین مصنف کے تجربات و مشاہدات کا نتیجہ ہیں اور ان میں بے جا مبالغہ آرائی یا آورد کے بجائے آمد کی کارفرمائی نظر آتی ہے جس کے سبب فطری بے ساختگی اور روانی پیدا ہو گئی ہے۔

خالد عابدی کو زبان پر عبور حاصل ہے انہوں نے مضامین کو پر لطف بنانے کے لیے موضوع

کے انتخاب کے علاوہ دلچسپ طرز اسلوب کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ ان مضامین کی نمایاں خوبی ان کے دلچسپ موڑوں اور چست مکالمے ہیں جو نہ صرف قاری کی دل بستگی کے لیے سامان فراہم کرتے ہیں۔ بلکہ اسے مصنف کا ہم خیال بھی بناتے ہیں۔

''صاحب مکان'' سالانہ خریداری''،''گمشدہ شیروانی''،''ریڈیو انا ونسر''،''خوش نویسی''، ''اکسیر نسخہ'' وغیرہ مضامین، مزاح کی اچھی مثالیں پیش کرتے ہیں۔

''صاحب مکان میں'' بڑھتی آبادی اور گرانی کے سبب مکانات کی کمیابی اور ان کے حصول کے سلسلے میں پیش آنے والی مشکلات یا سالانہ خریداری میں رسائل کے مدیران سے شکایت وغیرہ سنجیدہ اور تلخ حقائق کو مزاح کے پیرایہ میں بیان کرنا آسان کام نہیں ہے لیکن مصنف نے ان موضوعات کو خوش اسلوبی سے نبھانے کی کوشش کی ہے۔

''فلمی انسائیکلو پیڈیا'' اور حوالہ جات طنزیہ مضامین ہیں۔ اولالذکر مضمون میں عہدِ حاضر کے ان نوجوانوں کو موضوع بنایا گیا ہے، جن کے ذہن پر فلمی کلچر چھایا ہوا ہے او جو حقیقت کے بجائے خوابوں کی دنیا میں سانس لیتے ہیں۔

''حوالہ جات'' نام نہاد ادیبوں پر گہرا طنز ہے۔ ''نام'' اور اکسیر نسخہ'' اگر چہ تشنہ مضامین ہیں لیکن ان میں مزاح کی چاشنی کو برقرار رکھا گیا ہے۔

اگر چہ کتاب ''شکایتاً عرض ہے'' میں شامل تمام مضامین دلچسپ ہیں لیکن کتابت کی خرابی کے سبب ان سے پورے طور پر لطف اندوز نہیں ہوا جا سکتا۔

بہر حال آج کے مشینی عہد میں جبکہ انسان بیک وقت مختلف النوع مسائل و مصائب میں گرفتار ہے اور اس کی زندگی بے کیفی، بے یقینی اور غم انگیزی کی فضا سے گھری نظر آتی ہے۔ ایسے ہوشربا حالات میں ہنسنے ہنسانے کی کوشش ایک مستحسن عمل ہے۔ ادب خصوصاً مزاحیہ ادب زندگی میں نہ صرف توازن پیدا کرتا ہے بلکہ لطف و مسرت فراہم کرنے کا موثر ذریعہ بھی ہے۔ اس اعتبار سے محمد خالد عابدی کی یہ کتاب ایک مفید اور مستحسن کوشش تصور کی جانی چاہیئے۔

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو۔ بھوپال)

- **ظفر صہبائی**

فلمی مضامین، افسانے، ڈرامے، انٹرویوز، تحقیقی و علمی مضامین اور ان پر مستزاد طنزیہ مزاحیہ انشائیے لکھنے کی لیاقت پیدا کر لینا ہی اپنے آپ میں ایک غیر معمولی بات ہے۔ کیوں کہ ان اصناف

کا ایک دوسرے سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ ہر صنف کے اپنے فنی تقاضے مطالبات اور الگ الگ حدود ہیں ان متضاد اصناف کو کامیابی سے برتنے اور انہیں صیقل کر کے آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی چمک پیدا کرنا اور بھی مشکل کام ہے۔ محمد خالد عابدی نے اس کام کو ایمانداری سے حقیقت کر دکھایا ہے۔ ان کی تازہ تصنیف ''شکایتاً عرض ہے'' جو طنزیہ مزاحیہ انشائیوں پر مشتمل ہے۔ ان کی فطری حس لطیف کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ وہ عام گفتگو میں بھی بڑے بلیغ طنزیہ مکالمے بول جاتے ہیں جو بظاہر ہنسا کر دیر تک چبھتے رہتے ہیں۔ جب ''شکایتاً عرض ہے'' میرے ہاتھوں میں آیا تو مجھے کوئی تعجب نہیں ہوا کیونکہ یہ تو ان کا روزمرہ کا وطیرہ ہے۔ ہاں علمی اور تحقیقی مضامین لکھنے پر اکثر انگشت بدنداں ہونا پڑتا ہے اور خوف بھی آتا ہے کہ چار و ناچار اس ریگستان میں گھسنا پڑے گا کیوں کہ محمد خالد عابدی تبصرہ کی فرمائش ٹھونکیں گے۔ وہ مبصر اچھے ہیں جو کتاب کو پڑھے بغیر قلم فرسائی کر لیتے ہیں مگر ہم سے یہ نہیں ہوتا۔ خیر اس جملہ معترضہ کو چھوڑ کر ''شکایتاً عرض ہے'' پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

بارہ انشائیوں کی اس گدڑی میں کئی لعل موجود ہیں۔ ریڈیو ناونسر، گمشدہ شیروانی، اور خوش نویسی خصوصیت کے ساتھ بھرپور انداز نگارش، سلاست بیان، بلیغ طنز اور مزاح کی پھلجھڑیوں کے سبب ممتاز ہیں۔

صاحب مکان، قلم انسائکلو پیڈیا، سالانہ خریداری، ہمارے سماج میں پھیلی برائیوں کے آڑے ترچھے خاکے ہیں جنہیں دیکھ کر ہنسی آتی ہے اور محسوس کرنے پر تلخی اور کڑواہٹ سے دہن بھر جاتا ہے۔ محمد خالد عابدی کے انشائیوں میں عصری حسیت حاوی نظر آتی ہے۔ وہ بڑی خوبی سے اس عہد کی خامیوں پر نشتر زنی کرتے ہیں۔ عہد، حوالہ جات، اکسیر نسخہ، جب کسی کو ٹالنا ہو اور نام ذرا کمزور لمحوں کی پیداوار ہیں۔ اگر محمد خالد عابدی ذرا اور نوک قلم تیز کر لیتے تو ''شکایتاً عرض ہے'' کی گدڑی میں کئی اور لعل دکھائی دیتے۔ مجموعی طور پر محمد خالد عابدی کی یہ تصنیف طنزیہ مزاحیہ ادب میں ایک اچھا اضافہ ہے۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

(و) اردو انٹر ویوز:

(اُردو ادیبوں شاعروں اور فلمی ہستیوں سے مراسلاتی انٹرویوز ۱۹۹۲ء)

● عنوان چشتی

"ادبی انٹرویو وہ تحریر ہے، جس میں ملاقاتی (Interviewer) کسی "ادبی شخصیت" سے بات چیت کے ذریعہ اس کی زندگی کے ایسے "افکار واقعات" کو کھود کر نکالتا ہے، جو اس کی تحریر اور تقریر میں موجود نہیں ہوتے۔ یعنی ملاقاتی، صاحب ملاقات (Interviewee) کی شخصیت کے تاریک گوشوں کو روشنی میں لاتا ہے۔ اس کی شخصیت اور فن کے نادر، نازک اور مہین پردوں کو اٹھاتا ہے اور اس کی شخصیت کی گہرائی میں اتر کر نئے مگر پُرانے جلوے چُرانے کی کوشش کرتا ہے۔ مجھے کہنے دیجئے کہ ملاقاتی، اپنی خداداد صلاحیت و ذہانت اور دلکش مگر تیکھے اور انوکھے سوالوں کی مدد سے صاحب ملاقات (Interviewee) کے دل کو اس کی زبان تک لے آتا ہے اور گفتنی ناگفتنی سب کچھ اسی کی زبان سے کہلواتا ہے اس طرح "انٹرویو کا فن" ایک دو دھاری تلوار ہے، جس کی ایک دھار ملاقاتی کی اور دوسری دھار "صاحب ملاقات" کی رگِ گلو سے قریب ہوتی ہے۔ ادبی انٹرویوز کا پیمانہ لفظ و بیان، نسبتاً ایک نیا پیرائیہ اظہار ہے۔ جس پر ابھی تک خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ مجھے خوشی ہے کہ محمد خالد عابدی صاحب نے "ادبی انٹرویوز" کو اپنے ادبی شعور کا مظہر بنایا ہے۔ انھوں نے اردو کے متعدد محققوں، نقادوں، شاعروں اور ادبی شخصیتوں کی ادبی بات چیت (Interviews) کو کتابی صورت میں پیش کرنے کی جسارت کی ہے۔

محمد خالد عابدی اردو کے ایک بے لوث اور مخلص ادیب ہیں۔ انھوں نے استقلال اور لگن سے اردو زبان وادب کی جابندی کی سعی کی ہے۔ یوں تو ان کی متعدد تحریریں شائع ہو چکی ہیں اور اردو کے اہم لکھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کر چکی ہیں۔ لیکن ان کے ادبی انٹرویوز بہت اہم ہیں۔ ان کو ایسا جام جہاں نما کہا جا سکتا ہے، جس میں ادبی شخصیتوں کے جلوے بے نقاب نظر آتے ہیں۔ میں صمیم قلب سے اس کتاب کی اشاعت پر محمد خالد عابدی صاحب کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔"

● ۶ نومبر ۱۹۹۱ء

● رؤف خیر

محمد خالد عابدی اردو کے جانے پہچانے ادیب ہیں کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ افسانے

کے ساتھ مزاحیہ ادب اور ڈراموں پر گہری نظر ہے۔ آپ چونکہ خود آل انڈیا ریڈیو بھوپال سے منسلک ہیں اس لئے آپ نے کئی ڈرامے ریڈیو کے لئے بھی لکھے اردو ادب اور فلم سے متعلق آپ کے مضامین ملک کے مقتدر رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ عموماً ڈرامے طربیہ ہوا کرتے ہیں اس لئے ڈرامہ نگار کا طنز و مزاح سے قریبی تعلق ہوا کرتا ہے۔ عابدی صاحب کا ایک مجموعہ ''شکایتاً عرض ہے'' طنز و مزاح پر مشتمل مضامین کا مجموعہ ہے۔ آپ کی تحریر دلچسپ اور قاری کو اپنے سحر سے باندھے رکھتی ہے۔ افسانوں اور ڈراموں میں یہی جادو سرچڑھ کر بولتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب ''اردو انٹرویوز'' دراصل اردو کے مشہور و ممتاز ادیبوں، شاعروں، ڈرامہ نگاروں اور مزاح نگاروں سے مراسلاتی گفتگو پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں مراسلے کو مکالمہ بنانے کی پوری پوری کوشش کی گئی ہے۔ دو بدو بات چیت میں بات سے بات پیدا ہوتی ہے۔ مگر یہاں سوالات اور جوابات کا اکہرا پن جزئیات سے پاک ہے۔ گفتگو میں غیر ضروری عناصر بھی در آسکتے ہیں مگر تحریریں دو ٹوک اور جامع ہوا کرتی ہیں گفتگو میں انٹرویو دینے والا غیر ذمہ دار بھی ہو سکتا ہے تحریر کی دستاویزیت اسے ادھر ادھر کی ہانکنے سے روکے رکھتی ہے وہ بہت سنبھلا سنبھلا رہتا ہے۔ اس احتیاط کو کچھ لوگ تصنع اور تکلف سے عبارت بھی سمجھ سکتے ہیں کہ آدمی کھل کر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بعض باتیں Off the record بھی ہوتی ہیں اور وہی اہم بھی ہوتی ہیں مگر انھیں ضبط تحریر میں لایا نہیں جا سکتا اس لئے دن کی روشنی دیکھ نہیں پاتیں۔ غیر ذمہ دار سے بہت کچھ کہنے کے بجائے ذمہ داری سے کچھ لکھ دینا بہتر ہے۔ اسی ذمہ دار دستاویز کا نام ''اردو انٹرویوز'' ہے۔ خالد عابدی صاحب ''بیسویں صدی میں اردو کا مکتوباتی ادب'' پر ریسرچ بھی کر رہے ہیں۔ ''روبرو'' گفتگو پر مشتمل آپ کے ''انٹرویوز'' کی کتاب بھی شائع ہونے والی ہے۔

آپ نے پندرہ فن کاروں سے انٹرویو لئے۔ احسن رضوی، اظہر افسر، اسلم واحدی، پریم وار برٹنی، تیج ناتھ زار، جرم محمد آبادی، جمیل شیدائی، خواجہ عبدالغفور، رام لال نابھوی، رضا مظہری، ستیہ پرکاش سنگر شمیم جے پوری، ضیا فتح آبادی، قیصر عثمانی، اور نریندر لوتھر، ان میں بیشتر نام تو وہ ہیں جن سے عام قاری واقف ہے اسے ان کے بارے میں مزید واقفیت حاصل ہو جاتی ہے کچھ ایسے بھی ہیں جن کے بارے میں پڑھتے ہوئے اس کی معلومات میں اضافہ ہو رہا ہوگا۔

احسن رضوی ادب میں غیر معروف شاعر رہے فلموں میں چل نہیں سکے۔ گیت لکھ نہیں سکے عمر بھر Ghost writer بنے رہے۔ ایڈورٹائزنگ صداکاری میں امین سیانی کی وجہ سے وہ جم نہیں سکے۔ حالانکہ وہ مغل اعظم کے بھی کچھ ڈائیلاگ لکھنے کی بات کرتے ہیں مگر وہاں بھی امان جیسے

ڈائیلاگ رائٹر کے آگے ان کا چراغ جل نہیں پایا۔ ان کی غزلوں، نظموں سلاموں اور نوحوں کے مجموعے نکلے مگر عام قاری تک ان کی رسائی نہ ہو سکی۔؟

احسن رضوی نے کاتب وحی حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قاتل ثابت کرتے ہوئے ''مقتولین معاویہ'' بھی لکھی۔ اردو زبان کے بارے میں عابدی صاحب کے سوال کا جواب دیتے ہوئے احسن رضوی صاحب نے کہا کہ: ''سارے جہاں میں دھوم ہماری زبان کی ہے۔ کم بخت کٹ کے بھی چلتی ہے یہ دعویٰ نہیں تجربہ ہے۔''

حیدر آباد کے اظہر افسر ایک عرصے تک آل انڈیا ریڈیو میں ملازم تھے۔ بے شمار چھوٹے بڑے ڈرامے لکھے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ ہمیشہ ڈرامہ لکھتے وقت انہوں نے اس بات کا خیال رکھا کہ اس ڈرامہ کو نہ صرف ریڈیو پر پیش ہونا ہے بلکہ چھپنا بھی ہے۔ اس لئے نوک پلک درست رکھنے کی کوشش کی۔

اسلم واحدی اعظم گڑھ کے ایک شاعر ہیں جو نشور واحدی کے رشتہ دار بھی ہیں مگر آپ نے شاعری کے بجائے ڈرامہ نگاری۔ اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر کی سخت ترین ڈیوٹی بھی انجام دیتے رہے۔ آپ کے زیادہ تر ڈرامے ریلوے انسٹی ٹیوٹ میں اسٹیج کئے گئے ہیں اور پسند کئے گئے۔

پریم وار برٹنی ایک ایسے شاعر تھے جن کی فلم ''یہ بستی یہ لوگ'' آج تک ریلیز نہ ہو سکی مگر اس فلم کا ان کا لکھا ہوا گیت دل جلے گا تو زمانے میں اجالا ہوگا۔ آج بھی کانوں میں رس گھولتا ہے۔ آپ نے اپنے انٹرویو میں فلمی دنیا کے ہرجائی پن سے متعلق خوب روشنی ڈالی اور کہا کہ ''نہ تو ہر شاعر شکیل بدایونی اور ساحر لدھیانوی کا ہنر لے کر پیدا ہوتا ہے اور نہ کوئی معقول شاعر آنند بخشی اور ورما ملک بننا پسند کرتا ہے''۔ مرحوم پریم اور برٹنی آج زندہ ہوتے تو دیگر فلمی شاعروں کے گیت سُن کر پتہ نہیں کیا ارشاد فرماتے اللہ نے انہیں ان برے دنوں سے بچا لیا۔

تیج ناتھ زآر نے بتایا کہ انہوں نے شاعری کی افسانے لکھے اور ساتھ ساتھ فلموں کے لیے بھی لکھا کرتے تھے مگر ان کی تخلیقات کا کوئی مجموعہ ابھی تک منظر عام پر نہیں آسکا۔

جرم محمد آبادی اک بسیار گو شاعر تھے لمبی لمبی غزلیں کہتے تھے۔ آرزو لکھنوی کے شاگرد بھی تھے ان سے جب عابدی صاحب نے اپنی تخلیقات کی شانِ نزول بتانے کے لئے کہا تو جرم صاحب اپنے شعری مجموعوں کے نام گنوانے لگتے ہیں۔

جمیل شیدائی حیدر آباد کے ایک ہونہار ڈرامہ نگار ہیں۔ ان کے ڈرامے نہ صرف آل انڈیا ریڈیو حیدر آباد سے گاہے گاہے نشر ہوتے رہتے ہیں بلکہ ''ہوا محل'' سے نشر ہو کر مقبولیت حاصل کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے

مزید بتایا کہ وہ ریڈیائی اور اسٹیج ڈرامے نہ صرف لکھتے ہیں بلکہ ان میں کوئی رول خود بھی ادا کرتے ہیں۔

خواجہ عبدالغفور کی شہرت لطیفہ بازی کی وجہ سے ہے۔ آپ سماجیات اور نفسیات پر انگریزی میں لکھتے لکھتے اردو میں طنز و مزاح لکھنے لگے۔ آپ نے کہا کہ طنز دل آزاری کا باعث ہوتا اگر اس میں اصلاح کا پہلو نہ ہو۔ طنز اگر خوش مذاقی پر مبنی ہو تو مزاح پیدا کرتا ہے ورنہ دونوں میں کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔ رام لال نابھوی ادبی گھرانے کے آدمی ہیں ان کے دادا منشی گوبند رام فارسی، عربی اور سنسکرت کے عالم تھے۔ آپ نے طنزیہ مزاحیہ مضامین کے ساتھ ساتھ انشایئے بھی لکھے۔ آپ کی کتابوں پر کئی انعامات بھی ملے یعنی آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ آپ نے ڈرامے خاکے، رپورتاژ اور انٹرویوز ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔

رضا مظہری مشہور شاعر جمیل مظہری کے بھائی ہیں مگر آپ نے بتایا کہ اپنے کلام پر آپ نے کسی سے اصلاح نہیں لی حتیٰ کے اپنے بھائی سے بھی نہیں۔ البتہ کلکتہ کے بعض نوجوان شعرا کی اصلاح ضرور کی۔ ایک شعر کی شانِ نزول بتاتے ہوئے بزرگ محترم فرماتے ہیں کہ:

ایک دن سڑک پر جا رہا تھا۔ اُدھر ایک کمسن لڑکی آ رہی تھی۔ اس کی اٹکھیلیاں دیکھ کر بے ساختہ یہ شعر ٹپک پڑا:

ابھی سے چال میں اٹھ کھیلیاں جب اتنی ہیں
خرام ناز جوانی میں کیا سے کیا ہوگا

موصوف نے اصلاح نہیں لی ورنہ دوسرا مصرعہ کچھ یوں ہوتا

خرامِ ناز جوانی میں جانے کیا ہوگا۔

خالد عابدی صاحب چونکہ ''مکتوباتی ادب'' پر ریسرچ کر رہے ہیں اس لئے تقریباً ہر ادیب یا شاعر سے مکتوباتی ادب کے بارے میں ضرور سوال کرتے ہیں۔ چنانچہ ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں رضا صاحب نے کہا کہ اردو تو اردو ہر زبان کا مکتوباتی ادب نہایت اہم ہوا کرتا ہے۔

ستیہ پرکاش سنگر کے کئی ڈرامے چھپے اور اسٹیج ہوئے۔ محکمہ تعلیمات سے آپ کا تعلق تھا۔ آپ نے ادبی اور انتظامی دونوں سطحوں پر اصلاح کی بڑی کوشش کی ہے۔ انجمنیں قائم کیں اور انجمنوں میں اتحادِ فکر اور ذوقِ عمل پیدا کیا۔ ساتھ ساتھ آپ نے ڈینا بھی ہاتھ سے جانے نہیں دی۔ جہاں رہے پلاٹ خریدا یا گھر تعمیر کیا شہریار کا خیال ہے کہ ع

اپنے نقشے کے مطابق یہی زمیں کچھ کم ہے۔

قیصر جے پوری بھی مشاعروں کے کامیاب شاعر شمار ہوتے تھے۔ مشاعرہ بازی بھی دراصل ہاکی، فٹ بال، کرکٹ کی طرح ہے۔ آدمی جب تک فارم میں ہے نام کماتا ہے جہاں فارم کمزور ہونے لگا ٹیم سے

نکال دیا جاتا ہے۔ دوسرے کھلاڑی اس کی جگہ لے لیتے ہیں۔ کچھ دوستوں نے دشمنی کی ان کی پانچ بیاضیں اڑادیں اور ایک بیاض نذرِ آتش کردی۔ پتہ نہیں ان دوستوں کی نیت خراب تھی یا نیک نیتی سے ادب پر احسان کیا۔ شمیم صاحب نے کہا کہ ان شاعروں کا موضوع صرف محبت ہے اور فیض کہتے ہیں ع

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔

ضیاؔ فتح آبادی کپور تھلہ پنجاب میں پیدا ہوئے۔ امرت سر میں پلے بڑھے اور دہلی میں زندگی گزاری۔ سیمابؔ اکبر آبادی کے شاگرد تھے۔ ضیا صاحب کا خیال بلا تبصرہ پیش ہے۔ فرماتے ہیں!

''جس شاعر کے دماغ کا کوئی پیچ جتنا زیادہ ڈھیلا ہوتا ہے وہ اتنا ہی بڑا شاعر بن جاتا ہے جیسے انشاء اور مجاز۔''

اللہ کا شکر ہے کہ ضیاؔ صاحب نے مثال میں صرف دو ہی نام لئے ورنہ ہر شاعر ایسی بڑائی سے انکار کردیتا۔

قیصر عثمانی اپنا سلسلۂ نسب حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جوڑتے ہیں۔ انتہائی باحیا گھرانے کا شخص انتہائی بے حیا، فلمی میدان سے جڑا ہوا ہے۔ مینا کماری کی یادیں، ''فلمستان'' اور فلمی دنیا کا شعری ایکسرے ''پرچھائیوں کا دیس'' کا مصنف مکالمہ نگاری اور منظر نگاری وغیرہ کے لئے جو نئے لکھنے والے فلمی دنیا میں آنا چاہتے ہیں انھیں مشورہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ''ان نئے فن کاروں کو یہ ضرور دیکھ لینا چاہئے کہ وہ کہاں تک ''مخلوم الدماغ'' ہیں۔

آخر میں نریندر لوتھر نے اپنے انٹرویو میں کہا کہ داخلی محرکات کے علاوہ خارجی ترا غیب بھی انہیں لکھنے پر اکساتی ہیں۔ انہوں نے فرانسیسی آرٹسٹ یان کاکتو کے Jean Cocteu حوالے سے کہا کہ اگر کوئی پینٹر ایک کھڑکی بھی بناتا ہے تو وہ اپنی سوانح حیات لکھتا ہے۔ ادبی کردار حقیقی کرداروں کے مرکب ہوتے ہیں۔ بہر حال یہ فوٹو گرافی نہیں بلکہ مختلف تجربات و مشاہدات ایک نئی تخلیق کی بنیاد بنتے ہیں۔ میتھیو آرنلڈ Mathew Arnold کے لفظوں میں ہنسی ہنسی میں اخلاق کو سنوارا جاسکتا ہے یہی مزاح نگار کا منصب ہے۔

اس طرح ''اردو انٹرویوز'' مختلف ادیبوں، شاعروں، ڈراما نگاروں اور مزاح نگاروں کے خیلات کا مجموعہ ہے جن کی روشنی میں انہیں سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس کتاب میں خالد عابدی صاحب نے اپنے وجود کا احساس بھی دلایا اور اس تصنیف کو تالیف ہونے سے بچالیا۔

حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا ہوا یہ مجموعہ تقدیم و تاخیر کے جھنجھٹوں سے مرتب کو بچاتا ہے۔ قاری کو یہ کتاب یقیناً پسند آئے گی۔

● ۲۹ راگست ۱۹۹۳ء

● ڈاکٹر گیان چند جین

شمہ رضوی کی معرفت آپ کی دلچسپ اور معلوماتی کتاب اردو انٹرویوز ملی۔ تہہ دل سے مشکور ہوں۔ ان مضامین سے متعلقہ ادیب کے بارے میں مفید اور صحیح معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اہل تحقیق اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

●(مکتوب) ۲ر ستمبر ۱۹۹۳ء

● سلیمان اطہر جاوید

اردو میں ادبی شخصیات سے انٹرویو ہو گئے تو خاصے لیکن کتابی صورت میں ان کی اشاعت کم ہی عمل میں آئی ہے۔ ندا فاضلی کی ملاقاتیں اور مناظر ہرگانوی کی "روبرو" اور بھی ہوں گے مگر چند ایک۔ محمد خالد عابدی نے شعراء ادباء اور فلمی ہستیوں سے لئے گئے اپنے مراسلاتی انٹرویوز کو کتابی صورت میں بعنوان "اردو انٹرویوز" شائع کیا ہے۔ انٹرویوز کی خوبی اور عمدگی کا انحصار اس شخصیت سے زیادہ جس کا انٹرویو لیا جا رہا ہے۔ اس شخص پر ہوتا ہے جو انٹرویو لے رہا ہے انٹرویو لینے والے کو اپنے سامنے والی شخصیت کے مزاج، مذاق اس کے ذہنی پس منظر اس کی نفسیات اس کی مصروفیات اس کی صلاحیتوں اور زندگی اور زمانہ کے تعلق سے اس کے رویہ کو پوری طرح ذہن میں رکھنا ہوتا ہے انٹرویو لینے والے کی کامیابی یہ ہوتی ہے کہ وہ سامنے والے سے نہ صرف وہ کہلوائے جو وہ کہنا نہیں چاہتا اور جو اس نے اب تک نہیں کہا۔ ورنہ جو وہ کہنا چاہتا ہے وہی کہلوایا جائے تو انٹرویو کا حاصل کیا؟

بہر کیف انٹرویو لینا ایک فن ہے اور انٹرویو لینے والے کو اپنے دل و دماغ کی ساری کھڑکیاں کھلی رکھنی پڑتی ہیں۔ ہمارے ہاں انٹرویو جو ادھر ادھر ادبی جراید میں شائع ہوتے ہیں بالعموم رسمی ہوتے ہیں وہی باتیں جو اور ذرائع سے بھی مل سکتی ہوں انٹرویو دینے والا وہی کہہ دیتا ہے پھر انٹرویو لینے والے کو انٹرویو لینے کے لئے شخصیات کا انتخاب بھی ہنر مندی سے کرنا چاہئے۔ محمد خالد عابدی ریڈیو سے وابستہ ہیں اور ان دنوں بھوپال اسٹیشن سے منسلک ہیں۔ بھوپال ریڈیو سے ان کے ادبی انٹرویو اکثر و بیشتر "روبرو" کے عنوان سے نشر ہوتے ہیں ان کی کتاب "اردو انٹرویوز" میں جن شخصیات سے انٹرویوز ہیں، ان میں پریم وار برٹنی، خواجہ عبدالغفور، ضیا، فتح آبادی، شمیم جے پوری، نریندر لوتھر، اظہر افسر اور جرم محمد آبادی وغیرہ شامل ہیں۔ ان انٹرویوز سے متعلقہ شخصیات اور زندگی اور فن کے اہم گوشوں پر روشنی پڑتی ہے اور ان شخصیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے خاصی معلومات فراہم ہو جاتی ہے۔

محمد خالد عابدی نے اگر چہ بیشتر کھرے اور تیکھے سوالات بھی کیے ہیں لیکن فی البدیہہ۔ انداز کی کمی ضرور محسوس ہوتی ہے۔ یہ کیفیت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کہ انٹرویوز بالمشافہ ہوں۔ بالمشافہ انٹرویوز میں ایک اور فائدہ یہ بھی ہے کہ بات میں بات نکلنے کی وجہ سے کئی باتیں سامنے آجاتی ہیں تاہم ''اردو انٹرویوز'' خاصے کی کتاب ہے اور معلومات آفریں بھی۔ یقین ہے محمد خالد عابدی کے انٹرویوز کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

• روزنامہ منصف حیدرآباد۔ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۹۳ء۔ صفحہ ۳

• محسن رضا رضوی

خالد عابدی انشائیہ، ڈراما، تنقید، افسانہ وغیرہ کئی اصناف سے شغف رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ ادھر یہ اپنے مراسلاتی انٹرویوز کی وجہ سے بھی معروف ہوئے ہیں۔

ان کے وہ انٹرویوز جو گزشتہ چند برس میں مختلف رسائل میں چھپے ہیں، اب ''اردو انٹرویوز'' کے نام سے کتابی صورت میں منظرِ عام پر آئے ہیں۔ اس میں پندرہ شعراء ادبا و فلمی شخصیتوں کے مختصر مراسلاتی انٹرویوز شامل ہیں۔

خالد عابدی چھوٹے اور سیدھے سادے سوالات کے ذریعے صاحب ملاقات (Interviewee) کی زندگی کے ان اہم گوشوں کو اپنے قارئین پر اجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جو بہ وجوہ اب تک پردۂ خفا میں تھے۔ فلیپ پر عنوان چشتی کی رائے کے سوا کتاب میں کوئی مقدمہ، پیشِ لفظ وغیرہ شامل نہیں خالد عابدی نے اپنی طرف سے بھی کچھ نہیں لکھا ہے۔ خالد عابدی کا اپنی طرف سے کچھ نہ لکھنا ایک کمی کا احساس دلاتا ہے۔ دوسری کمی جو مجھے محسوس ہوئی یہ کہ انٹرویوز کے اختتام پر کوئی تاریخ یا سال درج نہیں ہے، جس سے پتہ چل سکے کہ یہ انٹرویو کب لیے گیے ہیں۔

• ماہنامہ ایوانِ اردو دہلی، نومبر ۱۹۹۳ء ص ۴۸۔۴۷

• ڈاکٹر ہارون ایوب

انٹرویو کے لفظی معنی ہیں ایک دوسرے کے خیالات کا تبادلہ۔ پہلے یہ انٹرویو صرف بالمشافہ لئے جاتے تھے مگر اب ٹیلیفون اور خط و کتابت کے ذریعے بھی لئے جانے لگے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب ''اردو انٹرویوز'' میں ایسے انٹرویو شامل ہیں جو خط و کتابت کے ذریعہ سے لیے گئے ہیں۔ ان

انٹرویوز سے بہت سی ادبی شخصیتوں کے خیالات کھل کر سامنے آگئے ہیں، جو ان کی تخلیقات کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

شخصی انٹرویوز میں حقائق بھی ہوتے ہیں اور رائے بھی اس نقطہ نظر سے یہ انٹرویوز قارئین کو بہت سی نئی معلومات فراہم کرتے ہیں اور نہ صرف ایک ادیب یا شاعر کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے بلکہ اس کے جذبات و خیالات سے بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے اور ایک عام قاری اس سے متعارف ہو جاتا ہے۔

یہ تمام انٹرویو خط و کتابت کے ذریعہ جوابی لفافہ بھیج کر حاصل کیے گئے ہیں۔ اس لیے ہمارے ادباء اور شعراء حضرات کو بھی کھل کر، وضاحت سے جواب دینے کا موقع ملا ہے، جس نے ان انٹرویوز کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا ہے، البتہ بعض جوابات خاصے طویل ہو گئے ہیں مگر ان کی یہ طوالت قارئین کو گراں نہیں گزرتی ہے۔ مثلاً مدھیہ پردیش کے قیام کا ذکر کرتے ہوئے جناب ستیہ پرکاش سنگر صاحب نے جو تاثراتی جواب تحریر کیا ہے، وہ کتاب کے تقریباً ۲ را ۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ مگر ایک ایک پہلو کھل کر سامنے آگیا ہے۔

اس انٹرویوز کے مجموعے کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں ہندوستان کے ہر علاقے کے ادیب و شاعر شامل ہیں لیکن بڑا حصہ پنجاب اور ہریانہ کے ادیبوں اور شاعروں کا ہے۔ مثلاً پریم وار برٹنی، تیج ناتھ زار اور ست پرکاش سنگر، ان کے علاوہ خواجہ عبد الغفور، اظہر افسر نریندر لوتھر اور شمیم جے پوری وغیرہ جیسی اہم شخصیتیں بھی شامل ہیں۔ زیر نظر کتاب مختلف مصنفین کے مختلف خیالات و تجربات کا احاطہ کرتی ہے اور کسی بھی انٹرویو کے مطالعہ سے جانب داری کا احساس پیدا نہیں ہوتا ہے۔

زبان سادہ اور عام فہم ہے، انٹرویو کے معیار اور مزاج کے عین مطابق ہے۔ علاقائی لب و لہجہ کی انفرادیت ہر انٹرویو میں نمایاں نظر آتی ہے۔ الغرض ''اردو انٹرویوز'' قاری کو ایسی دنیا میں لے جاتی ہے۔ جہاں اُکتا دینے والی کیفیت کا نام و نشان نہیں ہے البتہ چند سوالات ہر انٹرویو میں دہرائے گئے ہیں لیکن ان کے جواب مختلف ہیں اس لئے یکسانیت کا احساس پیدا نہیں ہونے پاتا ہے۔

خالد عابدی اردو کے بے لوث اور مخلص ادیب ہیں جو خاموشی سے ادب کی خدمت کر رہے ہیں یہ کتاب اُن کو مستقبل کے اچھے ادیب کی حیثیت سے روشناس کرانے میں کامیاب ہے۔

کتابت و طباعت صاف ستھری ہے۔

• ماہنامہ تعمیر ہریانہ چنڈی گڑھ، دسمبر ۱۹۹۳ء

● عمر انصاری

دوسری اصناف نثر ونظم کی طرح مصاحبہ بھی ایک صنف ادب ہی ہے۔ اس کی سب سے بڑی اہمیت ان معنی میں ہے کہ انٹرویو (مصاحبہ) کے ذریعہ کسی کو بھی ان سوالات کے جوابات فراہم کرنا ہوتے ہیں جو سوال کرنے والا چاہتا ہے، اس میں ایسے مقامات بھی آتے ہیں جب جواب دینے والا کسی بات سے صرف کرنا چاہتا ہے اور سوال کرنے والا صاحب موصوف سے اسی کا جواب اگلوانا چاہتا ہے۔

مثال کے طور پر زیر تبصرہ کتاب کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو کہ شمیم جے پوری عام طور پر مشاعروں کے مقبول شاعر تصور کیے جاتے ہیں اور ان سے مشاعروں کے سلسلے میں عابدی صاحب نے سوال پوچھ لیا:

عابدی: آج کل جو مشاعرے منعقد ہو رہے ہیں ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

شمیم: چوں کہ خود مشاعروں میں شرکت پر مجبور ہوں اس لئے اس پر روشنی ڈالنا خلاف مصلحت ہے۔ صرف اتنا عرض کروں گا کہ ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ آج کا مشاعرہ محض چند متشاعر اور رنگ بندوں کے اکھاڑے کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔''

اسی طرح بعض نقاد اپنا سارا زورِ قلم اس پر صرف کرتے رہے کہ شاعری مقصدی ہونا چاہئے اور ہر شاعر کو اپنی شاعری کے ذریعہ کوئی با مقصد پیغام دینا چاہیے اور اگر کسی شاعر کے پاس کوئی پیغام نہیں تو وہ شاعر ہی نہیں۔ جبکہ شاعری کے لئے پیغامات بالکل ضروری نہیں۔

میرے نزدیک ان مثالوں سے مصنف کی ذہانت اور بالغ نظری کا پتہ چلتا ہے اور اس اعتبار سے کتاب میں خاصی کام کی باتیں اور خاصے اہم نام بھی شامل ہیں۔

مصنف نے ان مصاحبوں کو مراسلاتی انٹرویوز کا نام دیا ہے، یعنی سوال نامہ بھیج کر جوابات حاصل کیے گئے ہیں۔

مراسلاتی انٹرویوز اور بالمشافہ انٹرویو کا خاص فرق کچھ اس طرح پر ہے کہ جہاں مراسلت کے ذریعہ سوال، پوچھے جانے پر کسی کو بہت سوچ سمجھ کر بہت نپا تُلا جواب تحریر کرنے کا موقع ملتا ہے وہیں سوال کرنے والے کو ان سوالات کے اعادے کا موقع نہیں ملتا جو جواب سے پیدا ہوتے ہیں اور یہ بات اس کتاب میں بھی کہیں کہیں دکھائی دے جاتی ہے۔

کتاب کی لکھائی، چھپائی اور گٹ اپ خاصا اچھا ہے۔ قیمت بھی مناسب ہے۔

● ماہنامہ نیا دور لکھنؤ۔ مئی ۱۹۹۴ء ص ۴۴

• ملک محمد علی خاں

اردو ادبی دنیا کا ایک جانا پہچانا نام محمد خالد عابدی کا ہے سرزمین مدھیہ پردیش کا یہ اردو زادہ، اردو زبان و ادب کی خدمت کو اپنا ایمان ثانی سمجھتا ہے۔ زیرِ نظر کتاب اردو انٹرویوز عابدی صاحب کا ایک شاندار کارنامہ ہے اس قسم کی کتابیں اردو میں بہت کم شائع ہوئی ہیں۔

عابدی صاحب نے اپنے قلم کا جن حضرات کو نشانہ بنایا ہے ان میں حیدرآباد کے جناب نریندر لوتھر اور اظہر افسر بھی شامل ہیں۔

جن حضرات سے انٹرویو لئے گئے ہیں وہ سب ہی اردو ادب و صحافت کی جانی مانی شخصیتیں ہیں۔ عابدی صاحب جو خود بھی ادیب ہیں قبل ازیں کئی کتابیں مختلف عنوانات پر شائع کی ہیں۔ اردو انٹرویوز کی اشاعت پر ہم عابدی صاحب کو تہہ دل سے مبارکباد پیش کررہے ہیں۔

• ہفت روزہ آندھرا پنچ حیدرآباد، ۲۱ جون ۱۹۹۴ء

• ڈاکٹر شاہد جمیل

زیر تبصرہ کتاب میں محمد خالد عابدی نے احسن رضوی داناپوری، اظہر افسر، اسلم واحدی، پریم وار برٹنی، تیج ناتھ زار، جرم محمد آبادی، جمیل شیدائی، خواجہ عبدالمنصور، رام لعل نابھوی، رضا مظہری، ستیہ پرکاش سنگر، شمیم جے پوری، ضیا فتح آبادی، قیصر عثمانی اور نریندر لوتھر سے لیے گئے مراسلاتی انٹرویوز کو پیش کیا ہے، باالفاظ دیگر "اردو انٹرویوز" اردو ادب کے معروف و اہم شعراء، و ادباء اور قلمی ہستیوں سے لئے گئے مراسلاتی انٹرویوز کا خوبصورت و دلکش گلدستہ ہے۔

انٹرویوز کا فن دراصل غواصی کا عمل ہے۔ جس طرح ایک ماہر فن غواص غوطہ لگا کر اتھاہ سمندر سے مطلوبہ شے نکال لاتا ہے ٹھیک اسی طرح "ملاقاتی" (Interviewer) اپنی استعداد و ذہانت کو بروئے کار لاکر "صاحب ملاقات (Interviewer) کی سیرت و فن اور افکار کے مستور و پوشیدہ، گوشوں سے مخصوص اور مختلف واقعات و نکات کا انتخاب کر کے انھیں اس زاویے سے پیش کرتا ہے کہ قاری نہ صرف اپنے علم و آگہی میں اضافہ محسوس کرتا ہے بلکہ اس احساس سے بھی گزرتا ہے کہ ع

میں نے جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

دانشورانہ و برجستہ سوالات اور جواب سے بحث طلب نکات کی تلاش "ملاقاتی" کی شخصی، علمی و فنی آگہی اور ذاتی صلاحیت و ذہانت کا پتہ دیتی ہے اور ساتھ ہی انٹرویوز کو دلکش و موثر بناتی ہے

''ملاقاتی'' کو خاکہ نگار کی سی سہولت نہیں کہ وہ موئے قلم سے کسی شخصیت کے ہلکے نقوش کو واضح وشوخ کر سکے لیکن یہ بات اس کے اختیار میں ہے کہ وہ ''صاحب ملاقات'' کی زندگی کے مخفی و پوشیدہ واقعات اور تحریر و تقریر میں ظاہر نہ کیے جانے والے افکار و آرا کو کھود نکالے۔

''اردو انٹرویوز'' میں شامل انٹرویوز کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ محمد خالد عابدی نے سوالنامہ کو اس حسن و خوبصورتی سے ترتیب دیا ہے کہ ان کے ''مراسلاتی'' نہ ہونے کا گمان گزرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ''ملاقاتی'' کے علم و آگہی، فنی شعور، قوت اختراع اور ذہانت و دانشورانہ سوچ کا احساس بھی ہو جاتا ہے سوالات کے سایہ میں ''صاحب ملاقات'' کے نام و تخلص تاریخ و جائے پیدائش، حسب و نسب، کسب، معاش، افکار و خدمات اور کارگزاریاں وغیرہ بہ حسن سلیقہ ظاہر ہوئے ہیں۔ جیسے کسی نے لامحسوس طور پر اپنا سینہ کھول دیا ہو۔ سوال و جواب کی طوالت سے ''ملاقاتی'' اور ''صاحب ملاقات'' دونوں نے دامن بچایا ہے، لیکن کہیں کہیں تشنگی اور پہلوتہی کا احساس بھی سر اٹھاتا ہے۔

اردو ادب میں محمد خالد عابدی کا نام محتاج تعارف نہیں ہے۔ وہ بڑی خاموشی سے زبان و اردو ادب کی آبیاری میں لگے ہیں۔ ان کی متعدد کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ادبی و فلمی شخصیات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے اردو انٹرویوز ایک قابل مطالعہ کتاب ہے۔ کتابت، کاغذ اور گٹ اپ اوسطاً اور قیمت کچھ زیادہ ہے۔

• غیر مطبوعہ

• عارف عزیز

جناب محمد خالد عابدی اردو ڈرامے، افسانے، تحقیق اور طنز و مزاح کے میدان میں برسوں سے جوہر دکھا رہے ہیں، حال میں ان کی چھٹی کتاب ''اردو انٹرویوز'' منظر عام پر آئی ہے، اس میں عابدی صاحب نے اردو شعر و ادب کی پندرہ اہم شخصیات کے انٹرویو شامل کیے ہیں، گذشتہ کچھ عرصہ کے دوران انٹرویو نے اردو کی ایک علاحدہ صنف کا درجہ حاصل کر لیا ہے جس کے وسیلہ سے سلگتے عصری اور فکری موضوعات پر ہی نہیں نامور شخصیات کے افکار، نظریات اور احوال کے بارے میں بھی قیمتی معلومات عام قاری تک پہنچائی جاتی رہی ہے، بالخصوص ہندو پاک کے ادبی رسائل اور ڈائجسٹوں میں ممتاز ادبی، سماجی اور سیاسی ہستیوں کے جو انٹرویو شائع ہوتے رہے ان کو کافی سراہا گیا

ہے۔ مذکورہ انٹرویو نگاروں میں سلامت علی مہدی، ظفر پیامی اور پاکستان کے چند صحافیوں کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

خالد عابدی کے یہ انٹرویو اگرچہ سوال و جواب کے بندھے ٹکے فارمولے کے مطابق ہیں جنہیں مراسلاتی انٹرویو کہا جا سکتا ہے مگر ان کی افادیت اپنی جگہ مسلم ہے کیونکہ ان کے وسیلہ سے بعض ایسے افکار واقعات کو کھود کر نکالا گیا ہے جو عام طور پر انٹرویو دینے والوں کی تحریر و تقریر میں موجود نہیں اور اس طرح بقول پرفیسر عنوان چشتی ''محمد خالد عابدی نے''''ادبی انٹرویوز'' کو اپنے شعور کا مظہر بنایا ہے، انہوں نے متعدد محققوں، نقادوں، شاعروں اور ادبی شخصیتوں کی بات چیت کو کتابی صورت میں پیش کرنے کی جو جسارت کی ہے وہ لائق تحسین ہے۔''

مذکورہ انٹرویوز سے ہمیں اردو زبان و ادب کی مختلف اصناف اور ان سے وابستہ شعبوں کے بارے میں بھی کافی اہم معلومات فراہم ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر پریم وار برٹنی، قیصر عثمانی، احسن رضوی اور تیج ناتھ زآر کے انٹرویو میں فلم کے مکالمے منظرنامے گانوں کے بارے میں، اسلم واحدی اور اظہر افسر سے ڈرامہ کے موضوع پر، رام لال نابھوی سے خاکہ نگاری اور انٹرویو پر، خواجہ عبدالغفور اور نریندر لوتھر سے طنز و مزاح پر اور شاعری کے تعلق سے رضا مظہری، شمیم جے پوری، ضیا فتح آبادی اور جرم محمد آبادی سے گرانقدر معلومات قاری کو ملتی ہے۔ اس سلسلے کو خالد عابدی آگے بھی جاری رکھیں تو یقیناً مفید ثابت ہوگا۔ مذکورہ کتاب بھوپال بک ہاؤس بدھوارہ، بھوپال اور دل آرام ہاؤس ہوا محل روڈ، بھوپال سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

• بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو، بھوپال۔

• سیّد مسعود حسن

جناب محمد خالد عابدی اردو کے ایک جانے پہچانے محقق اور ادیب ہیں۔ اب تک عابدی صاحب کی ۶ کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور اردو کے ادبی و علمی حلقوں میں ان کے کام کو تعریفی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب عابدی صاحب کے مراسلاتی انٹرویوز کا پہلا مجموعہ ہے اور اسی سلسلہ کا دوسرا مجموعہ زیرِ طبع ہے۔

مراسلاتی ملاقاتوں کا یہ مجموعہ ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے اور خاص اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ کاغذ کتابت اور طباعت معیاری اور سرورق دیدہ زیب ہے اور قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اس مجموعہ میں ۱۵ مراسلاتی انٹرویوز ہیں جو مشہور فلمی اور ادبی شخصیتوں پر مشتمل ہیں جن کے نام اس

طرح ہیں۔ احسن رضوی دانا پوری اظہر افسر، اسلم واحدی، پریم وار برٹنی، تیج ناتھ زار، جرم محمد آبادی، جمیل شیدائی، خواجہ عبدالغفور، رام لال نابھوی، رضا مظہری، ستیہ پرکاش سنگر، شمیم جے پوری، ضیا فتح آبادی، قیصر عثمانی اور نریندر لوتھر۔

اردو میں انٹرویو نگاری کا فن ایک نیا فن ہے اور پھر مراسلاتی انٹرویو تو اور زیادہ مشکل فن ہے۔ کیوں کہ جس طرح خطوط نگاری کو نصف ملاقات کہا جاتا ہے، اسی طرح مراسلاتی انٹرویو کا فن بھی نصف ملاقات ہی ہے اور یہ بات بغیر کسی تکلف کے کہی جا سکتی ہے کہ اس صنف ادب میں خالد عابدی کی کوشش بنیاد کا پتھر کہی جائیگی مراسلاتی انٹرویو نگاری اور روبرو انٹرویو میں جو فرق ہے وہ فن انٹرویو نگاری اور خطوط نگاری کے فنی فرق سے بہ آسانی سمجھ میں آسکتا ہے اور اس کمی کو جو مراسلاتی ملاقات میں ہے انٹرویو نگار کی فن کاری ہی پورا کر سکتی ہے۔ انٹرویو نگار کا کام ہے کہ وہ اس طرح کے سوالات مرتب کرے کہ صاحب ملاقات کی شخصیت، خیالات اور خدمات کے ان دریچوں سے پردے اُٹھ جائیں جو اس شخصیت کو جاننے والے جاننا چاہتے ہیں اور جس سے وہ شخصیت پوری طرح روشن ہو کر قاری کے سامنے آسکے۔ مراسلاتی انٹرویو کی تمام ترکیبوں کے باوجود اس کے ذریعہ صاحب انٹرویو کی شخصیت کے ان پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے جو عام طور سے روبرو انٹرویوز میں انٹرویو نگار پوچھنے سے کتراتا ہے یا نظر انداز کر دیتا ہے۔ عابدی صاحب نے مراسلاتی آدھی ملاقات کی ان کمیوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے مذکورہ شخصیات کی زندگی اور کارناموں کے ان گوشوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے جو عام طور سے منظر عام پر نہیں آتے ہیں۔ اس طرح اردو ادب کے ایک عام قاری، طالب علم اور تاریخ نگار کے لئے معلومات کا ایک ایسا خزانہ جمع کر دیا ہے، جو ان ادبی اور فلمی شخصیات کی سوانح مرتب کرنے میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ دوسرے ان حضرات کے اردو زبان کے مسائل اور اداروں پر بے لاگ تبصرے بھی سامنے آتے ہیں جس سے ان شخصیات کے خیالات اور محسوسات سے پردا اُٹھتا ہے اور براہ راست واقفیت ہوتی ہے۔ موجودہ مجموعہ میں جناب رام لعل نابھوی، جناب ستیہ پرکاش سنگر، رضا مظہری اور احسن دانا پوری کے انٹرویو خصوصی طور سے اس بات کا بہترین مظہر ہیں۔

اردو میں آج کل جو کتابیں چھپ رہی ہیں ان میں زبان و بیان کا خصوصی خیال نہیں رکھا جاتا خاص طور سے ان اخباری انٹرویوؤں میں جو عام طور سے اردو کے اخبارات اور رسائل میں چھپتے رہتے ہیں۔ لیکن زیر تبصرہ کتاب میں مصنف نے اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ زبان و بیان نہ سوالات میں متاثر ہوں اور نہ جوابات میں۔ شاید اُس کی وجہ انٹرویو کا مراسلاتی ہونا سمجھا جائے لیکن اصل یہ ہے کہ عابدی صاحب کو اس کا

غیر معمولی احساس ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ انٹرویوز بیان دبیان کے لحاظ سے ادبی اور علمی زبان کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی زبان عام فہم اور سادہ ہے جسے ایک طالب علم اور اردو کا قاری بھی سمجھ سکتا ہے۔ زبان دبیان کا یہ انداز اردو میں انٹرویو نگاری کے فن میں ادبی زبان کی اہمیت کی بھی نشان دہی کرتا ہے اور اسے بحسن وخوبی اجاگر بھی کرتا ہے۔

بد قسمتی سے نئی نسلوں میں اردو زبان وادب کے مشاہیر کی شخصیت اور ادبی خدمات سے واقفیت اب بتدریج کم ہوتی جارہی ہے اور یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ مشاہیر کی سوانح نئی نسلوں کی کردار سازی کا ایک بہترین ذریعہ ہیں۔ اردو کے مشاہیر کے روبرو انٹرویو اور مراسلاتی انٹرویو اس سلسلہ میں ایک اہم کردار ادا کر سکتے ہیں کیوں کہ یہ کم سے کم وقت میں مکالموں کی زبان میں طلباء، نوجوانوں اور ایک عام قاری کو مشاہیر کی خدمات سے واقف کرا سکتے ہیں اور ان کو مشکل حالات میں ہمت نہ ہارنے اور مسلسل کوشش اور جدوجہد کی عملی تعلیم دیتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے اگر عابدی صاحب کے مجموعہ پر نظر ڈالی جائے تو یہ مشاہیر سے واقفیت کا ایک اچھا وسیلہ ہیں۔

امید ہے کہ اردو زبان وادب کے وہ طلباء جو ادبی شخصیات کے بارے میں معلومات سے دلچسپی رکھتے ہیں اس کتاب کو ذوق وشوق سے پڑھیں گے اور اسکولوں وکالجوں کے کتب خانے اس کتاب کو خرید کر اپنے پڑھنے والوں کو اس کتاب سے استفادہ کا موقع دیں گے۔

ادبی انٹرویو کا یہ مجموعہ اور بہتر ہو سکتا تھا۔ اگر اس میں ان تمام ۱۵ شخصیات کے فوٹو اور ایک مختصر سوانحی خاکے بھی درج کر دیے جاتے کیوں کہ وہ قاری جو ان میں سے کسی شخصیت سے ناواقف ہیں پوری طرح واقف ہو جائیں اور اس شخصیت کا ایک عکس قاری کے ذہن میں محفوظ ہو جائے۔ امید ہے عابدی صاحب اگلے ایڈیشن میں اس کا اہتمام فرمائیں گے اور انٹرویو کے اس مجموعہ کو یادوں کا البم بنا دیں گے۔

● پروفیسر حسن مسعود

جناب محمد خالد عابدی نے شعراء، ادباء اور قلمی ہستیوں سے لیے مراسلاتی انٹرویوز کو ''اردو انٹرویوز'' کے نام سے کتابی شکل میں ترتیب دیا ہے۔ محمد خالد عابدی ادبی دنیا میں معروف شخصیت ہیں۔ ان کی پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور کئی کتابیں زیر ترتیب ہیں۔

پروفیسر عنوان چشتی کے الفاظ میں ''وہ اردو کے ایک ایسے بے لوث اور مخلص ادیب ہیں انھوں نے استقلال اور لگن سے اردو زبان وادب کی حنابندی کی سعی کی ہے۔'' انٹرویو کا مقصد کسی

بھی شخصیت کی زندگی، اس کے فن، اس کے افکار اور تخلیقی عمل کو ترغیب دینے والے اسباب پر روشنی ڈالنا ہوتا ہے جو عام طور پر ہم سے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ یہ انٹرویوز ۱۵ شخصیتوں سے لئے گئے جو ادب، شاعری اور فلم میں اپنا مقام بنا چکے ہیں۔ ان انٹرویوز کو مراسلات کے ذریعہ ترتیب دیا گیا ہے۔ ایک نشست میں آمنے سامنے بیٹھ کر سوال و جواب کرنے میں ایک کمی کا امکان رہتا ہے۔ کہ صحیح سوال سمجھنا، اس کا فوری جواب دینا، پھر اس جواب کو ان ہی معنوں میں تحریر کرنا جو اس شخصیت کا مقصد ہے۔ ان سب میں چوک کی گنجائش رہتی ہے اور بعد میں انٹرویو دینے والا کہہ سکتا ہے کہ ''میں نے یہ نہیں وہ کہا تھا''۔ اب یہی سوالات صاحب ملاقات کے پاس ایک سوالنامے کی شکل میں پیش کئے جاتے ہیں جن کو پڑھ کر وہ سوچ کر جواب تحریر کرتا ہے تو اس خطرہ سے بچا جا سکتا ہے۔

سوالات بڑی چابکدستی سے مرتب کئے گئے ہیں جن سے ان شخصیتوں کی ابتدائی زندگی، خاندانی حالات تعلیم، تخلیقی عمل کی ابتدا کے محرکات، فن و ادب کے بارے میں ان کا رویہ، وہ شخصیتیں جن کا اثر انھوں نے قبول کیا، جیسے بہت سے پہلوؤں پر مکمل روشنی پڑتی ہے جو آگے تحقیق کرنے والوں کے لئے رہبری کا مواد فراہم کرتے ہیں۔

احسن رضوی، اظہر افسر، اسلم واحدی، جمیل شیدائی، ستیہ پرکاش سنگر اور قیصر عثمانی جیسی شخصیتیں فلم، اسٹیج ڈرامہ یا ریڈیائی ڈرامے سے کسی نہ کسی حیثیت سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسکرین پلے اور مکالمہ نگاری جیسے موضوعات پر ان کے جوابات قاری کی معلومات میں مفید اضافہ کرتے ہیں اور فن کے بنیادی اصولوں کو واضح کرتے ہیں۔

کتاب میں ایک کمی ضرور محسوس ہوتی ہے۔ خالد عابدی صاحب نے کتاب کے لیے اپنی طرف سے کوئی دیباچہ یا پیش لفظ تحریر نہیں کیا۔ میں اس کی ضرورت اس لئے محسوس کرتا ہوں کہ اس سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ انھوں نے ان فنکاروں کا انتخاب انٹرویو کے لئے کیوں کیا۔

آخر میں کہنا پڑے گا کہ پروفیسر عنوان چشتی کی یہ رائے بالکل درست ہے کہ ''عابدی صاحب کی متعدد تحریریں شائع ہو چکی ہیں اور اردو کے اہم لکھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کر چکی ہیں۔ لیکن ان کے ادبی انٹرویوز بہت اہم ہیں۔ ان کو ایسا جام جہاں نما کہا جا سکتا ہے جس میں ادبی شخصیتیں کے جلوے بے نقاب نظر آتے ہیں۔ میں صمیم قلب سے اس کتاب کی اشاعت پر محمد خالد عابدی کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔''

(پہچان، آل انڈیا ریڈیو، بھوپال۔)

• ادارہ راشٹریہ سہارا

مصنف محمد خالد عابدی کی متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ زیر نظر کتاب میں انہوں نے احسن رضوی داناپوری، اظہر افسر، اسلم واحدی، پریم وار برٹنی، تیج ناتھ زار، جرم محمد آبادی، جمیل شیدائی، خواجہ عبدالغفور، رام لعل نابھوی، رضا مظہری، ستیہ پرکاش تنگر، شمیم جے پوری، ضیا فتح آبادی، قیصر عثمانی اور نریندر لوتھر جیسی ادبی اور فلمی ہستیوں سے لئے گئے مراسلاتی انٹرویوز پیش کیے ہیں۔ ان انٹرویوز کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ مصنف نے ادبی و فلمی شخصیتوں کے افکار اور ان کے حالات کو کھود کر نکالنے کی کوشش کی ہے اور ایک حد تک وہ اپنی کوشش میں کامیاب بھی رہے ہیں۔ زبان و بیان کے لحاظ سے بھی کتاب قابل قدر ہے۔

سرورق اور کتابت و طباعت کے لحاظ سے ''اردو انٹرویوز'' سادہ لیکن دلکش ہے۔ اس لیے یہ توقع کی جاتی ہے کہ ادبی اور فلمی شخصیتوں کے بارے میں دلچسپ اور پُر مغز معلومات کے خواہاں قارئین اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی کریں گے۔

• ڈاکٹر عزیز انصاری

خالد عابدی اردو ادب کی ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ ان کی کئی کتابیں شائع ہو کر داد تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ بہت کم عرصہ میں انہوں نے نہ صرف یہ کہ اچھی خاصی شہرت حاصل کر لی بلکہ اپنے لئے ادب میں ایک اچھی خاصی جگہ بھی بنالی ہے۔ خالد عابدی کسی ایک خاص صنف تک محدود ہو کر نہیں رہ گئے ہیں۔ کہیں یہ ڈراما نگار ہیں تو کہیں افسانہ نگار۔ کبھی یہ ایک پختہ منجھے ہوئے محقق نظر آتے ہیں تو کہیں طنز و مزاح کے زعفران زار کھلاتے ہوئے ملتے ہیں۔ زیر بحث کتاب ''اردو انٹرویوز'' خوبصورت رنگوں کے پھولوں سے سجا ہوا ایک حسین گلدستہ ہے، جس کی مہک سے اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے مشامِ جاں برابر معطر ہوتے رہیں گے۔ مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والی ہستیوں کے یہ مراسلاتی انٹرویوز ہیں۔ یہ کتاب نشاط آفسیٹ پریس، ٹانڈہ فیض آباد سے ۱۹۹۲ء میں شائع ہوئی۔ اس میں شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی، محقق بھی ہیں اور نقاد بھی، فلمی ہستیاں بھی ہیں اور ڈرامہ نگار بھی، طنز و مزاح نگار بھی۔

انٹرویو لینا کوئی آسان فن نہیں۔ انٹرویو لینے والے کی شخصیت سوچ و فکر، گہری نظر، بلند خیالی، وسیع مشاہدہ کی مرہون منت ہوتی ہے، اسی کے ساتھ انٹرویو لینے والے کو ہر لمحہ خود کو تیار رکھنا پڑتا ہے کہ وہ کس طرح صاحب ملاقات کے جواب کے بعد فوراً اُسی مناسبت سے دوسرا سوال پیش

کردے۔ انٹرویو لینے والے کے دلچسپ اور تیکھے سوالوں کی بوچھار جہاں صاحب ملاقات کی زندگی سے بے شمار پردے اٹھاتی چلی جاتی ہے وہیں انٹرویو لینے والے کی صلاحیتوں کو بھی اجاگر کرتی ہے۔ بعض اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انٹرویوز لینے والا صاحب ملاقات کی روح کی گہرائیوں تک پہنچ گیا ہے اور اس کے دل کی ہر دھڑکن نہ صرف یہ کہ خود سن رہا ہے بلکہ صاحب ملاقات کی زبان سے بھی ادا کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔

انٹرویو لینے والے کا یہ کمال بھی ہے کہ اس کے سوالات میں تسلسل ہو اور صاحب ملاقات کی شخصیت سے ایک ایک کر کے پردے اٹھتے رہیں اور قاری کی دلچسپی اس وقت تک قائم رہے جب تک انٹرویو مکمل نہ ہو جائے۔

اس فن و کمال میں خالد عابدی بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں، شروع سے لے کر آخر تک ان کے تمام انٹرویوز میں یہ خوبی برقرار رہی ہے۔ ان انٹرویوز کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں تسلسل برابر قائم رہتا ہے اور ایک سوال کے بعد دوسرا سوال صاحب ملاقات کو اور واضح کرتا چلا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ خالد عابدی نے اس بات کا بھی خیال رکھا ہے کہ سوالوں میں تکرار نہ پیدا ہو اور قاری کو کسی قسم کی بوریت محسوس نہ ہو۔ بلکہ ہر سوال کے بعد ایک نیا لطف حاصل ہو۔

ویسے تو اس کتاب میں پندرہ انٹرویوز شامل ہیں اور ان پندرہ ہستیوں کے انٹرویوز پر تبصرہ کے لئے ایک لمبا وقت درکار ہے، اس وقت تو صرف ان لوگوں کی فہرست پیش کر سکتا ہوں جن کو خالد عابدی نے اپنے انٹرویوز کے جال میں جکڑ رکھا ہے۔ ہاں پریم وار برٹنی اور جمیل شیدائی کے انٹرویوز پر ضرور کچھ بات کرنا پسند کرونگا۔ اردو انٹرویوز میں صاحب ملاقات کی فہرست کچھ اس طرح ہے۔

۱۔ احسن رضوی دانا پوری۔ شاعر، فلمی مکالمہ نگار۔ ۲۔ اظہر افسر ڈرامہ نگار۔ ۳۔ اسلم واحدی۔ شاعر و افسانہ نگار، ڈراما نگار، ناول نگار۔ ۴۔ پریم وار برٹنی، شاعر و فلمی شاعر۔ ۵۔ تیج ناتھ زار۔ فلمی ہستی۔ ۶۔ جرم محمد آبادی، شاعر۔ ۷۔ جمیل شیدائی، ڈرامہ نگار۔ ۸۔ خواجہ عبدالغفور طنز و مزاح نگار۔ ۹۔ رام لعل نابھوی، انشائیہ و ڈراما نگار۔ ۱۰۔ رضا مظہری۔ شاعر۔ ۱۱۔ ستیہ پرکاش سینگر۔ افسانہ نگار۔ ۱۲۔ شمیم جے پوری، شاعر و فلمی شاعر۔ ۱۳۔ ضیا فتح آبادی، شاعر۔ ۱۴۔ قیصر عثمانی۔ ادیب و فلمی و ادیب۔ ۱۵۔ نریندر لوتھر، مزاح نگار۔

پریم وار برٹنی:۔ ایک اچھے شاعر ہیں اور فلمی گیت بھی لکھتے ہیں۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے خالد عابدی کے سوالوں کی فہرست قابلِ غور ہے۔

سوال :۔ آپ فلموں میں گیت لکھنے کے لیے شوقیہ گئے تھے یا کسی کے دعوت و اصرار پر؟

جواب :۔ ایک ایسا شاعر جو اپنے شاعرانہ کمال سے ادب میں اپنے لئے ایک جگہ بنا چکا ہو اس سے سوال کیا جائے کہ شوقیہ گئے تھے یا کسی اصرار پر۔ یہ سوال قاری کو کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

آگے چل کر اسی سوال سے بہت قریبی تعلق رکھنے والا سوال سامنے آتا ہے۔ ادبی شاعری اور فلمی شاعری میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں۔ اس کے بعد اگلا سوال براہ راست فلمی گیت پر ہو جاتا ہے آپ کے نزدیک فلمی گیت کی تعریف کیا ہے؟ اس کے بعد خالد عابدی اور آگے بڑھ کر پریم وار برٹنی سے ایک بڑا اُلجھا ہوا سوال کر ڈالتے ہیں۔ آج کی فلمی شاعری سے کسی قدر ہماری اردو شاعری پر مضر اثرات مرتب ہو رہے ہیں کیا آپ اس سے اتفاق فرمائیں گے۔ یہاں پریم کا جواب پیش کرنا ضروری ہے چونکہ خالد عابدی کا مقصد اسی وقت واضح ہوگا جب ہم پریم کا جواب دیکھ لیں گے۔

''فلمی شاعری اور علمی شاعری میں بہت بڑا فرق ہے۔ فلمی شاعری ہماری علمی شاعری پر اثر انداز نہیں ہو سکتی، اسی تحفظ کے لئے جوش ملیح آبادی۔ منشی پریم چند اور مجاز لکھنوی کے بعد نریش کمار شاد، متعدد شعرا نے محض اس لئے انڈسٹری کو ترک کر دیا کہ ایک عظیم شاعر کو بھی یہاں واہیات قسم کی شاعری کے لئے مجبور ہونا پڑتا ہے۔''

اس جواب کے بعد آج کے اُبھرتے ہوئے نوجوان شعراء کے لئے دعوت فکر دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

سوال :۔ وہ نوجوان اردو شعراء جو فلموں میں گیت لکھنے کے خواہش مند ہیں ان کے لئے آپ کی کیا صلاح ہے؟ پریم وار برٹنی کا جواب بڑی کامیابی سے خالد عابدی کے مقصد کو واضح کر دیتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ خالد عابدی فلمی شاعری کے بارے میں کیا سوچتے ہیں اور کیا چاہتے ہیں اور اپنے قاری تک کیا پیغام پہنچانا چاہتے ہیں۔ پریم کے اس جواب پر ہی اس انٹرویو پر بات مکمل ہو جاتی ہے:

جواب :۔ نام اور سستی شہرت اور حصول زر کے لئے یہ دھندا کچھ برا نہیں، مگر یہ ضرور یاد رکھنا چاہئے کہ نہ تو ہر شاعر شکیل بدایونی اور ساحر لدھیانوی کا ہنر لے کر پیدا ہوتا ہے اور نہ کوئی معقول شاعر آنند بخشی، گلشن باورا اور ورما ملک بننا پسند کرتا ہے۔''

جمیل شیدائی کے انٹرویو سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خالد عابدی نہ صرف یہ کہ خود ایک

اچھے اور کامیاب ڈرامہ نگار ہیں بلکہ وہ اس فن سے بھی بخوبی واقف ہیں اور صاحب ملاقات کی زبان سے اس فن کو دلچسپ سوالوں کے ذریعہ سے قاری تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ سوالوں کا تسلسل قابلِ غور ہے۔

(۱) آپ ڈرامہ کی طرف کیوں متوجہ ہوئے؟ (۲) آپ نے پہلا ڈرامہ کب لکھا؟ (۳) آپ نے ریڈیائی ڈراموں کے ساتھ کیا اسٹیج ڈرامے بھی لکھے؟ (۴) ایک اچھے ریڈیائی ڈرامے میں کن کن باتوں کا ہونا ضروری ہے؟ (۵) اسٹیج کی بہ نسبت آج کا ریڈیائی ڈرامہ کامیاب ہے، کیا یہ دعویٰ درست ہے (۶) کیا ریڈیائی ڈرامے کو بغیر ترمیم و تنسیخ کے اسٹیج کیا جا سکتا ہے؟ (۷) اردو ہندی اور انگریزی ریڈیائی ڈراموں میں کس زبان کے ریڈیائی ڈرامے زیادہ کامیاب ہیں؟ (۸) ریڈیائی ڈرامہ کا سب سے زیادہ نازک اور جاندار حصہ کون سا ہوتا ہے؟

(۹) ڈرامہ خود ایک شاعری ہے کیا یہ درست ہے؟

(۱۰) کیا ادب میں ریڈیائی ڈرامہ کی اہمیت ہے؟

سوالات کا تسلسل اور اس کے جوابات نہ صرف یہ کہ اس فن کے تمام راز کھولتے ہیں بلکہ اس فن کی ادبی اہمیت کو بھی واضح کرتے ہیں۔

''یوں تو ان کی حصہ دتحریریں شائع ہو چکی ہیں اور اردو کے اہم لکھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کر چکی ہیں لیکن ان کے ادبی انٹرویوز بہت اہم ہیں۔ ان کو ایسا جام جہاں نما کہا جا سکتا ہے، جن میں ادبی شخصیتوں کے جلوے بے نقاب نظر آتے ہیں۔''

بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو، بھوپال۔

● پروفیسر سیّد حیدر عباس رضوی

''اردو انٹرویوز'' اردو کے ایک معروف ادیب ڈراما نگار اور نقاد جناب خالد عابدی کی تصنیف ہے۔ اس میں ادبی اور فلمی دنیا کے نمائندہ ادیبوں شاعروں، مزاح نگاروں اور ڈراما نگاروں کے پندرہ مراسلاتی انٹرویوز شامل ہیں۔

'انٹرویوز بنیادی طور پر ایک تکنیک ہے افراد کے افکار و خیالات و نظریات کی تہہ تک پہنچنے کی۔ ان کے باطن میں جھانکنے کی اور شخصیت کے پیچ و خم سے آگاہی حاصل کرنے کی۔ اس تکنیک کا استعمال ملازمتوں اور مقابلے کے امتحانوں میں انتخاب کے لئے عموماً کیا ہی جاتا ہے۔ لیکن تحریرو

تقریر اور نثر و اشاعت میں بھی اس کا چلن عام ہو گیا ہے۔ رسائل و اخبارات میں انٹرویوز کا چھپنا برسوں سے جاری ہے۔ انٹرویوز کی افادیت بڑھتی ہوئی مقبولیت اور اس کے کثیر سرمایہ کے پیش نظر اس کو ایک صنف ادب کی حیثیت سے تسلیم کئے جانے نیز اس کے فنی حدود اور ادبی عناصر کی شناخت کی سمت میں پیش رفت مغرب میں کوئی ایک صدی پہلے ہو گئی تھی۔ اردو میں بھی اس کی شیرازہ بندی کی جا رہی ہے۔ خصوصاً جناب مناظر عاشق ہرگانوی نے اپنے انٹرویوز کے مجموعہ "روبرو" کے دیباچہ میں اس صنفِ ادب کے امکانات کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ اس تحریر کو چند جملوں میں اس طرح مربوط کر لیا ہے۔

"انٹرویو سے مراد اس تخلیق سے ہے جس میں مضمون نگار مخصوص شخص سے ملاقات کرنے کے بعد اہم سوالات کی بنیاد پر اُس کی شخصیت اور اُس کے کارنامے سے متعلق مصدقہ معلومات حاصل کرتا ہے اور پھر انہیں قلم بند کرتا ہے۔ اس انٹرویو میں یادداشت، خاکہ نگاری اور خودنوشت کی آمیزش ہوتی ہے۔ انٹرویو لینے والے کے بیان، اسلوب اور تجزیہ کو اہمیت دی جاسکتی ہے۔ اس کے لئے ناول کا انداز پیدا ہونا بھی فطری ہے۔ کیونکہ ایک سوال کا ایک جواب ہوتا ہے۔ لیکن انٹرویو لینے والا درمیان میں سوالات پیدا کر کے جواب کو واضح پیچیدہ اور مکمل بنا لیتا ہے۔"

جناب خالد عابدی نے انٹرویو میں ایک نیا گوشہ پیدا کیا ہے "مراسلاتی انٹرویوز" کا یعنی یہ روبرو گفتگو پر مشتمل نہیں ہیں بلکہ دور دراز شہروں میں مکین شخصیتوں سے بذریعہ سوالنامہ لئے گیے انٹرویوز ہیں۔ اس کتاب میں جن لوگوں کے انٹرویوز شامل ہیں ان کا تعارف اس طرح ہے۔ احسن رضوی، شمیم جے پوری۔ پریم وار برٹنی۔ قیصر عثمانی اور تیج ناتھ زار فلمی دنیا سے وابستہ ادیب و شاعر اور ڈراما نگار ہیں جناب ستیہ پرکاش سینگر افسانہ نگار ہیں اور بھوپال سے ان کا بہت گہرا رشتہ رہا ہے۔ جرم محمد آبادی۔ ضیا فتح آبادی معروف شاعر ہیں۔ جناب رضا مظہری نے شاعری کے ساتھ طنز و مزاح بھی لکھا ہے اور ترجموں کا کام بھی کیا ہے۔ جناب رام لعل نابھوی ایک صاحب علم بزرگ ہیں۔ ان کی ادبی خدمات شاعری، طنز و مزاح، انشائیہ اور تنقید کو محیط ہیں۔ خواجہ عبدالغفور اور نریندر لوتھر طنز و مزاح نگار ہیں۔ اظہر افسر، جمیل شیدائی اور اسلم واحدی اردو ڈرامے کے معروف نام ہیں۔ انٹرویو نگار نے سوالناموں کے ذریعہ مذکورہ ادیبوں اور شاعروں کے سوانحی اور ادبی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر دلچسپ اور مستند معلومات فراہم کی ہیں۔ انہوں نے فلموں کی کامیابی میں اردو زبان و ادب کی کارفرمائی، فلموں کے بدلتے ہوئے معیار، مزاحیہ فلموں کی کمی وغیرہ پر براہ راست سوالات کئے ہیں۔ پریم وار برٹنی سے انہوں نے سوال کیا ہے۔

عابدی:۔ کیا آپ اس امر سے اتفاق فرمائیں گے کہ فلموں کی ترقی اور اس کی مقبولیت میں اُردو نے ایک نمایاں اور زبردست رول ادا کیا ہے؟

پریم:۔ اردو زبان "جس کی معنی لشکر کے ہیں" نے واقعی فلموں میں ایک نمایاں اور زبردست رول ادا کیا ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے فلم لائن پر اُردو شاعروں اور ادیبوں کا تسلط۔ گیت کاروں اور کہانی کاروں میں آج بھی ہندی کے مقابلہ میں اردو ادیب زیادہ ہیں اور یہی بات یعنی اہل قلم کی اکثریت گواہ ہے کہ فلم کی تاریخ میں آج بھی اردو ادیب چھائے ہوئے ہیں۔

مشہور مزاح نگار نریندر لوتھر سے عابدی نے سوال کیا ہے۔

عابدی:۔ ہندوستانی فلموں میں جو مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہیں کیا وہ کامیاب ہیں؟ اور ان میں کیا اصلاحیں درکار ہیں؟

نریندر لوتھر:۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے کوئی منظم کوشش یا تحریک تو شروع نہیں ہوئی۔ کئی فلموں میں آٹے میں نمک کی تعداد میں مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن جیسے دوسرے دیشوں میں دوسری زبانوں میں خالص مزاحیہ فلمیں دیکھنے کو ملتی ہیں ہندوستان میں نہیں ملتیں۔ ٹی۔ وی والے چاہیں تو تجربات کئے جاسکتے ہیں۔

جناب رام لعل نابھوی نے اردو کے متعلق ایک نہایت معنی خیز سوال کا مفصل جواب تحریر کیا ہے اس سوال کا ایک جزو اور اس کے جواب کی صرف متعلقہ عبارت پر اکتفا کرتا ہوں۔

عابدی:۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں اردو کا مستقبل وہی ہے جو مسلمانوں کا ہندوستان میں مستقبل ہے۔ کیا یہ اردو زبان اب ہندو حضرات کی نہیں ہے؟

نابھوی:۔ اردو کا مستقبل شاندار ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کا ہندوستان میں مستقبل کا سوال ہے میرا خیال ہے کہ اگر پاکستان اور بنگلہ دیش والوں کو ہندوستان میں Freely آنے دیں تو وہ بھاگے آئیں گے اور واپس نہیں جائیں گے۔ اردو زبان ہندوؤں کی ہے یا نہیں یہ ایک اہم سوال ہے۔ ملک کی تقسیم نے اردو کا بیڑہ غرق کیا۔ پھر تعصب گھر کر گیا اور اردو کو مسلمان کی زبان بتایا جانے لگا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کی کتاب "فارسی ادبیات میں ہندوؤں کا حصہ" کس نے پڑھی؟ کسی نے نئی نسل کو ان کی وراثت کا پتہ نہیں دیا۔ کسی نے ہندو سکھ عیسائی دانشوروں کے کام پر کوئی سیمینار مذاکرہ نہیں کیا۔ میرا دعویٰ ہے کہ جب تک نئی نسل کو

اُن کے بُزرگوں کے کارناموں کا پتہ نہیں ہوگا، ان کو وراثت میں کیا ملا نہیں بتایا جائے گا، اردو کی ترقی میں رکاوٹ رہے گی۔ ورثہ کوئی چھوڑا نہیں کرتا۔

اردو انٹرویوز میں خالد عابدی کے سوالات کا دائرہ وسیع ہے۔ انھوں نے اردو ادب اور اس کی اصناف سے متعلق تاریخی اور فنی زاویہ سے سوالات کئے ہیں۔ اردو ڈرامانگاری اور مسائل اور ڈرامے کی اصناف پر گفتگو کی ہے۔ فلموں سے متعلق بعض تکنیکی گوشوں کو زیرِ بحث لائے ہیں۔ روبرو انٹرویوز میں سوال در سوال کی جو تکنیک اختیار کی جاتی ہے وہ مراسلاتی انٹرویوز میں موجود نہیں ہے اس لیے کہیں کہیں تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ ثانوی سوالناموں کے ذریعہ اس تشنگی کو دور کیا جاسکتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ مراسلاتی انٹرویوز میں تحریری جواب دینے والا شخص محتاط رہتا ہے اور شعوری کوشش کرتا ہے کہ کوئی بات خلاف مصلحت قلم سے نہ نکل جائے وہ انٹرویو لینے والے کو اپنے شعور کے نہاں خانوں میں جھانکنے کا موقع نہیں دینا چاہتا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو انٹرویوز میں بے ساختگی کی جگہ تکلف کی فضا برقرار رہتی ہے۔ مراسلاتی انٹرویوز ایک نئی سمت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ ابھی تجرباتی دور میں ہیں ان میں اصلاح کے امکانات ہیں۔ خالد عابدی کی یہ تصنیف اردو کی نئی کتابوں میں اپنے موضوع کی ندرت کی وجہ سے نمایاں نظر آتی ہے۔ اسے دل آرام ہاؤس۔ ہوا محل روڈ، بھوپال نے شائع کیا ہے قیمت پچاس روپے ہے۔ کتابت وطباعت پر مزید توجہ کی جاتی تو پیشکش اور بہتر ہوسکتی تھی۔

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو، بھوپال)

(ز) ٹیچر کے بغیر :۔ (بچوں کے ڈرامے / ۱۹۹۴ء)

● ادارہ روزنامہ منصف، حیدرآباد

یہ کیا بات ہوئی ٹیچر کے بغیر کہیں اسکول چل سکتا ہے۔ یا بچے پڑھ سکتے ہیں۔ ٹیچر کے بغیر کتابوں کا پڑھنا کہاں کھیل کود بھی نہیں ہو سکتا ہے۔

ٹیچر کے بغیر ایک کتاب کا نام ہے۔ جسے بچوں کے لیے محمد خالد عابدی صاحب نے بھوپال سے شائع کی ہے۔ یہ چھ ڈراموں کا مجموعہ ہے۔

چھوٹے چھوٹے یہ ڈرامے اگر بچے اسٹیج کریں تو دلچسپ اور کامیاب رہیں گے۔ آج کل بچوں کی جانب سے ایسا معلوم ہوتا ہے بڑوں نے منہ پھیر لیا ہے۔ بچوں کے لئے لکھنے والے تو دور کی بات بڑے ادیب بھی بچوں کے لئے لکھنا ضروری نہیں سمجھتے۔ ضرورت ہے کہ یہ ادیب غفلت چھوڑنے یا چھپتانے سے یہ بے توجہی نہ برتیں۔ سب کبھی کبھی دلچسپ کہانیاں نصیحت وغیرہ لکھیں۔ ان کے اخلاق سدھارنے اور ان کی زندگی میں کام آنے والی باتیں ان کے کردار اچھا انسان بنانے والا بناتے ہیں۔ واقعات تعجب کے قصہ کچھ بھی وقتاً فوقتاً لکھا کریں مسئلے، دلچسپ سوال جواب یا نوک جھونک کی باتیں نصیحت کے فقرے بھی کوئی نہیں لکھتا۔ بچوں کو نہ سہی بڑے ادیبوں کو اس طرف توجہ کرنی چاہئے۔ جب تک بچے پڑھیں گے نہیں وہ ملک کی باگ ڈور سنبھالنے کے لائق کس طرح بن سکیں گے۔ بچوں کی ذہنی تربیت ہمارا آپ کا ادیبوں کا سب کا فرض ہے آپ ہی ان کی ذہنی تربیت کر سکتے ہیں، آپ ہی ان کی کامیاب زندگی بسر کرنے کو تیار کر سکتے ہیں۔

بچوں کے لئے صرف مدرسہ یا اسکول کافی نہیں بلکہ ان کی ہر جگہ تربیت ہونی چاہئے۔ گھر پر، کھیل کے میدان میں اسکول میں یا پھر اندر ہر جگہ صرف ٹیچروں کے بھروسہ پر چھوڑ دینے سے یا اسکول کو ذمہ دار ٹہرانے پر بچوں کی تعلیم ختم نہیں ہو جاتی ہے۔

ایک لڑکا تو بچپن سے جوان ہونے تک بلکہ بعد بھی ماں باپ محبت تعلیم اور تربیت کا محتاج ہوتا ہے۔ اس کی کتابوں کے ذریعہ ہی نہیں اسکول کے نصاب کے بعد کی کتابیں اچھی کتابیں بچوں کو پڑھنا ضروری ہیں۔

اچھی کتابیں ہی بچوں کو ذہین بنا سکتی ہیں آدمی بنا سکتی ہیں ملک کا سورما اور نیتا بنا سکتی ہے۔

محمد خالد نے بچوں کے لئے چھ ڈراموں کے ذریعہ ان کی ذہنی تربیت دینے کی کوشش کی جو بہت اچھی کوشش ہے۔ یہ کتاب دل آرام ہاؤس ۵۳، ہوائل روڈ مکتبہ عابدیہ بھوپال سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

● روزنامہ منصف حیدرآباد ۔ ۱۲ / اپریل ۱۹۹۶ء

• ڈاکٹر بانو سرتاج قاضی

آج ملک زبانوں، تہذیبوں اور فرقوں میں بٹ گیا ہے۔ ادب بھی اسی حساب سے تخلیق ہو رہا ہے لیکن ادب اطفال کے مقاصد اور ضرورتیں آج بھی وہی ہیں جو کل تھیں۔ بچوں کے لیے لکھتے وقت خیال رکھنا پڑتا ہے کہ اس کے ذریعے ان کے فطری رجحانات کی نشو ونما ہو، ذہنی تفریح ہو، جذبۂ تجسس کو ہوا ملے اور اس کی تسکین ہو، ساتھ ہی ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو بیدار ہونے کا موقع ملے۔ تہذیب اور شائستگی، ادب و احترام کے اقدار کا تعارف ہو۔ ممتاز فلاسفر، ماہر تعلیم ڈاکٹر رادھا کرشنن درج ذیل الفاظ میں بچوں کے ادب کی اہمیت واضح کرتے ہیں۔

"ہر بچہ اپنے آپ میں ایک تجربہ ہے اور پرانے ڈھانچے کو بدل کر نیا بنانے کا ذریعہ بھی بچوں کا ذہن کھلا ہوتا ہے اور ہر نئی چیز کو قبول کرنے کے لئے مستعد بھی۔ بچے جذباتی ہوتے ہیں۔ وہ دوستی کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے ہیں وہ آس پاس کے اثرات کو بہت جلد قبول کرتے ہیں۔ بچوں کی صرف جسمانی نشو ونما ہی پر دھیان دینا مقصود نہیں ہونا چاہیئے بلکہ ان کے جذبات اور احساسات کا بھی ہر ممکن دھیان رکھنا ضروری ہے۔

اردو میں اول تو ادب اطفال دوسری اصناف کے مقابلے کم لکھا جا رہا ہے۔ اور وہ بھی اتنی تیزی سے ان لوگوں (بچوں) تک نہیں پہنچ پا رہا ہے جن کے لیے تخلیق کیا جا رہا ہے۔ بچوں کے رسائل کم ہیں۔ ادبی رسائل میں بچوں کے لئے صفحات نہیں ہوتے نہ بچوں کے ادب میں تنقید پر توجہ دی جاتی ہے۔ نظمیں اور کہانیاں پھر بھی لکھی جا رہی ہیں مگر ڈراموں کی اردو ادب میں بہت کمی ہے۔

ڈرامے کم لکھے جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ڈراما نگاری، شاعری اور نثر نگاری سے کسی قدر مشکل فن ہے۔ بقول پروفیسر خواجہ امین: "فنی تقاضوں کے پیش نظر ڈراما نویسی کو چاول کے دانے پر قل ہو اللہ لکھنے یا شمشیر پر چلنے کا حوصلہ شکن عمل ہی سمجھنا چاہیے۔"

ڈرامے میں بچے کی دلچسپی ہوتی ہے۔ ٹیچر سبق کو ڈراما ٹائز کر کے پڑھائے تو بچے اسے جلدی قبول کرتے ہیں۔ بچے پڑھتے وقت خود بھی اداکاری کے ساتھ پڑھنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ بچوں کے جو ادیب درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں وہ اس امر کو بہتر طریقے سے سمجھتے ہیں اور ڈراما لکھتے وقت ان باتوں کا دھیان رکھتے ہیں۔

ڈرامے ہر چند کہ بہت کم لکھے جا رہے ہیں مگر جو لکھے جا رہے ہیں وہ کتابی شکل میں سامنے آ کر یہ احساس دلاتے ہیں کہ مستقبل میں اور اچھے ڈراموں کی امید کی جا سکتی ہے۔

''ٹیچر کے بغیر'' محمد خالد عابدی کے چھے ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل '' آواز نما'' اور ''پیکرِ آواز'' کے عنوان سے ان کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ''ٹیچر کے بغیر'' مجموعے میں جو ڈرامے شامل ہیں وہ ریڈیو اور اسٹیج کے لئے لکھے گئے ڈرامے ہیں۔

اسٹیج کے لئے لکھے گئے ڈراموں کی بنیادی ضرورت یہ ہوتی ہے کہ وہ اسٹیج پر پیش کیے جا سکیں اس لحاظ سے اس مجموعے میں ''توبہ توبہ'' اچھا اور کامیاب ڈراما ہے۔ اسٹیج کی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ اس میں ڈرامائیت بھی ہے اور مقصد بھی بچوں کی تربیت میں والدین کا جو حصہ ہے، اسے ڈرامے کا مرکزی خیال بنایا گیا ہے۔

''ٹیچر کے بغیر'' ان اساتذہ پر چوٹ ہے جو اس معزز پیشے کو بدنام کر رہے ہیں۔ اسکول میں نہ پڑھا کر گھروں میں ٹیوشن لیتے ہیں۔ بچوں پر دباؤ ڈال کر انھیں ٹیوشن لینے پر مجبور کرتے ہیں۔ اس ڈرامے میں بچوں کی شرارتوں کو اچھی طرح اجاگر کیا گیا ہے۔

''پرانا اسکول'' مشکل ہی سے ڈراما کہا جا سکتا ہے۔ یہ بچوں سے زیادہ بڑوں کے لیے ہے۔ ڈراما نگار اپنے مقصد میں مخلص ہے مگر اس میں بچوں کے لئے کچھ نہیں ہے۔

''جعلی سند'' بھی اچھا ڈراما ہے لیکن اس کا اختتام بہت عجلت میں کیا گیا ہے۔

''مثالی دوست'' ڈراما نہیں صرف مقصدی مکالمہ ہے۔ ڈرامے لکھنے میں بچے کے دل میں اٹھتے سوالوں کا جواب آخر میں ضرورت ہوتا چاہئے۔ لیکن یہ جواب مقصد یا پیغام یا اصلاح سیدھے سپاٹ بیانیہ انداز میں نہ ہو کر فطری اور ان ڈائرکٹ ہو تو زیادہ بہتر ہوتا ہے۔

محمد خالد عابدی نے زبان بہت سادہ اور عمدہ استعمال کی ہے۔ کتاب اچھی چھپی ہے۔ تمام اردو اسکولوں میں یہ کتاب ضرور پہنچنی چاہیے۔

● ماہنامہ بچوں کی نرالی دنیا، دہلی۔ ستمبر ۱۹۹۶ء، ص ۳۲۔۳۱

● ادارہ (راشٹریہ، دہلی سہارا)

زیرِ بحث کتاب جناب محمد خالد عابدی کے ان ڈراموں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے خاص طور پر بچوں کے لئے تحریر کئے ہیں۔ یہ کتاب مصنف کے نصف درجن ڈراموں پر مشتمل ہے۔ پہلے ڈرامے کا عنوان ہے۔ ''ٹیچر کے بغیر'' اور دوسرے ڈرامے کا نام ہی بہت دلچسپ ہے یعنی ''کہانی چور'' دیگر ڈراموں کے عنوانات بھی کافی ذائقے دار ہیں مثلاً ''پرانا اسکول''، ''جعلی سند''، ''توبہ توبہ'' اور ''مثالی دوست'' ''ان ڈراموں میں بچوں کی شرارتیں بھی ہیں اور ان کی فطری

کمزوریوں کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ تقریباً ہر ڈرامہ کا مقصد اصلاحی ہے۔ بچوں کے لئے اردو زبان میں کم لکھا جاتا ہے اس لحاظ سے بھی خالد صاحب کی یہ کوشش قابلِ تحسین ہے۔ علاوہ ازیں مصنف نے ان ڈراموں میں بچوں کی نفسیات اور زبان کا بھی لحاظ رکھا ہے۔

کتاب وطباعت اور سرورق کے لحاظ سے یہ مجموعہ سادہ لیکن پرکشش ہے اور امید ہے کہ بچوں اور بڑوں دونوں کو یہ ڈرامے پسند آئیں گے۔

● راشٹریہ سہارا۔ ۲۸/اکتوبر ۱۹۹۶ء

● تسکین زیدی

محمد خالد عابدی کے چھ مختصر ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ جس میں ایک ریڈیو ڈرامہ، ایک ہندی ڈرامہ بخط اردو اور چار دیگر ڈرامے شامل ہیں، بنیادی طور پر یہ سب ڈرامے بچوں کے لئے لکھے گئے ہیں۔ اردو میں بچوں کے لئے ڈرامے کم ہی لکھے گئے ہیں خالد عابدی نے اس جانب توجہ کر کے ایک اہم ادبی خدمت انجام دی ہے۔ وہ ریڈیو سے منسلک ہیں اس لئے ان کے ان مختصر ڈراموں میں ریڈیو کی تمام خوبیوں اور خامیاں موجود ہیں۔ انھوں نے بچوں کی نفسیات اور ان کی ضرورتوں کو سمجھ کر انھیں کے لہجہ اور زبان میں لکھنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ مگر کہیں کہیں لگتا ہے کہ ڈرامے مقصدی مکالمے بن کر رہ گئے ہیں۔

''ٹیچر کے بغیر'' ان کا ایک اچھا اور مقصدی ڈرامہ ہے جو آج کے ان اساتذہ پر خوبصورت طنز ہے، جنھوں نے تعلیم کے مقدس پیشے کو ڈاکٹروں اور انجینئروں کی طرح پیسہ کمانے کا ذریعہ بنالیا ہے۔

مختصر یہ کہ خالد عابدی کے یہ ڈرامے اپنے مقصد میں کامیاب ہیں مگر واضح مقصدیت کبھی کبھی ڈراموں کی روح کو مجروح کر دیتی ہے۔ اگر خالد عابدی ایسے ڈرامے لکھیں جنھیں چھوٹے چھوٹے بچے خود اسٹیج کر سکیں تو یہ اردو کی بڑی خدمت ہوگی۔

''ٹیچر کے بغیر'' ۷۵ صفحات پر مشتمل ہے زبان بہت سادہ اور سلیس استعمال کی گئی ہے۔ امید ہے کہ یہ مختصر ڈرامے بچوں میں بہت مقبول ہوں گے۔

● ماہنامہ نیا دور لکھنؤ۔ اکتوبر ۱۹۹۶ء۔ ص ۴۵

(ج) مضامین خالد :۔ (تحقیقی و تنقیدی مضامین ر ۱۹۹۵ء)

● صادق نوید

مضمون کا لفظ عربی سے لیا گیا ہے۔ عربی لغات میں مضمون کا مفہوم جانداروں کے تخلیقی جوہر سے ہے۔ اردو میں سرسید نے مضمون نگاری کو مغربی معیاروں پر تشکیل دینے کی کوشش کی اور اپنی قوم کو دکھایا ہے کہ مضمون لکھنے کا کیا طرز ہے۔ تحقیق اور تنقید جیسے علمی اور ادبی کارناموں کے لئے اس سے بہتر کوئی اور صنف نہیں۔ زیر تبصرہ، ''مضامین خالد'' محمد خالد عابدی کا تحقیقی و تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ہے، محمد خالد عابدی کے استاد محترم جناب عشرت قادری کے تعارف کے بموجب جناب خالد عابدی نے باقاعدہ علم و ادب پر لکھنے کا آغاز ساتویں دہائی میں کیا۔ اس سے قبل وہ پُرکشش فلمی ستاروں اور فلمی دنیا کے بارے میں مضامین لکھتے رہے ہیں، انہوں نے ڈرامے بھی لکھے ''آواز نما'' کے نام سے اُن کی اردو ڈراموں کی کتاب بھی شائع ہوئی۔ اُن کے ڈرامے ریڈیو سے بھی نشر ہوتے رہے اور اسٹیج پر بھی دکھائے گئے اردو نثر کی مختلف اصناف اور موضوعات پر اُن کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ''مضامین خالد'' ان کی تازہ تصنیف ہے جو بارہ تحقیقی و تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے۔ انھوں نے اپنے بیشتر مضامین کے ذریعہ، ایسے شاعر و ادیب جن کے حالات زندگی او ادبی کارنامے پردہ اخفا میں تھے ان کی بازیافت کر کے ایک اہم علمی ادبی اور تحقیقی کام انجام دیا ہے۔ ''اجین کے ہندو شعراء'' ان کا پہلا تحقیقی مضمون ہے۔ جس میں اجین کی قدیم تاریخ پر مختصر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ کس طرح کائستھ خاندان کے علاوہ دیگر ہندو شعراء نے اردو شاعری میں حمد و نعت کے ساتھ نظم و غزل ہی نہیں بلکہ تمام مروجہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ انہوں نے اجین کے ہندو شعراء کا نمونہ کلام بھی پیش کیا ہے جو قابلِ قدر ہے۔ اُن کے کلام کے مطالعہ سے بعض غیر مسلم حضرات کی غلط فہمی کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ جو یہ سمجھتے ہیں کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے حالانکہ اردو کی تشکیل اور ترقی میں بلا تفریق مذہب و ملت غیر مسلم بھی برابر کے شریک ہیں اور یہ زبان ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کی آئینہ دار ہے۔

''فراق کے تحریروں میں شعرائے مدھیہ پردیش'' کے عنوان سے تحریر کردہ مضمون فراق جیسے بلند قامت شاعر کی افتادِ طبع پر روشنی ڈالتا ہے فراق جتنے عظیم شاعر ہیں اتنے ہی خوبصورت نثر نگار بھی۔ اُن کی تحریریں فکر انگیز بھی ہیں اور پر لطف بھی۔ اُن کو جب تک کوئی شاعر بذاتِ خود متاثر نہ کرتا وہ کسی بھی اہم شخصیت کے کہنے پر قلم اٹھانے کو آمادہ نہیں ہوتے اور جس کی شاعری انہیں متاثر

کرتی اس کی کھلے دل سے ہمت افزائی کرتے۔ شباب اشرف کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہمارے سب سے شیریں نغمے وہی ہیں جو درد و غم سے پیدا ہوتے ہیں۔ شہاب صاحب کی آواز صاحب کی آواز صرف ہمارے کانوں کے پردوں کو نہیں چھوتی بلکہ دل کے پردوں کو بھی چھوتی ہے" فراق صاحب جاں نثار اختر کے قطعات اور رباعیات کے مجموعہ" گھر آنگن" پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کی رباعیوں میں ہندوستان کے اندازاً پندرہ کروڑ گھروں اور گھریلو زندگی کی نرم و نازک جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں ان رباعیوں میں ادھ کھلی کلیوں اور ان کی بھینی بھینی خوشبوؤں کی صفت رچی اور بسی ہوئی ہے۔ فراق کی رائے کا یہ خوبصورت انداز نثر میں بھی ایک شاعرانہ بانکپن لئے ہوئے ہے۔

جناب محمد خالد عابدی کا مضمون رفعت سروش کے ڈرامے" مضمون نگار کے تحقیقی شعور کے ساتھ تنقیدی صلاحیت کا بھی پتہ دیتا ہے۔ رفعت سروش کے ڈراموں کو سراہتے ہوئے جہاں جہاں انھیں ڈرامے کی تکنیک کے اعتبار سے خامیاں نظر آئیں ان خامیوں کا برملا اظہار بھی کیا ہے استدلال کے ساتھ ان کی تنقید برائے تنقید نہیں بلکہ تنقید برائے تعمیر ہے جناب خالد عابدی ڈرامے سے نہ صرف خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں بلکہ وہ خود بھی ایک اچھے ڈرامہ نگار ہیں۔ ڈرامہ جیسی اہم صنف ادب کو حکومتی اور ادبی سطح پر نظر انداز کئے جانے پر وہ سخت احتجاج کرتے ہیں ڈرامے پر اکثر جامعات اور دیگر اہم اداروں میں تحقیقاتی کام نہ ہونے پر اور اس اہم و موثر صنف ادب سے بے اعتنائی کے رجحان پر نالاں ہیں اردو ڈراموں کے بے لوث خدمت انجام دینے والوں میں معدودے چند ادیب ہیں جن میں ابراہیم یوسف رفعت سروش، اثل ٹھکر، کمال احمد اور سلیم واحدی ہیں جو سنجیدگی سے ڈرامے پر لکھ رہے ہیں۔ رفعت سروش کو اوپیرا، منظوم ڈراموں اور ڈانس ڈراموں پر تقریباً عبور حاصل ہے۔" آغا حشر کشمیری مرحوم پر ایک تعزیتی رپورٹ کے عنوان سے ۳۰ جون ۱۹۳۵ء" آل انڈیا حشر ڈے" کے شرکاء کی ایک طویل فہرست درج کی گئی ہے جن میں متعدد اکابرین کے علاوہ علامہ سر محمد اقبال بھی شامل تھے۔ آغا حشر کشمیری کے فن کو ملک کے طول و عرض کے ممتاز دانشوروں نے خراج عقیدت پیش کیا مولانا سیماب اکبر آبادی نے آغا حشر کو منظوم خراج عقیدت پیش کر کے آغا حشر کا سن وفات ۱۳۵۴ء نکالا ہے۔ یہ نظم بھی مضمون کے ساتھ منسلک ہے۔ آغا حشر نے اردو ڈرامے اور اسٹیج کو انگریزی ڈرامے کے دوش بدوش کھڑا کیا جس کی بنا پر انھیں شکسپیر ہند کا لقب دیا گیا جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔

فصیح الملک (ایک قدیم رسالہ) جسے احسن مارہروی داغ دہلوی کے شاگرد نے داغ کی وفات

کے تقریباً ڈھائی ماہ بعد ان کی یادگار کے طور پر جاری کیا۔ فصیح الملک کا پہلا شمارہ جناب خالد عابدی کے ہاتھ لگا تو انھوں نے اردو دنیا کو اس رسالے کی ادبی اہمیت سے واقف کروانے کے لئے فصیح الملک کے عنوان سے ایک مضمون لکھا اور بتایا کہ کس طرح اس ماہنامے نے اردو زبان کی خدمت انجام دی۔ اردو املا کی تصیح اور فصاحت و بلاغت کے باب میں اس رسالہ کی خدمات نا قابل فراموش ہیں۔

''چمنستان خلیل'' (ریاست ٹونک کا ایک گلدستہ) یہ وہ گلدستہ ہے جو جناب خالد عابدی کو ریوا کے قیام کے زمانے میں حافظ محمد فیضان خاں کے شخصی کتب خانہ سے دستیاب ہوا اور انھوں نے رفاہ عام کے لئے اس عنوان سے ایک مضمون قلمبند کیا جو کئی شعراء کے مختصر حالات زندگی کے علاوہ نمونہ کلام سے بھی آگاہ کرواتا ہے۔ کہیں کہیں ممکن ہے کتاب کی غلطی کی وجہ سے بے بحر مصرعے بھی درج ہیں جس کی تصیح نہیں کی گئی ''نواب شاہ جہاں بیگم آف بھوپال اور ان کے کلکتہ کے سفر'' کے عنوان سے جو مضمون لکھا گیا ہے اس میں نہ صرف بھوپال کی قدیم مختصر تاریخ سے آگاہی ہوتی ہے بلکہ وہاں کے نواب خاندان کی خاتون حکمرانوں کے تدبر اور فراست پر بھی روشنی پڑتی ہے انگریز حکمرانوں سے روابط اور ان کی قدر دانی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مضمون رضا نقوی واہی اور ان کے منظوم خطوط، رضا نقوی واہی کے دلچسپ اور طنز و مزاح سے بھرپور خطوط مخطوظ کا سامان فراہم کرتا ہے مضمون کے درمیان ان کے لئے دعوت فکر کے ساتھ ان کی قادر الکلامی پر دلالت کرتے ہیں ان کے منظوم خطوط میں لطف بیان کے ساتھ نثر کی سی روانی پائی جاتی ہے۔

''بہزاد لکھنوی کے خطوط نشتر اندوری کے نام یہ خطوط اگر چہ کہ اندرو کے عظیم الشان مشاعرہ میں شرکت کی دعوت پر مبنی ہیں لیکن ان خطوط کی خاص بات یہ ہے کہ ان سے بہزاد لکھنوی کے مزاج، شخصیت اور نجی حالات سے آگاہی ہوتی ہے فلمی مصروفیات کے باوجود مشاعروں میں شرکت کی دعوتیں اور ان کی ناسازی مزاج کے سبب یہ مجبوری شرائط پر زور دینے اور قبول کروانے کا ان خطوط سے اظہار ہوتا ہے۔ ان کے انداز تحریر سے ان کی شرافت نفس عیاں ہے کہیں وہ اپنی عظمت کو اہمیت دیتے اور جتاتے ہوئے نظر نہیں آتے اپنے ہمعصر دیگر ممتاز شعراء کے بھی قدر داں معلوم ہوتے ہیں۔

''میر سید علی شائق دہلوی'' کے عنوان سے جناب خالد عابدی نے جو تفصیلی مضمون لکھا ہے وہ بھی ان کا تحقیقی کارنامہ ہے کہ ایک گمنام، باکمال شاعر کی حیات اور ادبی کارناموں کو منظر عام پر لانے کی سعی یقیناً قابل تحسین ہے۔ اس طویل مضمون میں انھوں نے مستند ذرائع سے شائق ہلوی کی حیات اور ان کے کلام کو یکجا کر کے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔

''درسی کتب میں مولانا ابوالکلام آزاد'' کے عنوان سے جو مضمون لکھا گیا ہے وہ یقیناً

قوم وملت کے لئے دعوت فکر دیتا ہے۔ مولانا آزاد جیسی شخصیت کو حکومتی اور عوامی سطح پر نظرانداز کیے جانے پر وہ شدید احتجاج کرتے ہیں۔ جناب خالد عابدی کا یہ اعتراض کہ سیاسیات ادبیات اور صحافت میں مولانا ابوالکلام آزاد ایسی شخصیت نہیں ہے جسے آسانی سے بھلایا جاسکے یا تعصب کے پردوں میں چھپادی جائے" یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک حقیقی محب وطن اور سیکولر نظریے کا حامی رہنما جو مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کے دوش بدوش اپنے ملک کی آزادی کے لئے تمام عمر ہر طرح کی صعوبتیں برداشت کرتا رہا اسے اس کا جائز مقام نہیں مل سکا۔

جناب خالد عابدی کا آخری مضمون ،نازش پرتاپ گڈھی کی شاعری میں قومی یکجہتی' ہے۔ نازش پرتاپ گڈھی حضرت سیماب اکبرآبادی کے نامور شاگرد تھے جو مشاعروں میں اپنے قومی یکجہتی پر مبنی کلام کی بناء پر بے حد پسند کیے جاتے تھے۔ ایک حقیقی محب وطن اور انسانیت پر ایقان رکھنے والا شاعر جب اپنے مشاہدات اور دلی جذبات کو، فن کے چوکھٹے میں خوبصورت الفاظ اور تراکیب کے ساتھ شعر کے سانچے میں ڈھال دیتا ہے تو یقیناً ایسی شاعری دلپذیر بھی ہوتی ہے اور فکر انگیز بھی نازش پرتاپ گڈھی ایسے ہی شاعر تھے۔ جناب خالد عابدی نے نازش پرتاپ گڈھی کی شخصیت اور شاعری کو اپنے مضمون میں بھرپور خراج تحسین ادا کیا ہے۔

''مضامین خالد'' ایک علمی اور ادبی کتاب ہے جو عمومی طور پر شائقین ادب کے لئے مفید ہوتے ہوئے خصوصی طور پر ادب کے طالب علموں اور Research Schoars کے لیے نہایت کارآمد ہے۔ کتاب کا سرورق دیدہ زیب ہے۔ کاغذ اور کتابت عمدہ ۱۵۰ صفحات پر مشتمل کتاب مضامین خالد مکتبہ جامعہ نگر نئی دہلی، دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ بھوپال بک ہوز، بدھوارہ، بھوپال اور مولف محمد خالد عابدی مکتبہ عابدیہ دل آرام ہاؤس ۵۳ ہوا محل روڈ بھوپال نمبر۱ سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ کتاب کی قیمت پچاس روپیے ہے۔

● روزنامہ سیاست حیدرآباد، ۲۰ رمئی ۱۹۹۶ء

● ادارہ (راشٹریہ سہارا)

زیر نظر کتاب مصنف کے تحقیقی و تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے بیشتر مضامین پر مغز اور مدلل ہیں مثلاً اوجین کے ہندو شعراء، فراق کی تحریروں میں شعرائے مدھیہ پردیش، رفعت سروش کے ڈرامے، آغا حشر کشمیری پر ایک تعزیتی رپورٹ، فصیح الملک ایک قدیم رسالہ، چمنستان خلیل، ریاست ٹونک کا گلدستہ، نواب شاہ جہاں بیگم آف بھوپال اوران کے کلکتہ کے سفر،

رضا نقوی واہی اور منظوم خطوط، بہزاد لکھنوی کے خطوط نشتر اندوری کے نام، میر سید علی شائق دہلوی حیات اور ادبی خدمات۔ درسی کتب میں مولانا ابوالکلام آزاد، نازش پرتا گڈھی کی شاعری میں قومی یکجہتی۔

محمد خالد عابدی نے ان مضامین میں اپنے مفروضات اور حقائق کو دلائل اور ثبوت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ زبان صاف ستھری اور ادبی ہے۔ کتابت اور طباعت کے لحاظ سے "مضامین خالد" دلکش ہے اور اس کا سرورق سادہ لیکن پرکشش ہے اس لئے توقع ہے کہ باذوق اور ادب نواز قارئین اس کتاب کو پسند فرمائیں گے۔

● راشٹریہ سہارا دہلی۔ ۱۷ر جون ۱۹۹۶ء

● ڈاکٹر شاہد جمیل، پٹنہ

اردو ادب میں محمد خالد عابدی ایک معروف اور معتبر نام ہے۔ اب تک مختلف اصناف و موضوعات پر ان کی ۸ کتابیں منصہ شہود پر آچکی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب ان کے ۱۲ تنقیدی و تحقیقی مضامین پر مشتمل اور ۱۲۸ صفحات پر محیط مجموعہ ہے، جسے سنہ ۱۹۹۵ء میں مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع کیا گیا ہے۔ "اجین کے ہندو شعراء"، "فراق کی تحریروں میں شعرائے مدھیہ پردیش"، "رفعت سروش کے ڈرامے"، "آغا حشر کشمیری پر ایک تعزیتی رپورٹ"، "فصیح الملک، ایک قدیم رسالہ"، "چمنستانِ خلیل ریاست ٹونک کا ایک گلدستہ"، "نواب شاہ جہاں بیگم آف بھوپال اور ان کے کلکتہ کے سفر"، "رضا نقوی واہی اور ان کے منظوم خطوط"، "بہزاد لکھنوی کے خطوط نشتر اندوری کے نام"، "میر سید علی شائق دہلوی حیات اور ادبی خدمات"، "درسی کتب میں مولانا ابوالکلام آزاد" اور "نازش پرتاپ گڈھی کی شاعری میں قومی یکجہتی" ایسے موضوعات ہیں جن کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان میں سے بیشتر مضامین رسائل اور ان کے خصوصی نمبروں میں بھی جگہ پاچکے ہیں۔

تنقید و تحقیق کا فن بحرِ علم و آگہی میں غوطہ لگا کر موتی بدست نکلنے کا متقضی ہے۔ فنی بصیرت، اظہار رائے میں احتیاط اور بیان میں اختصار و جامعیت اس راہِ پُرخطر کی لازمی شرائط ہیں۔ محمد خالد عابدی کے مضامین واقفیت میں اضافہ اور ذہن کے دریچے وا کرتے ہیں۔ قاری تشکیک تذبذب کا شکار نہیں ہوتا لیکن کہیں کہیں احساسِ تشنگی دل میں کسک پیدا کردیتا ہے اور تحقیق کے تقاضوں سے کترا کر نکلتے ہوئے محقق پکڑے جاتے ہیں۔

"مدھیہ پردیش میں فراق صاحب کی تحریروں پر مشتمل محض اتنا ہی مواد حاصل ہو سکا ہے۔اس مضمون میں جن حضرات کے تعلق سے تحریریں شامل نہیں ہوسکی ہیں اس کے لئے تحقیق کا طویل انتظار تھا اور "نیا دور" کے "فراق نمبر" کی ضرورت اس طویل انتظار کی متحمل نہیں تھی چنانچہ دستیاب مواد کو ہی مضمون کی بنیاد بنایا ہے"(صفحہ ۳۶)

اس کے علاوہ نشتر اندوری کے نام بہزاد لکھنوی کے مکتوبات محض ذاتی نوعیت کے ہیں، جن کی اشاعت "فکر و آگہی" نئی دہلی میں ہو چکی تھی، کو موضوع تحریر بنانے کا معقول جواز نظر نہیں آتا ہے۔"رضا نقوی واہی اور ان کے منظوم خطوط" ایک عمدہ مضمون ہے۔

رضا نقوی واہی نباضِ وقت ہیں۔ان کی نگاہ کی زد میں آکر بچ نکلنا محال ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔مثلاً ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی ایک بسیار نویس فنکار ہی نہیں بلکہ مکتوبی ادیب بھی ہیں۔ ان کا مکتوب ٹیلی فون کے رانگ کال کی طرح کسی کو بھی کسی وقت موصول ہو سکتا ہے، واہی نے ان کے نام لکھے اپنے ایک منظوم خط میں، کس خوبی سے اپنی حیرت کا اظہار کیا ہے، ملاحظہ کیجئے

یہ بات سمجھنے سے سمجھانے سے ہے قاصر
کیوں ایک زمانے سے ہو خاموش مناظر
حیرت ہے کہ وہ ماہ بہ اک کارڈ نہ لکھے
وہ شخص جو مکتوب نگاری میں ہو ماہر

(صفحہ ۱۰۳)

"درسی کتب میں مولانا آزاد" "رفعت سروش کے ڈرامے" اور "میر سید علی شائق دھلوی حیات وادبی خدمات" بھی اس مجموعہ کے اچھے اور معلومات افزا مضامین ہیں۔

اپنی بعض منفرد خوبیوں کے سبب "مضامینِ خالد" ایک لائق مطالعہ تصنیف ہے۔ کتابت، طباعت اور گٹ اپ اوسطاً اور ۱۵۰ صفحات کی کتاب کی قیمت ۵۰ روپیے (مجلد) مناسب ہے۔

● **عبدالقوی دسنوی**

اُردو پڑھنے، لکھنے والوں میں میری نظر سے ایسے بہت کم لوگ گذرے ہیں جنھوں نے نہایت کم عمری سے نامساعد حالات میں اپنی زندگی کی تعمیر میں، دھوپ چھاؤں سے گذرتے ہوئے اور مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے اردو زبان وادب سے والہانہ محبت اردو کے بے شمار رسائل اور

کتابیں خرید کر اور پڑھ کر کی ہو اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ وہ مصنف کی صورت میں ابھر آئے ہوں اور ان کی خریدی ہوئی کتابیں اور رسائل ایک قیمتی کتب خانہ کی صورت اختیار کر گئی ہوں اور علم و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے معاون بن گئی ہوں۔

خالد عابدی ایسے ہی شخص کا نام ہے جس نے نہایت خاموشی کے ساتھ زمانے کی سرد و گرم ہواؤں کا مقابلہ کرتے ہوئے یہ سب کچھ کیا اور آہستہ آہستہ کامیابیاں اور نیک نامیاں اس کے قدم چومتی رہیں۔

اخبارات اور رسائل میں خالد عابدی عرصہ سے مضامین لکھ رہے ہیں۔ ان کی پہلی کتاب ریڈیو ڈراموں کا مجموعہ آج سے بیس سال قبل ''آواز نما'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد کئی کتابیں ''باغ فکر معروف بہ مقطعاتِ نساخ''، ''پیکر آواز'' ''زخموں کے دریچے'' ''شکایتاً عرض ہے''، ''اردو انٹرویوز'' ''تیچر کے بغیر'' ان کی مطبوعات ہیں جو ریڈیو اور اسٹیج ڈرامے، افسانے، طنزیہ مزاحیہ مضامین، مراسلاتی انٹرویوز، بچوں کے ڈرامے کے مجموعوں کی صورت میں مختلف وقتوں میں منظر عام پہ آتی رہی ہیں اور اب یہ تازہ مجموعہ ''مضامین، خالد'' دو ماہ قبل شائع ہوا ہے۔

یہ کتاب خالد عابدی کے ایک درجن تحقیقی و تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے جو ۱۲۸ صفحات اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے جسے انھوں نے اپنی درسگاہوں بر جیسہ ہوا محل اسکول اور سیفیہ اسکول بھوپال کے نام معنون کر کے ان تعلیم گاہوں سے اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار کیا ہے ان مضامین میں انھوں نے اپنی دلچسپی کے مطابق مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ جن میں تحقیقی بھی ہیں، تنقیدی بھی اور تعارفی بھی۔

مدھیہ پردیش اور بھوپال ان کے محبوب موضوعات ہیں۔ چنانچہ اوجین کے ہندو شعراء'' ''فراق کی تحریروں میں مدھیہ پردیش'' ''نواب شاہ جہاں بیگم آف بھوپال'' اسی تعلق کی وجہ سے لکھے گئے ہیں۔ ڈرامے سے دلچسپی نے ان سے ''رفعت سروش کے ڈرامے'' اور آغا حشر کشمیری پر ایک تعزیتی رپورٹ'' لکھوائے ہیں اور خطوط جمع کرنے اور مطالعہ کے شوق نے ''رضا نقوی واہی اور ان کے منظوم خطوط'' بہزاد لکھنوی کے خطوط نشتر اندوری کے نام'' قلمبند کرائے ہیں۔ باقی مضامین میں فصیح الملک، ایک قدیم رسالہ، چمنستانِ خلیل ریاست ٹونک کا ایک گلدستہ میر سید علی شائق دہلوی حیات اور خدمات، درسی کتابوں میں مولانا ابوالکلام آزاد اور نازش پرتاپ گڈھی کی شاعری میں قومی یک جہتی'' ان کی کچھ تحقیقی و کچھ تنقیدی دلچسپی اور کچھ پرانی چیزوں کے تعارف کرانے کی خواہش کی وجہ سے لکھے گئے ہیں۔ یہ سارے مضامین اگرچہ مختصر ہیں لیکن ادب اور اس سے

متعلقات کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے دلچسپ بھی ہیں اور مفید بھی ہیں۔

اوجین کے ہندو شعراء میں منشی ہیرالال وکیل خشی پربھودیال اشہر اوجینی پنڈت چاند نرائن رازداں مونس، پنڈت جھجو سنگھ صادق، گوری پرشاد کچلو، بالکشور بھٹناگر، کشور اوجینی، اشرون کمار بہار اوجینی، رام لال شجاع اور کرشن گوپال خاور نو ہندو شعراء کا تعارف کرایا گیا ہے اور نمونے کے طور پر ان کے کلام بھی پیش کئے گئے ہیں۔

"فراق کی تحریروں میں شعرائے مدھیہ پردیش میں انھیں شہاب اشرف، جاں نثار اختر، پنالال نورتین شعراء کو تلاش کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ رفعت سروش کے ڈرامے" ایک اچھا مطالعہ ہے جس میں ان کے ڈرامے کا جائزہ لیتے ہوئے خالد عابدی نے صحیح لکھا ہے۔

"رفعت سروش اس امر کے لئے بھی لائق ستائش ہیں کہ انھوں نے منظوم ڈرامے، اوپیرا، بیلے، ڈانس ڈراما وغیرہ اتنے لکھے ہیں کہ ان کا مشکل سے کوئی ثانی ملے گا"

"آغا حشر کشمیری پر تعزیتی نوٹ" میں آغا حشر کی وفات پر اجمیر میں ایک زبردست تعزیتی جلسہ کی رپورٹ کا تعارف ہے۔ اس طرح "فصیح الملک" ایک قدیم رسالہ کا تعارف کرایا گیا ہے۔ "چمنستانِ خلیل" ٹونک سے ایک گلدستہ نکلتا تھا عابدی نے اس کی تفصیل سے آگاہ کیا ہے اور شعراء کے کلام کے نمونے بھی پیش کئے ہیں۔ ایک مضمون میں رضا نقوی واہی کے مجموعہ کلام "متاع واہی" کے چھتیس منظوم خطوط پر روشنی ڈالی گئی ہے "بہزاد کے خطوط نشتر اندروی کے نام" میں بہزاد کے دس خطوط پیش کئے گئے ہیں۔ ایک دوسرے مضمون میں میر سید علی شائق دہلوی کی زندگی، ادبی خدمات کے ساتھ ساتھ، ان کے کلام کے نمونے بھی پیش کئے گئے ہیں۔ ایک مضمون میں درسی کتب میں مولانا آزاد کی تحریریں تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور آخری مضمون میں نارش پرتاپ گڈھی کی شاعری میں قومی یک جہتی پیش کی گئی ہے۔

یہ سارے موضوعات اس لحاظ سے اہم ہیں کہ ان پر عام طور سے بہت کم توجہ دی گئی ہے اس لئے خالد عابدی اس کامیاب کوشش پر مبارکباد کے مستحق ہیں یقین ہے کہ اس کتاب کی طرف توجہ کی جائے گی اور مصنف کی کوششوں کو سراہا جائے گا۔

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو بھوپال)

محمد خالد عابدی کی کُتب پر ایک نظر

یوسف ندیم

(۱) محمد خالد عابدی شاعر ادیب اور انشاء پرداز ہیں۔ تصنیف و تالیف ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ ان کی حسب ذیل کتب شائع ہو چکی ہیں۔

۱۔ آواز نُما ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ۱۹۷۵ء
۲۔ باغِ فکر معروف بہ مقطعات نساخ ۱۹۷۷ء
۳۔ پیکرِ آواز ریڈیائی اور اسٹیج ڈرامے ۱۹۸۳ء
۴۔ زخموں کے دریچے افسانے ۱۹۸۸ء
۵۔ شکایتاً عرض ہے طنزیہ و مزاحیہ مضامین ۱۹۹۱ء
۶۔ اردو انٹرویوز (مراسلاتی انٹرویوز) ۱۹۹۲ء
۷۔ ٹیچر کے بغیر بچوں کے لئے ڈرامے ۱۹۹۴ء
۸۔ مضامینِ خالد تحقیقی مضامین ۱۹۹۵ء

من جملہ ان کتب کے ہمارے پیش نظر تین کتب تبصرے کے لیے موجود ہیں۔

۱۔ اردو انٹرویوز۔
۲۔ ٹیچر کے بغیر
۳۔ مضامین خالد

اردو انٹرویوز ڈیمائی سائز کے ۱۲۸ صفحات کو محیط ہے یہ کتاب ۱۹۹۲ میں شائع ہوئی اس میں احسن رضوی داناپوری، اظہر افسر، پریم وار برٹنی، تج ناتھ زار، جرم محمد آبادی، جمیل شیدائی، خواجہ عبدالغفور، رام لال نابھری، جمیل شیدائی رضا مظہری ستیہ پرکاش تنگر، شمیم جے پوری، ضیاء فتح آبادی، قیصر عثمانی اور نریندر لوتھر کے مراسلاتی اساس پر لئے گئے انٹرویوز شامل ہیں۔

ان انٹرویوز سے متذکرہ بالا فن کاروں کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ محمد خالد عابدی نے بڑی مستحسن کوشش کی ہے اس کتاب کی کتابت، طباعت اور کاغذ عمدہ، نفیس اور اچھا ہے۔

خالد عابدی کی دوسری کوشش بچوں کے لئے ڈرامے "ٹیچر کے بغیر" کے عنوان سے پیش کئے گئے ہیں۔ یہ ۸۔۲۰۳۰۱ کے ۸۴ صفحات کو محیط ہے اور ۱۹۹۴ میں چھپی، اس میں ۶ ڈرامے ہیں

اور ہلکی پھلکی سلیس اور عام فہم زبان میں ہیں بعض ڈرامے تو درس آموز اور چونکا دینے والے نتائج کے حامل ہیں۔ اس کتاب کو بچوں کے ادب میں بہت ہی اچھا اضافہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

مضامین خالد تحقیقی وتنقیدی مضامین پر مشتمل ہے یہ کتاب ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی۔ ڈیمائی سائز کے ۱۵۰ صفحات کو محیط اس کتاب میں ۱۲ مضامین شامل ہیں کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کرتے ہوئے بڑی مسرت ہوتی ہے کہ محمد خالد عابدی نے موضوع سے انصاف کرنے کے معاملے میں اس کا حق ادا کردیا۔ مصنف بڑے مخلص اور ایثار واقع ہوئے ہیں۔ شاذ قسم کے موضوعات جیسے اوجین کے ہندو شعراء اور فصیح الملک ایک قدیم رسالہ اور چمنستانِ خلیل ایک قدیم گلدستہ وغیرہ پر انھوں نے بڑی نظر تحقیقی ڈالی ہے اس ٹائپ کے مضامین میں زبان وبیان کی بحث بھی بڑے اچھے انداز میں آئی ہے۔

● ماہنامہ: قومی زبان حیدرآباد۔ مارچ راپریل۔ ۱۹۹۶ء

---

(۲) پروفیسر قمر رئیس:۔

برادرم محمد خالد عابدی صاحب

تسلیم۔

آپ کی دونوں کتابیں ملیں۔ شکر گذار ہوں۔

یہ دونوں کتابیں میری نظر سے نہیں گذری تھیں۔

سرسری طور پر دیکھا۔ نساخ پر آپ کی کتاب، محنت لگن، تحقیق اور علمی استعداد کا اچھا نمونہ ہے۔ کاش ہمارے آج کے نوجوان محقق ایسی علمی کتابوں کو پڑھیں اور انھیں ماڈل بنائیں۔

مضامین میں بھی سنجیدہ مطالعہ اور افہام وتفہیم کا اعلیٰ معیار نظر آتا ہے۔

دہلی، ۲۰۰۴-۱۱-۱۳

---

(۳) شری ویریندر پرشاد سکسینہ، بدایوں

میں نے آپ کی کتاب "مضامین خالد کا مطالعہ کیا یہ اردو نثر کی تاریخ میں ایک گرانقدر اضافہ ہے اور منظعات نساخ اردو تحقیق میں زندہ رہنے والی کتابوں میں سے ہے"

مکتوب:۔ ۱۳ را کتوبر ۲۰۰۵ء

(ط) اردو مراسلاتی انٹرویوز: ۱۹۹۶ء

● امیر احمد صدیقی

"اردو مراسلاتی انٹرویو" ملک کے ممتاز اور مقتدر ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں، دانش وروں اور چند فلمی ہستیوں کے ساتھ تحریری گفتگو اور مکالمات کا مجموعہ ہے۔ ان اکابرین میں اختر الایمان، علی سردار جعفری، ڈاکٹر گیان چند، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، علامہ جمیل مظہری، کوثر چاند پوری، وامق جون پوری، علی جواد زیدی، خمار بارہ بنکوی، وجاہت علی سندیلوی، واہی نقوی، ڈاکٹر صفدر آہ جیسے منفرد اور باکمال شاعر، ادیب افسانہ نگار اور مزاح نگار شامل ہیں۔

یہ مراسلاتی انٹرویوز ادبی نقطۂ نظر سے بہت اہمیت کے حامل ہیں کیوں کہ جہاں ایک طرف ہم ان ممتاز اور بلند قامت ادبی شخصیتوں کی زندگی کے کوائف اور ان کے ادبی رجحانات سے واقف ہوتے ہیں وہیں دوسری طرف ان فن کاروں کے نظریات اور تاثرات سے بھی ہم کو کما حقہ آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ یہ انٹرویو چونکہ تحریری طور پر لئے گئے ہیں اسلئے ان کے معتبر ہونے میں کسی کو شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ فن کار نے بہت اطمینان کے ساتھ بذات خود اپنی حیات، تخلیقات اور نظریات کے بارے میں اظہار خیال فرمایا ہے۔ اس کتاب کی اصل خوبی اس کا تنوع ہے کیونکہ ادب، شاعری، افسانہ، ڈرامہ، تنقید، فلم ہر میدان کے قابل ذکر فن کاروں کے انٹرویوز اس میں شامل ہیں۔

اس کے علاوہ خالد عابدی نے ایسے سوالات قائم کئے ہیں جن سے ان فن کاروں کی زندگی اور ان کے ادبی کارناموں کے بارے میں بہت سے پوشیدہ پہلو اجاگر ہو جاتے ہیں۔ اس میں کوئی دو رائیں نہیں کہ یہ قابل قدر تصنیف ایک مستند اور معتبر دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۹۷ء۔ ص ۴۶

"نقطۂ نوگُریز" پر رائے / تاثرات

● دیویندر اِسّر

"منی کہانی" بڑے غور سے پڑھی۔ پسند آئی۔ اتنی مختصر لیکن اپنے معانی میں جامع۔ اسے آپ کسی پرچے میں شائع کرائیں۔"

۱۵ر ستمبر ۱۹۸۸ء

● دیویندر اِسّر

"۔۔۔۔آپ کی منی کہانیاں بھی پڑھ لی ہیں۔ آپ نے مختلف موضوعات کو پُر اثر طریقے سے فنی ملحوظات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ ایک خوشگوار عمل ہے۔ میں نے ان کہانیوں کو دلچسپی سے پڑھا اور متاثر ہوا ہوں۔ عام طور پر ایسی کہانیوں کے بارے میں ہوتا یہ ہے کہ وہ منی تو ہوتی ہیں، لیکن کہانی نہیں ہوتیں۔ ان کہانیوں میں ایسا نہیں ہے۔ امید ہے آپ اس عمل کو جاری رکھیں گے۔"

۱۵ر مارچ ۱۹۹۵ء

● جوگندر پال

"اگر یہ سچ ہے کہ کوئی تخلیق کتاب کی بجائے قاری کے ذہن میں پوری ہوتی ہے تو اس سچائی کا گواہ کسی اچھے افسانچہ کو ٹھہرا کر اپنی تشفی کر لیجئے۔ مثلاً محمد خالد عابدی کا یہ افسانچہ زندگی نامہ۔

"صبح جب میں گھر سے باہر نکلا تو ایک سادہ کاغذ کی مانند تھا اور جب شام کو واپس ہوا تو ایک اخبار تھا۔"

کیا آپ کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس دوسطری کہانی میں واقعی پورے کا پورا زندگی نامہ رقم ہو لیا ہے؟ قاری اسے اب اپنی ذاتی واردات اور تلازموں کے مطابق جیسے اور جتنا چاہے، جی ہی جی میں بڑھاتا چلا جائے۔ افسانچے کا اختصار ہی فی الحقیقت اسے اتنا پُرگو بنا دیتا ہے، چہ جائیکہ ہم اسے محض اس لئے ٹال جانا چاہیں کہ بالا سا تو ہے۔ محمد خالد عابدی جس پُر شوق انہماک سے اس نہایت محبوب ادبی صنف کو

کھنگالنے اور اس کی تخلیقی گنجائش دریافت کرنے میں جٹے ہوئے ہیں۔ اس سے اُمید بندھتی ہے کہ انکی پیہم شرکتیں ان پر افسانچے کے بیشتر امکانات کے انکشافات کا اسباب کرتی رہیں گی۔"

۱۴ راگست ۱۹۹۴ء

● ڈاکٹر شیشر پردیپ

"محمد خالد عابدی کی "منی کہانیاں" اس لحاظ سے کامیاب ہیں کہ ان میں زبان و بیان کی سادگی کے ساتھ وحدت تاثر قائم رہتا ہے چند جملوں میں بڑی بات کہہ جانا خالد عابدی کی خصوصیت ہے۔ ان کی کہانیاں دل و دماغ دونوں کو متاثر کرتی ہیں۔ یہ ان کا پہلا مجموعہ ہے اور اس مجموعے میں کم و بیش دس کہانیاں نہایت عمدہ کہانیوں کے زمرے میں آتی ہیں۔ جیسے "قومی ایکتا" "شہرت"، "انتخاب"، "آخری خواہش"، "پسینے کی مہندی" "سچا جھوٹ، جھوٹا سچ" "آدمی کا زہر" "ہم ایک ہیں"، "رات! رات!!" اور "جڑوں کا پانی"

میری دُعا ہے کہ۔۔۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ"

۱۴ رجون ۲۰۰۵ء

● نثار راہی

خالد عابدی کے منی افسانے میں نے پڑھے ہیں۔ ان کو پڑھ کر میں چونک گیا کیونکہ ان کے افسانوں کے خالق کا ذہن افسانوں کی لہلہاتی کھیتی کے لئے زرخیز ہے یہ وہ بیدار ذہن ہے جو سماج پر گہری نظر رکھتا ہے اور جو معمولی سے نظر آنے والے واقعات کے کوئی نہ کوئی غیر معمولی پن اور سماج کے عیوب کو کیچ کر لیتا ہے اور بس افسانہ بن جاتا ہے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر، اسی طرح میں کہتا ہوں کہ میں نے خالد عابدی کے منی افسانے پڑھ کر ہی سمجھ لیا کہ وہ طویل اور معیاری افسانے بھی بآسانی لکھ سکتے ہیں اور اپنے آپ کو باقاعدہ یعنی ریگولر افسانہ لکھنے والے افسانہ نگاروں کی فہرست میں جب چاہیں شامل کر سکتے ہیں، بشرطیکہ وہ اپنے ریڈیو اسٹیشن کے کاموں کی عدیم الفرصتی میں سے کچھ وقت افسانہ نگاری کے لئے وقف کر دیں۔ میں نے خالد عابدی کے منی افسانے "زندگی نامہ" "قومی ایکتا" "دھوپ کا موسم" "روٹی کی قیمت" اور "انتخاب" وغیرہ خصوصاً پسند کئے ہیں۔

انٹرویو

محمد خالد عابدی

۱۷ر دسمبر ۱۹۸۵ء

محترم ترین محبوب صدیقی صاحب

السلام علیکم

آپ کا مرسلہ سوالنامہ تقریباً سال ڈیڑھ سال قبل موصول ہوا تھا۔ میں نے گذشتہ سال ہی تقریباً سو سوالوں کے جوابات لکھ لیے تھے باقی کے جوابات التواء میں پڑ گئے۔

جب مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ جواب میں خاصی تاخیر ہو گئی ہے تو میں نے دیگر کام روک کر آپ سے دریافت کیا کہ آیا اس جواب نامے کی اب ضرورت ہے یا نہیں تو آپ کی جانب سے اطمینان بخش جواب موصول ہوتے ہی میں نے تین چار روز میں ہی از سرِ نو جوابات تفویض قلم کر لئے اور محترم کی خدمتِ شریف میں روانہ کر رہا ہوں۔

محترم مناسب خیال فرمائیں تو جواب نامہ پر اپنے تاثرات روانہ فرمائیں تجزیہ رقم فرمائیں کہ اس طویل جواب نامے کا مستقبل کیا ہے کس ضرورت کے تحت آپ نے یہ کام شروع کیا ہے۔

محترم مجھے خوش خطی کا بہت شوق ہے۔ یہ فن باقاعدہ تو سیکھا نہیں، تاہم اپنے طور پر گاہ گاہ مشق کر لیا کرتا ہوں، آپ کے اسمِ گرامی کو خوش خط لکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ کوشش بھی آپ کے ملاحظے کے لئے روانہ ہے۔ اُمید کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ میرے لائق کوئی کام ہو تو ضرور لکھیئے۔

والسلام

آپ کا

محمد خالد عابدی

17-12-85

جناب محبوب صدیقی
کے
سوالنامے کا جواب نامہ

۱۔ نام:۔ محمد خالد عابدی

۲۔ والدین کا نام:۔ محمد عابد و سعیدہ خاتون

۳۔ ادبی نام یا تخلص:۔ ابتداء میں خالدؔ ہی تخلص اور قلمی نام تھا۔ بعد میں محمد خالد بھوپالی اور ثم محمد خالد عابدی کے نام سے اور آصف کمال کے نام سے بھی لکھ رہا ہوں۔ واضح رہے کہ ''عابدی'' ولدیت کی مناسبت سے لکھتا ہوں۔

۴۔ تاریخ پیدائش:۔ میں شہر بھوپال میں ۱۷ر اگست ۱۹۴۷ء میں پیدا ہوا۔ اسناد وغیرہ میں ۱۷ر نومبر ۱۹۴۹ء درج ہے۔

۵۔ مقام:۔ شہر بھوپال۔

۶۔ تعلیم و تربیت:۔ ابتداء میں مسجد محمود خاں امامی دروازہ بھوپال میں دینی تعلیم حاصل کی۔ آٹھ سال کی عمر میں قرآن مجید (ناظرہ) ختم کیا۔ ۱۹۷۲ء میں ہائر سیکنڈری، ۷۸۔۱۹۷۹ء میں اودھیش پرتاپ سنگھ وشو ودھیالیہ (ریوا) سے بی اے کیا۔ ۸۴۔۱۹۸۵ء میں دیوی اہلیہ وشو ودھالیہ اندور سے ایم۔ اے (اردو) فرسٹ ڈویژن اور میرٹ، سیکنڈ پوزیشن میں پاس کیا۔

۷۔ شجرہ اساتذہ:۔ افسوس میں اپنے اساتذہ کا شجرہ نہیں معلوم کر سکا۔

۸۔۹۔ ازدواجی زندگی:۔ ۴ر دسمبر ۱۹۷۲ء بمطابق ۲۷ر شوال المکرم ۱۳۹۲ھ ہجری کو فرزانہ خاتون بنت محمد یونس (سپروائزر بجلی گھر۔ بھوپال) سے شادی ہوئی۔

۱۰۔ رفیقِ حیات کا ادب سے لگاؤ:۔ شادی کے دو چار سال بعد تک انھوں نے میرے ادبی ذوق کی مخالفت کی۔ حالات اس نہج پر پہنچے کہ میں نے لکھنا پڑھنا ترک کر دیا۔ لیکن میں نے اس مخالفت کا پہلے تو سنجیدگی سے مقابلہ کیا جب حالات معمول پر آتے نہ دیکھے تو پھر

میں نے شعوری طور پر اور سختی سے اپنی تحریک تیز کردی۔ اکثر انھیں میری کتابوں سے بیر رہتا ہے۔ بعید نہیں کہ وہ کتابیں نذرِ آتش کردیں۔ موصوفہ ہائیر سیکنڈری فیل ہیں گاہ گاہ اردو اخبار و رسالہ پڑھ لیا کرتی ہیں۔

۱۱۔ آپ کے ماشاءاللہ کتنے بچے ہیں اور ان کے اسماء گرامی تحریر فرمائیں۔

تین لڑکیاں ہیں فی الحال:۔(۱) فرحانہ خاتون پیدائش ۱۹راگست ۷۴ء (۲) فرقانہ خاتون پیدائش ۱۲ر نومبر ۱۹۸۰ء اور (۳) فردانہ خاتون پیدائش ۲۱ر فروری ۱۹۸۳ء۔

۱۲۔ کیا آپ پر خاندان کے دوسرے افراد کی ذمہ داری بھی ہے:۔ جی نہیں الحمدللہ والدین زندہ ہیں۔ وہ بھوپال میں ہیں اور میں ملازمت کے سلسلے میں اندور شہر میں ہوں افسوس کہ نہ تو اُن کی خدمت کرسکا اور نہ فرائض کی ادائیگی۔ بہرکیف ماہانہ ایک قلیل رقم ان کی خدمتِ شریف میں منی آرڈر کردیا کرتا ہوں۔ میرے والدین میرے بھائی بہن ہی میرا خاندان ہے۔ عام طور پر خاندان کی جو تعریف ہے اس میں ایسے اشخاص ہیں جو صاحب ثروت ہیں، متمول ہیں وہ اپنی امارت کے غرور میں ہم کم علم اور غریب گھرانے کو اپنے خاندان کے افراد تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ وہ لوگ باعلم ضرور ہیں لیکن مغرور اور بدمزاج ہیں۔

۱۳۔ معمولات:۔ میں آل انڈیا ریڈیو میں بحیثیت پروڈکشن اسسٹنٹ ہوں مجھے اپنے کاموں کے سلسلے میں اسٹوڈیو میں اور شہر شہر قریہ قریہ میں مصروف رہنا ہوتا ہے فرصت کا وقت بہت کم ملتا ہے۔ چھٹیاں بہت کم ملتی ہیں اس لئے معمولات روزانہ یکساں نہیں رہتے۔ بہرکیف صبح چھ سات بجے بیدار ہوتا ہوں۔ صبح ہی سے پانی بھرنے کی ذمہ داری اٹھانی پڑتی ہے۔ میں جہاں اندور میں رہتا ہوں وہ علاقہ آزاد نگر کہلاتا ہے۔ یہ علاقہ کثیر مسلم آبادی کا علاقہ ہے۔ ننانوے فی صد سے زیادہ مسلمان جاہل کم علم ہیں۔ ٹرک ڈرائیور، ٹیکسی ڈرائیور، آہن گر، جرائم پیشہ، سزایافتہ مسلمانوں کا علاقہ ہے۔ بے ایمانی سے اور زیادہ سے زیادہ پانی بھرنا ان مسلمانوں کا مذہب ہے خیر صبح ساڑھے آٹھ بجے تک پانی کی تگ ودو میں رہتا ہوں۔ دس بجے دفتر پہنچنا ہوتا ہے۔ چھ سات بجے شام کو دفتر سے واپسی ہوتی ہے۔ جس دن چھٹی مل جائے وہ نعمت سے کم نہیں ہوتا اور وہ نعمت تبرک کے طور پر بٹ جاتی ہے۔ جو آرام کا وقت ہے اس میں بیشتر وقت میرے لکھنے پڑھنے اور مطالعہ کا ہے۔

۱۴۔ تفریح و مشاغل:۔ تفریح و مشاغل کا تعلق فرصت سے زیادہ ہے۔ میں اندور شہر سے قدرے فاصلے پر رہتا ہوں آزاد نگر میں (میں اسے یزید نگر کہتا ہوں) یہاں کوئی تفریح گاہ نہیں ہے۔ پارک نہیں ہے لائبریری نہیں ہے دفتر اور گھر قریب ہیں۔ لہٰذا گھر آنے کے بعد لکھنے پڑھنے میں ہی وقت گذرتا ہے۔ ہاں اگر کسی کام سے شہر کی طرف نکل گیا تو یہی تفریح ہو جاتی ہے ہاں، البتہ پیدل چلنا بہت پسند ہے۔ کبھی پروفیسر عزیز اندوری نے میرے پیدل چلنے پر ایک مضمون وغیرہ لکھنے کا خیال ظاہر کیا تھا۔

۱۵۔ آپ کے کھانے پینے کی پسندیدہ چیزیں کونسی ہیں؟:۔ بریان، شیر مال، قورمہ مزعفر دو پیازہ، کباب، کوفتے اور پھلوں میں آم بالخصوص ملیح آباد، ضروری نہیں کہ کھانے میں مرغن غذائیں ہوں لیکن لذیذ اور نفیس ہونی چاہیے خواہ وہ مقدار میں کم ہی کیوں نہ ہوں۔ اگر دال یا سبزی لذیذ ہو تو بدمزہ بریان، قورمہ پر ترجیح دیتا ہوں۔

۱۶۔ ناشتہ:۔ ملازمت کی نوعیت کچھ اس طرح کی ہے ناشتے میں کھانے میں اور نیند وغیرہ میں نہایت بے قاعدگی ہے۔ دوئم وجہ یہ ہے کہ ناشتہ ساڑھے نو بجے تیار ہوتا ہے اس کا دوش کس کو دیا جائے؟ بہر کیف ناشتے میں جو کچھ مل جائے اسے مجبوراً اور ضرورتاً قبول کرنا ہوتا ہے پیش کیا گیا ناشتہ مجھے پسند آ گیا تو اللہ تیرا شکر اور اگر ناپسند ہوا تو زہر مار کر لیتا ہوں اس میں اللہ تیرا شکر کیوں؟ میں بالعموم ناشتہ کرتا نہیں ہوں۔ معمولی ناشتہ بھی میرے لئے کھانا ہی ہوتا ہے گویا ایک اچھے ناشتے پر صبح و شام کا گذارا ہو جاتا ہے۔

۱۷ غذا:۔ خواہ کتنی ہی پسند کی چیز ہو میں ایک خاص تناسب سے لیتا ہوں کسی کے اصرار کا احترام کرتے ہوئے قدرے تجاوز ہو جاتا ہے لیکن میری طبیعت پر بار رہتا ہے۔

۱۸۔ وہ کون سی اشیاء ہیں جو زندگی کا جز بن گئیں، مثلاً شراب، چائے، کافی، پان، حقہ، سگریٹ، پائپ وغیرہ:۔

میں ان چیزوں میں سے کسی کا عادی نہیں ہوں۔ چائے کافی اور پان اکثر دوستوں کا ساتھ دینے یا کسی کے اصرار سے اکثر لے لیا کرتا ہوں۔ سگریٹ حقے اور پائپ سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ اگر کسی محفل میں یا دوستوں میں سگریٹ کا شدید اصرار ہو جائے تو وقتی طور پر ان کا استعمال کیا جا سکتا ہے وگرنہ کوئی دلچسپی نہیں۔ بھوپال میں جاں نثار اختر مرحوم اور ریوا میں اسٹیشن ڈائریکٹر کے ساتھ ایک بار شراب نوشی کا اتفاق ہوا تھا۔ یہ ان لوگوں کے شدید اصرار کے باعث تھا۔ ریڈیو کی ملازمت میں اکثر پروگراموں میں جانا ہوتا ہے، شراب

کے لئے مدعو کیا جاتا ہے لیکن میں قبول نہیں کرتا مجھے کسی کا ڈر، خوف نہیں بس طبیعت ہی پسند نہیں کرتی۔

۱۹۔ آپ چائے اندازاً کتنی بار پیتے ہیں:۔ اوّل تو چائے کا لذیذ و نفیس ہونا شرط ہے، ویسے دن بھر میں صرف چار چائے، صبح ناشتے میں، دوپہر میں کھانے کے بعد اور شام چار بجے، شام چھ سات بجے اور رات کی چائے سے مجھے شب بیداری کی شکایت ہو جاتی ہے

۲۰۔ آپ کے شہر کی کھانے کی کیا چیز مشہور ہے؟ سیخ کے کباب، نرگسی کوفتے، قیمے کے سموسے (بھوپال) کے اچھے ہوتے ہیں۔ یہاں اندور میں تو لوگوں کو ان چیزوں کا شوق ہے اور نہ ان چیزوں کو تیار کرنے کا سلیقہ ہے نہ شعور و تمیز۔ البتہ یہاں کا ''مانڈہ'' اچھا ہوتا ہے۔

۲۱۔ کیا آپ ہوٹلوں یا قہوہ خانوں میں بیٹھنے کے عادی ہیں:۔ ضرورتاً تو بیٹھ جاتا ہوں۔ ہاں کوئی اخبار وغیرہ دیکھنا ہو تو۔

۲۲۔ آپ عام طور پر روزانہ دوست احباب کے ساتھ کتنے گھنٹے صرف کرتے ہیں؟:۔ بالعموم ساتھیوں کو دوست سمجھا جاتا ہے۔ دوست اور ساتھی علیحدہ ہوتے ہیں۔ زیادہ تر دفتر میں ساتھی ہوتے ہیں جو کسی قدر دوست نما ہوتے ہیں۔ خیر۔ ملازمت کے بے ہنگم طریقے اور اوقات نے تعلقات اور جذباتی رشتوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ احباب کے ساتھ وقت گذاری، سہولت اور وقت پر منحصر ہے۔

۲۳۔ کیا آپ کو جانور یا پرندوں کے پالنے کا شوق ہے؟:۔ مجھے جانوروں میں ہرن اور پرندوں میں کبوتر اور طاؤس بہت پسند ہیں نیز رنگ برنگی چڑیاں لیکن کہیں مستقل رہنا ہو تو یہ شوق پورا کیا جا سکتا ہے۔

۲۴۔ صحت:۔ عام طور پر موٹے شخص کو تندرست اور دبلے پتلے شخص کو غیر صحت مند تصور کیا جاتا ہے جب کہ یہ کلیہ بالکل غلط ہے۔ الحمد للہ میں خود کو صحت مند سمجھتا ہوں جس زمانے میں پورے ہندوستان میں آنکھوں کی تکلیف عام ہوئی الحمد للہ میں محفوظ رہا۔ ابھی کچھ ماہ پہلے ڈینگو بخار کا زور گھر گھر ہوا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں اس بدن توڑ بخار سے بھی محفوظ رہا۔ بینائی وغیرہ الحمد للہ اچھی ہے۔ ہاں البتہ کم نیند آنا میرے نزدیک بیماری ہے، سو میں اس کا مریض ہوں۔

۲۵ آپ کسی مرض میں تو مبتلا نہیں ہیں؟:۔ بارہ ماہ میں سردی محسوس کرتا ہوں۔ معمولی سردی

مجھے متاثر کرتی ہے۔ میرے والد کو ہرنیا کی شکایت تھی، آپریشن میں کامیابی ہوئی۔ میں گذشتہ تین چار سال سے دائیں فوطے میں ہلکا سا درد محسوس کرتا ہوں۔ ویسے الحمدللہ کوئی شکایت نہیں۔

۲۶۔ ادیب یا شاعر ہونے کے لئے کسی خاص قسم کا نشہ استعمال کرنا ضروری ہے؟
ضروری نہیں کہ شراب یا سگریٹ شاعر و ادیب کے تخیل کو ترقی دے۔ ویسے شاعر و ادیب کے لئے مطالعے و مشاہدے کا نشہ کرنا ضروری ہے۔ اس سے بہتر اور بڑا نشہ کسی فن کار کے لئے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ نشہ تو بالعموم نہایت گھٹیا قسم کے لوگ کرتے ہیں تو کیا وہ بھی ادیب و شاعر ہو سکتے ہیں۔ یا فن کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔

۲۷۔ آپ کس قسم کا لباس پہننا پسند کرتے ہیں؟:۔ شاید عربی کہاوت ہے کہ انسان لباس سے پہچانا جاتا ہے'' میں تو یہ کہتا ہوں کہ لباس اور فیشنی لباس انسان کی نفسیات کے مظہر ہیں۔ اپنی جسامت کے لحاظ سے لباس پہننا چاہیئے۔ لباس پہننے کے بعد آدمی مہذب اور خوش نما لگے نہ کہ جسم و جاں پر ظلم کرتا ہوا۔ مجھے لکھنوی کرتا اور بھوپالی پاجامہ (کم مہری والا) پسند ہیں میں عام طور پر بشرٹ اور پینٹ پہنتا ہوں اور گھر میں جب رہتا ہوں تو کرتا اور پاجامہ پسند کرتا ہوں دراصل عادت بھی پسند میں شامل بھی جاتی ہے۔

۲۸۔ آپ کس قسم کی خوشبو پسند کرتے ہیں؟:۔ مجھے ہندوستانی عطریات پسند ہیں۔ اگر عطر وغیرہ تیز ہو تو درد سر محسوس ہونے لگتا ہے۔ البتہ ہلکا عطر دل پسند ہے۔

۲۹۔ آپ تعطیل کے دن کہاں اور کیسے گذارتے ہیں؟:۔ بالعموم یوم تعطیل Duty میں ہی گذر جاتا ہے یا جس دن تعطیل ہوتی ہے اور اتفاق سے وہ چھٹی مل جائے تو وہ دن بھی لکھنے پڑھنے میں لگا دیتا ہوں یا کبھی کسی سے ملنے جاتا ہوں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ ملنے جلنے والے چھٹی کے دن غریب خانہ پر آجاتے ہیں۔ ان سے گھر پر گفتگو رہتی ہے۔ میں کیوں کہ ''مدھیہ پردیش میں اردو زبان و ادب'' پر تحقیق کر رہا ہوں۔ اس لئے شہر میں معلومات کی غرض سے شاعروں سے رابطہ قائم کرنا پڑتا ہے۔

۳۰۔ کیا آپ کو باغبانی کا شوق؟:۔ جی ہاں ہے تو شوق لیکن افسوس کہ میں اندور میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کی مکانیت عجیب واقع ہوئی ہے۔ اپنے مکان میں خواہ وہ بوسیدہ و شکستہ ہی کیوں نہ ہو اس کا لطف الگ ہے۔ کرائے کے مکان کی بات علیحدہ ہے۔ غرض کہ یہاں باغبانی ممکن نہیں۔

۳۱۔ اپنی پسند کے پھولوں کے نام تحریر کیجئے:۔ گلاب، چنبیلی، موگرا۔

۳۲۔۳۳۔ کیا آپ کو فنِ موسیقی سے بھی کچھ لگاؤ ہے؟:۔ موسیقی سننے میں حظ محسوس کرتا ہوں لیکن فن سے ناواقفیت ہونے کی وجہ سے وہ لطف نہیں محسوس کرتا جو ایک فن داں حاصل کرتا ہو۔ فلمی موسیقی سننے کا زیادہ اتفاق ہوا ہے چنانچہ فلمی موسیقاروں میں مجھے نوشاد علی، غلام محمد، سی رامچندر، خیام، سجاد حسین، حسن لال بھگت رام اور شنکر جے کشن کی موسیقی پسند ہے۔ کلاسیکی موسیقی کو سمجھنے کا مجھ میں شعور نہیں۔

۳۴۔ کلاسیکی موسیقی سے اگر ذوق ہے تو آپ کے پسندیدہ راگ کون کون سے ہیں؟

الف۔ اور اپنے پسندیدہ موسیقار کا نام تحریر فرمائیں۔

اس فن کو سننے کی حد تک تو دلچسپی ہے۔ اگر کبھی سننے کا اتفاق ہوتا ہے تو اسے دلچسپی اور سنجیدگی سے سنتا ہوں گو کہ اس فن سے واقف نہیں ہوں لیکن کوفت نہیں ہوتی ہے۔

ب۔ پسندیدہ رقص اور رقاص کا نام:۔

مجھے کتھک رقص بہت پسند ہے۔ گوپی کرشن اور ستارہ دیوی کا رقص پسند ہے۔

۳۵۔ کس قسم کی فلمیں آپ دیکھنا پسند کرتے ہیں؟:۔ یہ بہت دلچسپ اور میری پسند کا سوال ہے مجھے بچپن سے ہی فلمیں دیکھنے کا شوق تھا۔ ابتداء میں مجھے اسٹنٹ پکچرس پسند تھیں جس میں خوب مار دھاڑ ہو۔ لیکن کچھ عرصے بعد اس پسند میں زبردست تبدیلی آئی چنانچہ مجھے تاریخی اور رومانی فلمیں پسند آنے لگیں۔ جو فلمیں مجھے بے انتہا پسند ہیں ان کے نام ہیں ۔انارکلی، مرزا غالب، پکار، مغلِ اعظم، بیجو باورا، شباب، برسات کی رات، دل اپنا پریت پرائی، پاکیزہ، میرے محبوب، میرے حضور، سوہنی مہیوال اور رضیہ سلطان۔

۳۶۔ کیا آپ کو فنِ مصوری سے دلچسپی ہے؟:۔ فنِ مصوری کی کن کن مشہور تحریکات سے آپ کی شناسائی ہے ایسے مصوروں کے نام تحریر فرمائیں جن کے فن نے آپ کو زیادہ متاثر کیا ہو؟:۔ فنِ مصوری سے بھی مجھے بے انتہا شوق ہے لیکن افسوس کہ اس فن کو سیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ جب جب مصوری کی نمائش دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے ایک فنکارانہ دلچسپی کے ساتھ مشاہدہ کیا ہے اور اس سے بھرپور حظ اٹھایا ہے۔ بھوپال، ریوا، اندور اور اوجین میں اکثر نمائشیں دیکھی ہیں۔ مجھے روایتی مصوری تو خاص طور پر پسند ہے لیکن یہ مقصد نہیں ہے کہ جدید اور علامتی آرٹ سے مجھے دلچسپی نہیں ہے۔ مجھے عبدالرحمن چغتائی کا آرٹ سب سے زیادہ پسند ہے۔ دیوانِ غالب اور کلیاتِ اقبال میں جو انھوں نے اپنا آرٹ دکھایا ہے وہ

ملاحظے کی چیز ہے۔ میں ان کے فن سے خاصا متاثر ہوں۔ ادھر صادقین بھی متاثر کررہے ہیں اور پکاسو بھی لیکن میری پہلی پسند عبدالرحمن چغتائی ہی ہیں۔

۳۷۔۳۸ کیا آپ کو مغربی موسیقی سے شغف ہے اور آپ کن کن مغربی موسیقاروں کے دلدادہ ہیں؟

الف اس سلسلے میں میری کوئی واقفیت نہیں ہے۔

ب گلوکار:۔ آپ نے گلوکاران کے بارے میں کوئی سوال قائم نہیں کیا۔ بہر کیف مجھے طلعت محمود، محمد رفیع، مکیش، نورجہاں، لتا اور ثریا بہت پسند ہیں۔

۳۹ پیشہ:۔ پہلی ملازمت ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۷ء تک بھوپال، بجلی گھر میں کلرکی بعدہٗ اپنے ذوق وشوق کی نوکری ستمبر ۱۹۷۷ء آل انڈیا ریڈیو میں بحیثیت پروڈکشن اسسٹینٹ کام کررہا ہوں۔ اس پوسٹ کی نوعیت یہ ہے کہ پروگرام کی ریکارڈنگ ڈبنگ، ایڈیٹنگ کرنا ہوتی ہے اور پروگرام تیار بھی کرنا ہوتا ہے۔ پروڈکشن اسسٹنٹ کو بالعموم پروگرام کا Script بھی تیار کرنا ہوتا ہے۔

بعض نالائق پروڈیوسر اور پروگرام ایگزیکٹو کے ماتحت رہنے سے بے انتہا ذہنی تشنج رہتا ہے۔ یہ لوگ صرف کنویں کے مینڈک ہوتے ہیں لیکن پروڈکشن اسسٹنٹ زمین وآسماں کی خبر رکھتا ہے کیوں کہ پروگرام تو وہی تیار کرتا ہے۔ بہت کم پروڈیوسر اور پروگرام ایگزیکٹو ایسے ہوتے ہیں جو پروڈکشن اسسٹنٹ کی طرح اسٹوڈیو میں اور Out Door میں کام کرسکتے ہیں۔ یہ پروڈیوسر اور پروگرام ایگزیکٹو اکثر ایسا بھی کرتے ہیں کہ پروڈکشن اسسٹنٹ کے تیار شدہ پروگرام میں سے اس کا نام ہٹا کر اپنا نام نشر کرادیتے ہیں۔

دراصل پروڈکشن اسسٹینٹ میں بھی اتنی صلاحیت اور قابلیت ہوتی ہے کہ وہ بیک وقت چار پانچ لوگوں کا کام تنہا کرسکتا ہے۔ مثلاً وہ پلاننگ (پروگرام کی) بھی کرسکتا ہے، وہ اسکرپٹ بھی لکھ سکتا ہے، وہ اناؤنسر کا کام بھی کرسکتا ہے اور پروگرام تو خیر وہی تیار کرسکتا ہے۔ ریڈیو کے اکثر بڑے پروگراموں کی کامیابی کے پس منظر میں جو شمع جھلملاتی ہے اس میں پروڈکشن اسسٹنٹ کا خون جلتا ہے۔ لیکن ریڈیو کا مورخ اتنا بے ایمان اور خود غرض اور ابن الوقت ہے کہ وہ پروڈکشن اسسٹنٹ کے ساتھ انصاف نہیں کرسکا ہے۔

پروڈکشن دراصل ایک Creative Work کی طرح ہی ہے اس کی تکمیل میں فنکارانہ ذہن کی جگہ جگہ ضرورت پیش آتی ہے اور جو اشخاص اس بات کا خیال نہیں رکھتے وہ

پروڈکشن کے ساتھ انصاف نہیں کرتے ہیں بلکہ محض آوازوں کے ٹکڑوں کو پھوہڑپن سے جوڑ دیتے ہیں۔ پھولوں کا ڈھیر ایک الگ چیز ہے اور ایک گلدستے کے ساتھ جو تصور ہے وہ فنکارانہ عمل ہے۔

۴۰ مستقل سکونت سے مستقل ہونے کے اسباب:۔ میرے نزدیک یہ سوال مبہم ہے وضاحت فرمائیں۔

۴۱ کیا آپ نے اپنی زندگی کا بیمہ کرالیا ہے؟ جی ہاں میرے تین بیمے ہیں دو میری طرف سے اور ایک دفتر کی طرف سے ہے۔

۴۲۔۴۳۔ کیا آپ کا کوئی پرائیویٹ سکریٹری ہے؟ جی نہیں۔

۴۴۔۴۵۔ کیا آپ کے پاس ٹیلی فون، سائیکل، اسکوٹر یا کار ہے:۔ جی نہیں۔

۴۶۔ کیا آپ ڈائری لکھتے ہیں؟:۔ جی ہاں ۱۹۷۲ء میں ڈائری لکھنی شروع کی تھی۔ کہا گیا ہے کہ ڈائری لکھنے والے کو روز ہی لکھنا چاہیئے گویا ناغہ نہ ہو چنانچہ یہ شرط مجھے پسند نہیں آئی، لہذا یہ سلسلہ ترک کر دیا اور اس کی جگہ میں نے احباب ملاقاتیوں، شاعروں ادیبوں کو خط لکھنا شروع کر دیا۔ میرے پاس دو سے چار خط یومیہ (اخبار، رسالے اور خط) آتے ہیں اور میری طرف سے ایک ہفتہ میں تقریباً دس خط لکھے جاتے ہیں۔ بعض ضروری خطوں کی میں نقل بھی رکھ لیا کرتا ہوں۔ یہ سلسلہ ڈائری کا بدل تو نہیں ہے لیکن کافی حد تک اس کی ضرورت پوری کرتا ہے۔

۴۷۔ مکتوبات، نادرات، ملفوظات کا ذکر کریں جو آپ کے پاس ہیں:۔

میرے پاس مولانا امتیاز علی عرشی، قاضی عبدالودود، علامہ جمیل مظہری، جرم محمد آبادی پرتو لکھنوی، نادم سیتاپوری، صفدر آہ سیتاپوری، احسن رضوی داناپوری، حضرت آوارہ، پروفیسر رشید احمد صدیقی، پریم وار برٹنی، فیاض گوالیاری، تخلص بھوپالی، اعجاز صدیقی، نازش پرتاپ گڈھی، جاں نثار اختر وغیرہ کے خطوط میرے نام ہیں۔ پہلے میں ان خطوط کو "نقوشِ رفتہ" کے نام سے کتابی شکل دے رہا تھا لیکن رفعت سروش صاحب کی اس نام سے کتاب آگئی تو خیر یہ ارادہ ترک کر دیا۔ اب ان مکتوبات کو "متاعِ رفتہ" کے نام سے شائع کر رہا ہوں نادرات میں بعض مطبوعہ کتب ہیں بیشتر کتب تقریباً صد سالہ پرانی ہیں کچھ قلمی کتابیں ہیں جگر مرادآبادی مرحوم کی ایک ایسی نایاب تصویر ہے جو کہیں شائع نہیں ہوئی۔ اور بھی شعراء کی تصاویر ہیں۔ فن خطاطی پر کئی کتب ہیں۔

۴۸۔۵۲۔ کیا آپ کا کوئی ذاتی کتب خانہ ہے؟ آپ کے ذاتی کتب خانہ میں اندازاً کتنی کتابیں ہوں گی؟ آپ کے کتب خانہ میں اردو اور دوسری مشرقی زبانوں کی کتابوں کی تعداد کتنی ہوگی۔ آپ کے کتب خانہ میں زیادہ تر کن مضامین اور موضوعات پر کتابیں ہیں؟

جی ہاں تقریباً ڈیڑھ ہزار کتب اخباروں ورسائل پر مشتمل میرا ذاتی کتب خانہ ہے (مکتبہ عابدیہ) بھوپال ریڈیو سے میری ایک تقریر "بھوپال کے کتب خانے" نشر ہو چکی ہے اس تقریر میں میرے ذاتی کتب خانے کا بھی مختصراً ذکر تھا اور شاید نومبر ۱۹۸۲ء میں بی بی سی لندن کی اردو نشریات کے تحت میرا ایک طویل انٹرویو (دو قسطوں میں) نشر ہو چکا ہے اس انٹرویو میں بھی میرے کتب خانے کا میں نے ہی ذکر کیا ہے۔ میرے کتب خانے میں اردو زبان و ادب کی کئی کتابیں اور قلمی کتابیں محفوظ ہیں۔ نیز قدیم رسائل لغات اور تذکرے ہیں۔ مستقبل میں ذاتی کتب خانے کی نمائش کا ارادہ ہے۔ میرے کتب خانے میں بالخصوص مدھیہ پردیش کے شعراء و ادباء کی تصاویر ان کے خطوط، مشاعروں کے پوسٹرس اور کتب وغیرہ ہیں اور الحمدللہ روز افزوں اس میں ترقی ہو رہی ہے۔

۵۳۔ ادبی زندگی کی ابتداء:۔ ابتداء میں قلمی جریدہ شمع میں کچھ فلمی سوالات کے جوابات پوچھے، کچھ رسائل میں پسندیدہ اشعار شائع ہوئے۔ اس سے کچھ حوصلہ بڑھتا رہا، چھوٹے چھوٹے ادبی، نیم ادبی مراسلے اخبار ورسائل میں شائع ہوئے بالعموم فلمی جرائد میں فلمی مضامین میں جو معلومات اور واقعات کی غلطیاں راہ پا جاتی ہیں میں اپنی معلومات کی بناء پر اُن کی تصحیح شائع کرایا کرتا تھا۔ میرا پہلا مضمون حیدر آباد کے پندرہ روزہ فلمی اخبار "رنگ برنگ" میں دلیپ کمار کی شخصیت اور فن پر شائع ہوا تھا۔ غالباً یہ بات ۱۹۶۶ء یا ۱۹۶۷ء کی ہے پھر شاعری کی طرف رجحان بڑھا تو بھوپال کے حضرت شاہد بھوپالی اور عشرت قادری صاحبان کو کلام دکھایا لیکن یہ شوق بہت جلد ختم ہو گیا اور نثر کی طرف بڑھا اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

۵۴۔ عمر کے کس حصے میں آپ نے شعر کہنا یا ادبی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کیا؟

شاید ۱۹۔۲۰ سال کی عمر سے۔

۵۵۔ کیا آپ کا ذریعہ معاش صرف ادب ہے؟ جی نہیں۔

۵۶۔ آپ کن کن زبانوں سے واقف ہیں؟ اردو اور ہندی زبان سے۔

۵۷۔۵۸۔ کیا آپ کسی اخبار یا رسالے کے مدیر ہیں اور کیا آپ کسی ادبی انجمن یا کلب کے رکن ہیں؟

جی نہیں!

۵۹۔ کیا آپ نے دوسری زبانوں کے ادب کا مطالعہ کیا ہے؟ جی نہیں۔

۶۰۔ عالمی ادب میں وہ کون سے مصنف یا شاعر ہیں جنھوں نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے؟

اقبالؔ، غالبؔ اور فیضؔ احمد فیضؔ نے۔

۶۱۔ آپ کے پسندیدہ اخبار ورسائل کون کون سے ہیں؟۔ ماہنامہ شاعر بمبئی، ماہنامہ آج کل دہلی، ماہنامہ نیا دور لکھنؤ، عصری ادب دہلی، الفاظ علی گڈھ، غالب نامہ دہلی اکاڈمی لکھنؤ، روزنامہ انقلاب بمبئی، روزنامہ قومی آواز ہفت روزہ ہماری زبان دہلی۔

۶۲۔ کیا آپ اخبارات و رسائل میں کارٹون پسند کرتے ہیں۔ آپ کس کارٹونسٹ کو پسند کرتے ہیں؟

مجھے کارٹون بہت پسند ہیں، شنکر اور لکشمن میرے پسندیدہ ہیں۔

۶۳۔ کیا کسی غیر ملکی رسالے یا اخبار میں آپ کا کوئی مضمون شائع ہوا ہے؟:۔ جی نہیں۔

۶۴۔ کیا کسی اخبار یا رسالے کا کوئی نمائندہ کبھی انٹرویو لینے آیا ہے؟ ۱۹۷۷ء میں ایک اردو رسالے کے لئے انٹرویو ہونے والا تھا۔ نمائندے نے سوالنامہ ارسال کر دیا تھا۔ لیکن در یں اثناء ریڈیو کی ملازمت سے وابستہ ہو کر ریوا چلا گیا۔ ویسے بی بی سی لندن کی اردو نشریات میں، مدھیہ پردیش کے کتب خانوں پر میرا ایک انٹرویو ریکارڈ کیا گیا تھا جو بعدہٗ دو قسطوں میں نشر بھی ہوا تھا۔

۶۵۔ آپ نے کبھی ریڈیو، ٹی وی، پر کسی قسم کے پروگرام میں حصہ لیا ہے؟:۔ ریڈیو کی ملازمت میں آنے سے قبل بھی میں نے دو تین ریڈیو ڈراموں میں کام کیا تھا۔ کئی تقاریر نشر ہوئیں ہیں۔ بچوں کے لئے بھوپال ریڈیو سے کہانیاں نشر ہوئیں۔ اب جب کہ میں ۱۹۷۷ء سے ریڈیو سے وابستہ ہوں کئی اشخاص سے میں نے انٹرویو لئے ہیں۔

۶۶۔ کیا آپ کی تخلیق ادبی یا درسی انتخابات میں شامل ہیں؟:۔ مدھیہ پردیش اردو اکادمی کا پچیس سالہ انتخاب ''مدھیہ پردیش میں اردو ادب کے پچیس سال'' میں میرا ایک ریڈیائی ڈرامہ ''دوسرا جنم'' منتخب ہوا ہے۔ دو سال ہوئے مہاراشٹر کے ایک ادارہ نے درجہ چہارم کے لئے ایک تخلیق طلب کی تھی میں نے ''عید ملن'' کی کہانی روانہ کی تھی۔ اس کا انتخاب ہوا یا نہیں کوئی خبر نہیں۔

۶۷۔ کیا آپ کو غیر ملکی ادبی مجلسوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے؟:۔ جی نہیں۔

۶۸۔ کیا آپ نے بچّوں کے لئے اشعار و مضامین لکھے ہیں؟:۔ جی ہاں میں نے بچّوں کے لئے کہانیاں اور ڈرامے لکھے ہیں جو نشر بھی ہوئی ہیں اور شائع بھی۔

۶۹۔ کیا آپ کی کسی تخلیق کا غیر ملکی زبان میں ترجمہ ہوا ہے؟:۔ جی نہیں۔۔

۷۰۔ کیا آپ کی کسی تخلیق کا قومی زبان میں ترجمہ ہوا ہے؟:۔ جی نہیں ویسے قومی زبان میں میں نے طبع زاد مضامین اور کہانیاں لکھی ہیں۔

۷۱۔ آپ کو اپنی تصانیف پر اندازاً کتنے فیصدی منافع حاصل ہوتا ہے؟:۔ ابھی تک میری تین کتابیں (۱) آواز نما، ریڈیو ڈراموں کا مجموعہ (۲) باغ فکر معروف بہ مقطعات نسائخ اور (۳) پیکرِ آواز (ریڈیو اور اسٹیج ڈرامے) شائع ہوئی ہیں۔ لیکن میں نے یہ کتب تجارتی نقطۂ نظر سے نہیں چھاپیں بلکہ کتابیں زیادہ سے زیادہ تبصروں اور لائبریریوں کو پہنچائیں اور احباب کو تقسیم کیں تھوڑی بہت فروخت بھی ہوئیں لہٰذا منافع کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۷۲۔ کیا آپ کو کتابوں کی رائلٹی وغیرہ ملتی ہے؟:۔ جی نہیں۔

۷۳۔ ادبی مشاغل سے آمدنی مستقل ہے یا غیر مستقل؟:۔ میں اردو زبان میں لکھتا ہوں۔ صرف سرکاری جرائد ہی معاوضہ دیتے ہیں لیکن ان سرکاری پرچوں میں سال دو سال میں نمبر آتا ہے۔ بلکہ میں اردو زبان و ادب کی کتابوں کی خرید پر بلا مبالغہ ایک ہزار روپے سال خرچ کرتا ہوں۔

۷۴۔ غیر معمولی گرانی کے موجودہ دور میں آپ نے اپنی تصانیف شائع کرانے کے کیا ذرائع اختیار کئے ہیں اور وہ کونسی ایجنسیاں ہیں جو آپ کی اعانت کرتی ہیں؟

پہلی کتاب ''آواز نما'' میں نے خود پیسہ جمع کر کے شائع کی تھی۔ دوسری کتاب ''باغ فکر معروف بہ مقطعات نسائخ'' بھوپال بک ہاؤس کے اشتراک سے شائع ہوئی تھی اور تیسری کتاب ''پیکرِ آواز'' فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی (اردو) کے مالی اشتراک سے شائع ہوئی تھی۔

۷۵۔ آپ اندازاً دن میں کتنے گھنٹے لکھنے پڑھنے کا کام کرتے ہیں؟:۔ صرف تین گھنٹے۔

۷۶۔ اندازاً آپ کو ہر ماہ کتنے خط لکھنا پڑتے ہیں؟ تقریباً سو خط۔

۷۷۔ کیا آپ کو کبھی کسی قسم کا ادبی ایوارڈ ملا ہے تو کس تصنیف پر وہ کونسی ادبی انجمن ہے جس نے

آپ کو یہ اعزاز بخشا؟:۔ مجھے میری پہلی تصنیف ''آوازنما'' پر جو ریڈیو ڈراموں کا مجموعہ تھا اس کتاب پر یو۔پی۔اردو اکاڈمی سے ایک ہزار روپے کا انعام ملا تھا۔

۷۸۔ کیا آپ کو کسی قسم کا وظیفہ ملتا ہے؟:۔ جی نہیں

۷۹۔ آپ کا مکان ذاتی ہے یا کرایہ کا؟:۔ میں اندور میں کرائے کے مکان میں رہتا ہوں لیکن بھوپال میں میرا آبائی مکان ہے۔

۸۰۔ آپ کس قسم کے مکان میں رہنا پسند کرتے ہیں اندازاً اس میں کتنے کمرے ہونے چاہیئے؟

میں ایسی جگہ رہنا پسند کرتا ہوں جہاں شور شرابانہ ہو سکون کی جگہ ہو۔ چاہتا یہ ہوں ایک کمرے میں میری لائبریری ہو، ایک کمرہ مہمان کے لئے ہو اگر کوئی باہر سے آجائے تو آرام سے قیام کر سکے۔ اور دو تین کمرے ایسے ہوں جن میں گھر کے افراد رہ سکیں اور انھیں مجھ سے میری مہمانوں سے میری لائبریری سے کوئی تکلیف نہ ہو۔ کم از کم چار پانچ کمروں کے مکان کا خواب دیکھتا ہوں۔

۸۱۔ آپ کے نزدیک مشاعروں اور ادبی محفلوں سے اردو کے فروغ کے کیا امکانات ہیں؟

اردو کے فروغ میں مشاعروں اور ادبی بزم ائم محافل نے خاصہ اچھا رول ادا کیا ہے۔ لیکن ادھر کچھ عرصے سے مشاعروں کا معیار گرتا جارہا ہے۔ ہمارے یہاں دو قسم کے شاعر پیدا ہو رہے ہیں ایک تو صرف ادبی دوسرے عوامی۔ ان عوامی شاعروں میں مترنم شاعروں، گلے بازوں کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔ آج کل شاعروں کا وہی کلام مقبول ہوتا ہے جس میں عشقیہ جذبات کو پھوہڑ پن سے پیش کیا گیا ہو۔ مشاعرہ اب نوٹنکی ہو گیا ہے اور ایک بات اور وہ یہ کہ ابھی تک آپ غزل سنتے تھے اب آپ مشاعرہ میں غزل دیکھ بھی سکتے ہیں۔ ادھر جو شاعرات کا سیلاب آیا ہے اس میں کافی شاعرات تو ایسی ہیں جو شاعرہ کہلانے کی مستحق نہیں ہیں۔ ان کے اساتذہ انھیں کلام دیتے ہیں وہ اپنی خوش گلوئی سے آپ ہم تک پہنچا دیتی ہیں۔ بہت سے شاعر اپنی بیٹیوں کو اسٹیج پر پیش کر رہے ہیں اور یہ خالص تجارتی نقطۂ نظر سے مشاعرے پڑھتی ہیں۔ بیشتر شاعرات کی میں نے بیاضیں دیکھی ہیں جن میں اُن کی تخلیقات ہندی میں لکھی ہوتی ہیں اور ہندی بھی صحیح نہیں لکھی ہے۔ مشاعرہ اردو زبان وادب کے فروغ کا ایک اچھا ذریعہ ہے لیکن جس طریقے سے وہ پیش کیا جارہا ہے وہ بہت غلط طریقہ ہے اس میں اصلاح کی ضرورت ہے۔

ادبی بزم ائم ومحافل بہت بنتی ہیں لیکن لوگوں کو عہدوں سے زیادہ دلچسپی رہتی ہے۔

تقاریب میں فوٹو میں اگر کسی رکن کی شمولیت نہیں ہوگی تو وہ خفا ہو کر بزم سے استعفیٰ دے دے گا اور جواب میں اپنی دوسری بزم کا اعلان کر دیگا۔ زیادہ تر تو بزائم میں شعر خوانی ہی ہوتی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیئے کہ شاعری کے علاوہ نثری تخلیقات وغیرہ بھی پڑھنے اور پڑھی چیزوں پر تبادلۂ خیال ہونا چاہیئے۔ جب تک اردو زبان و ادب کے خادم، بزائم و محافل کے اراکین، عہدوں کے پیچھے دوڑتے رہیں گے، جذبۂ خدمت اور اصل مقصد ان سے دور ہوتے جائیں گے۔ شہر میں اگر کوئی شخص کسی پروجیکٹ (PROJECT) پر تحقیقی کام کر رہا ہے تو چاہیئے کہ اسے لوگ تعاون دیں تا کہ اس کے شہر سے یا صوبے سے ایک اچھا کام منظرِ عام پر آسکے۔

بہر کیف مشاعروں اور ادبی محفلوں میں جو غیر اردو داں شرکت فرماتے ہیں وہ اردو زبان و ادب سے کافی متاثر ہوتے ہیں۔ جب ہم ایمانداری سے کوئی کام کریں گے بے لوث خدمت کریں گے تو یقیناً ایک بڑا حلقہ ہماری خدمت سے متاثر ہوگا اور اردو زبان و ادب کے لئے اچھے امکانات پیدا ہو سکیں گے۔

۸۲۔ اپنی مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصنیفات کا ذکر کیجئے:۔

میری مطبوعہ کتابوں کی فہرست درج ذیل ہے۔

الف۔ آواز نما (ریڈیو ڈراموں کا مجموعہ) ۱۹۷۵ء یو۔پی۔ اکادمی سے انعام یافتہ۔

ب۔ باغِ فکر معروف بہ مقطعاتِ نساخ (عبدالغفور نساخ کے ایک شعری مجموعے کو اپنے مقدمے کے ساتھ ترتیب دیا ۱۹۷۷ء میں۔)

ج۔ پیکرِ آواز (ریڈیو اور اسٹیج ڈراموں کا مجموعہ) ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔

غیر مطبوعہ کتب کی فہرست درج ذیل ہے:۔

(۱) زخموں کے دریچے۔ (افسانوں کا مجموعہ) (۲) شکایتاً عرض ہے (طنزیہ و مزاحیہ مضامین)
(۳) ابراہیم یوسف، ایک مطالعہ (۴) مدھیہ پردیش میں امیر مینائی کے تلامذہ۔
(۵) مدھیہ پردیش میں داغ دہلوی کے تلامذہ (۶) مدھیہ پردیش کے ہندو شعراء۔
(۷) مدھیہ پردیش کے افسانہ نگار (۸) مدھیہ پردیش کے اخبار و رسائل
(۹) مدھیہ پردیش کی خواتین قلم کار (۱۰) اجین میں اردو (۱۱) مدھیہ پردیش میں اردو۔
(۱۲) متاعِ رفتہ (مرحوم شعرا و ادباء کے خطوط) (۱۳) اردو میں انٹرویو نگاری۔
(۱۴) روبرو (بھوپال کے شعرا و ادباء کے انٹرویو (۱۵) فلموں کی ترقی میں اردو کا حصہ

۸۳۔ آپ کے نزدیک اردو کا مستقبل روشن ہے یا تاریک؟ اس کے روشن یا تاریک ہونے کے کیا اسباب ہیں؟

میں تو اردو کے مستقبل سے مایوس ہوں کیوں کہ ہم لوگ اپنے بچوں کی اردو تعلیم کی طرف سنجیدگی سے توجہ نہیں دے رہیں ہیں۔ بیشتر مسلمانوں کے گھر ایسے ہیں جہاں اردو تعلیم کا کوئی سلسلہ نہیں ہے۔ اگر اس کے لئے انھیں آمادہ کیا جائے تو وہ کہتے ہیں کہ اردو میں (Scope) اسکوپ نہیں ہے۔ اسکوپ تو کسی زبان میں نہیں ہے۔ اسکوپ ہے تو سرٹیفکیٹ، ڈگری اور ڈپلوما میں۔ فرض کیجئے ایک شخص ہے اس کی ہندی میں قابلیت اعلیٰ درجہ کی ہے تو کیا وہ سرکاری ملازمت حاصل کرے گا، جی نہیں اس کے پاس ہائر سیکنڈری پاس، بی اے پاس، ایم اے پاس کی سند ہے تو اس بناء پر اسے نوکری ملے گی۔ یہی حال اردو کے ساتھ ہے تو پھر مسلمان اردو کی طرف کیوں متوجہ نہیں ہوتے میں نے تو ریوا میں یہاں تک دیکھا ہے کہ بی۔ اے۔ کے اردو طلباء اردو کے نوٹس ہندی میں لکھتے ہیں۔ بہت سے اردو اساتذہ ایسے ہیں جو اپنے بچوں کو انگریزی میڈیم میں تعلیم دلا رہے ہیں لیکن اردو نہیں پڑھا رہے ہیں۔ بلکہ یہ اردو اساتذہ اردو میڈیم کی مخالفت بھی کر رہے ہیں۔ بھوپال میں سرکاری کالجوں کے کچھ اساتذہ کا یہی رویہ ہے۔

بچوں میں اردو کا رجحان کم ہونے کے دیگر اسباب میں ہماری غفلتیں بھی ہیں ہم لوگ ہندی اور انگریزی اخبار تو لگا لیتے ہیں کیا یہ نہیں کر سکتے کہ ایک اخبار اردو کا بھی گھر میں آتا رہے کہ کسی بہانے بچوں کی نظر بھی اردو اخبار پر پڑتی رہیگی اور آہستہ آہستہ ان میں اردو سے دلچسپی پیدا ہو جائے گی۔ بزائم، محافل اور اردو انجمنیں وغیرہ شروع میں چھوٹے پیمانے پر ایسے مقابلے منعقد کریں جیسے کہ ابتدائی درجوں میں جس طالب علم کے اردو میں سب سے زیادہ نمبرات ہوں گے اسے انعامات سے نوازا جائے گا۔ انعامات میں بچوں کو ایسی ویسی چیزیں دینے کے بجائے دلچسپ کتابیں دی جائیں۔ امتحانات کے زمانے میں اردو داں حضرات، اردو طلباء کی رہنمائی کریں، طلباء کو اردو نوٹس لکھوائے جائیں انھیں معنی و مفاہیم سمجھائے جائیں۔ تعطیلات میں بچوں کا مشاعرہ بیت بازی اور اردو معلومات عامہ کے مقابلے رکھے جائیں۔ ویسے تو بہت سی تجاویز ہیں لیکن ان کاموں کے لئے سنجیدہ لوگوں کی ضرورت ہے۔

اپنے اپنے محلوں میں سرکاری اردو لائبریری کا اہتمام کیا جائے۔ اپنے لیٹر پیڈ اردو

میں بھی چھاپے جائیں اپنے مکان پر اپنے نام کی اردو میں بھی نیم پلیٹ لگایئے۔ اگر آپ اردو کے لئے قربانی دے سکتے ہیں تو یقیناً اردو کا مستقبل روشن ہو سکتا ہے ورنہ تاریک ہی ہے۔

آج کل ہر صوبے میں اردو اکاڈمیاں قائم ہو رہی ہیں۔ اکاڈمیاں اندھادھند کتب شائع کر رہی ہیں، ویکلوں کے کے لئے آزوقۂ حیات تیار ہو رہا ہے۔ شاعروں ادیبوں کو مالی تعاون کے بہانے شراب نوشی اور قمار بازی کے لئے رقوم منظور ہو رہی ہیں لیکن اردو کو اس سے کیا فائدہ۔ جب تک بچوں کو نصاب میں اردو نہیں پڑھائی جائے گی، اردو کا فروغ نہیں ہوگا اس وقت تک ان کتابوں کی اشاعت اور شاعروں ادیبوں کی امداد بے کار ہے۔ جب اردو داں ہی نہیں ہوں گے تو ان کتابوں کو کون پڑھے گا۔
مدھیہ پردیش اردو اکادمی گانے بجانے کا بھی پروگرام منعقد کرتی ہے (شاید وہ مستقبل میں کوئی رقص کا پروگرام بھی منعقد کرے) لیکن اس کے دماغ میں یہ بات نہیں آتی کہ وہ اپنا ایک اردو پریس قائم کرے تاکہ اپنی کتابیں خود چھاپ سکے جب پریس قائم ہوگا تو دوسرے لوگوں کو جو اردو داں ہیں ان کو بھی کچھ ملازمت کے مواقع حاصل ہوں گے۔
اردو کے نام پر اول تو سرکار دیتی ہی کیا ہے اور جو کچھ مل رہا ہے اس کا ہم آپ بہتر طور پر استعمال نہیں کر رہے ہیں۔

۸۴۔ نثری نظموں، تجریدی آرٹ، علامتی ادب و شاعری نظم آزاد و شعراء کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

کسی بھی شعبے میں جمود، ارتقاء کو روکتا ہے۔ اگر اردو ادب میں صحت مند اور با مقصد ادب تخلیق ہو رہا ہے تو ہمیں ان تجربات سے فائدہ اٹھانا چاہیئے اور ان فن کاروں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے جو ادب میں ان تجربوں کے لئے کوشاں ہیں۔ ادب دراصل سماج کی تاریخ بھی تو ہے لہٰذا سماج میں جو خوشگوار اور ناخوشگوار تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں ادب ان سے متاثر ہوتا ہے تو پھر ہم نئے تقاضوں نئے میلانات سے ہم آہنگ نہ ہوں یہ کیسے ممکن ہے۔ ان نئے تجربات کو ہمیں اپنی زبان کے علاوہ ہم عصر زبانوں میں بھی ہو رہے تجربات سے واقفیت رکھنی چاہیئے۔ بہر کیف ادب میں جو نئے تجربے ہو رہے ہیں یا نئی اصناف تشکیل پا رہی ہیں ان کا استقبال کرنا چاہیئے۔

۸۵۔ وہ کون سے مزاحیہ شاعر و ادیب ہیں جنھوں نے آپ کو بہت متاثر کیا ہے؟

اکبرالہ آبادی نہ صرف یہ کہ مجھے پسند ہیں بلکہ انھوں نے مجھے متاثر بھی کیا ہے۔ نثر نگاری میں کرشن چندر، پطرس بخاری اور کنہیالال کپور کی مزاحیہ تخلیقات نے متاثر کیا ہے۔

۸۶۔ غزل کا مستقبل روشن ہے یا تاریک اس کے فروغ کے کیا ذرائع ہیں؟

غزل اردو ادب کی ایک محبوب، مقبول عام اور ہر دلعزیز صنف ہے غزل پہلے بھی مقبول اور مستقل صنف تھی، آج بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ غزل کی پسندیدگی ہی نے اردو زبان و ادب کو مزید متعارف کرایا ہے اور یہ تعارف اس درجہ دلچسپ دلکش اور متاثر کن ہے کہ اب یہ صنف ہندی ادب اور مراٹھی ادب میں بے انتہا مقبول ہو رہی ہے۔ ہندی جرائد نے غزل پر خصوصی اشاعتیں نکالی ہیں۔ کوی سمیلنوں میں غزل "ان کی" تقریب کی کامیابی کی ضامن ہے۔ اور کوی سمیلن کی "بہار" ہے۔ غزل کا مستقبل بہت روشن ہے۔ "غزل" تو خود ایک خوشبو ہے ہم آپ اس میں "فروغ" اور ذرائع" کے کیا پر لگا سکیں گے۔"

۸۷۔ اُردو تھیٹر کا مستقبل، منظوم ڈرامے 'نئی کہانیاں' فلم بحیثیت تخلیقی آرٹ ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

اردو میں تھیٹر اور ڈراما دونوں سنجیدگی کے طالب ہیں آپ دیکھئے کہ 'بنگالی' مراٹھی، گجراتی اور ہندی زبانوں کے اپنے تھیٹر ہیں جب ان کے پاس یہ ذریعہ ہے تو ان کے یہاں ترقی کیوں نہیں ہوگی۔ اردو میں ڈراما کم سے کم لکھا جا رہا ہے اور منظوم ڈراما تو برائے نام۔ بعض ڈراما نگاروں کے ساتھ یہ دشواری اور کمی ہے کہ وہ شاعر نہیں ہیں اگر ان کے دل میں منظوم ڈراما لکھنے کی خواہش انگڑائی لے رہی ہو تو پہلے انہیں "شعر پری" کو اپنے قلب و ذہین کی بوتل میں اتارنا ہوگا اور یہ امر محال ہے اور جو اکتسابی یا وہبی شاعر ہیں وہ صرف شاعری کر لینا ہی ادب کی خدمت سمجھتے ہیں انہیں چاہئے کہ وہ منظوم ڈرامے کی طرف توجہ فرمائیں۔

اردو میں سب سے زیادہ شاعری ہی پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ اگر اس کے بعد کچھ خدمت ہوتی ہے تو افسانے" کی۔ ادھر افسانے میں بھی نئے تجربے ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں لیکن ان کی رفتار اطمینان بخش نہیں ہے۔ اردو جرائد میں نئی کہانیوں کے لیے آہستہ آہستہ گنجائش نکل رہی ہے۔ ماہنامہ کتاب لکھنو نے اکثر افسانے پر اچھا مواد اور بحث کا اہتمام کیا تھا۔ اس کی کمی بہر کیف ایک بڑی کمی ہے۔ "الفاظ" علی گڑھ نے بہت کم

وقت میں افسانے پر اچھے مواد پیش کیے ہیں اور کر رہا ہے۔ اردو میں کہانی اور نئی کہانی کی رفتار سست یوں بھی ہے کہ اس صنف پر سمپوزیم، سیمنار وغیرہ بہت کم ہوتے ہیں اور کہانی نگاروں کو شاعروں کے مقابلے میں مواقع بہت کم ملتے ہیں۔ میں ایک بات اکثر محسوس کرتا ہوں کہ مشاعروں اور شعری نشستوں میں ان سامعین حضرات کی تعداد بھی زیادہ ہوتی ہے جو کہ ناخواندہ بھی ہوتے ہیں یا کم پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔ لیکن شامِ افسانہ یا شب افسانہ جیسی نشستوں میں ان حضرات کی بھی شمولیت نہیں ہوتی۔ اس کی نشست میں پڑھا لکھا ہی دلچسپی لیتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ نہایت معمولی پڑھا لکھا شخص شاعری کر لیتا ہے لیکن افسانہ نگار کو اس سے اونچا اٹھنا پڑتا ہے تاہم شاعر کے آگے اسے کم مواقع حاصل ہیں۔ افسانہ نگاروں کی بھی خاطر خواہ پذیرائی ہونی چاہیے تاکہ انہیں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کا ماحول مل سکے۔ ادھر کچھ عرصے سے اردو میں بھی منی کہانیوں کا سلسلہ چل رہا ہے لیکن ہمارے جرائد نے فراخدلی سے نہ تو اس کا ابھی خیر مقدم کیا ہے اور نہ ہی اس پر مضامین نگاروں اور نقادوں نے قلم اٹھائے ہیں مجھے منی کہانیوں سے خصوصی دلچسپی ہے اور چاہتا ہوں کہ منی افسانوں، منی کہانیوں کے سلسلے میں کچھ کر سکوں۔

جی ہاں ہندوستان میں اب سے کچھ پہلے تک فلم محض تفریح کا ایک ذریعہ تھا۔ لیکن آج یہی فلم ہماری ضرورت کا ایک اہم حصہ بنتا جا رہا ہے۔ بعض اچھے ادیب و شاعر اور صحافی فلموں سے وابستہ ہو گئے ہیں اور اپنی تخلیقات کو بذریعہ فلم منظر عام پر لا رہے ہیں۔ فلم موجودہ دور کا ایک ''پاورفل میڈیم'' ہے اور جن تخلیق کاروں کے پاس کچھ ذرائع ہیں وہ ان سے اپنے خیالات نظریات اور احساسات کی ترسیل بھی کر رہے ہیں اور مالی منفعت بھی حاصل کر رہے ہیں۔

فلم کی مقبولیت اور اس کی صنعت میں ترقی کو دیکھتے ہوئے پونا یونیورسٹی نے اس کو شامل نصاب کر لیا ہے۔ یہ ایک اچھا سلسلہ ہے۔

۸۸۔ آپ کس قسم کے افسانے پسند کرتے ہیں؟۔ اور وہ کون لوگ ہیں جن کے افسانوں سے آپ بیحد متاثر ہوئے ہیں؟ نشاندہی کیجئے ان اقتباسات کی جو سرمایہ ہیں:۔ میں کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، منشی پریم چند اور احمد ندیم قاسمی سے متاثر ہوں مجھے وہ افسانے پسند ہیں جن میں حقیقت کا عنصر ہو یا جسے عقل تسلیم کرتی ہو اور وہ افسانہ اپنا واقعہ معلوم ہو۔

۸۹۔ کسی غیر ملکی زبان کے مضمون اور ان کے مضامین کا بھی ذکر کیجئے۔

میں غیر ملکی زبانیں نہیں جانتا۔ انگریزی زبان میں بہت معمولی شُدبُد ہے اس بنا پر اپنی کسی قدر ضرورت پوری کر لیتا ہوں۔ جس زبان میں یا جن زبانوں میں آپ اپنے جذبات کا اظہار بہتر طور پر ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں میں اس زبان سے اس کی واقفیت سمجھتا ہوں۔

۹۰۔ متاخرین شعرا میں سے بہت سے حضرات سے خط کتابت رہی ہے۔ باہر جا کر ان سے ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہو سکا۔ بھوپال میں علامہ محوی صدیقی سے دو ایک ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ مرحوم سے ایسے وقت میں ملاقاتیں ہوئیں جب کہ وہ ان کا آخری وقت تھا۔ بس ان سے کچھ رسمی باتیں ہی ہو سکیں۔ بھوپال کے مقبول اور مرحوم شاعر تاج بھوپالی سے اکثر ملاقاتیں ہوئی ہیں ان کی زندگی میں ان سے دو ملاقاتیں ہوئی ہیں جو کہ فلم ویکلی کلکتہ اور کتاب نما دہلی میں شائع ہوئی تھیں۔ مرحوم کو مولانا سہا مجددی (شارح دیوانِ غالب) کے بہت سے لطائف یاد تھے میں نے ان سے کہا کہ آپ یہ لطائف مجھے نوٹ کرا دیجئے میں کوئی مضمون یا کتابچہ شائع کروں گا۔ تو تاج صاحب نے کہا تھا کہ میں خود ان لطائف کو کتابی شکل دوں گا۔ لیکن افسوس کہ وہ اور بہت سے ضروری کاموں کی طرح اس کام کو بھی انجام نہیں دے سکے۔ اور انتقال فرما گئے۔ میں ۱۹۷۷ء سے ۳۰ رجون 1981ء تک آل انڈیا ریڈیو ریوا میں رہا، یکم جولائی ۱۹۸۱ء سے تا حال اندور میں ہوں یہاں حضرت نشتر اندوری، حضرت قیصر اندوری، حضرت ساغر چشتی اُجینی، حضرت رونق اندوری اور حضرت شیث ادیبی سے اکثر ملاقاتیں رہیں۔ پُر خلوص شخصیات تھیں حضرت راحت اندوری سے بھی دو تین ملاقاتیں ہوئی ہیں۔

۹۱۔ دوست احباب وان کا تذکرہ:۔ دوست تو صرف ایک ہیں سیّد امجد علی بھوپال میں ہیں ویسے ملاقاتی، شناسا، واقف کار سیکڑوں ہیں۔

۹۲۔ آپ کے شہر میں متاخرین شعراء ادباء اگر مدفون ہوں تو ان کا ذکر کیجئے۔

میرا وطن بھوپال ہے، بھوپال میں ہی خاصا وقت گزرا ہے اب ۱۹۷۷ء سے بھوپال سے باہر ہوں۔ بھوپال میں ہندوستان گیر شہرت یافتہ عالم، شاعر، ادیب اور مورّخ رہے ہیں اور بھوپال میں دفن ہوئے ہیں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری بھوپال میں دفن ہیں۔ غالب کے کچھ شاگرد بھوپال میں دفن ہیں۔ اس طرح داغؔ و امیرؔ کے تلامذہ بھی۔

اندور میں غریق خیرآبادی، شاداں اندوری، نشتر اندوری، قیصر اندوری، رونق اندوری،

کاشف اندوری، شیث ادیبی اندوری وغیرہ دفن ہیں۔

۹۳۔ جن شعراء وادباء سے آپ بہت زیادہ متاثر ہوئے ہیں ان کے اسماء گرامی۔

مرحوم شعراء میں غالب اور داغ سے ان کے بعد ساحر، مجاز اور بشیر بدر وغیرہ سے ادیبوں میں کرشن چندر سے اور پریم چند سے متاثر ہوں۔

۹۴۔ آپ کس قسم کی تعلیم اپنے بچوں کو دینا پسند کرتے ہیں اور کیوں؟

میں مذہباً مسلمان ہوں ایک علمی مسلمان خاندان میں پیدا ہوا ہوں۔ لہذا میں چاہوں گا کہ میرے بچے بھی اسلام سے واقف ہوں اور بہتر مسلمان اور بہتر انسان اور بہتر ہندوستانی بنیں۔ میں چاہونگا کہ میرے بچے دینی تعلیم ضرور حاصل کریں اور اس تعلیم کو وہ اپنی شخصیت کا ضروری حصہ بنائیں۔ میری خواہش ہے کہ میرے بچے دنیا کی بر ترقی یافتہ زبان سے واقف ہوں۔ بالخصوص اردو سے ضرور واقف ہوں اردو سے واقفیت اس لئے کہ اب جو کچھ ہمارا مذہب ہے وہ اردو میں ہے اس لئے اردو زبان میں ہمارا مذہبی، تہذیبی اور ثقافتی سرمایہ ہے اس کا تحفظ ضروری ہے۔

۹۵۔ کیا آپ اسے پسند کرتے ہیں کہ آپ کے بچے ادیب یا شاعر ہو کر قوم وملت کی خدمت کریں؟:۔ کاش ایسا ہو سکے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ شاعر کا بیٹا شاعر ہو ادیب کا بیٹا ادیب ہو، میں بچے کو اس کے رجحان، لگن اور جذبے کے تحت تعلیم وتربیت دینا چاہتا ہوں۔ میری ایک بچی فرحانہ خاتون کو کتابوں سے دلچسپی ہے۔ شاید وہ مستقبل میں اس دلچسپی کو قائم رکھ سکے۔

۹۶۔ آپ ادب میں کس تصور حیات کو غالب دیکھنا چاہتے ہیں؟

میں ادب میں اس تصور حیات کا قائل ہوں جس میں صداقت، انصاف اور احساس کا عنصر غالب ہو۔

۹۷۔ کیا آپ کے خاندان میں کوئی اور ادیب یا شاعر یا فن کار رہا ہے تو ان کا تفصیل سے ذکر کیجئے اور ان کی تصانیف سے بھی آگاہ کیجئے۔

میرے خاندان کی کچھ بزرگ خواتین جو قدرے عربی اور اردو سے واقف تھیں اور کچھ حیات ہیں انہوں نے میرے پوچھنے پر بتایا تھا کہ منشی جمال الدین گمنام جو کہ ریاست بھوپال میں "مدار المہام" تھے، انھوں نے مومن کی تجویز پر گمنام تخلص اختیار کیا تھا۔ وہ غالب اور ذوق کے دوستوں میں سے ایک تھے۔ منشی جمال الدین گمنام بھوپال کی بہت

ہی ہر دلعزیز شخصیت رہے ہیں وہ نواب صدیق حسن خاں آف بھوپال کے پہلے خسر بھی تھے۔

نواب صدیق حسن خاں نے دوسری شادی نواب شاہجہاں بیگم آف بھوپال سے کرلی تھی۔

مولوی جمال الدین خاں گمنام کی تصنیفات کا تو مجھے علم نہیں تاہم ان کی تصنیفات تالیفات تلاش کرر ہا ہوں۔

میری ایک پھوپھی، رابعہ بی جو کہ سہارن پور کے حکیم فضل عظیم صاحب مرحوم کی زوجہ ہیں انہوں نے خاندان کے بزرگوں کے اسمائے گرامی بتاتے ہوئے ڈپٹی (ڈاکٹر) نذیر احمد صاحب کی طرف بھی اشارہ کیا تھا۔ اب بھی خاندان کے بزرگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا تو تفصیل معلوم کروں گا۔

۹۸۔ آپ کو رفاہ عامہ کے کاموں سے کس حد تک دلچسپی ہے آپ نے کسی ایسے کام میں حصہ لیا ہے یا مالی مدد کی ہے جیسے اسکول، کالج یا اور کسی قسم کا ادارہ؟

ابھی تک تو ایسا اتفاق نہیں ہوا ہے۔ وقتاً فوقتاً کچھ کتابیں ضرور بھوپال، اُجین اور کھر گون سیہور کی لائبریریوں میں بطور عطیہ دی ہیں۔ اندور میں جہاں میں رہتا تھا آزاد نگر (آزاد نگر ریزیڈنگر) وہاں ایک لائبریری بنانے کا منصوبہ ہے۔ اپنی جانب سے کافی کتابیں پیش کرنے کی خواہش کا اظہار کر چکا ہوں۔

۹۹۔ غزل کے اپنی پسند کے پانچ اشعار تحریر فرمایئے۔

۱۔ اس درجہ ہو چکے ہیں پشیمانِ آرزو۔ جی چاہتا ہے کوئی تمنا نہ کیجیے (دانش اندوری)

۲۔ پڑے ہیں صورتِ نقشِ قدم نہ چھیڑ ہمیں۔ ہم اور خاک میں مل جائینگے اٹھانے سے

(وحید الہ آبادی)

۳۔ چوم لے میری بھیگی پلکیں / رخصت ہوتا لمحہ ہوں (مصحف اقبال توصیفی)

۴۔ پھیل جاؤں گا تیرے جسم میں خوشبو بن کر / شاخِ گل کی طرح اپنے پر جھکا لے مجھکو

(ندرت رتلامی)

۵۔ اگر کچھ تھی تو بس یہ تھی تمنا آخری اپنی / کہ وہ ساحل پہ ہوتے اور کشتی ڈوبتی اپنی

(شعری بھوپالی)

۱۰۰۔ اور اسی طرح نظم کے بھی اشعار لکھیں۔

۱۔ ہلا دیتا ہے جو ہر قلعہ ظلمت کی بنیادیں — مجھے وہ نعرۂ تکبیر بن جانا بھی آتا ہے۔
نظم "اے مرد مسلماں ماضی کی طرف دیکھ" از نازش پرتاپ گڈھی۔

۲۔ اگر منظور ہے یونہی تری شانِ مشیت کو۔ — تو اب شکوہ سرائی سے بھی ہم دامن کشاں ہوں گے
• از نظم 'فریادِ ملت'۔ نازش پرتاپ گڑھی

۳۔ نغمہ و ساز کے زیور سے رہے تیرا سنگار — ہو تری مانگ میں ترے ہی سروں کی افشاں
تیری تانوں سے تری آنکھ میں کاجل کی لکیر۔ — ہاتھ میں تیرے ہی گیتوں کی حنا ہو رخشاں
(از نظم "لتا منگیشکر کے نام" از مجروح سلطان پوری)

۴۔ مرے پلنگ پہ بکھری ہوئی کتابوں کو — ادائے عجز و کرم سے اٹھا رہی ہو تم
سہاگ رات جو ڈھولک پہ گائے جاتے ہیں — دبے سُروں میں وہی گیت گا رہی ہو تم
تصورات کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں
• نظم 'پرچھائیاں' از ساحر لدھیانوی

روح بے چین ہے اک دل کی اذیت کیا ہے ۔ دل ہی شعلہ ہے تو یہ سوز محبت کیا ہے
وہ مجھے بھی بھول گئی اس کی شکایت کیا ہے ۔ رنج تو یہ ہے کہ رو رو کے بھلایا ہوگا
• نظم "اندیشے" از کیفی اعظمی

۱۰۱۔ اپنی تحریر میں ایک غزل عنایت فرمائیں۔
استاذی حضرت عشرت قادری کی ایک غزل موصوف کے پہلے شعری مجموعے سحرتا (ص ۸) سے نقل کر رہا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

غزل

نہ کوئی عکس، نہ منظر، نہ خواب آنکھوں میں — ہر ایک شے ہے جہاں کی سراب آنکھوں میں
بچھڑ کے اس نے کیا ریزہ ریزہ آئینہ — وہ ایک شخص کہ تھا انتخاب آنکھوں میں
جو تو نہیں ہے تو خاک اڑ رہی ہے چاروں طرف — گئے وہ دن کہ کھلے تھے گلاب آنکھوں میں
پھر آئی شام وہ یادوں کے قافلے اترے — تمام شب ہے سفر کا عذاب آنکھوں میں
لبوں سے حرفِ تمنا ادا ہوا بھی نہ تھا — سمٹ کے آ گیا سارا حجاب آنکھوں میں
• عشرت قادری

۱۰۲۔ اپنی ایک تصویر بھی عنایت کیجئے۔ پیش نظر مسودہ کے ساتھ روانۂ خدمت ہے۔

۱۰۳۔ اپنی زندگی کے چند ایسے تجربات تحریر کریں جس سے نئی نسلیں استفادہ کر سکیں۔
میرے مزاج میں بچپن سے خودداری رہی۔ کبھی کسی شخص سے حسد نہیں کیا۔ عام طور پر میرے حلقۂ احباب میں جن باتوں کے لئے "ناممکنات" یا بہت دشوار" کہا گیا میں نے ان کاموں کو شروع کیا اور الحمدللہ خاصی کامیابی حاصل کی۔ مجھے قرض لینے سے سخت نفرت ہے۔ اپنی ضروریات اور خرچ اپنی حیثیت کے مطابق ہونا چاہیے۔ ہمیں دوسروں کی نقل نہیں کرنی چاہیئے بلکہ دوسرے ہماری نقل کریں۔ میں قسمت کو سب کچھ نہیں سمجھتا ہوں بلکہ تدبیر کو پسند کرتا ہوں۔ مسلسل تدبیر سے تقدیر بدل جاتی ہے۔ الحمدللہ خدا اور رسولؐ پر میرا کامل ایمان و یقین ہے لہٰذا حق بات کہنے کا اور صاف بات کرنے کا قائل ہوں۔ نقصانات اور برائی ہو تو ہوا کرے اسے برداشت کرتا ہوں۔ مجھے ایسی باتوں سے نفرت ہے کہ کسی قوم ، فرقے یا اس کی زبان کی بُرائی کی جائے اور خود کو دوسرے سے افضل و اعلیٰ سمجھا جائے۔ اگر کسی شخص سے کچھ اختلاف ہو جائے تو میں دو ایک بار اسے مطمئن کرنے اور اس نے میرے بارے میں جو رائے قائم کی ہے اس کی رائے کو تبدیل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر وہ رائے تبدیل نہیں کرتا تو میری بلا سے پھر میں ایسے شخص سے تا عمر بات کرنا پسند نہیں کرتا۔ افسوس کے لوگ اپنی غلط بات منوانے کے لئے مصر ہوتے ہیں اور اچھی اور صحیح بات کو قطعی تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ مجھے اپنے اصول پر قائم رہنے کی ضد نہیں ہے لیکن میرے اصول غلط نہیں ہیں۔ میں کسی کام یا سہولت حاصل کرنے کے لئے ایک دو بار گذارش تو کر سکتا ہوں لیکن خوشامد یا اس شخص سے بار بار کہنا پسند نہیں کرتا۔ اس سلسلے میں مجھے جن صدمات اور نقصانات کا سامنا کرنا ہوتا ہے وہ میری قربانیاں ہیں۔ مجھے اساتذہ عالموں اور فن کاروں کی خدمت کر کے کچھ فن حاصل کرنے میں بہت لطف آتا ہے گویا صدقِ دل سے عبادت کی اور خدا نے اس کا بہتر عوض دیا۔

۱۰۴۔ دوست احباب کی مجلسوں کا کوئی لطیفہ:۔ مجھے لطیفے سننے اور سنانے سے بہت دلچسپی ہے موقع محل کی مناسبت سے میں بھی لطیفہ سازی کر لیا کرتا ہوں۔ بالعموم حاضر جوابی اور برجستہ گوئی بھی لطیفے کا مزا اور لطیفے کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ روز ہی کوئی لطیفہ یا لطیفہ نما بات ہو جاتی ہے۔ کس کس کا ذکر کیا جائے۔ آج ہی کی بات ہے کہ میں دفتر کے کیشیئر کے پاس اپنے بونس کی رقم لینے گیا وہ موجود نہیں تھا۔ میں اس کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ آ گیا، کچھ گھبرایا ہوا تھا اس کے چہرہ پر کچھ پریشانی کے آثار تھے۔ میں نے اپنے بونس کی

رقم کا مطالبہ کیا تو وہ سن کر کہنے لگا ''کا ہے میں لوگے؟'' قبل اس کے کہ میں اس سے کہتا ''بھئی کیا کہہ رہے ہو'' میں نے فوراً ہی کہا ''بورا تو لایا نہیں، ہاتھ میں ہی دے دو'' کیشیر کے علاوہ دیگر کلرک بے ساختہ ہنس پڑے۔

دفتر میں ایک صاحب دیوار سے ٹیک لگائے اطمینان سے کھڑے تھے۔ سائیکل سے اترتے ہوئے ان کے ایک دوست نے شکایتاً کہا ''کیا یار میں اجین میں تمھارے گھر آیا تھا تمھارے پتا جی نے کہا تم نہیں ہو''

''کون سے پتا جی۔؟'' دیوار سے ٹیک لگائے اس شخص نے حیرت سے پوچھا تو میں نے درمیان میں لقمہ دیا کہ یار تمھارے کتنے پتا جی ہیں؟ دو چار دوست جو وہاں کھڑے تھے اس شخص کی غائب دماغی سے بہت حظ اٹھایا۔

میں ایک دن آل انڈیا ریڈیو کی لائبریری میں کچھ اس طرح سے بیٹھا ہوا تھا کہ باہر سے آنے والے کی ایک دم مجھ پر نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔ ایک اناؤنسر اندرا مشرا آئیں اور ڈیوٹی روم کی سامنے والی کھڑکی میں رکھی صراحی میں سے گلاس میں پانی نکالنے لگیں پانی گلاس میں نہیں آیا، انھوں نے صراحی کو اور جھکایا پانی اب بھی باہر نہیں آیا میں اندر سے بیٹھا ہوا ان کی یہ کوشش دیکھ رہا تھا۔ غرض یہ کہ انھوں نے صراحی کو رکوع سے سجدے میں لا کر گلاس اس کے مُنہ کے پاس کر دیا۔ پانی اب بھی نہیں آیا تو کافی دیر بعد انھوں نے محسوس کیا کہ صراحی میں پانی بالکل نہیں ہے۔ وہ مایوس ہو کر واپس جانے لگیں تو اچانک ان کی نظر مجھ پر پڑ گئی تو وہ خفت مٹاتے ہوئے کہنے لگیں ''عابدی صاحب صراحی میں بالکل پانی نہیں ہے'' میں نے شرارتاً کہا ''دیکھیے چلّو بھر تو ہوگا'' وہ بے اختیار ہنستی ہوئی چلی گئیں۔

بیشتر خود ساختہ برجستہ لطائف ایسے ہیں کہ انھیں اگر میں جمع کروں تو ایک کتاب کی ضرورت پوری ہو جائے۔

۱۰۵۔ مزید اگر کسی قسم کی رائے دینا پسند کریں تو ضرور تحریر فرمائیں:۔

آپ کا سوالنامہ طویل ہوتے ہوئے بھی مزید سوالات کا متحمل ہے مثلاً آپ نے یہ سوالات قائم نہیں فرمائے۔

(۱) کیا آپ تجرّد کی زندگی گذار رہے ہیں کیوں؟

(۲) کیا آپ نے لَو میرج کی ہے، اور کیا یہ کامیاب ازدواجی زندگی ہے؟

(۳) کیا آپ نے عشق کیا ہے، کتنے عشق کیے ہیں؟

(۴) کیا بیوی کے ہوتے ہوئے آپ نے عشق کیئے ہیں؟

(۵) کیا آپ نے دو شادیاں کی ہیں؟ دو بیویوں کی کیوں ضرورت محسوس کرتے ہیں؟

۱۰۶۔ آپ کا مشورہ نئی نسلوں کے لئے مشعلِ ہدایت ثابت ہو اور میں آپ کے تعاون سے کوئی ایسا کام کر سکوں جو ادب کے لئے سرمایہ ہو سکے۔

اردو زبان بہت تیزی سے اور شعوری طور پر ختم کی جارہی ہے۔ اردو ایک زبان ہی نہیں بلکہ تہذیب ہے۔ افسوس کہ یہ تہذیب ختم ہو رہی ہے۔ اس کی بقاء اور فروغ کے لئے کوشش کیجئے۔ اردو کا کھویا ہوا وقار واپس لانے کی سعی کیجئے غیر اردو داں میں اردو کا شوق پیدا کیجئے۔ اردو شاعروں ادیبوں، صحافیوں کے خطوط فوٹو کتابیں اور خطاطی کے نمونے محفوظ کیجئے اور وقتاً فوقتاً ان کی نمائش کیجئے۔ ابھی بھی سیکڑوں گھر ایسے ہیں جہاں ہمارے اسلاف کے کارنامے دیمک کی نذر ہو رہے ہیں ان کی حفاظت ہمارا فرض ہے اور بھی سیکڑوں تجاویز ہیں۔ آپ حکم فرمائیں گے تو تحریر کروں گا۔ والسلام

آپ کا

محمد خالد عابدی

۱۔ موجودہ پتہ:۔ آل انڈیا ریڈیو، اندور

۲۔ مستقل پتہ:۔ ۵۳، ہوائل روڈ بھوپال

462001

جناب افتخار جلیل شوقؔ کی محمد خالد عابدی سے بات چیت

حال ہی میں جب اپنے وطن بھوپال میں اپنی خانگی مصروفیات کے سلسلے میں گیا اور وہاں اپنے کام کے بعد ادبی سرگرمیوں میں کئی بار ممتاز افسانہ نگار و ڈرامہ نگار جناب اقبال مجید صاحب جو آل انڈیا ریڈیو بھوپال میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں ان سے خصوصی انٹرویو لینے جانا ہوا تو میں نے ان کے علاوہ جناب محمد خالد عابدی صاحب سے ریڈیو پر ان کی اہم ذمہ داریوں، ادبیانہ مصروفیات وغیرہ پر ایک تفصیلی گفتگو بھی کی جناب محمد خالد عابدی ایک ممتاز ادبی انسان اور براڈکاسٹنگ لائن میں بھی گوناگوں مصروفیتوں کے علاوہ اچھے انسان ہیں۔ انھوں نے ریڈیو میں اپنی مصروفیات کے بارے میں تفصیل سے بتایا کہ ۱۹۷۷ء سے وہ آل انڈیا ریڈیو اور اندور میں اپنے نشریاتی فرائض انجام دے رہے ہیں اور ان دونوں مقامات پر انھوں نے بارہ سال کا عرصہ گذارا ہے اور ۸۹۔۱۹۸۸ء میں وہاں سے بھوپال ریڈیو پر تبادلہ کرا کے اب تقریباً پندرہ سال سے آل انڈیا ریڈیو اندور بھوپال سے منسلک ہیں اس سوال پر کہ انھوں نے ریڈیو پر کن حیثیتوں سے آج تک اپنے فرائض انجام دیئے ہیں، انھوں نے بتایا کہ اس پندرہ سالہ ریڈیو جیسے اہم ابلاغ میں سارے ہی شعبوں میں اپنی کارکردگی کا اظہار کر چکا ہوں اور آج خدا کا شکر ہے کہ میں آل انڈیا ریڈیو بھوپال پر پروڈکشن اسسٹنٹ ہوں۔

ابلاغ کے اس موثر ترین شعبہ میں اس وقت میرا کام اردو پروگرام تیار کرنا ہوتا ہے۔ اس میں بھی ہر قسم کے ادبی شعری تعزیتی و دیگر انٹرویوز وغیرہ پر مشتمل ہوتے ہیں۔ جہاں تک اس ابلاغ پر کام کا تعلق ہے تو ریکارڈنگ ایڈیٹنگ ڈبنگ اور پروڈکشن کرتا ہوں اس کے علاوہ اکثر ادبی پروگراموں کے سلسلے میں انٹرویوز کی ریکارڈنگ کے علاوہ سوانحی پروگرام بھی کرنا پڑتے ہیں آل انڈیا ریڈیو پر آنے سے قبل سے اور بعد میں بھی میں نے ریڈیو کے لئے بہت لکھا ہے اور کبھی کبھی تو شوق کی بناء پر معاوضہ کی پرواہ بھی نہ کی۔ ان میں ڈرامے، فیچر، مضامین۔ بچوں کے لئے کہانیاں وغیرہ بھی لکھیں پھر میرا سب سے مقبول فیچر پروگرام ہندوستانی فلموں کے ۷۵ سال ایک نہایت ہی پسندیدہ سلسلہ تھا۔ اس کے ساتھ نئی نسل کے لئے ایک کوئز فلمی پروگرام میں بھی بحیثیت کوئز ماسٹر

پروگرام دیتا رہا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اردو کے ساتھ ہندی میں پروگرام بھی کئے وہ خاصی اچھی ہندی پر عبور رکھتے ہیں۔ کیف بھوپالی جو ہندوستان کے انتہائی مقبول شاعر تھے جن کا حال ہی میں بھوپال میں انتقال ہوا ہے انھوں نے نظم اور غزل کے علاوہ فلمی شاعری بھی کی اور کئی مشہور فلموں کے گیت کے لئے ان کے ساتھ ایک فلم کی کہانی بھی لکھ رہا تھا اس فلم کے گیت جناب کیف بھوپالی مرحوم کے تھے لیکن افسوس کہ ان کے انتقال کی وجہ سے یہ فلم رُک گئی ہے۔

ابھی اس فلم کی کہانی تکمیل ہی ہو رہی تھی کہ اس فلم کا موضوع Love story پر تھا اس کے علاوہ مشہور فلم ڈائریکٹر کیدار شرما نے بھی اب دوسری فلم کی کہانی لکھنے کے لئے وعدہ کیا ہے۔

جناب محمد خالد عابدی نے کہا کہ ان دنوں وہ ایک ٹیلی ویزن سیریل لکھنے میں مصروف ہیں جو مجاہد آزادی جناب برکت اللہ بھوپالی کے انقلابی کردار کے بارے میں ہوگی اس کے علاوہ جگر مرادآبادی مرحوم نے بھوپال میں ایک ''دارالکھلا'' (کاہلوں اور دوست احباب جن میں شاعر ادیب اور لکھنے والے لوگ شامل تھے) پر بھی ایک جامع کام کر رہا ہوں یہ بھی ایک تحقیقی تحریر ہوگی۔ جو آج سے کئی عشرہ قبل قائم اس تنظیم پر ایک قسم کا ریسرچ ہوگی اور یہ ایک بہت ہی دلچسپ کلچرل چیز بھی ہوگی۔

جناب محمد خالد عابدی جو مطالعہ کے انتہائی شوقین اور کتابوں کے رسیا ہیں انھوں نے اپنی لائبریری کے بارے میں بھی بعض دلچسپ انکشافات کرتے ہوئے کہا کہ میرا فی الحال ایک ذاتی کتب خانہ ہے میں نے اس کا نام ''مکتبہ عابدیہ'' رکھا ہے۔ اور اب اسے ''اردو ریسرچ سینٹر'' بنانے کا خواہشمند ہوں اور اب بھی باوجود نقصان پریشانیوں اور برائیوں کے میں لوگوں کو اردو ادب افسانہ ناول وغیرہ پر مشتمل کتابیں اپنے کتب خانے سے بغیر کسی معاوضہ یا کرایہ کے دیتا رہتا ہوں تیز طلباء جو ایم اے اردو اور پی. ایچ. ڈی. کر رہے ہوتے ہیں ان کو بھی خصوصی طور پر بطور ادب پرستی یہ کتابیں فراہم کرتا رہتا ہوں لیکن مجھے اس سلسلے میں ذاتی طور پر شکایات ہیں۔ ان میں سب سے اہم یہ ہوتی ہے کہ اتنی اہم نایاب اور قیمتی کتابوں کا وہ لوگ حوالہ بھی نہیں دیتے کہ کس سے حاصل کی گئی ہیں جبکہ میں نے بیک وقت طلباء وغیرہ کو آٹھ آٹھ دس دس کتابیں بھی فراہم کی ہیں اور بغیر کسی غرض اور فائدے کے حالانکہ ذاتی اور سرکاری دونوں ہی قسم کی لائبریری میں اس طرح کوئی بھی قیمتی کتابیں فراہم نہیں کرتا ہے صرف شہر بھوپال میں ایک محمد خالد عابدی ہی ایسا موجود ہے اور میرے پاس اردو جرائد رسائل وغیرہ کا بھی موثر Collection موجود ہے۔

جناب محمد خالد عابدی نے مدھیہ پردیش اردو اکادمی اور اردو ادب کے فروغ اور ترقی کے

بارے میں ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ حکومت مدھیہ پردیش کی طرف سے بہت سی سہولتیں موجود ہیں لیکن افسوس کہ ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اہل بھوپال اردو اور بھوپالی کے تعلق سے اتنا کام نہیں کر رہے جتنا کہ ان کا فرض ہے اور میرے خیال میں ہم سب لکھنے والوں جن میں افسانہ ناول ڈرامہ تخلیق کاروں کی اس سے بڑی بدنصیبی کیا ہوگی کہ یہاں سے کوئی ایک بھی موقر ادبی رسالہ تک نہیں نکلتا جبکہ اردو اکادمی جیسا موثر ادارہ تک ایسا کام نہیں کر سکتا۔ ہاں صوبائی سطح پر وزارت ثقافت مدھیہ پردیش سے اردو میں مدھیہ پردیش سندیش نامی ایک رسالہ نکالتی ہے اس میں بھی حکومتی سطح پر اپنی کارکردگی کے بارے میں خبریں ہوتی ہیں مگر ادبی طور پر برائے نام ہی ہے ہماری اکادمی جیسے کم از کم دو عشرے ہو چکے ہیں آج تک اردو میں ایک رسالہ تک جاری نہ کر سکی جس میں کل ہند اور مقامی پیمانے پر ادیبوں کے تخلیقی کام شائع ہو سکیں حالانکہ بھوپال کے علاوہ پورے ہندوستان کی اردو اکادمیاں اپنی طرف سے ادبی رسالے شائع کرتی ہیں جس میں ادبی تخلیقات پروگرام افسانہ نثر شاعری وغیرہ پر سیر حاصل مواد ملتا ہے بلکہ کہیں کہیں تو ایک کے بجائے دو دو رسالے بھی نکل رہے ہیں۔

افسوس یہ ہے کہ ہماری اکیڈمی اور بھوپال کے موقر ادیبوں شاعروں وغیرہ کو ان کی ذرہ بھر فکر نہیں ہے جبکہ بھوپال آج سے نہیں بلکہ گذشتہ تقریباً ایک صدی سے اردو زبان و ادب شاعری کا منبع رہا ہے۔ یہاں زمانہ قدیم سے آل انڈیا مشاعرے، مذاکرے، سیمینار ہوتے رہے ہیں جن میں برصغیر پاک و ہند کے شعراء ادباء بھوپال کی ان تقریبات میں شامل رہے ہیں ان میں حضرات جوش جذبی، نیاز فتح پوری، حفیظ جالندھری، احسان دانش، فیض احمد فیض عبید اللہ علیم وغیرہ وغیرہ آتے رہے ہیں پھر ہندوستان کے بڑے اہم ممتاز لکھنے والوں میں جناب مجنوں گورکھپوری، اختر الایمان، جاں نثار اختر، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، علی سردار جعفری وغیرہ اکثر و بیشتر یہاں آتے رہتے ہیں۔ خود بھوپال جو دارالاقبال رہا ہے۔ اور اس بھوپال نے ادب علم شاعری تہذیب سیاست ثقافت کے حوالوں سے کافی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

جناب محمد خالد عابدی نے اپنے ادبی اور ریڈیائی و دیگر مشاغل کے بارے میں ایک سوال پر انتہائی تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ میں اپنے ریڈیائی پندرہ سالہ سفر میں ریڈیو کے تمام ہی قسم کے ادبی تہذیبی ثقافتی علمی و دیگر پروگراموں میں بذات خود اپنی ادبی دلچسپی کے تحت شرکت کرتا رہا ہوں لیکن گذشتہ ڈیڑھ سال سے میں خصوصی طور پر اردو پروگرام دیکھ رہا ہوں بلکہ یوں کہیں کہ اس شہر کی تمام ذمہ داریاں میری ہی ہیں اور آل انڈیا ریڈیو بھوپال سے ہر ہفتہ جمعہ کے دن صبح

ساڑھے آٹھ بجے اور پیر کے دن بالترتیب اردو پروگرام نشر کئے جاتے ہیں یہ پروگرام آدھے گھنٹہ ایک گھنٹے پر مشتمل ہوتے ہیں ان میں میرے ریڈیو سے ادبی پروگرام نشر ہوئے ان میں خصوصی ادبی شعری شخصیات کے حوالے سے تعزیتی پروگرام یہ ہیں۔

۱۔ کوثر چاند پوری مرحوم۔

۲۔ علامہ قاضی وجدی الحسینی مرحوم جو ایک مذہبی اسکالر ہونے کے علاوہ مایہ ناز شاعر اور ادیب بھی تھے۔ ان کا حال ہی میں انتقال ہوا تھا۔

۳۔ ظ انصاری مرحوم

۴۔ حضرت شعری بھوپالی مرحوم

ان سب ممتاز اہلِ ادب و شعراء پر تعزیتی پروگرام میں نے خود ہی لکھے اور میری نگرانی میں نشر ہوئے۔ جناب خالد عابدی نے اپنے خالص فکری اور دیگر ادبی حوالے سے جو تخلیقی کام کیے ہیں۔ ان کے بارے میں بتایا کہ میں نے اب تک جو کچھ تحقیقی حوالوں سے کام کیے ہیں ان میں

۱۔ تذکرہ شعراء مدھیہ پردیش ۲۔ تذکرہ نثر نگاران مدھیہ پردیش۔ ۳۔ ہندوستانی فلموں کی تاریخ۔ ۴۔ فلم ببلوگرافی۔ ۵۔ فلم و ادب ان میں کرشن چندر اور فلم منشی پریم چند اور فلم مولانا ابوالکلام آزاد اور عصمت چغتائی اور فلم سعادت حسن منٹو اور فلم، آغا حشر کاشمیری قابلِ ذکر کام ہیں۔ ان کے علاوہ ممتاز ڈرامہ نگار جنھیں ہندوستان کی کئی اردو اکیڈیمیوں نے تخلیقی ڈرامہ پر ایوارڈ اور اعزازات دیے ہیں جناب ابراہیم یوسف ایک مطالعہ" یہ میرا ایم اے کا مقالہ تھا۔

۲۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کا موضوع۔ ''بیسویں صدی میں اردو کا مکتوباتی ادب'' بھی قابلِ ذکر مقالات لکھے ہیں اس کے علاوہ جناب خالد عابدی کی مطبوعات کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ اب تک ان کی یہ کتابیں مکمل ہو چکی ہیں اور کچھ طبع ہو چکی ہیں۔

۱۔ آواز نما (۲) پیکرِ آواز (۳) باغ فکر معروف بہ مقطعات، نساخ۔ (تدوین) (۴) زخموں کے دریچے (افسانوں کا مجموعہ)

(۵) شکایتاً عرض ہے (طنزیہ و مزاحیہ مضامین)

جناب خالد عابدی نے مزید وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ انٹرویوز بھی آج کل ایک خصوصی صنف کی حیثیت سے معروف ادبی صنف بن چکے ہیں انٹرویوز پر مشتمل ایک کتاب شائع کرنے کا کافی عرصہ سے خیال پیدا ہوا ہے مگر مختلف مضامین اور کتب پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوا کہ اکثر چھوٹی چھوٹی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو بروقت علم میں آجائیں یا ان کی تردید ہو جائے یا کسی

اہم جواب کی وضاحت ہو جائے تو میں نے ہندوستان کے نامور ادیبوں شاعروں صحافیوں وغیرہ کو پہلے تو خطوط لکھے اور پھر انٹرویوز "رو بہ رو" کے لئے ان کو سوالنامے ارسال کیئے۔ چنانچہ یہ ایک لحاظ سے رو بہ رو انٹرویوز کو مراسلاتی کہا جا سکتا ہے یہ انٹرویوز مختلف ادبی شخصیات سے کیئے گئے وہ ماہنامہ سہیل گیا اور سہ ماہی گلستان جے پور میں شائع ہوئے ہیں ان کی کل تعداد ۲۷ ہے اس کے علاوہ تقریباً ۲۰ مزید تیار کر کے رسائل کو بھیجنا ہے اس کے بعد یہ کل ۴۵ انٹرویوز انشاءاللہ کتابی شکل میں شائع کراؤں گا۔

ویسے رسائل میں ان انٹرویوز کی اشاعت کے بعد انھیں خاصی پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ بالخصوص فلمیات کے تعلق سے جو انٹرویوز ہیں ان کی ادبی حیثیت یہ ہے کہ میں نے گیت نگاری مکالمہ نگاری اور منظر نامے کے بارے میں کافی اہم اور مشکل سوالات کیئے تھے اور ان کے خاصے اچھے اور مفید جوابات آئے ہیں۔ ویسے بھی میرے مشاہدے اور مطالعے میں اردو میں ان موضوعات پر مجھے کہیں بھی کچھ نہیں ملا۔

انٹرویو کے آخر میں جناب محمد خالد عابدی نے دونوں ممالک پاک و ہند میں کتب رسائل کی پابندی کو ختم کرنے ادیبوں شاعروں وغیرہ اور فنکاروں تخلیق کاروں کے باہمی میل جول اور رابطوں کو وسیع کرنے کی ضرورت پر زور دیا اور کہا اس میل جول اور برادرانہ روابط سے آپس کے تعلقات پُر امن طریقہ سے حل ہوں گے۔

جناب محمد خالد عابدی کے والد جو بھوپال کے مشہور خیاط تھے اور ان کی ول آرام نام کی دکان تھی ان کے والد کو یہ شرف حاصل ہے کہ انھوں نے مولانا سہا مجددی مرحوم ارشد تھانوی مرحوم سید سلیمان ندوی مرحوم کی شیروانیاں ہاتھ سے سی تھیں اس کے علاوہ علامہ اقبال کے پانچ پاجامے بھوپالی طرز کے جو نواب حمید اللہ خاں والیء بھوپال کی طرف سے بڑھیا فائیو پی کے کپڑے کے تھے۔ سیئے تھے۔

● ہفت روزہ گڈ نیوز کراچی ۲۵ را پریل ۱۹۹۲ء

جنابِ خالد عابدی سے آفتابِ جدید (بھوپال) کے نمائندے اشرف ندیم کا انٹرویو

محمد خالد عابدی:۔ میری تاریخ پیدائش ۱۷ر اگست ۱۹۴۷ء ہے اور میرا وطن مالوف، وطن عزیز بھوپال ہی ہے۔ میرے والد صاحب کا نام جناب محمد عابد صاحب ہے۔ وہ بھوپال کے مشہور خیاط رہے ہیں۔ دل آرام اینڈ سنس کے نام سے بھوپال میں تین چار دوکانیں تھیں۔ میرے والد نے علامہ اقبال سر راس مسعود، سُہا مجددی سلیمان ندوی اور نواب حمید اللہ خاں کے اکثر لباس سیئے ہیں وہ بھوپال میں اور دور دور شرٹ اسپیشلسٹ رہے ہیں۔

محمد خالد عابدی:۔ میری ابتدائی تعلیم مسجد میں دینی تعلیم سے ہوئی۔ بعدہٗ برجیسہ اسکول ہوا جس میں پہلے کلاس میں داخل ہوا یہاں سے تیسری کلاس پاس کرنے کے بعدہٗ چوتھی جماعت میں سیفیہ اسکول میں داخل ہو گیا تعلیمی سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ میں نے دسویں کلاس تک ریگولر اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے پاس کیے۔ ایم اے اردو فرسٹ ڈویژن میں اور میرٹ میں سیکنڈ رہا اب برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال میں پی ایچ ڈی (بیسویں صدی میں اردو کا مکتوباتی ادب) پر کام کر رہا ہوں۔

اشرف ندیم:۔ آپ کا ادبی شوق کس طرح ہوا؟

محمد خالد عابدی:۔ میری ابتدا فلمی مضامین لکھنے سے ہوئی تھی اس زمانے میں ادب سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی لیکن بعض بزرگوں اور دوستوں نے مشورہ دیا کہ جب اللہ نے مضمون لکھنے کی صلاحیت ودیعت فرمائی ہے تو ادبی مضمون لکھا کرو چنانچہ شروع میں شاعری بھی کی خالد بھوپالی تخلص سے۔ میری کئی غزلیں نظمیں مختلف پرچوں میں طبع ہوئیں لیکن پھر شاعری چھوڑ دی اور حضرت عشرت قادری کی تجویز پر نثر کی طرف توجہ کی آج الحمداللہ میری چھ تصنیف وتالیف ہیں۔

(۱) آواز نما۔ (ریڈیو ڈراموں کا مجموعہ) (۲) باغ فکر معروف بہ مقطعات نساخ

(ترتیب و تدوین) (۳) پیکرِ آواز (ریڈیو اور اسٹیج ڈراموں کا مجموعہ) (۴) زخموں کے دریچے (افسانوں کا مجموعہ) (۵) شکایتاً عرض ہے (طنزیہ و مزاحیہ مضامین (۶) اردو انٹرویوز (اردو انٹرویوز شعراء و ادباء اور فلمی ہستیوں سے لئے گئے مزاحیہ اسلامی انٹرویوز)

محمد خالد عابدی :۔ غیر مطبوعہ تصانیف کے نام (۱) اردو مزاحیہ اسلامی انٹرویوز (۲) اُجین میں اردو (۳) متاعِ رفتہ (۴) روبہ رو (۵) مضامین خالد (۶) فلموں کی ترقی میں اردو کا حصہ (۷) مضامین قلم (۸) مدھیہ پردیش کی خواتین اردو قلم کار (۹) مدھیہ پردیش میں امیر مینائی کے تلامذہ (۱۰) مدھیہ پردیش میں مضطر خیرآبادی کے تلامذہ (۱۱) مدھیہ پردیش میں داغ کے تلامذہ (۱۲) مدھیہ پردیش میں سیماب اکبرآبادی کے تلامذہ (۱۳) مدھیہ پردیش میں مولانا احسن مارہروی کے تلامذہ (۱۴) مرزا غالب کا تعلق مدھیہ پردیش سے (۱۵) مدھیہ پردیش میں اردو کے شعراء و ادباء (۱۶) مدھیہ پردیش کے اردو افسانہ نگار (۱۷) مدھیہ پردیش کے اردو ڈراما نگار (۱۸) مدھیہ پردیش کے اردو اخبار و رسائل (۱۹) تذکرہ شعرائے مدھیہ پردیش (۲۰) مدھیہ پردیش کا لوک ادب اور فن۔

ریڈیو کی ملازمت :۔

میں ۱۹۷۲ء میں بجلی گھر میں کلرک تھا۔ ستمبر ۱۹۷۷ء میں ریڈیو کی ملازمت میں آ گیا۔ میں ابھی تک ریڈیو میں پروڈکشن اسسٹنٹ کے عہدے پر فائز ہوں اور ریڈیو میں جس طرح اپنی خدمت انجام دیتا ہوں وہ آپ کے علم میں بخوبی ہے۔ تقریباً تین چار سال میں نے بھوپال ریڈیو پر اردو پروگرام آفیسر نہ ہونے کی صورت میں اعزازی اردو پروڈیوسر رہا ہوں۔ اہلِ بھوپال واقف ہیں کہ میں نے شعبہ اردو (ریڈیو بھوپال) کو کتنی عزت و وقار اور مرتبہ دلایا ہے۔ ریڈیو کی اگر سب سے خراب بات ہے تو وہ پروموشن کا معاملہ ہے یہاں اتنی تاخیر سے (کم از کم بیس سال میں) ترقی ہوتی ہے کہ کام کرنے کا جذبہ، اس کی اُمنگ، اس کا جوش ختم ہو جاتا ہے بعض لوگ تو اس حسرت میں ریٹائر اور فوت ہو جاتے ہیں۔

کتابیں جمع کرنے کا شوق :۔

مجھے کتابیں پڑھنے کا شوق پہلے ہے اور جمع کرنے کا شوق بعد میں۔ جس زمانے میں میرے پاس چار آنے تک نہیں ہوتے تھے میں دس پندرہ پیسے دے کر بال وہار کے سامنے ایک دوکان سے کہکشاں اخبار لے کر پڑھتا تھا۔ بعض لوگ میرا ذخیرہ دیکھ کر کہتے ہیں اتنی کتابیں آپ نے سب پڑھ لی ہیں؟

تو میں انہیں جواب دیتا ہوں کہ جی ہاں پڑھ لی ہیں لیکن حفظ نہیں کی ہیں اور حفظ کی ہوئی چیزیں بھی لوگ بھول جاتے ہیں۔ مجھے کتابیں پڑھنے اور لائبریری بنانے کا شوق خدا بخش لائبریری رضا لائبریری سید مسعود حسن ادیب مرحوم کی لائبریری نیشنل لائبریری اور منشی نول کشور کی خدمات کا سُن سُن کر میرے دل میں بھی یہ جذبہ پیدا ہوا کہ میرا بھی ایک اچھا کتب خانہ ہو۔ اور الحمدللہ میرا کتب خانہ آہستہ آہستہ ایک اچھے کتب خانے کی شکل اختیار کر رہا ہے۔

کتب خانے کی تعداد اور رکھ رکھاؤ:۔

ایک قیاس کے مطابق میرے پاس کتب، اخبار، رسائل، خطوط اور فوٹو کی تعداد بلا مبالغہ چار ہزار ہوگی کتابیں تو کوئی بھی جمع کر سکتا تھا لیکن کتابوں کی تنظیم اور ان کا تحفظ ایک دشوار کام ہے جو وقت طلب، وقت طلب اور صبر طلب ہے۔ میرے کمرے میں ادھر ادھر کتابیں ہی کتابیں ہیں یہاں تک کہ میرے بستر پر بھی اتنی کتابیں ہیں کہ میں ڈھائی تین بالشت کی جگہ پر سوتا ہوں۔ اس کا مشاہدہ وملاحظہ دہلی اور ترقی بیورو کے چیف جناب شیخ سلیم احمد صاحب بھی فرما چکے ہیں۔ بارش میں تو بہت دشواری ہوتی ہے بارش کی اکثر راتیں کتابوں کی حفاظت اور ان کی اٹھا دھری میں گذر جاتی ہیں۔ مکان بہت تنگ وتاریک ہے طالب کتاب کے لئے بیٹھنے کا کوئی معقول انتظام نہیں ہے۔ تاہم مطلوبہ کتابیں میں خود آپ کے گھر آپ کے قیام گاہ پر ہی فراہم کراتا ہوں۔ میں اور میرا کتب خانہ چلتی پھرتی کتب خانہ یا گشتی لائبریری تصور فرمالیجئے۔ میرے پاس اس وقت تین الماریاں ہیں اور پانچ الماریاں دیواروں میں بنی ہیں گویا آٹھ الماریاں کتابیں ہیں میں اور میرے والد عابد صاحب بھی کتابوں کی تنظیم میں لگے رہتے ہیں۔ مناسب جگہ کی تلاش میں ہوں تا کہ اپنی لائبریری جو کہ مکتبہ عابدیہ کے نام سے موسوم ہے اسے مزید ترقی دی جاسکے۔

بھوپال کا شاید ہی کوئی ایسا لکھنے پڑھنے والا شخص ہو جس نے مکتبہ عابدیہ سے رجوع نہ کیا ہو۔ ڈاکٹر ابومحمد سحر صاحب، جناب ابراہیم یوسف صاحب، پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب ڈاکٹر حامد حسین صاحب، ڈاکٹر شفیقہ فرحت، پروفیسر آفاق احمد صاحب، جناب اقبال مجید صاحب، پروفیسر حیدر عباس رضوی صاحب، جناب اظہر راہی صاحب، جناب عشرت قادری صاحب، جناب اختر سعید صاحب، جناب عارف عزیز صاحب، جناب

اشرف ندیم صاحب، حبیب احمد صاحب، ڈاکٹر بشیر بدر، جناب ظفر صہبائی صاحب
، جناب نجیب رامش صاحب، پروفیسر حامد جعفری، جناب اشتیاق عارف، ڈاکٹر محمد نعمان
خان، ماسٹر اختر حسن پروفیسر انیس سلطان پروفیسر کوثر جہاں پروفیسر فضل تابش اور انجم
سلمانی صاحبان کو مکتبہ عابدیہ کی خدمات کا اعتراف ہے۔ مزید یہ ہے کہ بی اے، ایم
اے، پی ایچ ڈی کے اردو طالب علم مکتبہ عابدیہ سے استفادہ فرمارہے ہیں، اس کا ثبوت
ان کے مقالے ہیں جس میں انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ فلاں کتاب یا فلاں مقالہ محمد
خالد عابدی نے فراہم کیا۔ یہ ان کی شرافت اور ایمانداری ہے ورنہ تو اس کے برخلاف اور
برعکس بھی ہیں ریڈیو بھوپال اور بھوپال ٹی وی کے لئے تیار کیے گئے تمام پروگراموں میں
مکتبہ عابدیہ کی کتب اور مضامین سے مدد لی گئی ہے۔

کمیاب اور نایاب کتب:۔

کمیاب اور نایاب کتب ہونے کا علم تو مجھے طالب کتاب سے ہی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر بلقیس
جہاں (بیگم پروفیسر آفاق احمد) جب مخدوم محی الدین پر تحقیق فرمائی رہی تھیں تو اس وقت
میں نے ایک نایاب کتابچہ مخدوم محی الدین کے تعلق سے دیا تھا۔ موصوفہ نے اپنے مقالہ
میں اس کا اعتراف کیا ڈاکٹر کشور سلطان (بیگم ڈاکٹر مختار شمیم) جب جانثار اختر کی شخصیت
وفن پر کام کررہی تھیں تو اس وقت جانثار اختر کی فلمی خدمات پر کچھ مواد اسی خاکسار نے
فراہم کیا تھا، ڈاکٹر موصوفہ نے اپنے مطبوعہ مقالے میں توصیف فرمائی۔ ڈاکٹر مختار شمیم
صاحب نے ظہیر دہلوی پر جو تحقیقی کام کیا ہے انہوں نے بھی مجھ ناچیز کا شکریہ ادا کیا ہے
اور بھی پی ایچ ڈی کے اسکالر جیسے پروفیسر انیس سلطان محترمہ عنبر دختر ایوب آرٹسٹ،
محترمہ نجمہ محترمہ عتیقہ جناب جلیل الرحمان صدیقی وغیرہ کو ایسا مواد فراہم کیا ہے کہ شاید
بھوپال میں انھیں مکتبہ عابدیہ کے علاوہ دستیاب نہ ہوتا۔ مرحوم سہیل صدیقی نشور واحدی پر
کام کررہے تھے۔ اس خاکسار نے نشور واحدی کی ایک غیر مطبوعہ نظم انھیں فراہم کی تھی۔
افسوس ان کی موت کے باعث وہ نظم واپس نہیں مل سکی۔

مجھے خوشی کے ساتھ ساتھ فخر بھی ہے کہ مشہور ترین ڈرامہ نگار و ناقد و محقق جناب ابراہیم
یوسف صاحب نے بھی اپنے ایک مضمون میں مجھ ناچیز کا شکریہ ادا کیا ہے علاوہ ازیں
حضرت مختار آرزو، مالک رام وغیرہ کو مطلوبہ مواد فراہم کیا ہے۔

میں ۱۹۷۷ء میں ریڈیو میں آیا تھا، ہنوز پروڈکشن اسسٹنٹ ہوں۔ ریکارڈنگ اسکرپٹ اور

پروڈکشن ہمارا کام ہوتا ہے۔ پندرہ سال ہو گئے ہیں امسال ترقی کا قوی امکان ہے ابھی تقریباً پندرہ سترہ سال اور ملازمت کرنا ہے ترقی کے بہت امکانات ہیں میرا یہ ماننا ہے کہ اگر آپ کسی کو بھی ذرا بھی فیض پہونچا سکتے ہیں تو وہ آپ کی ترقی ہے بعض ایسے بڑے عہدے کے افسران ہوئے ہیں جو نہایت بے فیض ہوتے ہیں ضروری نہیں کہ اصول شکنی کر کے ہی لوگوں کو فائدہ پہونچایا جا سکتا ہے مجھے خوشی ہے کہ میں نے ریڈیو بھوپال کے اردو پروگرام کو جو وقت، محنت اور تنوع دیا ہے بعد کے افسران قائم نہیں رکھ سکے لیکن اس سے انکار نہیں کہ اقبال مجید صاحب کے زمانہ میں اردو پروگرام کا زبردست معیار تھا کاش میں ان سے پروگرام کی ابجد سیکھ سکتا۔

ادب میں مقام اعزاز:۔

کتابوں اور مضامین کی تعداد سے مرتبہ کا تعین نہیں ہونا چاہیئے۔ کیا لکھا ہے، ادب میں کیا اضافہ کیا ہے اور کس زوال پذیر چیز کو زندگی بخشی ہے، وغیرہ خدمات ادب میں مقام کا تعین کرتے ہیں اور پھر صاحب کسی کو برداشت کرنا بھی بڑے ظرف کی بات ہے۔

لوگ اسمِ شماری میں ہی بد دیانتی، عصبیت اور جانب داری سے کام لیتے ہیں تو وہ کیوں کر مقام دیں گے۔ میری کتابیں شائع ہوئیں، میرے مضامین ہندو پاک کے اخبار ورسائل میں شائع ہوئے قارئین نے مجھے حوصلہ افزا خطوط لکھے یہی میرا انعام و اکرام ہے۔

لوگ میرے کتنے کام آئے اور میں کتنے لوگوں کے کام آیا یہی میرا انعام ہے۔ میں سراپا ممنون ہوں یوپی اردو اکیڈمی کا کہ وہاں سے مجھے ۱۹۷۵ء میں میری پہلی کتاب ''آواز نُما'' پر ایک ہزار روپیہ کا انعام ملا اور تین بار فخر الدین علی احمد میموریل اردو کمیٹی لکھنؤ سے 'پیکرِ آواز' 'زخموں کے دریچے اور 'شکلاً بتا عرض ہے'' مسودوں پر مالی امداد ملی۔ یہ میرے لئے اعزاز ہے۔ مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کی کسی انعامی فہرست میں ابھی میرا نام درج نہیں ہے۔

پسندیدہ صنف:۔

میری پسندیدہ اصناف اور دلچسپی فلمیات ڈرامہ، طنز و مزاح اور تحقیق ہیں۔ میں بالعموم ان موضوعات پر لکھتا بھی ہوں اور یہی اصناف میرے مطالعے میں بھی رہتی ہیں۔ آپ معاشرے کو کس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں؟ مسلمان اور ہندوستانی ہونے کے ناطے۔

خالد عابدی:۔ ایک اچھا اور مثالی ہندوستانی وہ بھی ہو سکتا ہے جو بہتر مسلمان بھی ہو ایک اچھے معاشرے کی تشکیل میں مسلمان کے بغیر تعریف نامکمل سمجھی جائیگی۔

اشرف ندیم:۔ آپ نے ہندوستانی کی کیا تعریف متعین کی ہے؟

خالد عابدی:۔ ہمیں ہندوستانی ہونے پر فخر ہے۔ ہم ہندوستان ہی میں پیدا ہوئے ہندوستان کی زمین میں دفن ہونا پسند کریں گے۔ ہمیں دستور میں بحیثیت مسلمان کے زندہ رہنے، تعلیم حاصل کرنے اور ملازمت حاصل کرنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن آج کل جس گندی سیاست نے اپنی باہیں پھیلا رکھی ہیں وہ آپ سے پوشیدہ نہیں ہے۔

ہندوستان ایک گلدستہ کی مانند ہے اس کی رونق اور دلکشی اور خوشبو کسی ایک پھول پر موقوف نہیں ہے۔ لفظ ''ہندوستان'' جس تہذیب وثقافت کا امین ہے اس میں بہت تیزی سے خیانت ہو رہی ہے۔ ہمیں، آپ کو اور دوسروں کو یہ خیانت روک کر ایک مثالی ہندوستانی کا تحفظ و تشکیل کرنی ہوگی اور یہی میرا نقطۂ نظر ہے۔

اشرف ندیم:۔ تصانیف کے ذریعہ سے معاشرے کو پیغام؟ معاشرے قوم وملت سے توقعات اور تبدیلی کی خواہش؟

خالد عابدی:۔ میرے یہاں کوئی نعرہ نہیں ہے۔ کوئی بات صحت مند اور افادی ضرور ہو سکتا ہے۔ میں تخریبی ادب اور صحافت کا قائل نہیں اور یہی چیزیں زیادہ سے زیادہ دیکھنے میں آرہی ہیں۔ ہر شاعر، ادیب، صحافی عصری آگہی رکھتا ہے اور یہی آگہی بالعموم اس کا نقطۂ نگاہ بن جاتی ہے تخلیق اور فکر میں سرایت کرتی ہے میرا پیغام، محبت ہے اتفاق ہے۔ ہم ادیب شاعروں اور صحافیوں کو غلط پروپگینڈہ اور نعرے بازی سے دور رہنا ہوگا۔ لیکن یہ ایک طرفہ ذمہ داری نہیں ہے۔ ہر شخص کو احتساب کرنا ہوگا اس کے بعد ہی کوئی چیز سامنے آئے گی۔ جو شخص انتقامی جذبہ رکھے گا وہ اپنے زخم تازہ رکھے گا۔ میں تو یہ سوچتا ہوں کہ ملک کا انتظام ادیبوں اور شاعروں کی سونپ کر دیکھیں۔ مجھے ادبی تقریبات میں سیاسی لیڈروں کی شمولیت، سخت ناپسند ہے یہی لوگ ادب کو معاشرے کو ملک کو پراگندہ کر رہے ہیں۔ جس شخص کی فکر صالح اور مفید ہے اسے ہندوستانی کہلانے کا حق ہے۔

● (روزنامہ آفتاب جدید۔ بھوپال ۳۱ مئی ۱۹۹۳ء)

☆☆☆

خالد عابدی، کہتے ہیں

محمود قریشی

ہم نے پوچھا آپ ادبی میدان میں کب آئے تو خالد عابدی نے بتایا کہ میں نے ۱۹۶۷ء سے باقاعدہ لکھنا شروع کیا۔ شروع میں اخباروں میں لکھا کرتا تھا کیونکہ شوق کے ساتھ ساتھ یہ مالی منفعت کا بھی باعث تھا ابتداء قلم سے کی فلمی دنیا کے لئے لکھنے میں مالی فائدہ زیادہ تھا لیکن میرا گھرانہ مولویانہ تھا اس لئے وہ میرا فلمی دنیا سے تعلق پسند نہیں کرتے تھے چنانچہ اسے خیرباد کہنا پڑا اور میں ادب کی طرف راغب ہوگیا ادب میں میں نے مضامین نگاری، تحقیقی مقالہ جات معلوماتی فیچر اور شاعری تمام اصناف ہی میں طبع آزمائی کی لیکن کچھ غزلیں کہہ کر ہی یہ ثابت ہوگیا کہ میرا یہ میدان نہیں چنانچہ ریڈیو ڈراموں کی طرف راغب ہوا اور ریڈیو اور اسٹیج ڈرامے لکھے "آواز نما" میرا ریڈیو ڈراموں کا مجموعہ ہے اور پیکر آواز ریڈیو اور اسٹیج ڈراموں کا مجموعہ ہے لیکن ابھی یہ طباعت کے مراحل سے گذر نہیں سکے ہمارے سوال پر انھوں نے کہا کہ میں ادب میں ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوا لوگ مذہب کو ادب میں شامل نہیں کرتے لیکن میں کہتا ہوں کہ ہمارا مذہب ہی سب سے زیادہ ترقی پسند ہے مارکسزم والے مزدور کے حقوق کا رونا روتے ہیں لیکن اسلام تو مزدور کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے مزدوری ادا کرنے کا حکم دیتا ہے اور جس نے مذہب اسلام، کا مطالعہ کیا ہے کبھی مارکسزم کو ترجیح نہیں دے سکتا۔ ہمارے اس سوال پر کہ بھارت میں اردو ادب کا کیا مستقبل ہے خالد عابدی نے دوٹوک کہا کہ یہاں اردو ادب کا مستقبل تاریک ہے۔

کیونکہ انگریزی اور ہندی میں تعلیم کے مواقع زیادہ ہیں اردو کے علمبرداروں کے گھروں میں بھی اردو مفقود ہے نئی نسل تو اردو کے قریب نہیں پھٹکتی نصاب تعلیم اردو سے بے بہرہ ہے اور یہ مسلمانوں کو ختم کرنے کی سازش ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ کسی قوم کو ختم کرنا ہو تو پہلے اس کی زبان کو ختم کر دو اسی قول پر عمل کیا جا رہا ہے۔ اگرچہ اس سلسلے میں احساس موجود ہے لیکن عمل نہیں ہو رہا ہے زبان مردہ ہو رہی ہے ہم نے کہا کہ یہاں تو اردو اکادمیاں قائم ہوگئی ہیں۔

خالد عابدی گویا ہوئے کہ اردو اکادمیاں شاعروں اور ادیبوں کی ترقی کے لئے قائم ہوتی

ہیں اردو کو ان سے کوئی فائدہ نہیں ہے اب مدھیہ پردیش اردو اکادمی کو ہی لیجئے اس اکادمی نے سلے بس اور تعلیم کے فروغ کے لئے کوئی کام نہیں کیا کوئی معیاری کام نہیں ہوا ہاں البتہ شخصیات کی تعمیر ہوتی ہے شاعروں کی ترقی ہوتی ہے ذاتی مفادات حاصل کئے گئے ہیں حالانکہ میں یہ کہتا ہوں کہ پہلے اردو زبان پر زور دیا جائے اور پھر ادب پر ترقی پسندی یہ نہیں ہے کہ کیمونزم کو ہی مانا جائے وہ دور بھی چلا گیا ہے مزاج بدل گیا ہے یہ باتیں بے معنی معلوم ہوتی ہیں بات اتنی ہے کہ کونسا ادب وقت کی صحیح ترجمانی صحیح اور ٹھیک انداز میں کر رہا ہے ہمارے لحاظ سے یہی ترقی پسندی ہے۔

سوال:۔ادب پر مذہبی اثرات پر آپ کیا کہیں گے؟

جواب:۔ادب تو وہ ہے کہ انسان روحوں کی سچائیوں کو پیش کرتا ہے شاعری اثر انگریز چیز ہے لیکن یہاں اخلاقیات کو مدنظر نہیں رکھا جاتا شاعری میں شباب وشراب کا ذکر ضرور ہوگا ادب پر مذہبی اثرات ہیں اور ہر ادب پر ہیں ادیب اگر سچائیوں کا قائل ہے تو لازمی امر ہے کہ اس کے اثرات تحریر پر پڑیں گے شروع میں میرا پورا گھریلو ماحول اسلامی تھا لہذا میں یہ کہتا ہوں کہ خدا کو مانے بغیر انسان بہتر زندگی نہیں گذار سکتا اسلام بہترین مذہب ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ دوسرے مذاہب پر تعصب نہیں رکھتا اچھا ادیب بننے کے لئے یہ تو ضروری نہیں کہ وہ مذہب سے انکار کرے بہرحال ادیب پر مذہب کا اثر گہرا ہے اور ادیب مذہبی اثرات سے الگ نہیں ہوسکتا۔

سوال:۔آپ کون کونسے ادیبوں سے متاثر ہیں اور کیوں؟

جواب:۔نثر نگاری میں شبلی، سرسید حالی، ڈپٹی نذیر احمد، سید سلیمان ندوی آل احمد سرور، احتشام حسین، پریم چندر، سعادت حسن منٹو، ابوالکلام آزاد اور قاضی عبدالغفار شامل ہیں۔ میں ان کی تحریر اور تحریک کے اسلوب سے متاثر ہوا ابوالکلام آزاد کی تحریروں میں ان کے بیان کی سچائی کے اظہار میں بے باکی پر شکوہ اور پرتاثیر ہوتی ہے منٹو کے پاس افسانویت کے ساتھ بڑی حقیقت پسندی ہے اس نے انسانیت کے چراغ کو روشن کیا وہ زندہ رہتا تو اردو ادب کو مزید مالا مال کرتا اقبال کی شاعری پر شکوہ ہے اسلام کے نظریئے سے ہم آہنگ ہے اور اسلامی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔

ہم نے پوچھا آپ کن ادیبوں سے متاثر ہوئے ہیں تو خالد عابدی نے کہا کہ منشی پریم چند اور سعادت حسن منٹو نے مجھے متاثر کیا ہم نے پوچھا آپ آکاش وانی سے تعلق رکھتے ہیں اردو کے لئے آپ نے تمام ادیبوں سے رابطہ کیا؟ تو انھوں نے کہا کہ میں مدھیہ پردیش سے تعلق رکھنے والے تمام افراد سے رابطہ رکھنا جانتا ہوں اور اس سلسلے میں کام کر رہا ہوں۔

ایک اور سوال کے جواب میں انھوں نے ادب میں جدید تحریک کو محدود ذہن کی پیداوار قرار دیا۔

اور کہا کہ یہ گلے سے اترے نے کی چیز نہیں ہے انشائیہ کے بارے میں یہ کہنا ہے کہ یہ اظہار کا اچھا ذریعہ ہے ہم مشینی دور سے گذرر ہے ہیں اس لئے ہمیں یقیناً اختصار کی جانب آنا ہوگا۔اس سلسلہ میں انھوں نے جوگندر پال کے انشائیوں کو پسند کیا ادب میں تنقیدی کام کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ اطمینان بخش ہو رہا ہے انھوں نے بتایا کہ وہ پی ایچ ڈی کرر ہے ہیں انھوں نے بتایا کہ اردو میں خطوط نگاری پر بھی عنقریب میرا ایک مقالہ آرہا ہے۔

● ماہنامہ ادوار۔خانپور پاکستان

مکتبہ عابدیہ

کتابوں کا آدمی

نعیم صبا

کسی بھی کام میں کامیابی عام طور پر آسانی کے ساتھ نہیں ملتی۔ خاص کر شعر و ادب کے میدان میں کامیابی پانا نہایت مشکل ہے بلکہ بعض حالات میں ناممکن ہوتا ہے۔ شاعر یا ادیب کی حیثیت سے کامرانی حاصل کرنا ایثار و قربانی، محنت و ریاضت سچی لگن پر منحصر رہتا ہے۔ خالد عابدی کی شخصیت ایثار و قربانی محنت و ریاضت اور سچی لگن سے عبارت ہے۔ پڑھنا لکھنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ کتابیں اور رسائل خریدنا ان کا دوسرا پسندیدہ شغل ہے۔ حال کے برسوں میں شاید کوئی ایسا رائٹر نہیں ہوا ہے۔ جس نے اس فراخدلی سے اپنی تنخواہوں کا معقول حصہ کتب و رسائل خریدنے میں لگایا ہو۔ خالد عابدی نے یہ کام کیا ہے اور اس کا سلسلہ نہ صرف جاری ہے بلکہ آئندہ بھی جاری رہنے کے امکانات ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کتابوں پر روپیہ خرچ کرنے کے معاملے میں آگے چل کر وہ ریکارڈ بنالیں۔

مقامی اصطلاح میں خالد عابدی بہت ''لکھاڑ'' یعنی بسیار نویس آدمی ہیں۔ چنانچہ چند برسوں میں ہی وہ بے شمار مضامین اور کئی کتابوں کے مصنف اور مؤلف بن گئے ہیں۔ ان کی یہ کتابیں اس طرح ہیں (۱) ریڈیو ڈراموں کا پہلا مجموعہ ''آواز نما'' (۲) ریڈیو ڈراموں کا دوسرا مجموعہ ''پیکرِ آواز'' (۳) افسانوں کا مجموعہ ''زخموں کے دریچے'' (۴) مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ''شکایتِ عرض ہے'' (۵) تالیف ''باغِ فکر معروف بہ مقطعاتِ نساخ'' (۶) تعارفی کتاب ''اردو انٹرویوز'' ان کے علاوہ کئی دوسری کتابوں کے مسودے منتظرِ اشاعت ہیں۔ خالد عابدی کی کتابوں کے نام بڑے دلآویز اور شاعرانہ ہوتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خالد عابدی رومانٹک شاعر بنتے بنتے رہ گئے ہیں۔

ویسے تو خالد عابدی نے نثر کی کئی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کو زیادہ دلچسپی مزاحیہ ریڈیو ڈرامہ سے ہے۔ میری رائے میں ڈرامہ کو موٹے طور سے تین خاص حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ (۱) ڈرامہ برائے مطالعہ (۲) ڈرامہ برائے اسٹیج اور (۳) ڈرامہ برائے ریڈیو۔ یہاں

خالد عابدی کے تعلق سے ریڈیو ڈرامہ متعلقہ موضوع ہے۔ ریڈیو ڈرامہ کو بھی مزید دو خاص بڑے حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے (۱) غیر مزاحیہ ریڈیو ڈرامہ اور (۲) مزاحیہ ریڈیو ڈرامہ نگاروں میں شوکت تھانوی کو سب سے اونچا مقام حاصل ہے۔ ممکن ہے کہ مستقبل میں خالد عابدی مزاحیہ ریڈیو ڈرامہ نگاری میں شاید شوکت تھانوی کے ہم پلّہ ہو سکیں۔ فی الحال میں اس میدان میں خالد عابدی کو اظہر افسر ثانی سمجھتا ہوں اول الذکر کے مزاحیہ ریڈیو ڈرامہ میں مکالموں کی معنی خیزی دیکھیے۔ ڈرامہ ''دوسرا جنم'' میں مرزا کہتے ہیں:۔

''مرزا:۔ تمھاری بھابی بھی کچھ کم نہیں، دن بھر محلے میں میری کتابیں تقسیم کرتی ہیں۔ میری کتابیں نہ ہوئیں خدا بخش لائبریری ہوگئی''۔

مزاحیہ ڈرامہ نگاری میں خالد عابدی کو چاہے بھوپال کا شوکت تھانوی نہ کہا جاسکے مگر افسانہ نویسی میں ان کو بھوپال کا عادل رشید ضرور کہا جاسکتا ہے۔ خالد عابدی کے افسانوں کی اساس ان کا گھٹا گھٹا ہوا ماحول ہے۔ یہاں بھی وہ اپنی عبارت میں پہلو دار معنویت لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً افسانہ'' کانٹے کی خوشبو'' میں وہ کہتے ہیں:۔

''شہر میں چاروں طرف شعلے بھڑک رہے تھے۔ دیوار پر خون کے چھینٹے اس طرح سے تھے گویا کسی نے ماڈرن آرٹ بنا رکھا ہو''

خالد عابدی کے مزاحیہ مضامین میں اکثر جگہ تیکھا پن منھ سے بولتا ہوا ملتا ہے جیسے مضمون ریڈیو اناؤنسر میں وہ رقم طراز ہیں:۔

جس طرح کاتب حضرات اپنی جانب سے ترمیم و اضافہ کرنے میں طاق ہی نہیں محراب ہوتے ہیں، ریڈیو سے پروگرام پیش کرنے والا ناشر بھی اپنے جملوں سے پروگرام کا تاثر تبدیل کرنے میں ید اولیٰ رکھتا ہے''۔

خالد عابدی کے مزاحیہ مضامین پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے خود کو اس کارواں میں شریک کر لیا ہے جس کی صفِ اول میں مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، وجاہت علی سندیلوی اور ڈاکٹر شفیقہ فرحت جیسی محترم ہستیاں نظر آتی ہیں۔

خالد عابدی نے بہت سے انٹرویو بھی ترتیب دیے ہیں اس کا ثبوت ان کی کتاب ''اردو انٹرویوز'' ہے۔ اس کتاب کا نام مراسلاتی انٹرویوز بھی ہوسکتا ہے کیونکہ اس میں جو انٹرویوز شامل ہیں وہ سب خالد عابدی نے سوالنامہ بھیج کر بذریعہ ڈاک حاصل کیے ہیں یہ کتاب پڑھنے سے کچھ شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جن سے پہلے واقفیت نہیں تھی۔

میں خالد عابدی کو کتابوں کا آدمی کہتا ہوں۔ سچ پوچھیے تو ان حضرت کے لئے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک ایسا بھنورا ہیں جن کے لئے کتابیں، رسالے اور اخبارات ہی کلیاں غنچے اور پھول ہیں جناب کا شوق بیکراں جناب کا خضر راہ ہے۔ جو لوگ خالد عابدی کو جانتے ہیں وہ یقیناً اس بات کو تسلیم کریں گے کہ میں نے موصوف کو کتابوں کا آدمی کہہ کر غلطی نہیں کی۔ ان کے بارے میں جب مزید معلومات حاصل کی گئیں تو پتہ چلا کہ یہ کتابوں کا آدمی جب ایک سال کا تھا اس وقت بھی کوئی نہ کوئی کتاب اپنے ہاتھ میں پکڑے رہتا تھا۔ جب یہ تین سال کا ہوا تب ہی سے کاغذ اور قلم اُٹھا کے دن دن بھر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ کر لکھنے کی کوشش کرتا تھا اور جب یہی آدمی چھ سال کا ہوا تو اس نے بامعنی الفاظ لکھنا شروع کر دیئے۔ دس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے یہ آدمی باقاعدہ اور بامقصد عبارت لکھنے لگا سن بلوغ تک پہنچنے سے پہلے ہی یہ آدمی چھوٹا موٹا رائٹر بن چکا تھا اور پھر اس کے بعد۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ بے شمار کتب، ڈھیر سارے مضامین اور ڈراموں وغیرہ کی شکل میں ارباب ادب کے سامنے ہیں اور یہ سب کام مسلسل داد و تحسین حاصل کر رہا ہے میں اپنی بات ایک مختصر غیر پابند نظم پر ختم کرتا ہوں۔

کتابوں کا آدمی

کتابیں اس کے دائیں ہیں
کتابیں اس کے بائیں ہیں
کتابیں اس کے سر پر ہیں
کتابیں گود میں اس کی
کتابیں اوڑھتا ہے وہ
کتابیں وہ بچھاتا ہے
کتابیں مونس و ہمدم ہیں اس کی
کتابیں اس کا سب کچھ ہیں
کتابوں کو وہ رچتا ہے
اسے کہتے ہیں خالد عابدی ہم سب

خالد عابدی کی باتیں اور کتابیں

حیدر بیابانی

جی ہاں عابدی صاحب کی باتیں۔ لیکن ان کی باتیں محض تضیع اوقات نہیں ہوتیں۔ نہ تو کسی پاگل کی بڑ ہوتی ہیں اور نہ کتے کی دُم سیدھی کرنے جیسے کوئی عمل ہوتی ہیں (جیسی کہ اکثر باتونی اشخاص کی ہوتی ہیں) اُن کی باتیں تو معلومات کا خزانہ اور دلچسپ افسانوں کا ایک افسانہ ہوتی ہیں۔ ان کی گفتگو کا سلسلہ ادب، سماج، سیاست، تاریخ، مذہب وغیرہ وغیرہ ہر پہلو سے جڑتا ہے اور ہر موضوع کا پورا پورا حق ادا کر دیتے ہیں۔ خالد عابدی صاحب بہت زیادہ لکھنے لکھانے والے اور چھپنے چھپانے والے ادیب بھی ہیں۔ ملک کا ہر اردو رسالہ ان کے پاس آتا ہے اور ہر رسالہ میں وہ چھپتے رہتے ہیں اور کہیں نہ کہیں چھپتے بھی چلے جاتے ہیں۔

اپنی ادبی زندگی کی ابتداء، ہر ادیب کی طرح انھوں نے شاعری سے کی تھی لیکن انھیں شاید شاعری کی مبالغہ آرائی، شاعر کی بے اعتدالی اور مشاعرہ کی ہلّو بازی راس نہیں آئی اور خالد صاحب نے اپنے قلم کے اسپ تازی کو نثر کی سیدھی سادی اور ٹیڑھی ڈگر پر ڈال دیا اور اب وہ آٹھ کتابوں کے مصنف بن گئے ہیں۔ مزید آٹھ دس کتابیں زیرِ طبع وزیرِ ترتیب ہیں اور تقریباً چھ ہزار کتابوں کے وہ مالک ہیں۔

خالد صاحب کی زبان کے ساتھ ان کے ہاتھ پیر بھی چلتے رہتے ہیں۔ قلم کے وہ دھنی ہیں اس لیے جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو لگاتار لکھے ہی چلے جاتے ہیں اور جب پیدل چلنے پر آمادہ ہوتے ہیں تو بے تکان چلتے جاتے ہیں ایک دن میں پانچ چھ کلومیٹر چلنا ان کا روزانہ کا معمول ہے لیکن ان کا پیدل سفر بھی ایک ادبی نوعیت کا ہی حامل ہوتا ہے۔ ہمہ وقت ان کے ہاتھ میں ایک بیگ لٹکا رہتا ہے جس میں کئی کتابوں کے علاوہ ایک عدد کتاب کا زیرِ ترتیب مسودہ ہوتا ہے یا پھر کسی پریس سے نظرِ ثانی کے لئے آیا ہوا کتابت شدہ مواد ہوتا ہے اور دوست احباب کے خطوط۔ جب خالد صاحب کے لئے کچھ لکھنے لکھانے کے لئے نہیں ہوتا تو وہ خطوط ہی لکھتے رہتے ہیں۔ دوستوں کو خطوط، مدیروں کو خطوط، شاعروں وادیبوں کو خطوط، رشتہ داروں کو خطوط۔ مختلف مشاہیرانِ ادب کے اُن کے نام

آئے ہوئے خطوط کی تعداد کافی سے کچھ زیادہ ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ریسرچ کا موضوع بھی ''اردو میں مکتوباتی ادب'' ہے۔

باتونی آدمی ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح ہوتا ہے اور خالد عابدی واقعی اس بات کی بہترین مثال ہیں وہ دوران گفتگو اپنی خوبیوں اور کامرانیوں کے ساتھ اپنی خامیوں اور پسپائیوں کا ذکر بھی کھلے دل اور کھلی زبان سے کر جاتے ہیں اُس وقت وہ بڑے معصوم اور بچوں جیسے دکھائی دیتے ہیں۔

ہم نے ذکر کیا ہے کہ خالد صاحب تقریباً چھ ہزار کتابوں کے مالک ہیں اس طرح وہ ایک انوکھے اور نرالے کتب خانے کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ انوکھا اور نرالا یوں کہ وہ بذات خود تنِ تنہا اس کتب خانے کے سب کچھ ہیں۔ مالک بھی، نگراں بھی، محافظ بھی اور لائبریرین بھی۔ قارئین کی ضرورت کی کتابیں وہ گھر گھر جا کر ایشو کرتے ہیں اور ریسیو بھی کرتے ہیں اور یہ سب کچھ وہ بغیر کسی ممبر سازی کے اور بغیر کوئی فیس لئے کرتے ہیں۔ ہم تک وہ تقریباً دو سو کلو میٹر دور سے کتابیں پہنچاتے ہیں۔ وہ ایسے کہ ان کا کتب خانہ بھوپال میں اُن کے ذاتی مکان میں ہے اور وہ خود بیتول ریڈیو اسٹیشن میں ملازم ہیں اور بیتول (جہاں ہمارا قیام رہتا ہے) بھوپال سے دو سو کلو میٹر دور ہی واقع ہے۔

ہندوستان میں ایسی ہی ایک لائبریری بنام کتب خانہ خدا بخش پٹنہ ہے جو تنہا ایک شخص کی ذاتی محنت اور کوشش کا نتیجہ ہے۔ مولوی خدا بخش خاں کوئی بہت زیادہ دولت مند شخص نہیں تھے۔ ایک وکیل تھے اور اپنی وکالت کے ذریعہ ہی اپنی گذر بسر کیا کرتے تھے لیکن انھوں نے اپنا سارا کمایا ہوا مال و زر اپنی ذاتی لائبریری کو سجانے سنوارنے میں لگا دیا جناب خالد عابدی صاحب بھی خدا بخش مرحوم کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ اپنی ریڈیو اسٹیشن والی نوکری سے ملنے والی تنخواہ سے اپنا گذارہ بھی کرتے ہیں اور مہنگی مہنگی کتابیں بھی خرید کر پڑھتے رہتے ہیں۔ کتابیں خرید کر پڑھنے کا شوق انھیں شروع سے ہی رہا ہے۔ اسی شوق نے ان کے پاس کتابوں کا ایک ڈھیر لگا دیا ہے اور اب ایک کثیر تعداد میں ان کے ذاتی کتب خانے کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ کتابوں کے وہ دیوانے ہیں، ہر گھڑی وہ جسمانی اور ذہنی طور سے کتابوں کے تعاقب میں رہتے ہیں اور کبھی کبھی کتابیں خود ان کا تعاقب کرتے ہوئے ان تک پہنچ جاتی ہیں۔

مکتبہ عابدیہ میں ہر قسم اور ہر موضوع پر کتابیں موجود ہیں۔ تاریخ، تحقیق اور تنقید پر کتابیں، اسلام، عیسائیت اور ہندومت پر کتابیں، فلم، مصوری اور فوٹوگرافی پر کتابیں۔ شکاریات، معاشیات

اور سیاسیات پر کتابیں۔ کارٹون سازی، خطاطی اور نفسیات پر کتابیں۔ بچوں، بڑوں اور عورتوں کے ادب پر کتابیں۔ غرض یہ کہ ہر اس موضوع پر یہاں کتابیں دستیاب ہیں جو قارئین کو چاہیے۔

خالد عابدی صاحب نے بھی اپنا قلم بھی رنگارنگ موضوعات پر اُٹھایا ہے اور نثر میں مختلف موضوعات پر کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ تحقیق و تنقید کے سلسلے میں ان کی دو کتابیں "مضامین خالد" اور "باغ فکر معروف بہ مقطعات نساخ" شائع ہو چکی ہیں اور تقریباً آٹھ دس کتابیں زیر ترتیب ہیں۔ طنزیہ و مزاحیہ ادب کے سلسلے میں ان کی ایک کتاب "شکایتاً عرض ہے" منظر عام پر آچکی ہیں ہے اور چند ایک آنے والی ہیں۔ اردو ڈراموں کے تین مجموعے 'بیکر آواز' 'آواز نما' اور 'لیکچر کے بغیر' چھپ چکے ہیں اور دو تین چھپنے والے ہیں۔ 'اردو انٹرویو' نام کی ایک کتاب آچکی ہے اور دو کتابیں زیر طبع ہیں۔ افسانوں کا ایک مجموعہ 'زخموں کے دریچے' شائع ہو چکا ہے اور ایک مجموعہ 'منی افسانے' چھپ رہا ہے۔ ان تمام کتابوں پر مشاہیر اہل قلم سے خالد صاحب داد بھی حاصل کر چکے ہیں اور مختلف اداروں اور اکادمیوں سے مالی تعاون اور انعامات بھی پا چکے ہیں۔

غرض کہ خالد صاحب کی باتیں بھی بہت سی ہیں اور کتابیں بھی بہت ساری ہیں۔ باتیں جو بہت پیاری ہیں اور کتابیں جو معیاری ہیں۔

● روزنامہ ندیم بھوپال، سنڈے ایڈیشن۔ ۹، جون ۱۹۹۶ء

بھوپال کے خدا بخش: خالد عابدی

ڈاکٹر جلیل الرحمن صدیقی

خالد عابدی سے میری شناسائی بہت پرانی ہے میں جب سیفیہ کالج بھوپال کا طالب علم تھا۔ اس وقت بھی ان سے ایک ''سیفین'' کی حیثیت سے واقفیت رہی سیفیہ کے کلچر پروگراموں میں خاص طور پر ''بیت بازی'' کے پروگرام میں انھیں بہت سرگرم دیکھا۔

خالد عابدی میری رہائش گاہ سے موتی مسجد اور نقار خانے کے درمیان واقع مفتی ہاؤس سے کچھ ہی فاصلے پر ہوا محل روڈ پر رہتے تھے۔ اکثر ملاقاتیں ہوتیں اور آمنا سامنا ہوتا تھا۔ میرا خالد عابدی کے زیادہ قریب آنے یا خالد عابدی کا مجھ تک آنے کا سلسلہ 'ریڈیو بھوپال' ذریعہ بنا۔

آل انڈیا ریڈیو بھوپال سے ''بھوپالیات'' سیریز کے لئے مجھے خالد عابدی نے ایک موضوع دیا 'بھوپال کے ذاتی کتب خانے' میں ریڈیو کے لئے نیا نہیں یا نو وارد تو نہیں تھا پہلے بھی وہاں اکثر ریکارڈنگ میں جانا ہوتا تھا۔ بھوپال میں ذاتی کتب خانے موضوع کے لئے میں نے کافی محنت کی اور بھوپال شہر کے ذاتی کتب خانے جو بہت اہم اور خصوصی حیثیت رکھتے تھے ان کتب خانوں تک پہنچا مثلاً ابراہیم یوسف صاحب مرحوم کا ذاتی کتب خانہ اس وقت وہ حیات تھے ان سے ڈرامے کی کمیاب کتابوں کے سلسلہ میں دیر تک گفتگو ہوئی اور مجھے ڈرامے سے متعلق بہت اہم معلومات حاصل ہوئیں۔ ابراہیم صاحب کے کتب خانے میں ڈراما خصوصیت سے اردو ڈرامے کی تاریخ پر بقول ان کے بہت نادر کتابیں ہیں انھیں ان میں چند نسخے تو بہت قدیم تھے کہ ہندوستان کے دوسرے کتب خانوں میں مشکل ہی سے دستیاب ہو سکے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے وارثین نے یہ نادر کتابیں مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی لائبریری میں جمع کر دیں جہاں ان کا بہتر استعمال ہو سکے گا میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کا قابل قدر اور قابل تحسین فیصلہ تھا۔

پروفیسر آفاق احمد صاحب کے ذاتی کتب خانے میں بہت قیمتی کتابیں تھیں ان میں بیشتر کتابیں اردو ادب سے متعلق ریسرچ اسکالرز کے لئے محفوظ تھیں۔ ان کتابوں کو میں نے دیکھا بعض کا مطالعہ بھی کیا اُن میں زیادہ تر کتب انڈو پاک کے نامی گرامی شعراء، ادباء، نقادوں کے دستخط

کوئی ریمارک، کوئی یادداشت کتاب کے ابتدائی اوراق میں درج ہیں جو دراصل ایک تاریخی ادب کا ایک حصہ ہیں اور اس طرح نوٹ تحقیق میں انتہائی مفید اور مددگار بن جاتے ہیں۔ آفاق صاحب نے بھی اپنی وہ کتب جوان کی عمر دراز سے ساتھ تھیں اور عزیز تھیں مدھیہ پردیش اردو اکادمی کو نذر کر دیں۔ کتب خانوں کی تلاش کے سلسلہ میں میں نے ڈاکٹر ابو محمد سحر صاحب مرحوم، پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب، ڈاکٹر حامد حسین صاحب مرحوم، پروفیسر شفیقہ فرحت صاحبہ کے ادبی ذخیرے کا جائزہ لیا متذکرہ تمام ذخائر کتب ادبی حیثیت سے بہت اہمیت اور خصوصیت کے حامل ہیں۔

مضمون کے آخری حصہ میں مکتبہ عابدیہ کا ذکر کیا گیا تھا مکتبہ عابدیہ کے جائزے میں مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ مضمون کی طوالت کے سبب ریڈیو سے نشر ہونے والے پروگرام میں نہیں دی جا سکیں اور نہ صرف بھوپال بلکہ پورے صوبے میں مکتبہ عابدیہ کی ادبی خدمات پیش کی جا سکیں۔ یہ مضمون آل انڈیا ریڈیو بھوپال سے نشر بھی ہوا اور بعد میں ڈاکٹر رضیہ حامد صاحبہ کی اہم کتاب 'نقوش بھوپال' سہ ماہی فکر و آگہی کا بھوپال نمبر میں شائع بھی ہوا۔

اب یہاں مکتبہ عابدیہ کی ادبی خدمات کے تمام تر گوشوں اور حصوں کو 'بھوپال کے خدا بخش خالد عابدی' کے عنوان میں سمیٹ کر یکجا کیا گیا ہے تا کہ اردو زبان اور ادب کی ترویج و ترقی میں مکتبہ عابدیہ کی خدمات کو واضح کیا جا سکے۔ اردو زبان و ادب کے محافظ اس شہر میں اس کی موجودگی کو اجاگر کیا جا سکے تا کہ ریسرچ اسکالرز زیادہ سے زیادہ اس سے فائدہ حاصل کر سکیں۔

خالد عابدی کے کتب خانے 'مکتبہ عابدیہ' کا حال ہی کچھ اور ہے۔ یہ کتب خانہ برسوں سے ان کے شکستہ اور بوسیدہ مکان کے ایک تنگ کمرے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ کتابوں کے انبار الماریاں رکھنے کے لئے جگہ کی کمی میں اکثر مطالعہ کے لئے کتابیں لینے ان کے گھر جاتا تھا باہری پٹیے پر بیٹھ کر خالد عابدی سے باتیں ہوتی تھیں بہر صورت وقت گذرتا گیا خالد عابدی کے کتب خانے میں کتابوں کی تعداد بڑھتی رہی کتابوں کی گنتی اب الماریوں کی تعداد میں بڑھتی جا رہی ہے۔ اس وقت تک خالد عابدی نے لائبریری کے کیٹلاگ کا کام شروع نہیں کیا تھا۔ لیکن اب کیٹلاگ تیار کرنے کا کام بھی آخری مراحل میں ہے۔ وہ ایک اچھے خوش نویس بھی ہیں اس لئے لائبریری کے تمام رجسٹر بقلم خود ترتیب دے رہے ہیں۔

خالد عابدی ایک ذہین، محنتی اور نرم مزاج انسان ہیں۔ قدرت کی عطا کردہ صفات میں مروت، رحم دلی اور نرم مزاجی کچھ زیادہ ہی حصے میں آ گئی ہے۔

ضرورت سے زیادہ سیدھا پن اور نرم مزاجی بھی انسان کی جان پر کئی طرح کی مشکلیں کھڑی

کردیتی ہے بہر صورت یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے کہ مکتبہ عابدیہ کی کتب خود لوگوں کے گھروں تک لے جاتے ہیں۔ بعد میں ہزار تقاضوں کے بعد خود ہی کتابیں واپس لاتے ہیں ان میں بعض پھٹی ہوئی حالت میں بھی ہوتی ہیں۔ بہر حال شب و روز کی مصروفیات میں ان کا یہ کام یہ ادبی خدمت بھی جاری ہے۔ان کی ذہانت اور یادداشت کا یہ حال ہے کہ وہ خود ایک موبائل لائبریری کی طرح ہیں جو بروقت اور برجستہ ادبی معلومات فراہم کرنے پر قادر ہیں۔ یہی ان کی وہ ادائے دلربانہ ہے جو دوستوں اپنوں اور پرائیوں کو انکا ہردلعزیز بنائے ہوئے ہے۔

اس وقت جبکہ میں خالد عابدی کی کتابوں کے اس عظیم ذخیرے کتب خانہ مکتبہ عابدیہ کے بارے میں اپنے تاثرات پیش کرنے جارہا ہوں میرا ذہن لحہ بھر کے لئے تقریباً آج سے ۹ سال پہلے حیدر بیابانی کی اس تحریر پر چلا گیا۔ وہ اپنے مضمون میں تحریر فرماتے ہیں' خالد عابدی کی باتیں اور کتابیں'۔

''جناب خالد عابدی صاحب بھی خدا بخش مرحوم کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اپنی ریڈیو اسٹیشن والی نوکری سے ملنے والی تنخواہ سے اپنا گذارہ بھی کرتے ہیں اور مہنگی مہنگی کتابیں بھی خریدتے رہتے ہیں کتابیں خرید کر پڑھنے کا شوق ان کو شروع سے ہی رہا ہے۔اس شوق نے ان کے پاس کتابوں کا ایک ڈھیر لگادیا ہے اور اب کثیر تعداد ان کے ذاتی کتب خانے کی زینت بنی ہوئی ہیں''

خالد عابدی نے اس کتب خانے کو خوب سے خوب تر بنانے میں اپنی عزیز عمر کے ۳۵ سال صرف کئے ہیں۔انھوں نے ہزار مشکلات کے درمیان جس صبر و تحمل اور انہماک کے ساتھ اس کتب خانے کو اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے وہ خود ان کی دن رات کی محنت مشقت اور جدو جہد کی ایک عظیم مثال ہے وہ مکتبہ عابدیہ کی اہم ذمہ داریوں کو انتہائی خوش اسلوبی کے ساتھ آگے بڑھاتے ہوئے تن تنہا اس مقام تک آئے ہیں، اور یہ سب کچھ کام ایک فرد واحد کا ہے۔ پندرہ سولہ الماریوں میں محفوظ مکتبہ عابدیہ کے کتب خانے کو بھی ایک بڑے کمرے ایک بڑی جگہ۔ لائبریری سے متعلق کام سے واقف چند افراد اور ایک بڑے سرمائے کی ضرورت ہے۔ جن کی بنیاد پر اس کو ایک بڑا ریسرچ سینٹر بنایا جاسکے۔مکتبہ عابدیہ میں قدیم اور جدید کتابوں کے عظیم ذخیرے کے جائزے سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ مکتبہ عابدیہ صوبے کے اعلیٰ کتب خانوں میں اور اس کی فہرست میں شامل کیئے جانے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔

مکتبہ عابدیہ میں کتب کا یہ سرمایہ موجودہ وقت میں نہ صرف بھوپال بلکہ ملک بھر کے مشاہیر کی توجہ کا مرکز بنتا جارہا ہے۔ یہ بات ملک کے ان مشاہیر کے تاثرات سے ظاہر ہوتی ہے جن میں ملک کی نامور ہستیاں ہیں مثلاً سرسوتی سرکیف، ڈاکٹر رحمت یوسف زئی، اقبال نیازی، ڈاکٹر خلیق انجم ڈاکٹر

وقار الحسن صدیقی مقامی حضرات میں اقبال مجید صاحب، سید شرافت علی ندوی، عارف عزیز صاحب کوثر صدیقی صاحب اور سعید اختر صاحب کے تاثرات اس کتب خانے کے رجسٹر میں درج ہیں۔ میرے ذہن میں اس وقت ملک کے نامور ادیب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب کے وہ تاثرات ہیں جو انھوں نے خالد عابدی کے لئے تحریر فرمائے تھے ''خالد عابدی نے ادبی علمی کتابوں کا جو ذخیرہ جمع کیا ہے وہ دوسروں کے لئے مثال کا درجہ رکھتا ہے'' اس طرح کے تاثرات خالد عابدی کے کاموں کی عظمت اور اس کی بلندیوں کا احساس کراتے ہیں کہ وہ ایک کتب خانے کی شکل وصورت کو ایک ریسرچ سینٹر میں تبدیل کرنے کی ایک بڑی ذمہ داری کو پورا کرنے میں سرگرم عمل ہیں۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نہ صرف بھوپال بلکہ صوبے بھر کے ادبی حلقوں میں ممتاز اساتذہ اور دیگر ادبی شخصیات میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے مکتبہ عابدیہ کی کتابوں سے استفادہ نہ کیا ہو۔ اس کے رجسٹر دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پورے صوبے میں لوگوں اور خاص طور پر اردو ادب کے ریسرچ اسکالروں کو ان کے تحقیقی کاموں میں مکمل اور بغیر کسی مالی فائدے کے تعاون دیا ہے اور یہ کام ہنوز جاری ہے اور یہ عمل مکتبہ عابدیہ کے لئے یقیناً قابل فخر ہے۔ کئی ریسرچ اسکالرز نے اس سے استفادہ کیا ہے۔

تحقیق کے سلسلہ میں مکتبہ عابدیہ نے اردو ادب کی خدمت اور اپنی فرض شناسی کی اہم مثال قائم کی ہے کئی اسکالرز نے اپنے مقالات کے دیباچوں میں مکتبہ عابدیہ کے پر خلوص تعاون کا اعتراف کرتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا ہے۔ مکتبہ عابدیہ کی کتابوں کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ بھوپال کے ادبی حلقوں میں شاید ہی کوئی شخصیت ایسی بچی ہو جس نے اس ادارہ سے فیض نہ اٹھایا ہو۔ ان کے رجسٹر دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ مکتبہ عابدیہ کی مقبولیت نہ صرف بھوپال بلکہ پورے صوبے تک جاچکی ہے۔ فیضیاب ہونے والوں میں یا مطالعہ کے لیے ضرورت مند اصحاب میں مفتی جنید صدیقی مرحوم ابراہیم یوسف صاحب، ڈاکٹر ابو محمد سحر صاحب۔ ڈاکٹر حامد حسین صاحب، پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب، ڈاکٹر بشیر بدر صاحب، اقبال مجید صاحب، کوثر صدیقی صاحب، ڈاکٹر رضیہ حامد صاحبہ، پروفیسر انیس سلطان صاحبہ، عارف عزیز صاحب، مرضیہ عارف صاحبہ، نعیم کوثر صاحب، نئی نسل کے لکھنے والوں میں صبیحہ صدیقی صاحبہ وغیرہ رہے ہیں۔ موجودہ حالت میں مکتبہ عابدیہ کا کتب خانہ اپنی کمیاب کتابوں کے باعث بھی یاد رکھا جارہا ہے۔

خالد عابدی کا مکتبہ عابدیہ ادبی خدمات کا ایک قابل رشک، قابل قدر اور قابل تقلید کارنامہ انجام دے رہا ہے جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ کسی بھی لائبریری یا کتب خانے

کا کیٹلاگ اہم ہوا کرتا ہے۔ کیٹلاگ جتنا سائنٹفک ہوگا عوام کو سہولت زیادہ میسر آئیں گی اور یہ کمی آج کے کمپیوٹرائز عہد نے کافی حد تک پوری کردی ہے۔ مکتبہ عابدیہ کا کیٹلاگ کمپیوٹرائز تو نہیں ہے لیکن کمپیوٹر سے کم بھی نہیں ہے مکتبہ عابدیہ میں اس وقت کتابوں کی ۱۶ الماریاں ہیں جو کتابوں سے بھری ہوئی ہیں۔ جس کا کیٹلاگ خالد عابدی ایک عرصے سے تیار کرنے میں شب و روز مصروف ہیں مکتبہ عابدیہ کی الماریوں میں محفوظ کتابوں کے اس عظیم ذخیرے میں، تاریخ، تذکرہ، شخصیت، سوانح خودنوشت، سرگزشت، ڈائریکٹری، کوائف نامے پر مشتمل کیٹلاگ ہے۔ جس میں ایک منصوبہ بند طریقہ پر اس کو ترتیب دیا گیا ہے اس میں، کتابوں کے نام، مصنف، مرتب کا نام، ناشر، پبلشر، ادارہ پریس کا نام، سن اشاعت اور آخر میں کیفیت کا کالم دیا گیا ہے۔ خالد عابدی انتہائی ذہین اور محنتی انسان ہیں۔ کیٹلاگ کی ترتیب میں ان کا قائم کیا ہوا کیفیت کا خانہ بہت اہم اور خصوصی نوعیت کا ہے۔ خاص طور پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے بہت اہمیت کا حامل ہے۔

کتاب سے متعلق اس کالم میں بہت اہم معلومات درج ہیں مثلاً کتاب کے ایڈیشن کے بارے میں، اس میں دی گئی تصویر یا پیش لفظ، مطبع سرورق کاتب، خوش نویسی کے بارے میں اہم معلومات درج ہے۔ ان کے رجسٹر سے حاصل کی گئی تحریر مثلاً کتاب کا ذکر کتاب کا نام "ارباب سخن" مصنف حسرت موہانی، مرتب ڈاکٹر احمد لاری، کتاب نمبر ۳۲۳ میں کالم کیفیت اور خصوصی نوٹ میں لکھا ہے "شعراء کا شجرہ اور سلسلہ شاگردان" درج ہے یہ ایک اضافی معلومات ہے جو محقق کے لئے کافی کارآمد ثابت ہوتی ہے ایک اور کتاب کی مثال دیکھیے۔ "کتاب" جگناتھ آزاد "فکروفن" کتاب کا نمبر ۲۹۰ کیفیت کے خانے میں درج ہے کہ "جگناتھ آزاد کا شجرہ نسب بھی ہے" بعض کیفیات کتب میں کتاب کے سرورق پر ٹائٹل بنانے والے آرٹسٹ کا نام بھی درج ہے۔ اسی طرح ایک اور کتاب کے بارے میں درج ہے" اردو ادب میں علامت نگاری کتاب نمبر ۶۵۲ کا ٹائٹل صادقین نے بنایا ہے ایک کتاب میں جگر مرادآبادی کا آرٹ ہے یا سلام خوش نویس کا نام درج ہے۔ اسی طرح ایک اور کتاب کی تفصیل، کیفیت کے خانے میں درج ہے۔ جو ایک تاریخی سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ پروفیسر آفاق احمد صاحب کی کتاب "امانت قلب و نظر" کتاب (ت۔م۔۲۶۸) میں درج ہے مجروح سلطان پوری کے الفاظ میں ابھی تک دو مشاعرے ہوئے ایک کتابی صورت میں دلی کا آخری یادگار مشاعرہ اور دوسرا بھوپال کے لال پریڈ گراؤنڈ پر منعقد ہونے والا مشاعرہ جس میں ایک لاکھ سے زیادہ سامعین نے آج بھوپال کی ہر راہ لال پریڈ کو جاتی ہے کو سچ کر دکھایا" مکتبہ عابدیہ کے کاموں پر ہی منحصر نہیں ہے انھوں نے جس کام کو بھی اپنے ہاتھ

میں لیا اسکو اسی ماہرانہ انداز میں بہتر سے بہتر حالت میں اور طریقے سے انتہائی خوش اسلوبی کے ساتھ کیا۔ وہ انتہائی محنتی اور ذہین انسان ہیں۔ ان میں جدت اور اختراع کی بے پناہ صلاحیتیں موجود ہیں۔ عام طور پر یہ بات لوگوں پر ظاہر نہیں ہے کہ وہ ایک اچھے خوش نویس بھی ہیں یہ خصوصیت اپنے کام میں گہری دلچسپی اور لگن کو ظاہر کرتی ہے۔ انھوں نے خاص طور پر خوش خطی یا خوش نویسی کو سیکھا ہے گو کہ وہ اس میں مہارت حاصل نہ کر پائے ہیں بہر صورت انھوں نے اپنے کتب خانے کے رجسٹروں کو جس صفائی، جس خوش اسلوبی کے ساتھ تکمیل تک پہنچایا ہے وہ ان کے کام میں ان کے انہماک اور گہری لگن کو اجاگر کرتی ہے۔ خالد عابدی اپنی کتابوں پر برجستہ تحریریں بھی لکھتے ہیں اس کا اظہار ان کے کیٹ لاگ کے کیفیت اور "خصوصی نوٹ" کتابوں کے حاشیوں سے ظاہر ہوتا ہے یہ ان کے انہماک کی ایک روشن مثال ہے۔

یہاں میں ان کے مکتبہ عابدیہ کے کتب خانے کے کیٹ لاگ اور ان رجسٹروں کو تفصیلی انداز میں بیان کرنا چاہتا ہوں

(۱) "رجسٹر، خریداری رسائل اور اخبارات": ۔ مکتبہ عابدیہ بھوپال کا یہ رجسٹر ان رسائل و اخبارات پر مبنی ہے جو ماہنامہ، دو ماہی، سہ ماہی اور شش ماہی ہیں۔ یہ رسائل اور اخبارات بھوپال کے کتب فروشوں کے یہاں تو دستیاب نہیں ہیں، پیشگی رقم پہنچا کر سالانہ خریدار بن کر رسائل حاصل ہوتے ہیں۔ اس وقت درج ذیل رسائل مکتبہ عابدیہ بھوپال میں آرہے ہیں۔ ماہنامہ آج کل (اردو) دہلی، ماہنامہ نیا دور (اردو) لکھنؤ، ماہنامہ شاعر بمبئی، ماہنامہ ایوان اردو دہلی، ماہنامہ اُمنگ دہلی (بچوں کا رسالہ) ماہنامہ مریخ پٹنہ، ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڈھ ماہنامہ اردو دنیا دہلی، ماہنامہ طلسماتی دنیا، ماہنامہ اردو بک ریویو دہلی، ماہنامہ یوجنا (اردو) ماہنامہ قومی زبان حیدر آباد، ماہنامہ تعمیر ہریانہ چنڈی گڈھ ماہنامہ انشاء، ماہنامہ رہنمائے تعلیم دہلی، دو ماہی گلبن لکھنؤ سہ ماہی تمثیل بھوپال سہ ماہی تمثیل نو در بھنگا سہ ماہی کاروان ادب بھوپال، سہ ماہی اردو ادب دہلی، سہ ماہی نخلستان جے پور سہ ماہی روح ادب کلکتہ، سہ ماہی جمناتٹ چنڈی گڑھ سہ ماہی سائنس کی دنیا دہلی، سہ ماہی نیا سفر دہلی شش ماہی غالب نامہ دہلی، شش ماہی فکر و تحقیق دہلی پندرہ روزہ صدائے اردو بھوپال ہفت روزہ ہماری زبان دہلی۔

متذکرہ بھی رسائل کی جلد بندی بھی ہوتی رہتی ہے ضخیم اور خصوصی شماروں کی جلد علیحدہ بنتی ہے۔ رسائل اور کتابوں کی جلد بندی پر ہزار روپیہ سال کے مصارف آتے ہیں۔ ایک ایک رسالے کا فائل سو سوا سو روپے کا پڑتا ہے اس ذخیرے کو دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مذکورہ جملہ رسائل میں

سے کچھ سیلاب اور الماریوں میں دیمک لگنے سے ضائع بھی ہو گئے ہیں

(۲) ''رجسٹر برائے خطوط، مکاتیب رقعات و مراسلات'':۔ اس رجسٹر میں خطوط و مکاتیب کے مجموعوں کی تفصیل اس طرح ہے کہ کتاب کا نام، مصنف، مولف و ناشر کا نام۔ مطبع کا نام سال اشاعت مکتوب نگاران و مکتوب الیہ کے نام ہیں۔ مکتبہ عابدیہ کے رجسٹر میں کلیات مکاتیب اقبال مرتب سید مظفر حسین برنی کی چار جلدیں اور غالب کے خطوط مرتبہ خلیق انجم کی پانچ جلدیں اور تقریباً بھی مشاہیر کرام کے خطوط کے مجموعے ہیں۔

(۳) ''رجسٹر برائے صحافت'':۔ یہ رجسٹر اردو، ہندی صحافیوں اور صحافت پر مبنی کتابوں پر ہے۔ اس وقت تقریباً ۵۸ کتابوں کا اندراج ہو چکا ہے اردو صحافت پر جس کتاب کو پہلی کتاب کہا گیا ہے وہ ''فن صحافت از چودھری رحم علی ہاشمی'' (۱۹۴۳ء) کتاب بھی ہے۔ امداد صابری کی صحافت پر اہم اور ضخیم کتاب ''تاریخ صحافت اردو'' کی پانچ جلدوں میں سے محض دو جلدیں ہیں۔ کئی صوبوں اور شہروں کے نام پر صحافت کی کتابیں درج ہیں۔ اسی کے ساتھ صحافت کے فن صحافت کی تاریخ کے علاوہ نامور اور اہم اخبار و رسائل پر کتابیں اور اشاریہ بھی ہیں۔

(۴) ''رجسٹر اردو کتب کے تنقیدی و تحقیقی مضامین'':۔ اس رجسٹر کی نوعیت یہ ہے کہ مکتبہ عابدیہ کے ذخیرے کی وہ کتابیں ہیں جن میں مختلف موضوعات پر مضامین شامل ہیں۔ خواہ وہ تنقیدی ہوں یا تحقیقی یا تاثراتی وغیرہ کتاب پر حوالہ نمبر (ت۔م/۔۔۔۔) درج ہے کتاب کا مصنف، مولف، مرتب، مترجم، ناشر، سنِ اشاعت مطبع، تمہید، پیش لفظ، مقدمہ نگار کا نام درج ہے کتاب کی فہرست نقل ہے۔ اس کے علاوہ دیگر موضوعات کے رجسٹروں کی طرح اس رجسٹر میں بھی ''خصوصی نوٹ'' فہرست کے آخر میں درج ہے یہ خصوصی نوٹ (کسی کسی کتاب پر) دو طرح کے ہیں۔ ایک تو خود خالد عابدی نے جو بھی کتاب سے اور اس کے مشمولات سے تاثر قبول کیا ہے اور کتاب میں سے کوئی اقتباس ضروری سمجھا ہے تو اسے ''خصوصی نوٹ'' کے تحت درج کر دیا ہے مثلاً کتاب نمبر ت م/۱ ''غالب حیات اور اردو شاعری کی تنقیدی تحقیقی یہ کتاب ڈاکٹر سید عبدالطیف پی ایچ۔ ڈی لندن کی انگریزی ترجمہ ہے۔ مترجم سید معین الدین قریشی ایم۔ اے (عثمانیہ) ہیں۔ اب اس کتاب کا خصوصی نوٹ ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) ''میں نے دیوان غالب کے اس نسخہ سے بہت مدد حاصل کی جو ۱۲۳۷ھ۔ ۱۸۲۱ء کا لکھا ہوا ہے۔ سرکار بھوپال نے از راہ فیاضی مجھے یہ نسخہ مستعار فرمایا تھا۔'' ص ۷

(۲) حالی اور بجنوری، غالب کے سمجھنے میں اپنے علم و فضل کو تو خوب سمجھا گئے لیکن خود غالب کے

ذہن وکمال کی مکمل تصویر پر نہ کھینچ سکے'' ص ۱۱ خصوصی نوٹ (بھی رجسٹروں میں) کے تحت دلچسپ اور اہم معلومات درج کی ہے۔ اس رجسٹر میں تادم تحریر ۲۸۴ کتب درج ہو چکی ہیں۔

کتاب ''اقبال کی خامیاں'' (ت۔م/ ۲۷۷) کے خصوصی نوٹ سے جوش ملسیانی کے ایک اور قلمی نام کا انکشاف ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں

''اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا تھا مصنف حضرت جراحؔ (جوش ملسیانی) اور مرتبہ نوہریا رام دردنکودری تھے دردنکودری نریش کمار شادؔ کے والد تھے''

(۵) ''رجسٹر، قلمی مخطوطات قلمی کتابیں قلمی رسالے'':۔ مکتبہ عابدیہ کے ذخیرہ کتب میں قلمی ۲۹ کتابوں کی فہرست پر مشتمل ایک رجسٹر ہے۔ جس میں کلیات، دیوان کیفی کا کوری انتخاب الشعراء۔ نسخہ فقۂ ہندی (اردو) از شیخ عبدالکریم خطیب قلعہ رائسین رسالہ عروض فارسی نسخہ تذکرہ الشعراء، مراۃ التخیال از شیر خاں لودھی عہد ریاست نواب حیات محمد خاں بہادر درج ہیں۔ اس رجسٹر میں نمبر شمار مخطوطہ، بیاض، قلمی کتاب کا ایک کالم علیحدہ کالم میں عنوانات کے تحت معلومات درج ہیں۔

(۶) ''رجسٹر برائے لغات، شرح، تبصرے، انشائیہ، قواعد، محاورات'':۔ پہیلیاں، اصلاحات، مخطوطات، تلمیحات وغیرہ۔

(۷) ''رجسٹر طنز ومزاح'':۔ اس رجسٹر میں ۳۰ کتابیں ہیں طنزیہ، مزاحیہ ادب پر اردو، ہندی کتابیں ہیں۔ اس رجسٹر کو دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ طنزیہ ومزاحیہ ادب سے متعلق ہمہ قسم کے موضوعات پر کتابیں ہیں۔ ایم۔ اے۔ ایم فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالات لکھنے والے طلباء کے لئے یہ ذخیرہ بہت مفید ثابت ہوسکتا ہے۔

(۸) رجسٹر ''تاثرات'':۔ تاثرات سے متعلق ایک رجسٹر ہے۔ جس پر مقامی وبیرونی حضرات کے (مکتبہ عابدیہ سے متعلق) تاثرات درج ہیں کہ مہمان نے ان کتابوں وغیرہ کو دیکھ کر کیا محسوس کیا ہے۔

(۹) بچوں کے رسالوں کتابوں کا رجسٹر:۔ بھی موجود ہے۔ جس سے اطفال ادب پر لکھنے والے حضرات استفادہ حاصل کر سکتے ہیں۔

(۱۰) رسائل کے خصوصی نمبرات کا رجسٹر بھی ہے۔

(۱۱) ایک رجسٹر Issued Register بھی ہے۔ جس شخص کو کتاب وغیرہ دی جاتی ہے

وہ اس میں نام کے ساتھ درج کردی جاتی ہے۔

مکتبہ عابدیہ کے رجسٹروں کی تفصیل پیش کی گئی ہے جس میں ذخیرہ کتب کو مختلف رجسٹروں میں منقسم تو کیا ہی ہے۔ لوگوں کی سہولت کی خاطر ابھی اصناف پر رجسٹر بنانے (کیڈلاگ سازی) کا عزم مصمم کرنے والے خالد عابدی ابھی ڈراما، فلم، افسانہ، ناول، داستان، رپورتاژ، شاعری، خطوط، طب، مذہبیات، پر بھی رجسٹر تیار کئے جانے کا ارادہ ظاہر کر چکے ہیں کیڈلاگ سازی کے بعد مدھیہ پردیش کے متعدد شہروں کی جو بے ترتیب فائلیں ہیں انھیں باترتیب کیا جائے گا۔

مکتبہ عابدیہ کے کیڈلاگ کا میں نے جو جائزہ لیا ہے ابھی وہ مکمل نہیں ہے۔ کیونکہ کتابوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے سولہ الماریوں میں بھری کتابوں کی تفصیل مختلف رجسٹروں میں درج ہونا باقی ہے۔ جس کا کام جلد ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔ خالد عابدی کے مکتبہ عابدیہ اور اس کے کئی رجسٹروں کو دیکھنے کے بعد میرے محسوسات یہ ہیں۔

۱۔ خالد عابدی کے کتب خانے کو ایک بڑی جگہ کی ضرورت ہے۔

۲۔ کتابوں کے اس عظیم ذخیرے کو مختلف اصناف اور شعبوں میں تقسیم کر کے رکھنے کے لیے الماریوں کی مزید ضرورت ہے۔

۳۔ مکتبہ عابدیہ کی کتب کو ترتیب دینا اب ایک مشکل مسئلہ بن گیا ہے۔ اس کے کام کے پھیلاؤ کو دیکھتے ہوئے ایک ٹرینڈ لائبریرین کی بھی ضرورت ہے۔ اس کے لئے ایک بڑے سرمائے کی ضرورت ہے جو خالد عابدی کی قدرت سے باہر ہے۔

۴۔ اس کتب خانے میں تحقیقی کاموں کو انجام دینے اور اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کمیاب اور نایاب کتب اور مخطوطات کا تحفظ بھی ضروری ہے۔

اس لحاظ سے یہ کتب خانہ ایک بڑے ریسرچ سینٹر میں تبدیل کئے جانے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ یہاں خالد عابدی اور ان کے مخلص دوستوں کے سامنے ایک مسئلہ یہ ہے کہ اخراجات کس طرح برداشت کئے جائیں۔ اس کار خیر کے لئے ماضی میں تو اردو کی خدمت انجام دینے سے متعلق اپنی ذاتی جائیداد کو اردو کی ترویج و ترقی میں صرف کرنے کی عظیم مثال بابائے اردو ایم۔ عرفان صاحب مرحوم پیش کر کے چلے گئے۔

بھوپال میں انگلیوں پر شمار کئے جانے والوں میں خالد عابدی بھی ہیں۔ جو اپنے مقصد اور تحریک میں دن رات مصروف رہتے ہیں۔ ایم عرفان صاحب مرحوم۔ ڈاکٹر رضیہ حامد صاحبہ اسی زمرے میں آتے ہیں جنھوں نے اپنے کام اردو کی خدمت سے اپنی ایک شناخت اور اپنی ایک

پہچان بنائی ہے اور اپنی زندگی اردو کی خدمت کے لئے وقف کر دی۔ خالد عابدی مکتبہ عابدیہ کو اس مقام تک لے آئے ہیں۔ جس کا اعتراف نہ صرف بھوپال شہر بلکہ صوبے کے اور ملک کے ادیبوں اور شاعروں کو بھی ہے۔

خالد عابدی کے علاوہ کیا کوئی اور بھی شخص ہے؟ بھوپال میں قیمتی سے قیمتی کتاب خریدنے والا ہو۔ بھوپال کے کتب فروشوں اور براہ راست باہر سے کتابیں منگانے والا ہو۔ کتابوں کی ایڈوانس بکنگ کرانے والا ہو۔ ملک بھر کے زیادہ سے زیادہ رسائل خریدنے والا ہو، نظر ٹھہرتی ہے تو ایک جنونی انسان، خالد عابدی پر جو اردو زبان وادب کی خدمت میں سرگرداں ہے۔

آخر میں اس حقیقت کا اظہار کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں جسے عام طور پر زیادہ تر حضرات سرسری نظر سے دیکھتے ہیں کہ ریسرچ اسکالرز کو اپنے تحقیقی کام کرتے وقت یا اس کی تکمیل کے سلسلہ میں بعض ایسی اہم باتوں کی تصدیق یا سند کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کے موضوع سے متعلق ہوتی ہے اور جو ضروری معلومات انھیں درکار ہوتی ہے مثلاً، قدیم شخصیات کے فوٹو، ان کی قلمی تحریریں جو ان کتابوں پر ان کے حاشیوں پر درج رہتی ہیں۔ یا ان کے دستخط، جائے پیدائش، سن پیدائش، تاریخ وفات، تخلص، قلمی نام کی تصدیق، دیگر کتابوں کے حوالہ جات، ان سب کو حاصل کرنے کے لئے ریسرچ اسکالرز سرگرداں رہتے ہیں ایسی تمام تر سہولات بھوپال میں مکتبہ عابدیہ کے علاوہ اور کسی لائبریری یا ادارے میں موجود نہیں ہیں۔ خالد عابدی ان متذکرہ خدمات کو یا ادبی ضروریات کو بخیر خوبی غیر مشروط طریقوں پر بغیر کسی سے ایڈوانس فیس لئے بغیر قیمتی سے قیمتی سواد فراہم کر رہے ہیں۔ جو ان کی وسیع النظری، اخلاقی خدمت اور انسانی ہمدردی کی عظیم مثال ہے۔ خالد عابدی مستقبل میں مکتبہ عابدیہ کے لئے ایک تقریب بھی منعقد کرنے والے ہیں۔ اس تقریب میں وہ مکتبہ عابدیہ سے محبت رکھنے والوں سے تبادلۂ خیال کریں گے کہ ادارہ کے استحکام، اس کے تحفظ کے لئے کیا مناسب اقدام ہو سکتے ہیں۔

میں نے بہت غور وخوض کے بعد اپنے مضمون کا عنوان بھوپال کا خدا بخش قائم کیا ہے۔ اگر میرے قارئین کو کوئی اعتراض ہو تو وہ اس سے اچھا عنوان تجویز فرما دیں کیونکہ خالد عابدی بھی لائبریری کو "خدا بخش" کے نقش قدم پر لے جانے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔

خریدارِ ادب

ماسٹر اختر

تلاش و تحقیق ہی جب ہمارا مقدر ٹھہرا تو ہم نے سوچا کہ کیوں نہ ایک ایسی لائبریری دریافت کریں جو دنیا میں عجیب ترین ہو۔ اس مقصد کی تلاش میں ہمارا واسطہ بڑی عجیب و غریب لائبریریوں سے پڑا۔ مثلاً ایک بڑی قد آور ادبی شخصیت ہیں ان کی لائبریری بچوں کی گلک کی طرح ہے۔ انہیں مہینے میں درجنوں کتب و رسائل ملتے ہیں جنہیں موصول ہوتے ہی پڑھے بغیر وہ کتابوں کے کمرے میں پھینک کر دروازہ بند کر دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے جب کتاب اور رسائل کا ڈھیر کمرے کی چھت سے جا لگے گا تب وہ گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ والوں سے رجوع کریں گے اور شاید اس معنوں میں بھی وہ ایک ریکارڈ قائم کرینگے کہ کتب و رسائل کا اتنا بڑا انبار ایک بھی صفحہ کھولے بغیر وجود میں آیا۔ ان کا کہنا ہے کہ جس طرح ایک طالب علم فارغ التحصیل ہونے کے بعد کتابوں سے ہاتھ لگانا گناہ سمجھتا ہے اسی طرح ایک سچے ادیب کو اپنی حیثیت منوانے کے بعد دوسروں کی تحریرات پڑھنے کا گناہ نہ کرنا چاہیئے۔ اتنے اونچے خیالات اور اس انوکھے کلیکشن نے ہمیں اندر ہی اندر مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ ہم نے سوچا چلو مل گئی اپنی منزل لیکن جب ہم نے ایسی لائبریری دیکھی جہاں کتب و رسائل، ڈی۔ ڈی۔ ٹی اور چوہے مار دوائیں لائبریری کے دروازے کو تکلیف دیئے بغیر روشن دان سے اندر پھینک دی جاتی ہیں تو ہماری خوشی پر اوس پڑ گئی۔ میں نے سوچا جلد بازی سے کوئی فائدہ نہیں ہمیں صبر سے کام لینا چاہیئے ہمارا اور بھی عجیب و غریب لائبریریوں سے واسطہ پڑ سکتا ہے اس لئے جب ہم نے ظ۔ انصاری کے پورے فلیٹ کو معہ ان کے کتابوں میں دبا دیکھا یا مشفق خواجہ کو ان سے بھی زیادہ قابلِ رحم حالت میں دیکھا تو ہمیں قطعی کوئی حیرت نہ ہوئی اور ہم بہتر سے بہترین کی تلاش میں سرگرداں رہے۔

اکبر اپنی محبوبہ کو چند بیبیوں کے ساتھ بے پردہ دیکھ کر غیرت قومی سے محض محاورے میں گڑے تھے۔ لیکن ہم مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی میں اپنی محبوبہ یعنی اردو کو باورچی خانے کے پلیٹ فارم پر مُند حتا پستا اور واش بیسن میں منجھا دھلتا دیکھ کر وہیں سے بان گنگا میں چھلانگ لگانے والے تھے کہ اکیڈمی کے سکریٹری نے ہمیں یہ کہہ کر روک دیا کہ ہم کسی تقریب کے بغیر ایسا ہرگز نہیں ہونے

دیں گے۔ اگر خالی خولی جان ہی دینا ہے تو خالد عابدی کے گھر جا کر دو جہاں تمہاری چار پانچ ہزار محبوبائیں باورچی خانہ تو کیا باتھ روم میں بھی تمہارا استقبال کریں گی۔

اکیڈمی کے سکریٹری کا یہ انکشاف ہمیں رفع شر کی خاطر محض جھٹکا لگا۔ ہم خالد عابدی اور ان کی رہائش گاہ دونوں کی حدود اربع سے کچھ کچھ واقف تھے لیکن ہم یہاں بھی مات کھا گئے۔ خالد عابدی تو کچھ اور ہی چیز نکلے، ان کے بارے میں ہمارے سارے اندازے غلط نکلے۔ ان کے گھر میں داخل ہوتے ہی ہماری وہ کیفیت ہوئی جو چالیس چوروں کے خزانے کو دیکھ کر علی بابا کی ہوئی ہوگی۔ حیرت کا یہ پہلا شاک تھا جو خالد عابدی نے ہمیں دیا اور دوسرا شاک یہ تھا کہ کتب و رسائل کا یہ خزانہ چالیس چوروں کا جمع کیا ہوا نہ تھا بلکہ یہ ان کی محدود قلیل آمدنی سے خریدا ہوا تھا۔ قطرہ قطرہ دریا اور دریا کو سمندر ہوتے ہم نے خالد عابدی کے یہاں دیکھا۔ گویا وہ اپنے گھر میں یہ جوئے شیر تیشۂ مفلس سے لائے تھے۔ بہرحال جس لائبریری کی ہمیں تلاش تھی وہ ہم کو مل گئی تھی۔

یہ محاورہ تو ہم بہت پہلے سے سنتے آئے ہیں کہ فلاں چیز فلاں شخص کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ بس سنا ہی سنا تھا کبھی دیکھا نہ تھا۔ خالد عابدی نے عملی طور پر یہ ثابت کر کے ہمیں تیسرا شاک دیا۔ حقیقتاً اردو ہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ان کا بستر کتابوں کا ہے، تکیہ کتابوں کا ہے اور اوڑھنا ان معنوں میں کہ کبھی کبھی سوتے میں دھکا لگ جانے سے پلنگ کے آس پاس کتابوں کے ڈھیر ان سے بغل گیر ہو جاتے ہیں۔ اس گھر میں جدھر نگاہ ڈالو کتابیں ہی کتابیں نظر آتی ہیں۔

خالد عابدی کی لائبریری کی ظاہری بے ترتیبی میں بھی غضب کی ترتیب ہے جو اپنی جگہ خود ایک ریکارڈ ہے۔ جس طرح جدید لائبریریوں میں کمپیوٹروں سے کام لیا جاتا ہے۔ اس لائبریری میں خالد عابدی کی کارکردگی کا مظاہرہ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہوتا ہے۔ اگر آپ کی مطلوبہ چیز ان کے کلکشن میں موجود ہے تو ادھر آپ کے منہ سے نکلا نہیں اور اُدھر وہ چیز آپ کے ہاتھ میں ہوگی۔ یہ خود ہم نے آزما کر چوتھا شاک کھایا۔

خالد عابدی ایک پرستارِ ادب تو ہیں ہی وہ ایک اچھے ادیب بھی ہیں۔ ان تمام خصوصیات کی بنا پر وہ ہم سے بڑے اردو کے عاشق ہیں۔ اس لئے اردو کی بے آبروئی پر جان دینے کا حق بھی ہم سے زیادہ انہی کو پہنچتا ہے۔ بھلا ہو بیچارے اکیڈمی کے سکریٹری کا ورنہ ہم تو خواہ مخواہ ہی اپنی جان دیئے دے رہے تھے۔ اسی لئے ہم نے خالد عابدی کے گھر کے باتھ روم کا رخ نہ کیا ہمیں یقین تھا کہ وہ بھی کتابوں سے مزین ہوگا جو ہم سے دیکھا نہ جاتا اور ہم ایک اور شاک کھا کر وہیں بلا ارادہ ڈھیر ہو جاتے۔ اور یوں بھی ہم نے باتھ روم میں جھانکنے کی کوشش نہیں کی کہ ہم اپنی محبوبہ کی باتھ روم

میں نظارگی کے قطعی قائل نہیں۔

ہم نے دنیا کی انوکھی لائبریری تو دریافت کر لی لیکن اس دریافت سے بھی زیادہ خطرناک دریافت میں الجھ گئے کہ دراصل عجوبہ یہ لائبریری ہے یا اس کا موسس؟ اس اُلجھن سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے ہم نے خالد عابدی کا پیچھا کرنا شروع کیا تو ہمیں پتہ چلا کہ ان کا ہر قدم اُردو پر سے اُٹھتا ہے، اردو کے لئے اُٹھتا ہے اور اردو پر ہی پڑتا ہے۔ وہ ایک وقت کی روٹی تو کھانا بھول جاتے ہیں لیکن وقت پر کتب و رسائل خریدنا نہیں بھولتے۔ ان میں زندگی کے آرام و آسائش، اچھا کھانے، اچھا پہننے اور اچھا رہنے کی خواہش کا کوسوں پتہ نہیں ہے۔ ان کے دل میں صرف ایک ہی خاموش ایک ہی تمنا جاگزیں ہے اور وہ ہے زیادہ سے زیادہ کتابوں کا حصول۔ ہماری یہ حسرت ہی رہی کہ ہم کبھی ان کے ہاتھوں میں کتب و رسائل کے علاوہ بھی کوئی چیز دیکھیں زندگی کی دیگر ضروریات کے لئے بھی کبھی وہ سرگرداں نظر آئیں۔ ایک دن رمضان کے مہینے میں افطار کے وقت گھر کی جانب بھاگے جارہے تھے ان کے ہاتھ میں ایک تھیلی تھی جسے وہ اس طرح تھامے ہوئے تھے گویا گھر میں داخل ہونے کی جلدی ان کو نہیں تھیلی کو ہو۔ ہم نے سوچا اس تھیلی میں یقیناً افطاری ہوگی۔ ہم آج انھیں رنگے ہاتھوں پکڑ لینگے اور دنیا کو بتادینگے کہ وہ لائبریری یا ادب کی خدمت کے لئے بنایا گیا روبوٹ نہیں بلکہ انسان بھی ہیں۔ ہم نے انہیں روکا اور ہمیں پھر ایک زوردار شاک لگا۔ اس تھیلی میں بھی کتابیں تھیں، ہمارے ساری خوشیوں پر اوس پڑ گئی اور ہم صدمے سے وہیں ڈھیر ہو گئے۔ وہ سمجھے ہماری یہ حالت روزے کی وجہ سے ہو رہی ہے۔ وہ ہمیں سہارا دیکر اپنے گھر لے گئے افطار کا وقت ہوا وہ ایک ٹرے لئے ہوئے ہماری جانب بڑھے جس میں پانی کا ایک گلاس اور تازہ رسائل تھے۔ ہم نے سوچا کہ ہمیں خالد عابدی نے بالجبر اس نتیجے پر پہنچادیا ہے کہ عجوبہ ان کی لائبریری میں نہیں بلکہ وہ خود ہیں۔

ہمیں لفظ ادب کے سارے سابقے اور لاحقے ازبر یاد ہیں اور ادب والوں کی پوری گردان ہم نے گھول کر پی لی ہے اور پاسدار ادب سے لے کر آزار ادب تک بڑے بڑے بادبوں کو دیکھا ہے۔ چلّو بھر پانی میں اشنان کرنے والوں سے لے کر بحر بے پایاں میں ڈوب مرنے والوں تک کو ہم نے بھگتا ہے۔ لیکن یہ خالد عابدی کوئی اور ہی چیز ہیں۔ ہماری عقل کام نہیں کرتی کہ اس خریدار ادب کو کیا نام دیں۔

مکتبہ عابدیہ پر تاثرات

۱۔ اجیت سنگھ دیول (فلم اداکار)
۲۔ ماسٹر اختر
۳۔ اسد محمد خاں (کراچی (پاکستان)
۴۔ اشتیاق عارف
۵۔ افتخار امام صدیقی (مدیر شاعر ممبئی)
۶۔ اقبال مجید
۷۔ اقبال نیازی
۸۔ بشیر بدر
۹۔ جاوید عالم
۱۰۔ جاوید یزدانی
۱۱۔ ڈاکٹر خلیق انجم
۱۲۔ دنیش رائے
۱۳۔ ذاکر حسین (نیشنل آرکائیوز بھوپال)
۱۴۔ ڈاکٹر رحمت یوسف زئی
۱۵۔ ڈاکٹر رضیہ حامد
۱۶۔ رفعت سروش
۱۷۔ زبیر محمود
۱۸۔ سرسوتی سرن کیف
۱۹۔ پروفیسر سعید اختر
۲۰۔ ڈاکٹر سید حامد حسین
۲۱۔ سید شرافت علی ندوی
۲۲۔ حکیم سید ظل الرحمن
۲۳۔ ڈاکٹر سیفی سرونجی
۲۴۔ ڈاکٹر سید محمد حامد
۲۵۔ ڈاکٹر شفیقہ فرحت
۲۶۔ ظفر صہبائی
۲۷۔ عارف عزیز
۲۸۔ ڈاکٹر عمر فاروق
۲۹۔ کوثر صدیقی
۳۰۔ ڈاکٹر محمد احسن
۳۱۔ ڈاکٹر محمد انصار الحق
۳۲۔ محمد قریشی (پاکستان)
۳۳۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
۳۴۔ نعمت اللہ خاں ندوی
۳۵۔ ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی

- **اجیت سنگھ دیول** (فلم اداکار)

جناب محمد خالد عابدی صاحب خود بھی ایک یونیورسٹی ہیں ان کی اردو کتابوں کا ذخیرہ کسی بھی یونیورسٹی کی کتابوں کی لائبریری سے زیادہ ہے۔ میں ان کو بڑے ادب سے اپنا سلام پیش کرتا ہوں۔

۲۴ر جون ۲۰۰۶ء

- **ماسٹر اختر**

محمد خالد عابدی کے کتب و رسائل سے عشق کو دیکھ کر میں حیران ہوں کہ وہ اپنے مہنگے شوق کو آج بھی پہلے جیسے جوش و خروش سے اپنی قلیل آمدنی سے کس طرح جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی ہمت کی داد دینا پڑتی ہے۔ بلا شبہ ان کا یہ ایثار اپنی زبان سے ان کی والہانہ محبت کا ثبوت ہے۔ اگر کسی کو یہ دیکھنا ہو کہ قطرہ قطرہ دریا کس طرح بنتا ہے تو وہ خالد عابدی کے کلکشن کو دیکھے جواب ایک الگ ہی نوعیت کی لائبریری کی شکل اختیار کر چکا ہے۔

یہ میرا اپنا تجربہ ہے کہ میرے تحقیقی کاموں میں بعض اوقات جو حوالے مجھے کہیں نہ مل سکے، خالد عابدی کا بیش بہا سرمایہ فراہم کرتا رہا ہے۔

مجھے یقین ہے علم و ادب کے متوالے اُن کی اس لائبریری سے مستفیض ہوتے رہیں گے۔

- **اسد محمد خاں** (کراچی پاکستان)

عابدی صاحب کی لگن اور ان کی محنت اور کاوش دیکھ کر سیروں خون بڑھ گیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اردو علم و ادب کا ذخیرہ اکٹھا کرتے ہوئے انھوں نے وہ کام کر دکھایا ہے کہ جو کسی عام انسان کے بس کا کام نہیں تھا تو درست ہوگا۔

برسوں کی یہ کوشش کو جہاد برائے ادب اردو کا نام دیا جائے تو انسب ہے۔ میرے علم میں فی زمانہ ایسا کوئی انسان نہیں ہے۔ جس نے تن تنہا اس محنت اور زر کثیر کے صرف سے اس طرح کا کام کر دکھایا ہو۔ ان کے لئے دل سے دُعا نکلتی ہے۔

۲۹ر دسمبر ۲۰۰۶ء

- **اشتیاق عارف**

مجھے آج خالد عابدی کے نئے فلیٹ میں جانے کا موقع ملا۔ میں اپنی اس رائے سے پہلے

ہی خالد صاحب کو باخبر کر چکا ہوں کہ بھوپال میں اردو کے عاشق زار اور سچے خدمت گزار دو حضرات ہیں ایک محترم عبدالقوی دسنوی اور دوسرے خالد عابدی، باقی تو اردو کو ذریعہ معاش بنائے ہوئے ہیں اور پیٹ کی سلطنت میں مست ہیں۔ مجھے ان کی لائبریری کو دیکھنے اور جستہ جستہ کتابوں کو دیکھنے اور ان کو سلیقہ سے محفوظ رکھنے اور ان کی حفاظت کے لئے اپنی محنت کی کمائی کا بڑا حصہ صرف کرنے پر یہی خیال آیا کہ ایسا وہ کیونکر کر سکے جو بڑے بڑے ادبی سُورما نہیں کر سکے۔

یہ حضرت تو چھپے ہوئے رستم نکلے لیکن برملا ان سے یہ بات نہیں کہہ سکا۔ مگر اب میں اس کو مستقبل کے لیے ریکارڈ کر رہا ہوں۔

میری دلی تمنا یہ ہے کہ آگے چل کر جب وہ ملازمت سے سبکدوش ہو جائیں تو اپنی اس متاع حیات، کی ترقی اور حفاظت میں جی جان سے لگ جائیں۔ بھوپال میں کسی اردو نواز کی غالباً اس سے بہتر لائبریری وجود میں نہیں آئی۔

بھوپال ۸راگست ۲۰۰۶ء

• افتخار امام

"۔۔۔میں بھوپال آؤں گا تو آپ سے ملاقات کروں گا۔ آپ کی لائبریری دیکھنا چاہتا ہوں۔"

مکتوب: یکم اکتوبر ۱۹۹۹ء

• اقبال مجید

بے حد خوشی ہوئی کتابوں کی الماریاں دیکھ کر۔ آپ کا ذوق اور حوصلہ عنقا ہے۔ کون ان نایاب کتابوں کی قدر کرے گا اس پتھریلے شہر میں۔ خدا کرے وہ دن آئے جب ہمارے نوجوان اس ذخیرے سے مستفید ہو سکیں۔ سو روپئے آپ کی خدمت میں کچھ رسائل کی بائینڈنگ کے لئے پیش ہیں۔

۱۸ر ستمبر ۲۰۰۳ء

• اُقبال نیازی

اب تک میں اس گمان میں تھا کہ ذاتی نوعیت کی لائبریری بڑے پیمانے پر صرف میں نے ہی ممبئی میں قائم کر رکھی ہے لیکن خالد عابدی صاحب کا یہ "دھن" دیکھ کر شرمندگی ہوئی، اپنے دعویٰ پر ندامت۔

یقیناً مکتبہ عابدیہ کا یہ انتخاب بیحد وسیع اور نایاب ہے اور خصوصی میں خالد عابدی صاحب

کی محنت اور دلچسپی کا مظہر بھی۔

خالد صاحب نے جس ترتیب واہتمام سے تمام کتابوں کا Glassification کیا ہے میں سمجھتا ہوں اس قدر باریکی اور اہتمام سے کوئی لائبریرین بھی نہیں کر سکتا۔

ان کتابوں کو دیکھ کر جی للچایا اور بے اختیار ایک ہی خیال آیا "کاش۔۔۔ان کتابوں کو میں چُرا سکتا۔"

۶ ر ستمبر ۲۰۰۴ء

• ڈاکٹر بشیر بدر

جناب محمد خالد عابدی کے ذہن و دل میں ریڈیو کے پروگراموں کو بہتر سے بہتر بنانے کی لگن ہے۔ وہ خود اچھے ادیب ہیں۔ اردو ادب و فلم سے متعلق ان کی ذاتی لائبریری ہے۔ وہ نئے نئے موضوعات پر ادیبوں سے لکھواتے وقت، اس موضوع کی سناپس کرنے میں رہنمائی کرتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ بعض مرتبہ اپنی ذاتی لائبریری سے لکھنے والوں کو کتابیں اور جرائد فراہم کی ہیں۔ اُن کے ذہن میں تخلیقی اُپج ہے۔ ریکارڈنگ سے قبل وہ بڑی اپنائیت سے لکھنے والوں کو مفید مشورے بھی دیتے ہیں اور ان سے بہتر کام کرا لیتے ہیں۔

بھوپال ریڈیو پر شعبہ اردو سے متعلق اقبال مجید جیسے بڑے افسانہ نگار بھی رہے اس کے علاوہ نیر صدر الدین صاحب اور رئیس صدیقی صاحب کی بھی کارکردگی دیکھی لیکن خالد عابدی صاحب کی محنت اور محبت کی آمیزش نے انھیں منفرد اور ممتاز شخصیت بنا دیا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ وہ مقتدر شاعروں اور ادیبوں کو اس عزت اور احترام سے مشورہ دیتے ہیں کہ پروگرام میں گہرائی اور نیا پن آجاتا ہے۔ دوسری قابل قدر بات یہ ہے کہ وہ نوجوان اور باصلاحیت لوگوں کو اپنی نگرانی میں اچھا سے اچھا لکھنے کا حوصلہ بھی دیتے ہیں۔

دراصل اپنے کام اور منصب سے ان کی دلی وابستگی، فرض کا احساس، محنت اور صلاحیت نے انھیں اردو پروگراموں کا قابل قدر فرد بنا دیا ہے۔ بھوپال ریڈیو کی اپنی اہمیت ہے اور یہاں خالد عابدی جیسے مخلص کارکن کی اشد ضرورت ہے۔ خدا انھیں اور زیادہ حوصلہ عطا کرے۔

• جاوید عالم

کتابیں انسان کی سچی دوست ہوتی ہیں۔ مگر علی الخصوص اس دور میں ان سے محبت کرنے والے کم ملتے ہیں۔ بدلتا وقت پتہ نہیں کتابوں کے ساتھ کھیل کر رہا ہے۔ یا ہمارے ساتھ۔ تمام طرح کے ایسے کھیلوں کے باوجود محمد خالد عابدی صاحب کتابوں سے دیوانوں کی طرح وابستہ ہیں۔ اللہ

کرے ان کا یہ کتب خانہ دور آئندہ کا عظیم سرمایہ ثابت ہو اور مجھ ایسے طالب علم کے لیے ہمیشہ نفع بخش پناہ گاہ۔

۱۸/ جون ۲۰۰۶ء

● جاوید یزدانی

''محترم خالد عابدی صاحب سے میری ملاقات تقریباً پانچ سال پرانی ہے۔ میں ان کو ریڈیو سے متعلق شخص سے زیادہ نہیں جانتا تھا۔ بعد میں ان کے ڈرامے اور ادبی سرگرمیاں جان کر اور ان کی اردو سے محبت نے مجھے ان کا گردیدہ بنا دیا۔ لیکن آج جب میں نے ان کی لائبریری دیکھی تو میں حیرت زدہ رہ گیا۔ میں نے اتنا جنون آج تک نہیں دیکھا۔ اُردو کے سچے سپاہی کو میرا سلام۔

۲۸/ مئی ۲۰۰۶ء

● ڈاکٹر خلیق انجم

خالد عابدی کا ذاتی ذخیرہ مکتبہ عابدیہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ عابدی صاحب نے بڑی محنت سے اتنی اچھی کتابیں جمع کی ہیں کتابیں تو اکٹھا ہو گئیں۔ اب دوسری منزل یہ ہے کہ اردو کے قارئین کو ان کتابوں سے استفادہ کرنے کا موقع ملے۔ یہ کام بہت مشکل ہے اس کے لئے وسائل فراہم کرنا بہت دشوار ہے لیکن جو شخص اتنی اچھی کتابیں جمع کر سکتا ہے وہ اسے باقاعدہ لائبریری بھی بنا سکتا ہے۔ خدا کرے مکتبہ عابدیہ ترقی کرے اور اردو کی خدمت میں اہم رول ادا کرے۔ آمین

۱۹/ جون ۲۰۰۴ء

●श्री दिनेश राय :– (गीतकार, रंगकर्मी)

अकसर सुनता था कि ख़ालिद सा० लम्बे अरसे से अलग–अलग मज़ामीन पर किताबें इकट्ठा करते हैं। हैरानी भी तो होती थी कि कोई शख्स अपनी गाढ़े पसीने की कमाई को ख़ासा हिस्सा किताबे खरीदने पर खर्च कैसे कर लेता होगा। कभी–कभी उनसे इस मसले पर बातें होती और मैं किन्हीं किताबों के बारे में उनसे जानकारी लेता तो बड़ी फुर्ती से वो उन किताबों के बारे में खासी तफसील से बातें करते और यह भी कि अकसर उनमें से वह किताबे उनके कलेक्शन में होने का भी बताते। बात सिर्फ किताबें खरीद कर इकट्ठी करने की नहीं है दरअसल जो चीज़ उन्हें दूसरे केजुअल या रसमी किसी की कलेक्टर से अलग करती है वो है किताबें। हौलाकि हासिल करने और उन्हें संभालने का जुनून की हद तक शौक एक–एक किताब उनकी बरसों की भाग–दौड़ का

नतीजा है यही हाल मैग्जीन का है उनसे ज्यादा बरस पुराने रिसालों का जबरदस्त ज़खीरा उनके पास है। जिसे उन्होंने बहुत एहतियात और तरतीब से रखा है। कितने ही रिसर्च स्कालर्स उनकी जानकारी और जमा की हुई किताबों से फायदा उठा चुके हैं। आज मुझे उनका यह जबरदस्त कलेक्शन देखने का मौका मिला। तबीयत तो यह होती है कि इन्हीं किताबों के बीज आसन जमा लूँ। वाकई 'रेयर कलेक्शन' है खालिद भाई की यह पर्सनल लाइब्रेरी और इसी तरह बढ़े और ज्यादा से ज्यादा लोग इसका फायदा उठायें। इसी दुआ के साथ।

4 जून 2006

● ذاکر حسین

آج بحمد اللہ میں نے ڈاکٹر انصار الحق صاحب کے ساتھ خالد عابدی صاحب کا نادرو نایاب ذخیرہ کتب ومخطوطات دیکھا تو بے اختیار زبان پر یہ مصرعہ آگیا۔ ع

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

آج کے اس علم بے زار دور میں جب کہ الیکٹرونک میڈیا نے کتابوں سے عملاً بے زار کر دیا ہے تو عابدی صاحب برملا کہہ سکتے ہیں کہ:

تو میرا شوق دیکھ مرا انتظار دیکھ

واقعی یہ ذوق وشوق یہ دلچسپی قابل داد ہے۔ میری دعا ہے کہ اس قدر قابل قدر اور کارآمد ذخیرہ نہ صرف محققین کے کام آئے بلکہ عوام بھی اس سے مستفید ہوں جس کے لئے ایک عمارت کی ضرورت ہے جہاں یہ بے انتہا قیمتی ذخیرۂ کتب محفوظ رکھا جا سکے اور استفادہ عوام وخواص کے لئے مہیا ہو سکے۔ یہ مجموعہ دراصل محققین کے لئے ایک نعمت بے بہا ہے۔ بالخصوص بھوپال میں واقع ایک ایسی تحقیقی لائبریری کی ضرورت ہے جو کہ سینکڑوں مقالات اور کتابوں کے لکھنے کے لئے مواد فراہم ہو سکے۔ اور یہ کام صرف اسی ذاتی ذخیرہ کتب سے ہی ممکن ہے۔ خدا کرے کہ یہ کارآمد ذخیرہ مزید کارآمد ہوتا چلا جائے۔

۳ر جنوری ۲۰۰۶ء

● پروفیسر رحمت یوسف زئی

سخت حیرت ہوتی ہے یہ جان کر کہ ابھی اس دور بلاخیز میں اردو کے دیوانے تن من دھن سے شعروادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ زبان زوال پذیر ہے! جب تک خالد عابدی

جیسے مجاہد رہیں گے اردو زندہ رہے گی اور مستقبل میں بھی اردو کی تابناکی برقرار رہے گی۔ خالد عابدی نے محض اپنے شوق اور ادبی ذوق کی تکمیل کے لئے جو ذاتی لائبریری ترتیب دی ہے وہ تو کسی یونیورسٹی یا کالج کی لائبریری سے کم نہیں۔ لائبریری کی جدید ٹیکنک سے آراستہ کرنا کوئی بڑی بات نہیں، وہ تو ایک کلرک کا کام ہے، کتاب کا انتخاب، کتاب کے مشمولات کا مطالعہ، مزید چھان بین، جیسی خصوصیتوں کا ہر شخص حامل نہیں ہو سکتا۔ خالد عابدی میں یہ سارے اوصاف موجود ہیں۔ کتاب رکھنا اور بات ہے۔ کتاب کے موضوع اور مندرجات سے واقفیت تو اسی وقت ممکن ہے جب کتاب پڑھی جائے اس پر غور کیا جائے اور مزید نتائج کے امکانات تلاش کئے جائیں۔ خالد عابدی کی یہ صفت ایسی ہے کہ اردو کے کسی بھی استاد کے لئے لائق تقلید ہے۔ میں خالد عابدی کی ذاتی لائبریری دیکھ کر بے حد متاثر ہوا۔ میرا خیال تھا کہ حیدرآباد میں عبدالصمد خاں کا ذخیرہ (جو اب ایک بہت بڑے کتب خانے میں تبدیل ہو چکا ہے اور جس کی سرپرستی دو یا تین امریکی یونیورسٹیاں کر رہی ہیں) ہی سب سے بڑا اور اہم ذخیرہ ہے۔ لیکن خالد عابدی کا ذخیرہ بھی کچھ کم نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ اس میں منتخبہ کتابیں ہیں اور کسی بھی ریسرچ اسکالرس کے لئے یہ ذخیرہ ایک گنج بے بہا سے کم نہیں۔ اس کتب خانے کو ایک ریسرچ سینٹر میں تبدیل ہونا چاہیئے تاکہ اردو کے طالب علم اس سے استفادہ کر سکیں۔ صرف اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ کتاب کسی کو جاری نہ کی جائے بلکہ وہ اسی سینٹر میں بیٹھ کر اس سے استفادہ کریں۔ بھوپال کے ادبی حلقوں کو چاہیے کہ اس شخصی کوشش کو اجتماعی بنائیں اور اس کی حفاظت کا اس طرح اہتمام کریں کہ آنے والی نسلوں کے لئے یہ ایک اہم تحقیقی مرکز ثابت ہو۔

۲۸ر جنوری ۲۰۰۴ء

● **ڈاکٹر رضیہ حامد**

خالد عابدی کا نام بھوپال میں اس وقت سنا تھا جب میں خود ایک طالبہ تھی۔ ملنے کا اتفاق بھوپال سے دہلی جانے کے بعد ہوا۔ ان کی کتب بینی، کتب شناسی اور کتب دوستی سے کسی نہ کسی حد تک ہر بھوپالی جس کو ریڈیو میں اور کتابوں سے واسطہ رہتا ہے واقف ہے۔ لیکن ان کے جنون اور عشق سے جو خالد عابدی کو کتابوں اور رسالوں سے ہے وہی لوگ واقف ہیں جن سے ان کا رابطہ رہتا ہے۔ خالد عابدی نے اس زمانہ سے اپنے اس شوق کو پروان چڑھایا جب کہ وہ خود طالب علم تھے اور ان کے گھریلو حالات ان کو اتنے مہنگے شوق کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ ایسے نامساعد حالات میں اپنے شوق کو انھوں نے خون جگر سے سینچا اور نہ معلوم کتنی خواہشات کا گلا گھونٹا اور کتنا وقت اس جدوجہد میں صرف کیا کہ اپنی پسند کی کتاب خرید لیں۔

خالد عابدی کا کتب خانہ دیکھ کر ان کی لگن اور محنت کا قائل ہونا بڑی معمولی بات لگتی ہے۔ ان کا جنون صرف جنون ہی نہیں اس میں تہذیب، سلیقہ اور مطالعہ کا ذوق و شوق بھی کارفرما ہے۔ ہزاروں کتابیں، رسالے، اخبار اس ترتیب سے سجے ہوئے ہیں کہ ان کو دیکھ کر بے ساختہ دل چاہتا ہے کہ ہم یہیں مطالعہ کریں۔ ان کے ترتیب دیئے کتابوں کے کیٹلاگ نہایت سلیقہ اور سائنٹفک طریقے سے تیار کئے گئے ہیں جس سے کتاب کو ڈھونڈنے میں وقت ضائع نہیں ہوتا اور مطلوبہ کتب فوراً حاصل ہو جاتی ہیں۔

خالد عابدی اتنے ہمدرد اور معاون شخصیت کے مالک ہیں کہ ہر کسی کو اپنی کتابیں بغرض مطالعہ دے دیتے ہیں اور پھر تعلقات خراب ہونے کے باوجود کتاب ہاتھ نہیں آتی یعنی دہرا نقصان اُٹھاتے ہیں۔ آج کے دور میں ٹی۔ وی کے بعد کسی اور طرف انسان کی توجہ مبذول نہیں ہو رہی۔ کتابیں دھول میں اٹ رہی ہیں یا ردی والے کے پاس چلی جاتی ہیں۔ ایسے حالات میں خالد عابدی کا دم بہت غنیمت ہے جو کتابوں میں جیتے ہیں دوسروں کو کتابوں کی قدر و قیمت سے آگاہ کرتے ہیں اور کتاب کی افادیت و اہمیت بتاتے ہیں۔ بھوپال میں کسی زمانے میں بڑی اچھی کتب چھپیں اور بہت بڑی لائبریری بھی تھی جہاں سے دیوانِ غالب، نسخہ حمیدیہ اردو دنیا کو ملا۔ آج خالد عابدی کی لائبریری اس مقام تک پہنچنے کی بہترین کوشش ہے۔ میں ان کے اس کار خیر ان کے عشق۔۔۔ ان کے کتابوں کو جمع کرنے کے جنون پر ان کو مبارک باد دیتی ہوں اور ان کے کاموں کے جہات کے مکمل ہونے کی دعا کرتی ہوں۔ خدا ان کو طویل عمر اور صحت و تندرستی کے ساتھ کتابوں کی دنیا میں مصروف رکھے وہ نہ صرف بڑھیں بلکہ اردو کے طالب علموں کو اپنی معلومات سے مستفید بھی کرتے رہیں۔ آمین۔

۳ر ستمبر ۲۰۰۵ء بھوپال

● رفعت سروش

کتاب خالد عابدی کی زندگی ہے۔ اور کتاب سے رشتہ کا مطلب ہے انسان کی تہذیب سے براہِ راست رشتہ۔

وہ تہذیب جس کی معلوم عمر پانچ ہزار سال ہے میں اپنے نوجوان دوست خالد عابدی کو ان کے علمی ذوق پر مبارکباد دیتا ہوں اور رشک کرتا ہوں کہ وہ ریڈیو اسٹاف میں ہوتے ہوئے علمی ذوق اور کتاب سے تہذیبی رشتے کو مضبوط تر کرنے کے لئے مسلسل کام کرتے رہتے ہیں۔

۲۰ر مارچ ۱۹۹۴ء، بھوپال

● زبیر محمود

● Janaab Zubair Mehmood Saheb

I have sean maktaba Abidia Librеary. The collection of this library is very atreative Eneyclopedia of filam is good and catalogue of this collection is systamatic. Manusericption collection are very rare and price less. But the place of this library is not for suitable for the collection.

I pray to God your financial condition will be good.

I suggest to you prepare the classification according to Devey Decimal Classification and cataloguing according to Anglo American cataloging rules.

16/02/2003

● سرسوتی سرن کیف

میں نے محمد خالد عابدی صاحب کا ذخیرہ کتب سرسری نگاہ سے دیکھا۔ مجھے کتابیں جمع کرنے کا تھوڑا بہت شوق ہے لیکن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایک ریڈیو کے پروگرام افسر کا یہ ذوق اتنا بڑھا ہے جو مشہور و معروف علماء سے بہت اوپر جا پہنچتا ہے۔ ہزار دقتیں اُٹھا کر بھی عابدی صاحب نے اپنے محدود جگہ کے مکان میں اتنی کتابیں جمع کر رکھی ہیں اور جمع کرتے جا رہے ہیں کہ اگر آدمی خود نہ دیکھے تو شاید یقین نہ کرے کہ یہ شوق جنون کی حد تک ہو سکتا ہے۔ میں نے ویسے اس سے بڑے ذاتی ذخیرہ ہائے کتب دیکھے ہیں مثلاً کالی داس گپتا رضا صاحب کا ذخیرہ لیکن جن پریشانیوں کو اُٹھا کر عابدی صاحب نے یہ کام کیا ہے اور ادبی موضوعات پر ہی نہیں فلم سازی سے متعلق جیسا نادر مواد جمع کیا ہے اس کی جتنی ستائش کی جائے کم ہے۔ بے ساختہ منہ سے نکلتا ہے۔ ع

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

۳۱ر دسمبر ۲۰۰۲ء

- **پروفیسر سعید اختر**

ایک عرصے سے کوشاں تھا کہ بھائی خالد عابدی کا کتب خانہ مکتبۂ عابدیہ کا دیدار کروں۔ خوش قسمتی سے عابدی صاحب نے آج اس دیرینہ خواہش کی تکمیل کر دی۔ بھائی خالد عابدی اگر کسی کالج کے پروفیسر ہوتے تو اس کتب خانے کو دیکھ کر اتنی حیرت نہ ہوتی کیوں کہ یہ ان کے پیشہ کے تعلق سے ان کی ضرورت تھی۔ مگر ایک غیر مدرّسی اور غیر تعلیمی ادارہ سے وابستہ ہوتے ہوئے انھوں نے جن قدیم اور جدید نایاب کتب کا ذخیرہ جمع کر رکھا ہے اور جس محنت اور جانفشانی سے ان کی نگہداشت کر رہے ہیں وہ نہ صرف انتہائی قابل تحسین ہے بلکہ آئندہ نسل کے لئے ایک قیمتی و بیش بہا سرمایہ ہے جس کے لئے یقیناً وہ عابدی صاحب کی ممنون و احسانمند رہیں گی۔

کتب خانہ میں نہ صرف کمیاب کتابیں ہیں بلکہ قدیم و جدید رسائل، جرائد، گزٹس اور دیگر بیش قیمت نسخے بھی مہیا ہیں۔ مزید لائق تحسین امر یہ ہے کہ عابدی صاحب نے جملہ ذخیرہ اپنی گاڑھی کمائی سے اپنی دیگر ضروریات کو پس پشت ڈال کر جمع کیا ہے۔ علم و ادب سے والہانہ عشق ہی یہ جنونی کیفیت پیدا کر سکتا ہے۔ جس کی داد و توصیف نہ کرنا انتہائی ناانصافی اور بخل کی بات ہوگی۔ دل تو یہ چاہتا ہے کہ اپنے خون دل کی کشید بھی اس میں شامل کر دی جائے۔

کتب خانہ دیکھ کر یہ اندازہ بھی ہوا کہ اردو کے تعلق سے کسی بھی شاعر، ادیب، مصنف یا دیگر کسی بھی موضوع پر تحقیقی کام کرنے میں یہ تنہا نہیں کلی طور پر مددگار و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ کتب خانہ مزید گنجائش کا طلبگار ہے جسکی تکمیل بہت ضروری محسوس ہوتی ہے جو تقریباً مکان کے نصف حصہ پر قابض ہے اور اہل خاندان کی رہائش میں حائل ہو رہا ہے۔ جس کا مداوا ہم سب کی اخلاقی ذمہ داری ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ کچھ صاحب حیثیت اور متمول حضرات کو آگے آ کر اسے محفوظ رکھنے کی ذمہ داری قبول کرنا چاہیئے۔ گورنمنٹ سے بھی گذارش کی جائے کہ وہ اس سرمایہ کو بہ حفاظت رکھنے کے لئے معقول جگہ فراہم کرے۔

میں بھائی خالد عابدی کی درازیٔ عمر کی دعا کرتا ہوں تا کہ وہ اس سرمایہ میں روز افزوں اضافہ کرتے رہیں۔ میری نیک خواہشات ان کے قدم بہ قدم ساتھ رہیں گی۔

۱۵ر اکتوبر ۲۰۰۲ء

● ڈاکٹر سید حامد حسین

مکتبہ عابدیہ جناب محمد خالد صاحب کی نادر کتب ورسائل وغیرہ جمع کرنے میں گہری دلچسپی اور تقریباً پچیس سال کی ان تھک کوشش کا ثمرہ ہے۔

یہ ذخیرہ تقریباً چار ہزار کتب، اخبارات ورسائل پر اس وقت مشتمل ہے اور اس میں برابر اضافہ ہورہا ہے۔ کتب خانے کی ایک اہم خصوصیت وہ اہم گوشہ ہے جس میں مدھیہ پردیش کی ادبی وصحافتی تاریخ کو سمجھنے کے لئے ضروری دستاویزی مواد (بشمول تصاویر) یکجا کیا گیا ہے۔

یہ کتب خانہ بالخصوص تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے ایک اہم ضرورت کو پورا کرتا ہے اور اس کا ضرورتمند ہے کہ اس کی مناسب حوصلہ افزائی کی جائے۔ اگر کتب خانے کو بہتر مالی وسائل حاصل ہوں تو اس کو اور مفید بنانے میں مدد مل سکتی ہے اور اس میں مزید توسیع کے امکانات ہو سکتے ہیں۔

۱۵ر مارچ ۱۹۹۳ء

● سید شرافت علی ندوی

آج ۲۷ر فروری ۲۰۰۵ء کو محترم خالد عابدی کے دولت کدہ دولتکدہ نہیں علم وفن کے مرکز میں حاضری کا اتفاق ہوا۔ ان کے کتب خانہ سے تو میں پہلے سے باخبر تھا۔ بعض کتابوں سے استفادہ بھی کر چکا تھا لیکن آج ان رجسٹروں کی زیارت کی جو عابدی صاحب نے انتہائی محنت اور جانفشانی کے ساتھ مرتب کئے ہیں۔ یہ رجسٹر نہیں۔ آپ کے کتب خانے کی کتابوں میں کیا کیا ہے اور کہاں کہاں پوری علمی تفصیلات آپ کو مل جائیں گی۔ یہ فن ہر ایک کے بس کا نہیں۔ بعض جگہ تو ایسی معلومات لکھ دی گئی ہیں جو کتاب کے مطالعہ سے بے نیاز کر دیتی ہیں۔

خالد عابدی خود ایک مصنف، محقق، ناقد، ادیب ہیں۔ لیکن میرے نزدیک ان کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ مکمل طور پر اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ سے قلبی، ذہنی، وجدانی اور عملی طور پر مربوط ہیں۔ ایسی مثال آپ کو کم ملے گی۔

خالد عابدی کو آپ دیکھ لیں، سُن لیں۔ یا ان کا کتب خانہ۔ کتب خانہ کے دستاویزات دیکھ لیں۔ دونوں باتیں ایک ہیں۔ بس یہی کہنے کو جی چاہتا ہے۔

ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

• حکیم سید ظل الرحمٰن

اس مرتبہ بھوپال کے سفر میں خالد عابدی صاحب کے کتب خانہ کو دیکھنے کا موقع ملا۔ میں ان کے ذوق ادب اور کتابوں سے ان کے شغف کو دیکھ کر بےحد متاثر ہوا۔ انہوں نے بڑی کاوش اور جستجو کے بعد نایاب کتابوں کا بڑا ذخیرہ فراہم کیا ہے۔ بھوپال میں انفرادی طور پر اس قدر اہم علمی سرمایہ بہت ہی کم اصحاب کے پاس محفوظ ہے۔ تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے یہ بہت اہم جگہ ہے۔ انہوں نے مختلف شہروں میں تبادلہ اور ملازمانہ مصروفیات کے باوجود اس کا اہتمام کیا اور ہر جگہ نا مساعد حالات میں اپنے شوق کو پروان چڑھایا۔ خالد عابدی صاحب جس خاموشی سے ریسرچ اسکالرس اور مصنفین کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں اس کی تحسین ضروری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ انشاء اللہ اس ذخیرہ میں مزید اضافہ ہوگا اور بھوپال میں ایک اہم علمی مرکز کے طور پر اس کی اہمیت تسلیم کی جائے گی۔

۳۰ر جولائی ۲۰۰۶ء

• ڈاکٹر سیفی سرونجی

جب میں پہلی بار ممبئی میں کالی داس گپتا رضا سے ملا اور ان کی ذاتی لائبریری دیکھی تو کئی رات سو نہیں پایا۔ میں نے دنیا بھر کی لائبریریوں میں اپنے سفر کے دوران جائزہ لیا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ دنیا میں جس نے کتاب سے محبت کی ہے وہی شخص عزت، مرتبہ پر پہنچا ہے۔

لندن میں جب وہاں کی سرکاری لائبریری میں گیا اور اردو شعبے میں جب کتابوں پر نظر پڑی جو کتاب سب سے پہلے ہاتھ میں آئی وہ ہمارے مدھیہ پردیش کے مشہور ادیب محمد خالد عابدی کی کتاب اردو انٹرویوز تھی تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس لئے کہ میں نے خالد عابدی جیسا کوئی شخص کتابوں کا اتنا دیوانہ نہیں دیکھا جس نے اپنی ساری زندگی صرف کتابوں میں غرق کی ہے۔ ان کے پاس کتابوں کا جو ذخیرہ ہے وہ مدھیہ پردیش کی کسی بھی سرکاری لائبریری میں نہیں ہے بلکہ مدھیہ پردیش کیا میں نے تو اپنی زندگی میں سوائے کالی داس گپتا رضا کے کسی بھی شخص کے پاس نہیں دیکھا۔ میں ان کی لائبریری دیکھ کر اتنا متاثر ہوا ہوں کہ آج میری غلط فہمی دور ہوگئی۔ دراصل میں خود کو کتابوں کا عاشق سمجھتا تھا۔ میں نے بھی اپنی ذاتی لائبریری یعنی سیفی لائبریری قائم کی ہے لیکن خالد عابدی صاحب کی لائبریری اور ان کے

کیٹلاگ رجسٹر کتابوں کی حفاظت کا طریقہ ان پر اشاراتی زبان میں کتابوں کی نوعیت دیکھ کر تو میں حیران رہ گیا کہ خالد عابدی نے تمام عمر کوئی دوسرا کام کیا ہی نہیں۔ میں ہی نہیں کتابوں کے اس سچے عاشق کو جس نے بے شمار طالب علموں کو اپنی ذاتی لائبریری سے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کرائی۔ کتنے تو حوالے تک نہیں دے سکے لیکن خالد عابدی کے برتاؤ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آج بھی ان کی لائبریری ان طالب علموں کے لئے کھلی ہے جو ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ جن کے پاس ذرائع نہیں ہیں یا جنھیں مواد نہیں ملتا وہ کسی بھی موضوع پر کوئی بھی کسی قسم کا رسالہ کتاب خالد عابدی صاحب کی لائبریری سے حاصل کر سکتے ہیں کہ ان کے پاس ادب ہو یا فلم، صحافت ہو یا ڈراما یا ادب کی کوئی بھی صنف ہو ہر طرح کی کتابیں، رسائل، اخبارات کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے جو اس عہد کے طالب علموں کے لئے ہی نہیں بلکہ آئندہ نسلوں کے لئے بھی مشعل راہ ثابت ہوگا لیکن اردو کے اس سچے دیوانے کی اس عمر بھر کی کمائی کے لئے اب ایک ایسے بڑے ہال کی ضرورت ہے۔ جس میں ان کا یہ نایاب ذخیرہ محفوظ رہ سکے۔ یہ ہماری ہی نہیں بلکہ اہل بھوپال کی اور گورنمنٹ کی اور ہماری ادبی دنیا کے ان اردو کے چاہنے والوں کی ذمہ داری ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم سوتے رہیں اور یہ سب سرمایہ جو آئندہ نسلوں کے لئے ایک قیمتی سرمایہ کی حیثیت رکھتا ہے ضائع ہو جائے۔

۲۱ر نومبر ۲۰۰۶ء

• ڈاکٹر سید محمد حامد

خالد عابدی صاحب کی کتابوں سے محبت اور تعلق قابل رشک ہے۔
ان کی اسکیم بھوپال میں ایک کتاب کلب ضرور قائم ہونا چاہیے۔
میں بھرپور تائید کرتا ہوں اور تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔

۳ر دسمبر ۲۰۰۵ء

• ڈاکٹر شفیقہ فرحت

میں خالد عابدی کو اس زمانے سے جانتی ہوں جب وہ ہائی اسکول کے طالب علم تھے۔ علم حاصل کرنا اور کتب و رسائل کا جمع کرنا ان کے لئے عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔ آج بھی ان کے ذوق و شوق میں کمی نہیں آئی بلکہ اس میں ایک والہانہ وارفتگی کا رنگ پیدا ہو چکا ہے۔

یوں وہ اپنی ذات میں خود ہی ایک مکتبہ ہیں پھر بھی ۱۹۷۰ء میں انھوں نے مکتبہ عابدیہ کے

نام سے باقاعدہ ایک لائبریری قائم کرلی۔ اس مکتبہ میں تقریباً ۴ ہزار کتب و رسائل ہیں۔ ایک محدود آمدنی والے شخص کے لئے یہ کام بہت مشکل ہے مگر خالد عابدی نے اپنی تمام خواہشات اور تمنائیں کتابوں کے شوق پر قربان کردیں۔

مکتبہ عابدیہ سے ایم۔ اے کے طالبا اور ریسرچ کالرز کو بہت مدد ملتی ہے اور کبھی کبھی کل ہند سطح پر پڑھے جاتے والے مقالوں کی تیاری میں دیگر حضرات بھی اس مکتبہ سے استفادہ حاصل کرتے ہیں کیونکہ خالد عابدی کتابیں بہت سلیقے سے رکھتے ہیں۔ ذرا سی دیر میں ضرورت مند کو مطلوبہ مواد حاصل ہو جاتا ہے۔ ان کا کیٹلاگنگ سسٹم بہت سائنٹفک ہے۔ لہٰذا پورے مدھیہ پردیش میں اُسے شہرت حاصل ہے۔

ان کے شوق اور علمیت کو دیکھتے ہوئے بعض حضرات نے عطیہ کے طور پر بھی کچھ کتابیں انھیں دیئے ہیں۔ جن کا ان کے پاس باقاعدہ ریکارڈ ہے میں بھی وقتاً فوقتاً ان کی خدمت کرتی رہتی ہوں۔

تمام اہل ادب سے تعاون کی درخواست ہے اور دعا ہے کہ ان کا مکتبہ ان کی کوششوں سے ملک کے اچھے مکتبوں میں جگہ پاکر بھوپال کے نام کو روشن کرے۔

• ظفر صہبائی

ہمارا عہد اگر چہ کتابوں کا عہد ہے اور ہر زبان کے لوگ بڑی تعداد میں کتابیں خریدتے اور پڑھتے ہیں لیکن اردو زبان کے جاننے والوں میں اقتصادی پسماندگی کی وجہ سے یہ ذوق ذرا نچلی سطح پر ہے۔ مگر ممتاز ادیب و محقق اور آکاش وانی بھوپال سے وابستہ جناب محمد خالد عابدی کی اپنی کم مائیگی کے باوجود کتابیں خرید کر انھیں پڑھنے اور محفوظ رکھنے نیز ان کے ذریعہ کسی بھی ادبی و فلمی موضوع پر کام کرنے والے کو فائدہ پہنچانے کی حوصلہ مندی یہ ثابت کرتی ہے کہ اقتصادی پسماندگی ذوق و شوق کے آگے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ انھوں نے اپنے مختصر گھر میں کتابوں کا اتنا بڑا انبار جمع کر رکھا ہے کہ دیکھ کر چشم فلک کو بھی حیرت ہوتی ہے۔ حد یہ ہے کہ ان کے پلنگ پر بھی کتابیں اس طرح جمی ہیں کہ آرام کے لئے صرف ۶×۲ کی جگہ دکھائی دیتی ہے۔ دیمک کے خوف سے نایاب کتابوں اور رسائل کو پولیتھن میں لپیٹا گیا ہے۔ شیلف، الماریاں نہ ہونے سے ہر وقت کتابوں کے زیاں کا خطرہ موجود رہتا ہے مگر خالد عابدی پامردی سے اس خطرے کے ساتھ نہ صرف

نبرد آزما ہیں بلکہ کتابوں کا ذخیرہ مسلسل بڑھاتے جا رہے ہیں۔ ان کی یہ لائبریری خاصی نایاب اور قیمتی کتابوں سے بھری ہے۔ مجھے جب بھی کسی موضوع پر کام کے لئے کتابوں کی ضرورت پڑی ہے انھیں کے ذخیرے سے استفادہ کیا ہے۔ ان کتابوں کے ذریعہ انھوں نے آکاش وانی بھوپال کے اردو پروگراموں کو بھی فائدہ پہنچایا ہے۔ کاش کہ اس نایاب ذخیرے کو محفوظ رکھنے کی کوئی مستقل صورت ہو سکتی۔

۱۶ر ستمبر ۱۹۹۶ء

- عارف عزیز

عزیز گرامی جناب خالد عابدی کے کتب خانے سے میں عرصہ دراز سے واقف تھا۔ ان سے ذہنی وفکری مناسبت اور قرابت داری بھی ہے لیکن کتب خانے کو کبھی دیکھنے کی سعادت حاصل نہیں ہوئی۔ ایک انسان کی کاوش ومحنت کے اور بھی مراکز میرے علم میں ہیں لیکن وہ سب صاحب حیثیت اور مالی اعتبار سے کافی مستحکم لوگ تھے جبکہ خالد عابدی صاحب کی حیثیت سے میں آگاہ ہوں۔ انھوں نے اپنی ذاتی تنگ ودو سے کتابوں کا جو ذخیرہ کیا ہے۔ اس دور میں وہ کسی فرد واحد کا کام نہیں ادارے کا کام محسوس ہوتا ہے، ان کے ذوق اور خاص طور پر ادب سے گہرے رشتہ کے ساتھ یہ کا نہایت قابل قدر ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت فرمائے اور دوسروں کے لئے استفادہ کا باعث بنائے۔ یہ پہلو اُن کی شخصیت کا بڑا تابناک پہلو ہے اور میں اس سے بہت متاثر ہوا ہوں۔

۱۳ر مارچ ۲۰۰۵ء

- ڈاکٹر عمر فاروق

جب میں بھوپال آیا تھا تو مجھے ایسی لائبریری کی تلاش ہوئی جہاں میں اپنی علم کی پیاس بجھا سکوں تو مجھے کتب خانہ عابدیہ جانے کا مشورہ دیا گیا تھا۔ آج تقریباً ایک سال بعد جب خالد عابدی صاحب کے ذاتی کتب خانہ کو دیکھنے کا موقع ملا تو اندازہ ہوا کہ لوگوں نے یہاں استفادہ کا مشورہ صحیح دیا تھا۔

ذاتی طور پر اتنی تعداد میں ادب وصحافت بالخصوص فلم سے متعلق کتابیں، میگزین اور اخبارات جمع کرنا واقعی بڑے حوصلے کی بات ہے۔ آئندہ نسل کے لئے ریسرچ اسکالروں کے لیے

خالد عابدی صاحب نے ایک بڑا خزانہ محفوظ کر دیا ہے۔ ان کی کوششوں کو جتنا بھی سراہا جائے کم ہے۔ ذاتی طور پر اردو کی کتابوں کو جمع کرنا آج کے دور میں بڑے عزم کی بات ہے۔

۲۶ر جون ۲۰۰۶ء

• کوثر صدیقی

محترم جناب خالد عابدی صاحب کی ذاتی لائبریری جس کا نام مکتبہ عابدیہ ہے آج دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ذاتی شوق کی بناء پر ذاتی خرچ سے اتنی کتابیں جمع کرنے کے لئے ان کی مساعی جمیلہ لائق تحسین تو ہیں ہی لیکن ان مساعی کے پس پردہ ان کا اردو سے بے پناہ تعلق جسے دیوانگی کی حد تک بھی کہا جاسکتا ہے، کارفرما ہے۔ میں نے بھوپال کے پروفیسر حضرات کے کتب خانے دیکھے ہیں جہاں کتابیں بڑی تعداد میں موجود ہیں لیکن ان کے جمع کرنے میں اردو سے والہانہ محبت کا جذبہ نظر نہیں آتا ہے۔ خالد عابدی نے درس و تدریس سے متعلق نہ ہوتے ہوئے بھی ہزاروں کی تعداد میں کتابیں جمع کی ہیں جو بہت قیمتی وراثت ہے۔ یہ لائبریری ان کی ذاتی ضرور ہے لیکن عوامی بہبود کے لئے انھوں نے اس کے دروازے سب کے لئے کھول رکھے ہیں۔ کئی ریسرچ اس کالو آپ کی اس لائبریری میں موجود نایاب کتابوں اور قلمی نسخوں کا استفادہ کر چکے ہیں۔

خالد عابدی صاحب کو اگر میں بھوپال کا سالار جنگ کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ کیونکہ انھوں نے محدود وسائل میں جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ سالار جنگ کے عظیم کارنامے سے بھی عظیم ہے۔ ان کتابوں کے رکھ رکھاؤ اور حفاظت کی انتہائی ضرورت ہے۔ یہ ایک طرح کا قومی اثاثہ ہے اور اردو داں اور محبان اردو کے لئے ان کی حفاظت اور بندوبست کرنا ضروری ہے۔

خالد عابدی صاحب دُھن کے پکے ہیں۔ میری گذارش ہے کہ وہ متعلقہ اکابرین حکومت اور میونسپل وغیرہ سے رابطہ قائم کر کے اور شہر کے مقتدر بزرگ ہستیوں کا تعاون حاصل کر کے ایک بلڈنگ کا اہتمام کرنے کی کوشش کریں۔

میں خالد عابدی کا بہت بہت شکر گذار ہوں کہ مجھ ہیچ مداں کو انھوں نے اپنا قیمتی کتب خانہ دکھایا۔ میری نیک خواہشات ان کے ساتھ ہیں میں ان کی اس کامیاب مہم جوئی کے لئے انھیں

مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

۱۳؍اکتوبر۲۰۰۲ء

● **محمد احسن**

ریجنل ڈائریکٹر، ریجنل سینٹر

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی بھوپال

مجھے آج مکتبہ عابدیہ دیکھنے کا موقع ملا۔ دیکھ کر میں حیرت زدہ ہوں اور خالد عابدی صاحب کے ذوق کی داد دیتا ہوں۔ اردو کے ایسے شائقین کم ہی دیکھنے کو ملے ہیں۔ ریڈیو اسٹیشن کا ایک افسر اتنی کتابوں کا مالک ہے۔ خدا ان کے شوق کو اور پروان چڑھائے۔ ان کے یہاں کتابوں کا ایسا ذخیرہ موجود ہے جسے اردو کے شائقین کو مستفید ہونا چاہیئے۔ خدا کرے یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوں اور ان کی کتابوں کی catalaging ہو جائے تاکہ آئندہ نسل اس کا فائدہ اٹھا سکے۔

۱۶؍ستمبر۲۰۰۶ء

● **ڈاکٹر انصار الحق**

میرے مخلص و محترم بھائی خالد عابدی صاحب کی ذاتی کاوشوں سے ان کے گھر میں موجود کتب خانہ دیکھنے کا موقع نصیب میں آیا۔ عرصہ سے آپ کی اس لائبریری کو نزدیک سے دیکھنے و خصوصی طور پر مخطوطات و دیگر رسائل کو جاننے کا شوق تھا جو آج پورا ہوا۔ اللہ کا ہزار شکر و احسان ہے کہ آج کے اس دور میں بھی جہاں عموماً لوگ T.V. و دوسرے ذرائع ابلاغ کی وجہ سے کتابوں سے دور ہوتے جا رہے ہیں اسی پر آشوب دور میں جناب عابدی صاحب اپنی علم دوستی و ذاتی شوق سے بھرپور ہیں۔ ان تمام کتابوں، مخطوطات و رسائل کو وہ بڑے شوق و Scientifically تحفظ کر رہے ہیں تاکہ اس گراں قدر مجموعہ کو وہ اپنی آنے والی نسل کو سونپ سکیں۔ اردو ادب و تاریخ دانی کے لئے یہ بہت ہی اہم و بیش قیمتی تحفہ ہے جسے خصوصی طور پر تحقیق کے لئے استعمال ہونا چاہیئے۔ ۱۵؍۱۶ اپنی الماریوں میں محفوظ یہ کلکشن اگر آنے والے دنوں میں کسی قومی لائبریری یا آرکائیوز کے ماتحت کر دی جائے تو میں سمجھتا ہوں خالد عابدی صاحب کی مسلسل جستجو و محنت مزید رنگ لائیگی اور یہ ان کے نام سے انشاء اللہ تعالی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ رہے گا۔

میری دعا ہے کہ اللہ تبارک تعالی اپنی مزید ترقی و کامرانی سے نوازے اور لمبی حیات عطا

فرمائے۔آمین

"ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا"

۳رجنوری ۲۰۰۶ء

● ڈاکٹر محمود قریشی
(مدیر ماہنامہ ادوار خان پور پاکستان)

آج مورخہ ۶ردسمبر ۲۰۰۶ء جناب خالد عابدی کی لائبریری مکتبہ عابدیہ آنا ہوا۔ ذخائر کتب کے بارے میں پہلے سے سُنا ہوا تھا۔ لیکن ذخیرہ کتب دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ایک تنہا شخص نے تمام تر خانگی اور دفتری معاشی اور معاشرتی مصروفیات کے ساتھ اتنا کام کیسے کرلیا۔ کہ یہ کام کسی انسان کا محسوس نہیں ہوتا بلکہ ان میں کچھ مافوق الفطرت چیز حلول کرگئی ہے۔ لیکن شاید اس جذبہ کو شوق، لگن اور مقصدیت سے لگاؤ کہتے ہیں۔

جناب خالد عابدی کا کام تو ایک سرمایہ ہے اس حوالے سے ان کی ذات بھی ایک عظیم سرمایہ ہے۔ انھوں نے جو کچھ کیا ہے۔ وہ اپنی ذات کے لئے نہیں کیا۔ بلکہ فروغ علم وادب اور اردو کے اثاثہ کے تحفظ کے لئے کیا ہے۔ اس لیے جہاں ان کی تعریف ہونی چاہیئے وہاں ان کے کام کو بڑھانے اور اس کام کی حفاظت اور اس کو محفوظ طریقے سے اگلی نسل تک پہنچانے میں ان کی مدد کرنے کی ضرورت ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے جذبوں کو مہمیز دے۔ انھیں ہمت دے اور صحت عطا کرے۔ ان کی زندگی میں ان کی ایسی لائبریری تعمیر ہو جس سے تا قیامت لوگ استفادہ کرتے رہیں۔ اور اردو ادب وزبان کا یہ چراغ اپنی روشنی پھیلاتا رہے۔ (آمین)

۶ردسمبر ۲۰۰۶ء

● ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

"۔۔۔ پاکستان میں مشفق خواجہ کی لائبریری اہم تھی۔ ہندوستان میں ذاتی طور پر کالی داس گپتا رضا کی لائبریری اہم ترین تھی۔ اب آپ کی لائبریری کے چرچے ہیں۔ سنا ہے آپ کتابوں کے لئے کھاتے ہیں کتابوں کے لئے سوتے جاگتے ہیں۔ کتاب آپ کی محبوبہ ہے اور آپ

کا عشق جنون تک پہنچا ہوا ہے۔"

مکتوب ۶ / جون ۲۰۰۶ء

● نعمت اللہ ندوی

(تاج المساجد بھوپال)

آج بتاریخ ۲۰ / ستمبر ۲۰۰۶ء جناب محترم محمد خالد عابدی صاحب کی قیمتی لائبریری دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ماشاء اللہ اتنا بڑا ذخیرہ جو خود موصوف کے ذاتی سرمایہ سے تیار ہوا حیرت انگیز چیز ہے۔ خاص طور پر ادبی کتابیں، خطوط کے مجموعے اور بہت سے علمی و ادبی رسائل۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ پورے مدھیہ پردیش میں ایسا علمی ذخیرہ شاید ہی کہیں ملے گا۔ اس وقت جب کہ قحط الرجال اور علمی فقدان کا ماحول ہے۔ خالد عابدی صاحب کے ذخیرۂ کتب کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے ہمارے محترم کو خصوصی طور پر یہ توفیق ملی ہے اس پر جتنا بھی شکر کریں کم ہے۔ میری دعا ہے محترم محمد خالد عابدی سے بھوپال اور دوسرے اہل علم ان سے بخوبی استفادہ کریں تا کہ یہ کاروان علم و ادب رواں دواں رہے۔

۲۰ / ستمبر ۲۰۰۶ء

● ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی

آج شام ڈاکٹر حافظ ماجد صاحب کے ساتھ جناب محمد خالد عابدی صاحب کی ذاتی لائبریری دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ عابدی صاحب نے بڑی جستجو اور محنت سے مطبوعہ کتابوں کو جمع کیا اور ان کی فہرست بھی تیار کی ہے اور ریسرچ کے اسکالرز کو استفادہ کے لئے مہیا کرتے ہیں۔

تمام مشاہیر ادیب اور شعراء کی کتابیں نیز ڈرامے، فلم اسکرپٹ وغیرہ بھی اکٹھا کی ہیں۔ ریڈیو اسکرپٹ بھی محفوظ کی ہیں۔ کچھ مخطوطات بھی ہیں جنھیں عابدی صاحب نے گودریج کی الماریوں میں برآمدہ نما گھر میں جن کی چھتیں از بس ٹین کی شیٹ لگی ہوئی ہیں۔ کتابوں کی کیفیت اطمینان بخش نہیں ہیں۔ عابدی صاحب نے تیس پینتیس سال میں بہت ساری کتابیں رسائل اور خاص نمبر اکٹھا کئے ہیں جنھیں برباد ہونے سے بچانے کے لئے جلد سے جلد کوئی انتظام ضروری ہے۔

میں نے ڈاکٹر حافظ ماجد صاحب چیف ایڈیٹر ایکشن اردو رہندی سے درخواست کی ہے کہ وہ اس علمی سرمایہ کی حفاظت کے لئے کوئی نہ کوئی انتظام کرادیں۔

میں نے بڑی حسرت اور بے اطمینانی سے اس ذخیرہ کو دیکھا۔ میرے ساتھ ڈاکٹر ابو سعد اصلاحی اور شری ارن کمار سکسینہ رضا لائبریری بھی موجود تھے۔

میں عابدی صاحب کو مبارکباد دیتا ہوں اور ان کی محنت اور کامیابی کے لئے دعا کرتا ہوں۔

۲۲ر فروری ۲۰۰۳ء

فلم

محمد خالد عابدی: فلم اور فلمیات سے ان کا شوق

رشید انجم

قدرت نے انسان کو کئی خصلتوں سے نوازا ہے۔ تمام خصلتوں میں ایک خصلت تفریح کا جذبہ ہے۔ یہ جذبہ دیگر تمام خصلتوں میں ممتاز، اہم اور بیباک ہوتا ہے۔ بیباک اس لئے کہ اس کی تکمیل جب تک آدمی پا نہیں لیتا تب تک اسے تسکین حاصل نہیں ہوتی اور وہ پر سکون نہیں ہو پاتا۔

تفریح کے بہت سے ذرائع آدمی نے ایجاد کر رکھے ہیں۔ وہ مختلف انداز میں ان تفریحات سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ ان تفریحات میں سب سے شدید اگر کوئی جذبہ ہے تو وہ ہے فلم کا جذبہ۔ اسے دیکھنے، ان واقعات سے لطف اندوز ہونے، اس کی موسیقی، مکالموں، اداکاری اور بار بار پردۂ سیمیں پر ابھرتی، بدلتی سچویشن سے تسکین پہنچانے میں آدمی کو عجیب سی پر سکون تسکین کا احساس ہوتا ہے۔

دیگر ممالک میں تو اتنا نہیں ہاں ہمارے ملک میں فلم کے لئے ہمارے اپنے اندر بے پناہ کشش ہر وقت موجود رہتی ہے۔ ہر فلم میں بار بار دہرائے گئے مناظر کو ہم اتنی ہی شدومد سے دیکھتے ہیں جتنا اس منظر کو ہم نے سب سے پہلے دیکھا ہوتا ہے۔ یہ دلچسپ خصلت عمر کے آخری پڑاؤ تک ہمارے جذباتی عمل کا حصہ بن کر ہمیں پل پل فلم سے لطف اٹھانے پر اکساتی رہتی ہے۔

محمد خالد عابدی بھی ایک ایسے شخص ہیں جنہوں نے اپنی نسبتوں سے اپنی الگ پہچان قائم کی ہے مکتبہ عابدیہ ان کی ادبی کاوشوں کا ایک بہت ہی گراں قدر کتب خانہ ہے جس سے ایک جہاں واقف ہے یہ ان کا جنون ہے۔ ان کے جذباتی عمل کا وہ عظیم سرمایہ ہے جسے ادبی دنیا میں ہمیشہ قدر حاصل رہے گی ادب کے علاوہ ان میں ایک جذبہ اور بھی ہے اور وہ جذبہ ہے، فلم کا۔ ہندوستانی فلموں کا۔ انہوں نے ابتداء سے ہی اس جذبے کو اپنی تمام خصلتوں پر حاوی رکھا، کبھی اسے کم نہیں ہونے دیا۔

بچپن میں جو شوق ایک بار اپنی تاثیر قائم کر لے وہ تا عمر اس کے ہمراہ رہتا ہے۔ فلموں کا شوق بھی بچپن سے ہی خالد عابدی کو رہا۔ والد محمد عابد صاحب۔ بہت سخت گیر انسان تھے۔ خالد عابدی جہاں تعلیم کے حصول میں آگے تھے وہاں فلمیں دیکھنا اور وہ بھی پہلے دن فلم دیکھنا ان کا جنون تھا۔ اگر کسی وجہ سے پہلے دن فلم نہ دیکھ پائے تو پھر وہ فلم نہیں دیکھی۔ اس دور میں صرف تین

سینما بھوپال میں ہوا کرتے تھے اور جو آج بھی موجود ہیں۔ لکشمی ٹاکیز، بھوپال ٹاکیز اور بھارت ٹاکیز۔ ان میں اپنے وقت کی کامیاب فلمیں دکھائی جایا کرتی تھیں۔ تب صرف تین شو ہوا کرتے تھے۔ تین بجے والا میٹنی شو جس میں عموماً پرانی، پہلے کی چلی ہوئی، اسٹنٹ فلمیں کم ریٹ پر دکھائی جاتی تھیں۔ سات بجے شام کو پہلا شو اور نو بجے رات میں دوسرا شو جس میں نئی فلمیں ہی فلم بینوں کی دلچسپی، تفریحات کا پرکشش ذریعہ ہوا کرتی تھیں۔

خالد عابدی عموماً اسکول سے چپکا لگا کر میٹنی شو میں فلمیں دیکھا کرتے تھے اور کبھی نئی فلم ریلیز ہوتی تو ہزار بہانے کرکے پہلے شو میں فلم دیکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ظاہر ہے ڈھائی گھنٹے گھر سے باہر رہنا والدین کے لئے تشویش کا باعث ہوتا تھا۔ تب والدین اپنے بچوں کی تربیت پر خاص توجہ دیتے تھے۔ والد کو معلوم ہو جاتے پر کہ فلم دیکھ کر رات گئے گھر لوٹا ہے تو والد اُن کی مرمت کر دیا کرتے تھے۔ بہت سخت سزائیں دیتے۔ کھانا بند کر دیتے۔ والد خود فلم نہیں دیکھتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ فلموں سے اخلاق پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ لیکن خالد عابدی جتنی سزائیں بھگتتے ان کا شوق اور بڑھتا جاتا۔ صرف یہی نہیں تھا کہ سنیما ہال میں فلم دیکھی، لطف اندوز ہوئے اور اگلی فلم تک اس فلم کو فراموش کر دیا۔ نہیں بلکہ اس فلم کے پورے کوائف بھی جمع رکھنا اس شوق کا ایک حصہ بنتا گیا۔ فلم کس نے بنائی؟ کون ہدایت کار تھا؟ کب ریلیز ہوئی؟ کس سنیما میں پہلے دکھائی گئی؟ کون موسیقار اور نغمہ نگار تھا؟ کس کس اداکار اور اداکاروں نے کام کیا تھا؟ کہانی منظرنامہ اور مکالمے کس کے تھے؟ کون سا گانا کس گلوکار و گلوکارہ نے گایا تھا؟ اس کی تفصیلات بھی رکھنا خالد عابدی کا شوق رہا ہے۔

بچپن سے لڑکپن اور لڑکپن سے جب انہوں نے جوانی کی حدود میں قدم رکھا تو مزاج بھی سنجیدہ ہوا تعلیم کے جذبوں کو بھی صیقل کیا۔ تمام خصائل پر والدین کا احترام اور تعظیم واجب ٹھہری۔ ان کے تئیں بھی والدین کے دلوں میں نرم گوشے ابھرے اور بیٹے کی نسبت جان لیا کہ اب وہ دور گزر چکا جب اولاد بے راہ رو ہو جایا کرتی ہے۔ محمد خالد عابدی اعلیٰ تعلیم کے حصول کی منازل طے کرتے رہے مگر فلموں سے جو جذباتی رشتہ ان کا قائم ہو چکا تھا وہ اور مستحکم ہوتا گیا۔ انہوں نے جن فلموں کو جس کوائف کی جمع تک محدود رکھا تھا اب ان کے عوامل پر بھی غور کیا۔ فلمیں کیوں بنتی ہیں؟ کس لئے بنائی جاتی ہیں؟ کہاں کہاں بنائی جاتی ہیں؟ ان کا مقصد کیا محض تفریح مہیا کرنا ہوتا ہے؟ یا ان کے اور بھی منطقی مقاصد ہوتے ہیں۔ کیا کیا لوازمات کام آتے ہیں فلم بنانے میں۔ خالد عابدی جنون کی حد تک ان تمام امکانات پر نہ صرف غور کرتے رہے بلکہ ان کا لٹریچر بھی جمع کرتے رہے۔ فلم کے ہر ہر پہلو پر انہوں نے اپنی نگاہ مرکوز کی اور قلم سے جب انگلی کا رشتہ قائم ہوا تو قرطاس پر

تحریریں شکل لینے لگیں۔ گو یہ تحریریں کچی تھیں۔ نو آموز تھیں مگر اپنی ادبی و فلمی شوق کی ابتدائی عمر میں بہت حقیر بھی تھیں ان کے نزدیک کہکشاں بمبئی، سب رنگ حیدرآباد، تیج دہلی، پرتاپ دہلی، انقلاب بمبئی، فلم ویکلی کلکتہ، پونے ایڈوانس بینگلور وغیرہ میں ان کے فلمی مضامین شائع ہوئے تو مزید حوصلہ ملا۔ الحمراء بھوپال، ندیم بھوپال، کے روزناموں میں بھی اپنے فلمی مضامین شائع کرائے تا کہ مقامی شوقیہ حضرات بھی ان سے لطف اٹھا سکیں۔

محمد خالد عابدی نے اردو ادب و شعر کی ان نمائندہ شخصیات کو بھی اپنی تخلیق کا حصہ بنایا جو واسطہ یا بالواسطہ۔ دانستہ یا غیر شعوری طور پر فلموں کے توسط سے نمایاں ہوئیں۔ مثلاً غالب صدی کے موقع پر ۱۹۶۹ء میں روزنامہ ندیم بھوپال میں خالد عابدی کا ایک طویل مضمون غالب اور فلمی صنعت شائع ہوا تھا جس میں غالب کے کلام کا فلموں میں استعمال، ان کی حیات پر مبنی سعادت حسن منٹو اور راجیندر سنگھ بیدی کے اسکرپٹ پر سہراب مودی کی تخلیق کردہ فلم "مرزا غالب" کا تذکرہ کیا گیا تھا۔ ان کے فلمی شوق کا یہ عالم رہا کہ ایک مشہور گلوکارہ مبارک بیگم بھوپال پروگرام کے سلسلے میں آ کر مقامی گرانڈ ہوٹل میں ٹھہریں تو خالد عابدی اپنے شوق کو دبا نہیں پائے اور ان سے ملنے پہنچ گئے۔ تعارف ہوا اور جب مبارک بیگم کو ان کا نام معلوم ہوا تو تبسم سے فرمایا: "اچھا تو آپ ہیں وہ خالد جو طویل خطوط لکھتے ہیں؟ خالد عابدی مسکرائے۔ مبارک بیگم بال کوی بیراگی سے ملنے کی خواہش مند تھیں۔ خالد نے اپنی خدمت پیش کیں کہ اپنے اسکوٹر پر انہیں بیٹھا کر بیراگی جی سے ملاتے لے گئے۔ راہ میں ٹرافک پولس نے روک لیا۔ لائسنس طلب کیا تو لائسنس ندارد۔ پولیس والا سخت ہوا لیکن تب خالد نے اپنے ہوش قائم رکھے۔ شاید اس لئے کہ ایک فلمی ہستی ان کے ساتھ تھی۔ انہوں نے بے خوف کانسٹیبل سے کہا کہ یہ محترمہ مشہور فلمی گائیکہ مبارک بیگم ہیں اور بال کوی بیراگی کی مہمان ہیں (تب بیراگی منسٹر تھے) کانسٹیبل بیراگی کے نام سے مرعوب تو کیا ہوا البتہ مبارک بیگم کو روبہ رو دیکھ کر اپنی قسمت پر نازاں ہو گیا اور انہیں جانے کی اجازت دے دی۔

خالد عابدی فلم سے متعلق زیادہ تر نمائندہ شخصیات کی تاریخ پیدائش اور ان کے پتے اپنے پاس ذاتی ڈائری میں نوٹ رکھتے تھے۔ ہر ماہ جتنی بھی سالگرہ آتیں انہیں پابندی سے مبارک باد کے خطوط لکھتے۔ اکثر فلمسٹار خطوط کے جواب، کے ساتھ اپنی دستخط شدہ تصویر بھی بھیج دیتے تھے۔ یہ تصاویر سیاہ و سفید ہوا کرتی تھیں مگر اس خوشی کا کیا ٹھکانہ جو خالد عابدی کے جسم سے عیاں ہوتی تھیں۔

چالیس دن، ریشمی رومال اور نقلی نواب فلموں کے خالق تیج ناتھ زار سے ان کی فلمی دوستی تھی اسی شوق ملاقات میں خالد عابدی بمبئی بھی گئے اور تیج ناتھ زار سے ملے ان کی فلمی خدمات پر خالد

عابدی کی گہری تھی ۔ تیج ناتھ زار کے اکثر افسانے شمع دہلی میں شائع ہوا کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک سوانحی مضمون میں تیج ناتھ زار نے فلموں میں لکھنے سے انکار کیا تھا۔ خالد، جب ان سے ملے تو اور جب یہ موضوع زیر گفتگو آیا تو خالد نے اپنی معلومات سے یہ ثابت کر دیا کہ تیج ناتھ زار نے فلموں میں گانے بھی لکھے تھے۔ تیج ناتھ زار ورطۂ حیرت ہو کر خالد کی معلومات کے قائل ہو گئے۔

خالد عابدی نے مراسلاتی انٹرویوز کا سلسلہ بھی شروع کیا تھا جس کے تحت انہوں نے ہندوستان میں اردو ادب کے تخلیق کاروں کے علاوہ فلمی شخصیت کے انٹرویوز بھی لئے۔ ان میں ایک کیدار شرما بھی تھے۔ بہت مشہور و معروف فلمساز، ہدایت کار، اداکار، نغمہ نگار اور ڈانس ڈائریکٹر جنہوں نے راج کپور کو اپنی فلم ''نیل کمل'' میں ۱۹۴۷ء میں سب سے پہلے مدھوبالا کے مقابل پیش کیا تھا۔ کیدار شرما سے ملنے کے لیے وہ بمبئی گئے۔ ان کے بھائی ہمت رائے شرما کی معرفت کیدار شرما سے ملے تھے۔ ان کا دفتر شری ساؤنڈ اسٹوڈیو دادر میں ہوا کرتا تھا۔ بہت خلوص سے ملاقات کی۔ خالد نے ان سے انٹرویو کیا اور کامل ڈھائی گھنٹے تک ان کی فلمی خدمات، ذاتی حالات اور فلموں سے وابستگی پر مختلف سوالات قلمبند کئے جو ان کی کتاب ''مراسلاتی انٹرویوز'' میں شائع ہو چکے ہیں۔ کیدار شرما اس وقت حیران رہ گئے جب ان کی ذاتی زندگی کی معلومات خالد سے انہیں حاصل ہوئیں۔ مثلاً وہ انگریزی ادب میں ایم۔ اے۔ تھے سعادت حسن منٹو اور گیانی ذیل سنگھ ان کے ہم جماعت تھے۔ انہوں نے آغا حشر کاشمیری کے ایک ڈرامے میں خاتون کردار ادا کیا تھا جس کا انعام انہیں چار آنے ملا تھا۔ حسرت امرتسری کے تخلص سے انہوں نے اردو میں شاعری بھی کی۔ ان کا ایک شعری مجموعہ بہ عنوان ''پنچھی'' لاہور سے مشہور فلمساز بی۔ آر۔ چوپڑہ نے پاکٹ سائز میں چھاپا تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اس مجموعہ کلام کے ناشر بی۔ آر۔ چوپڑہ تھے جو جب فلموں سے دور تھے۔

کیدار شرما کی حیات پر اتنی معلومات کی فراہمی جب خالد عابدی نے ان کے روبرو بیان کی تو وہ کافی دیر تک حیرت زدہ سے ان کی شکل دیکھتے رہے۔

کیدار شرما سے یہ ان کی پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ اس وقت ملاقات میں جہاں خالد نے ان سے انٹرویو کیا وہیں اپنا مافی الضمیر بھی بیان کر دیا کہ وہ فلموں میں مکالمہ نویس کی حیثیت سے داخلہ چاہتے ہیں۔ کیدار شرما نے ان سے کوئی مکالمہ ادا کرنے کے لئے کہا۔ خالد نے انہیں ایک مکالمہ سنایا۔ ''مہ ناز تم نے مجھے اس راہ پر لا کر چھوڑ دیا ہے جہاں اب نہ امیدوں کے پڑاؤ ہیں نہ خوابوں کے قافلے'' کیدار شرما نے ایک ماہر فلم تاجر کی طرح ان کے مکالمے کی تعریف کی اور ان کی آنکھوں کو خوش آئند خواب دے کر رخصت کر دیا۔ کیدار شرما اب دنیا میں نہیں ہیں مگر ان کے پندرہ بیس خطوط، خالد کے پاس محفوظ ہیں۔

ڈرامہ، فلم اور اردو ادب کے معروف فنکار ڈاکٹر صفدر آہ سے بھی ان کی خط و کتابت رہی۔ ان کے علاوہ وجاہت مرزا چنگیزی، آغا جانی کاشمیری، علی رضا، ساگر سرحدی، مجروح سلطان پوری، خمار بارہ بنکوی، عزیز قیسی، آنند رومانی وغیرہ۔ فلموں کے ابتدائی دور کے مشہور فلم ایکٹر ماسٹر نثار سے بھی خالد کی خط و کتابت رہی جس پر انہیں بے حد ناز ہے۔

خالد عابدی کی فلمی شوق کی ایک مثال اور بھی ہے۔ فلموں کے پچھتر ۷۵ سال پورے ہونے پر ہندوستان کے مرکزی حکومت نے کندن لال سہگل، پرتھوی راج، دادا صاحب پھالکے، ستیہ جیت رے، بیگم اختر، کشور کمار، دیویکا رانی، مکیش، راج کپور، گرودت اور نرگس پر ڈاک ٹکٹ جاری کئے تھے یہ تمام ٹکٹ خالد عابدی کے فلمی ذخیروں میں محفوظ ہیں۔

خالد عابدی ہر کتاب کے ہر مضمون کو بہت غور سے پڑھتے ہیں۔ ان میں جو نقائص نظر آتے ہیں یا کوئی معلومات حوالے سے محروم پائی جاتی ہے تو وہ فوراً مصنف اور ناشر کو خط لکھ کر اس نقص کی نشاندہی کرتے ہیں اور حوالے کی عدم فہمی پر بھی سرزنش کرنے سے نہیں چوکتے ان کی معلومات وسیع ہیں۔ ان کا مطالعہ عمیق ہے۔ کتب و رسائل، جرائد خریدتے ہیں کبھی نہ تو کسی سے مستعار لیتے ہیں اور نہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ کوئی تخلیق کار انہیں اپنی تخلیق تحفۂ پیش کرے۔ وہ متعدد رسائل و اخبارات کے مستقل خریدار ہیں۔ تواتر سے چندہ بذریعہ منی آرڈر ارسال کرتے ہیں اور ان کا تفصیلی ریکارڈ مرتب رکھتے ہیں۔

جہاں سے جس قدر اور جس قیمت پر بھی انہیں فلمی معلومات فراہم ہو سکتی ہیں ہر ممکن ذریعہ سے حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ تب تک سکون نہیں پاتے جب ان کی مطلوبہ کتب ان تک نہ پہنچ جائیں۔ وہ ہر مضمون کا باریک بینی سے مطالعہ کرتے ہیں۔ اپنی معلومات کا تحریر سے موازنہ بھی کرتے ہیں اور اس کے بعد ہی انڈیکس سے گزر کر وہ کتاب یا رسالہ ان کے کتب خانے کے سلسلے میں شامل ہوتا ہے۔

خالد عابدی کی غیر معمولی فلمی معلومات پر کلا پریشد بھوپال کے ہال میں ایک نمائش کا اہتمام بھی بہت عرصہ قبل کیا گیا تھا۔ اخبارات اور رسائل کی کٹنگ، فلمی شخصیات کے خطوط، ان سے لئے گئے انٹرویوز بے حد قیمتی پوسٹر، زمانہ قبل میں شائع فلمی گیتوں کی کتب اور دیگر قیمتی مفید اور اہم ترین فلمی تصاویر پر مشتمل یہ فلمی معلومات نمائشی طور پر پیش کی گئی تھیں۔ اخبارات نے اس نمائش پر اپنے تاثرات شائع کئے تھے اور جب فلمی صحافت کے موضوع پر عارف عزیز اور انیس انصاری کے مضامین بھوپال ریڈیو سے نشر ہوئے تو ان میں خالد عابدی کا بھی ذکر تھا۔

خالد عابدی نے اپنی پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کے مقالے کے لئے جو موضوع چنا وہ ''فلموں کی ترقی میں اردو کا حصہ'' تھا۔ لیکن یہ موضوع پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کے پابند موضوعات میں سے نہیں تھا اس

لیے ان کی خواہش تکمیل نہ پاسکی۔ ان کی ایک ''اردو ڈائریکٹری'' عنقریب زیور طباعت سے آراستہ ہو کر افق ادب پر نمودار ہونے جارہی ہے۔ یہ ڈائریکٹری اردو زبان کے ادبا، شعراء پر مشتمل ہے۔ انہوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ انڈین فلموں پر مشتمل ڈائریکٹری بھی ترتیب دے رہے ہیں۔ عرصۂ دراز کی یہ کاوش ہر لمحہ انہیں مواد فراہم کرتی رہتی ہے اور ڈائریکٹری کی ضخامت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے ان کی یہ بھی کوشش ہے کہ انڈین فلموں میں ابتداء سے آج تک تمام نغمہ نگاروں کی فلمی تخلیقات مع ان کے سوانحی کوائف کے جمع کریں اور اسے کتاب کی شکل میں شائع کریں۔ ''فلموں میں بھوپال کا حصہ'' کے عنوان سے ان کا ایک معلوماتی مضمون فکر و آگہی کے بھوپال نمبر میں شائع ہو چکا ہے انہوں نے شعر و ادب کی شخصیات کے علاوہ سیاست سے متعلق شخصیات کے فلمی رشتے، رابطے اور فلم کی تخلیق میں ان کی معاونت کا جائزہ بھی لیا ہے۔

محمد خالد عابدی ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جنہیں قدرت نے آگ، پانی ہوا اور مٹی سے تو وجودی صداقت دی ہے۔ مگر ان کی تخلیق میں وہ اجزا بھی شامل وجود کر دیئے ہیں جو انہیں عام آدمی کی سوچ، فکر، ادراک اور روایت سے جدا کرتے ہیں اور وہ وصف انہیں حاصل ہے جو مصور کی فطرت کو پڑھ کر اس کی فنی صلاحیت کا اندازہ لگا لیتا ہے۔ اگر ملکی سطح پر دیکھا جائے تو فلمی نقاد، فلموں پر تبصرہ، فلمی فنکاروں کے سوانحی خاکوں پر عبور رکھنے والا لاتعداد قلم کار اور صحافی کل بھی تھے اور آج بھی موجود ہیں جن کی بیش بہا فلمی معلومات اور فلموں سے متعلق ان کی فنی صلاحیتوں سے ہر وہ شخص واقف ہے جو فلم سے تھوڑی سی بھی دلچسپی رکھتا ہے۔ خالد عابدی بھی ایسے ہی با صلاحیت انسان ہیں جب کا شہرہ گولک گیر تو نہیں ہوا، مگر ان کی فلمی معلومات اور فلمی ذخیرہ سازی سے انکار بھی ممکن نہیں ہے۔ وہ اپنے آپ میں محبوس ضرور رہتے ہیں۔ کبھی خود کو نمایاں نہیں کرتے مگر جن کی فلموں سے مصلحانہ کاوشوں سے ایک زمانہ معترف ہے اور جو ان سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ شخص جس کی مجلسی زندگی اس کی غیر مجلسی زندگی پر حاوی نہ ہو سکی جس نے زندگی کو برائے زندگی نہیں، زندگی کو برائے تخلیق، برائے مطالعہ اور برائے فنی تشکیل تسلیم کیا وہ بذات خود ایک وجودی صداقت کا مظہر ہے۔ جس کی صفات ایک دائرے میں محبوس نہیں، جس کا ذہن ہر لمحہ تجرباتی عمل سے صیقل ہوتا ہے جس نے ادب کی مخلصانہ خدمات کے ساتھ فلموں پر بھی اپنی بصیرتی معلومات کا ذخیرہ اندوز کیا ہے وہ محمد خالد عابدی ہے، جسے بہر حال انہیں نسبتوں سے یاد رکھا جائے گا۔

❖❖❖

فلموں سے متعلق اہم خطوط

۱۰ر جنوری ۱۹۹۵ء

محترمی۔ تسلیم

جناب کا خط ملا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ ہندوستانی فلموں کی تاریخ مرتب کر رہے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ زمانہ کے تغیر و تبدل کے باعث ''شمع'' کا ریکارڈ محفوظ نہ رہ سکا۔ اگر آپ کو کہیں سے ''شمع'' کے ابتدائی شمارے مل جائیں تو ملاحظہ کے لئے ہمیں مستعار دیں۔ ہم آپ کے شکر گزار رہیں گے۔

ادریس دہلوی

محترم محبوب الرحمن صاحب فاروقی

ماہنامہ آج کل کا تازہ شمارہ (فروری ۱۹۹۵ء) دیکھا بہت اچھے اور معلومات افزا مشمولات ہیں۔ شمس کنول صاحب کا مضمون ''فلموں کی خاتونِ اول دیویکا رانی'' بہت اچھا مضمون ہے۔ شمس کنول صاحب ایک اچھے مدیر بھی رہے ہیں اُن کا رسالہ گگن میرے مطالعے میں رہا ہے۔ مذکورہ مضمون میں موصوف نے دیویکا رانی کو فلموں کی خاتون اول کہا ہے لیکن تعین نہیں فرمایا کہ وہ کس لحاظ سے فلموں کی خاتونِ اوّل رہی ہیں۔ میری دانست میں تو یہ ہے کہ کملا بائی کامت رگو کھلے فلموں کی خاتون اوّل ہیں۔ نیز دیویکا رانی پہلی ڈریم گرل کہی گئیں جس کا کہ مذکورہ مضمون میں اظہار نہیں ہے۔ شمس کنول صاحب نے لکھا ہے کہ ''اچھوت کنیا'' بامبے ٹاکیز اور دیویکا رانی کی یہ سب سے مقبول فلم ہے نرنجن پال کی اس کہانی کا پہلا نام ''لیول کراسنگ'' تھا لیول کراسنگ کو ''اچھوت کنیا'' جیسا موزوں ترین نام ہمانسو رائے نے دیا۔ چھوت چھات، ذات پات اور ہندو سماج کے بیجا بندھنوں سے متعلق یہ بڑی موثر کہانی تھی۔ کستوری نام کی ایک ہریجن لڑکی، جس سے ایک برہمن کا لڑکا محبت کرتا ہے''۔ واقعہ یہ ہے کہ فلم ''اچھوت کنیا'' میں پہلے ہندو لڑکا اور مسلمان لڑکی کا معاشقہ دکھایا جا رہا تھا لیکن فرقہ وارانہ فساد کے خوف سے ہریجن لڑکی اور برہمن لڑکے میں یہ کہانی منتقل کی گئی تھی۔

شمس کنول صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''اسٹوڈیو کی لیبوریٹری سے کمد لال گنگولی کو باہر لا

کر اشوک کمار بنا دیا گیا۔ "اشوک کمار" نام تو ان کے والد نے ان کی پیدائش سے پہلے ہی تجویز کر دیا تھا۔ "کمد لال" ان کا اصلی نام نہیں ہے بلکہ کاشی وشویشور گانگولی ان کا اصلی نام ہے۔

بمبئے ٹاکیز کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے شمس کنول صاحب نے لکھا ہے کہ "۱۹۴۵ء کے آخری مہینوں میں دیویکا رانی نے بامبے ٹاکیز کمپنی سے متعلق اپنے تمام حصے شیراز علی حکیم کو فروخت کر دیئے" لیکن بامبے ٹاکیز صرف شیزار علی حکیم تک ہی نہیں رہا بلکہ اسے شیراز علی حکیم نے پاکستان جاتے وقت سکسیر یا نامی تاجر کو مالکانہ حق دیا اور سکسیر یا نے آجین چودھری کو منتظم مقرر کیا تھا اس شکل میں اشوک کمار اور ساوک واچا وغیرہ واپس بمبئی ٹاکیز میں آئے تھے۔ شمس کنول صاحب نے بمبئی ٹاکیز اور فلمستان کی تاریخ میں تو لا رام جالانی کا کہیں ذرا بھی ذکر نہیں کیا جنھوں بامبے ٹاکیز اور فلمستان خرید لیا تھا۔ شمس کنول صاحب نے اپنے اسی مضمون میں لکھا ہے کہ "دلیپ کمار اسٹوڈیو کے اوقات میں سہ پہر کے شو میں (بمبئی کے) میٹرو سینما میں دیکھے گئے تو سزا کے طور پر دلیپ کمار کی ایک دن کی تنخواہ کاٹ لی گئی" لیکن خود اشوک کمار نے تو یہ کہا ہے کہ وہ اور دلیپ کمار سگریٹ نوشی فرما رہے تھے جو کہ اسٹوڈیو کے ڈسپلن کے خلاف تھا چنانچہ ان پر تاوان عاید ہوا۔

دلیپ کمار کی دریافت پر شمس کنول صاحب نے لکھا ہے کہ "دیویکا رانی کے فیملی ڈاکٹر نے یوسف خان کو دیویکا رانی سے متعارف کرایا۔" کچھ عرصے پہلے دلیپ کمار پر ایک ہندی مضمون پڑھا جس میں کہا گیا ہے کہ دلیپ کمار بحیثیت صحافی دیویکا رانی سے انٹرویو کرنے گئے تھے۔ دلیپ کمار نئے صحافی تھے وہ دیویکا رانی کو صحافی کی حیثیت سے متاثر نہیں کر سکے چنانچہ دیویکا رانی نے انھیں صحافت ترک کرنے اور فلم جوائن کرنے کی تجویز پیش کی جو انہوں نے قبول کر لی۔

شمس کنول صاحب نے بامبے ٹاکیز کے ذکر میں فلم "محل" کا ذکر نہیں کیا جو کہ ضروری تھا اور بامبے ٹاکیز میں سعادت حسن منٹو، اوپندر ناتھ اشک، منشی پریم چند اور اختر حسین رائے پوری کا قطعی ذکر نہیں کیا گیا۔ بہر حال چند خامیوں کے باوجود ان کا مضمون خاصا دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔

محمد خالد عابدی

۲۷ جنوری ۱۹۹۵ء

محترم مدیر شمع یونس دہلی ر ادریس دہلوی
السلام علیکم

ماہنامہ شمع کا فروری ۹۵ء کا شمارہ تاخیر سے مطالعہ میں آیا۔ بلاشبہ اردو میں فلمی صحافت کا شمع نے جو آج مقام قائم کیا ہے وہ ہنوز جاری ہے۔ اردو میں فلمی صحافت کے تعلق سے شمع کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ اردو زبان کو عام کرنے میں شمع نے جو خدمت کی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ ہماری یونیورسٹیوں میں ہمارے پروفیسران نے فلمی صحافت پر پی۔ ایچ۔ ڈی۔ وغیرہ کے لئے مقالے نہیں لکھوائے۔ اگر ہم صدق دل سے، ایمانداری سے اور محب اردو کی حیثیت سے "شمع" کا اعتراف کریں تو ماہنامہ شمع کی علمی، فلمی اور ادبی خدمات پر ایم اے۔ ایم۔ فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھوایا جاسکتا ہے۔ لیکن ہمارے پروفیسران گھسے پٹے موضوعات سے دامن چھڑا نہیں پا رہے ہیں۔

اے کے ہنگل (بازگشت، فروری ۹۵ء۔ ص ۸۳ کالم ۱) کا خط پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ وہ اردو میں مطالعہ کرتے ہیں۔ محترم بازگشت کالم میں (فروری ۱۹۹۵ء) مسز طاہرہ حبیب صاحبہ نے ناصر خاں کے بارے میں مختصراً جو معلومات بہم پہنچائی ہے اس میں ایک ذرا غلطی راہ پاگئی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ "ایک فلم جو بحیثیت ہیرو ان کی آخری تھی وہ "سمندری لٹیرا" جس میں انہوں نے اداکارہ بیگم پارہ کے ساتھ کام کیا تھا" تصحیح فرمائیں کہ "سمندری لٹیرا" کے نام سے کوئی بھی فلم نہیں بنی۔ ناصر خان نے جس فلم میں کام کیا تھا اس کا نام "سمندری ڈاکو" تھا اور یہ غلطی بھی درست ہو جائے کہ اس فلم میں بیگم پارہ نہیں بلکہ نادرہ تھیں۔ یہ فلم ۱۹۵۶ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ نیو آرٹ بمبئی کی فلم تھی۔ ہدایت کار تھے اے۔ آر۔ زمیندار موسیقار جے دیو اور گیت کار تھے وشو متر اعادل۔ نیز اس فلم میں گم گم، جانی واکر، اندو پال اور افتخار وغیرہ تھے۔ میرا یہ خط شائع فرما کر ممنون فرمائیں۔ والسلام

احقر
محمد خالد عابدی

آل انڈیا ریڈیو، بیتول
۵ راگست ۹۵ء
محترم محمود ایوبی صاحب
السلام علیکم

میں ہفت روزہ بلٹز اردو کا بہت پرانا قاری ہوں اس لئے کہ بلٹز میں حقائق ہوتے ہیں اور مواد و معیار اچھا ہوتا ہے۔ ۲۲ رجولائی کی اشاعت میں جناب شکیل احمد کا مضمون فلمی صنعت کے سو سال پڑھا۔ مضمون میں بیشتر غلطیاں راہ پا گئی ہیں۔ مثلاً انہوں نے لکھا ہے کہ "سہراب مودی کی فلم مرزا غالب کو ۱۹۵۶ء میں ماسکو میں گولڈ میڈل ملا تھا۔" سبھی جانتے ہیں کہ وہ ۵۴-۱۹۵۳ء میں صدر جمہوریہ ہند نے مرزا غالب فلم کو گولڈ میڈل اور سلور میڈل دیا تھا اور یہ فلم ہندوستان کی پہلی اردو فلم تھی جسے صدر جمہوریہ نے گولڈ میڈل دیا تھا۔

شکیل احمد صاحب نے لکھا ہے کہ "گرو دت نے کاغذ کے پھول سے سینما اسکوپ متعارف کرایا تھا جب کہ کاغذ کے پھول سے پہلے "زمین کے تارے" آچکی تھی۔ شکیل احمد لکھتے ہیں کہ فلم "میرا" دوبارہ بنی۔ میری دانست میں اور ثبوت میں تو یہ ہے کہ فلم "میرا" تو بار بنی ہے۔ اسی طرح فلم وقت کو ۱۹۵۵ء کی فلم کہا ہے جب کہ فلم وقت ۱۹۶۵ء کی ہے۔ ایک اور بڑی غلطی یہ کہ مضمون نگار نے لکھا ہے کہ "پہلی تاریخی (بولتی) فلم امپیریل ۱۹۳۱ء میں نور جہاں اور جہانگیر بنائی تھی۔ کون نہیں جانتا کہ ۱۹۳۱ء کی پہلی بولتی فلم "عالم آراء" تھی موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ "وجاہت مرزا نے "بابر" میں شیخ مختار کو مرکزی کردار دیا۔ "بابر" فلستان کمپنی نے ۱۹۶۰ء میں بنائی تھی اور وجاہت مرزا نے "بابر" نہیں "شہنشاہ بابر" بنائی تھی۔

محمد خالد عابدی

خوش نویسی

محمد خالد عابدی کا ذوقِ خوش نویسی

● مبارک شاہ خاں

محمد خالد عابدی (خالد عابدی) سے میری واقفیت تقریباً ۳۵ سال سے ہے "آواز تما" ان کی کتاب شائع ہو رہی تھی اس کا ٹائٹل میں نے ہی تیار کیا تھا۔ اس کتاب کے بعد ان کی ایک کتاب "باغِ فکر معروف بہ مقطعات جستانج" کی بھی کتابت کی تھی۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ میاں خالد عابدی خوش نویسی میں بھی کچھ دخل رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنا لکھا ہوا کچھ دکھایا بھی تھا۔ انھوں نے باقاعدہ خوش نویسی کی تعلیم حاصل نہیں کی تھی چنانچہ بعض معمولی کمزوریاں تو تھیں۔ میں تو اکثر ان سے کہا کرتا تھا تم اپنی کتاب کی کتابت کے لئے اتنے پریشان رہتے ہو خود ہی کر سکتے ہو۔ وہ کئی سال ملازمت کے سلسلہ میں بھوپال سے باہر بھی رہے۔ ابراہیم پورہ میں ایک بار ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے انکشاف کیا کہ مبارک صاحب آپ نے میری حوصلہ افزائی فرمائی تو میں نے اپنے افسانوں کے مجموعے "زخموں کے دریچے" کی کتابت کی ہے۔ ساغر چشتی، اوجینی کے شعری مجموعے "متاعِ ساغر" اور نشتر اندوری کے شعری مجموعے کی کتابت بھی کی ہے انھوں نے بتایا کہ اندور میں انھوں نے شادی کارڈ بھی لکھے ہیں اور بھی چھوٹے موٹے کام کئے ہیں۔ اب جبکہ کمپیوٹر کا زمانہ آ گیا ہے پھر بھی بیشتر لوگ شادی کارڈ اور دوسری چیزیں کاتبوں سے ہی لکھوانا پسند کرتے ہیں۔ میاں خالد عابدی خوشخط ہیں وہ مشق کو ہی اپنا استاد بنائیں۔ ان میں ایک اچھا خوشنویس اور خطاط بننے کی صلاحیت ہے۔ میری دعا ہے کہ وہ خوش نویسی میں اپنی ایک پہچان بنائیں گے۔ وہ جب بھی مجھ سے فنِ خوش نویسی اور کتابت وغیرہ کے بارے میں کچھ سمجھنا چاہیں وہ مجھ سے سمجھ سکتے ہیں۔ مجھے بھی اس فن کی خدمت کر کے خوشی ہوگی۔

● ۲۹ رمئی ۲۰۰۶ء

- **وکیل احمد بستوی**

جہاں تک مجھے معلوم ہے، محترم خالد عابدی صاحب، ملنسار، بااخلاق، ہمدرد انسان ہیں، بھوپال ریڈیو اسٹیشن پر ایک باوقار عہدہ پر فائز ہیں۔ موصوف کے ذریعہ ہی یہ بات میرے علم میں آئی تھی کہ جناب کو خطاطی سے دلچسپی ہے۔ ذہن میں آیا کہ کیڑے مکوڑے بنالیتے ہوں گے۔ لیکن آج جب ان کے کچھ نمونے سامنے آئے تو معاملہ بالکل اس کے برعکس تھا۔ موصوف میں ایک اچھا خطاط بننے کی ساری صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

میری خواہش ہے کہ وہ خوب سے خوب تر کی تلاش کو جاری رکھیں، انشاء اللہ کامیابی ان کے قدم چومے گی۔

۵/اپریل ۲۰۰۶ء

- **آنند رومانی (مکالمہ نگار)**

آپ کا لیٹر ہیڈ پسند آیا۔ ہمارے نام کے بھی تین چار ڈیزائن اپنے دست مبارک سے رقم کر کے بھیج دیں۔ تو ہم بھی اُردو میں اپنا لیٹر ہیڈ بنوالیں۔

میرے لیٹر ہیڈ کے ڈیزائنوں کا بہت بہت شکریہ۔ ان میں اوپر سے دوسرے خانے والا ڈیزائن نسبتاً بہتر ہے اگر آپ آنند اور رومانی کے بیچ قدرے فاصلہ رکھ دیں اور رومانی کی "نی" کو یوں بنادیں تو شاید یہ اور بھی اچھا لگے۔ اس کے ساتھ ہی آپ ایک عربی کے حروف میں جیسا کہ قطب مینار پر قرآن کی آیتیں لکھی نظر آتی ہیں، اور ایک فارسی کے رسم الخط میں لکھا میرا نام تحریر کر کے بھیجیں، جیسا کہ قدیم قلمی نسخوں کی منقش عبارت ہوا کرتی تھی، تو میں ان تینوں ڈیزائنوں میں سے ایک چن کر اپنا لیٹر ہیڈ بنوالوں گا۔

آپ کے بنائے ڈیزائن تھوڑی سی تبدیلی کرانے کے لئے ساتھ رکھ کر پوسٹ کیے تھے۔ اب آپ بتائیں گے تو پتہ چلے گا میرا وہ خط آپ کو ملا تھا یا نہیں۔"

مکتوب: ۲۳/مارچ ۱۹۸۸ء

۱۶/جون ۱۹۸۸ء، ۵/ستمبر ۱۹۸۸ء

- **جناب علی رضا (مشہور مصنف وہدایت کار)**

"۔۔۔آج کل کاتب بھی اتنے خوش خط نہیں ہوتے جتنے آپ ہیں۔ خط کہت نگاہ ہے۔"

- مکتوب: ۲ر جولائی ۲۰۰۱ء

- **ڈاکٹر شفیقہ فرحت**

"۔۔۔آپ کا حُسنِ خط یعنی Writing ہمارے بڑا کام آئیگا۔ اب جب بھی مجھے کچھ نقل کروانا ہوگا آپ کی گردن پکڑی جائیگی۔ حیرت ہے یہ حُسن اتنے دن تک ہمارے عینک پوش نگاہوں سے کیسے چھپا رہا۔ اور اب کیا خط کا شکریہ بھی ادا کرنا پڑیگا۔ اگر "شاعر" میں "انارکلی کا مقدمہ" تمہاری تخلیق ہے تو واہ واہ۔ کیا کہنے ہیں۔ بیحد قابلِ تعریف ہے۔"

مومن
محمد خالد عابدی
داغ
محمد خالد عابدی
16.9.83

شیخ ابراہیم ذوق دہلوی
محمد خالد عابدی

مرزا غالب
محمد خالد عباسی
16.9.83

میر تقی میر
محمد خالد عباسی
16.9.83

مخزن المکاتیب

محمد خالد عابدی: مشاہیر سے خط و کتابت ۳۶۰

مولانا نعمت اللہ ندوی (استاد ادب دار العلوم تاج المساجد بھوپال)

محمد خالد عابدی: مشاہیر سے خط و کتابت

مولانا نعمت اللہ ندوی

اردو زبان میں جہاں تصنیف و تالیف، ریسرچ و تحقیق کے ذریعہ بڑی خدمات کی گئی ہیں، وہیں علمی و ادبی شخصیات کے درمیان خط و کتابت سے قابل قدر علمی و ادبی سرمایہ کا اضافہ بھی ہوا ہے۔ خطوط نگاری مستقل ایک فن ہے، جس میں شخصیات کے حدود و قیود سے آزاد ہو کر اپنے چھوٹے بڑے مخاطبین کو بیباک ہو کر اپنا مافی الضمیر بیان کر دیتی ہیں۔ خطوط میں وہ بہت ساری باتیں منظر عام پر آجاتی ہیں جو کسی تصنیف، تنقید و تحقیق میں عمداً پیش نہیں کی جاسکتی ہیں۔ ایسے رموز و نکات بھی واضح ہو جاتے ہیں جس کو کسی علمی اور ذاتی مصلحت سے پردہ میں رکھا جاتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مکاتیب و خطوط سے شخصیت نگاری کا ایک نیا باب شروع ہوا ہے۔ اکثر ناقدین تو خطوط ہی کو شخصیت کے خدوخال کے اظہار کا سچا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اور مصنف و ادیب کی تصنیف و تحقیق کو صحیح "منظر" قرار نہیں دیتے۔

اردو میں خطوط نگاری کے ہزاروں نمونے ہیں۔ جن میں زبان اور بیان کے اسلوب، طرز ادا، اور بلاغت و فصاحت نیز جامعیت کے رموز و نکات پائے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی مکتوب الیہ اور صاحب مکتوب کے درمیان تعلقات کے معیار کا بھی ان سے پتہ چلتا ہے۔ خاص طور پر جب کہ دو معاصر شخصیتیں کسی علمی و ادبی موضوع پر ایک دوسرے سے مخاطب ہوں۔ اردو اس اعتبار سے بہت ممتاز اور مالا مال ہے کہ اس میں خط و کتابت کی وہ عظیم ترین مثالیں ہیں جو دنیا کی کسی اور زبان میں نہیں ہیں۔

محمد خالد عابدی مدھیہ پردیش کی ایک ممتاز شخصیت ہیں جنہوں نے علم و ادب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ مطالعہ و تحقیق کے علاوہ معاصر شخصیات سے ان کا زبردست تعلق رہا۔ وہ بالمشافہ ملاقاتیں بھی کرتے رہے اور خطوط کے ذریعہ بھی استفادہ کرتے رہے۔ ان کے لکھے ہوئے خطوط سے جہاں ان کی ذہانت، طلب صادق اور علمیت کا پتہ چلتا ہے وہیں ان کے ادبی ذوق کی بھی داد دینا پڑتی ہے۔

بلاشبہ خالد عابدی ایک صاحب طرز ادیب، تحقیق و تدقیق کے مالک ہیں، ان کا اسلوب

نگارش سادہ مگر مسحور کن ہے، خیر پسند طبیعت کے حامل، خدمت خلق کے جذبہ سے سرشار ہیں۔ وہ ادباء شعراء و مصنفین کے قدرداں، قلمکاروں و فنکاروں کے خدمت گار، اخلاق و شائستگی کے پیکر ہیں، خودی و خودداری کے جوہر سے آراستہ و پیراستہ، اصناف ادب کے تمام گوشوں کے ماہر، ادیبوں، شاعروں مدیروں کے محبوب نظر ہیں، مشاہیر اہل علم کے منظور نظر، ڈرامہ و افسانہ کے گرویدہ، اس کے شیدا اور پر فدا، اردو زبان و ادب کے سچے خادم، اردو رسائل کی آبرو، اپنے قیمتی مضامین سے سنوارنے کی لگن اور فکر میں رہتے ہیں، نشر و اشاعت کے مرکز آکاش وانی کے اردو پروگراموں کے محافظ، امانت و دیانت کی صفت سے مزین، بزرگوں کے علمی ورثہ کے امین، خطوط کی دنیا کے بادشاہ، اہل علم سے مکاتبت کے شرف سے ممتاز۔ اپنی بے انتہا طلازمانی مصروفیات (جن کی بنا پر وہ ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل ہوتے رہے) کے باوجود انہوں نے کبھی کتاب و قلم سے ناطہ نہیں توڑا۔ غیر علمی ادبی سرکاری ماحول میں مشینی مشغولیات کے باوجود ان کا دل و دماغ لائبریریوں اور کتب خانوں میں گھومتا رہتا ہے۔ اور کتابوں کو تلاش کرتا رہتا ہے۔

خالد عابدی صاحب نے ۱۹۶۷ء میں ایک مضمون لکھ کر قلمی دنیا میں قدم رکھا، پھر مسلسل لکھتے رہے، یہاں تک کہ آج ۲۰۰۷ء میں توفیق الٰہی سے تصنیف و تالیف کی دنیا میں وہ ایک روشن مینار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اس لمبے عرصہ میں علم و ادب کی سرد انگیٹھیوں کو گرمایا اور ادب کو اعلیٰ قدروں کا حامل بنایا ہے۔

خالد عابدی صاحب ادب کو سیر و تفریح کی چیز نہیں سمجھتے بلکہ وہ ادب سے زندگی کے راز آشکارہ کر کے زندگی کے مسائل سے بحث کرنا چاہتے ہیں، ادب کو خادم اور زندگی کو مخدوم بنا کر بلندی عطا کرنا چاہتے ہیں، اس لئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ تعمیری ادب کو فروغ دینے اور اس کو پروان چڑھانے میں ان کا نام صف اول کے ادیبوں میں ہے۔

ان کی عادت ہے کہ وہ علم و ادب کے ذریعہ ظلمت کے پردوں کو چاک کرتے ہیں، عمل کے ذریعہ علم کو بلندی و پاکیزگی عطا کرتے ہیں، مطالعہ کے ذریعہ، علم و فن، تحقیق و تصنیف کو آگے بڑھاتے ہیں، خدمت کے ذریعہ علم کے پروانوں کو ٹملاتے ہیں، بالآخر وہ خود اور ان کا علم دوسروں کا مطمح نظر بن جاتا ہے۔

خالد عابدی صاحب کی زندگی کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ صبر و تحمل کا پیکر ہیں، ان کی زندگی میں طوفان و حوادث آئے مگر نہ شکستگی سے دو چار ہوئے، اور نہ ان کے قدم تزلزل کا شکار ہوئے، اللہ تعالیٰ نے جب ان کے قدموں کو ثبات عطا فرمایا، یاس و قنوطیت ان کے قریب نہ آسکی،

عزم وحوصلہ کی صفت سے متصف ہو کر دیوانہ وار آگے بڑھتے گئے، اور نا امیدی کے غبار سے اپنے آپکو نکالتے چلے گئے، نہ ہمت ہاری، نہ قدم رُکے، سیلاب نے ان کے علمی سرمایہ کو برباد کر دیا، بیش قیمت کتابیں ضائع ہو گئیں، لیکن پھر نئے عزم کے ساتھ سفر کے لئے رواں دواں ہو گئے، دوبارہ پھر اپنے ذاتی سرمایہ سے ایک قیمتی لائبریری تیار کر ڈالی، ہزاروں کتابوں اور رسائل پر مشتمل حیرت انگیز ذخیرہ عابدی صاحب کے خزینہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

کہتے ہیں کہ ادب شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے، ادب میں شخصیت جلوہ گر ہوتی ہے۔ اور یہ بات کہی جاتی ہے کہ مٹی میں گلاب کی خوشبو اس لیے محسوس ہوتی ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے مٹی کو گلاب کی صحبت مل گئی تھی، بالکل اسی طرح ادب میں سوز و گداز، اثر و تاثر خود خالد عابدی صاحب کی سیرت واخلاق کا عکس جمیل ہے۔

عابدی صاحب نے علم وادب کے متعدد شعبوں میں امتیازی خدمت انجام دی ہیں لیکن یہاں ہم مکاتیب و خطوط کی نسبت سے ان کی خدمات اور کمالات کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ اس شخصیت نے دینی ادبی وفنی وابستگی کو کس طرح مشاہیر علم وادب سے مزین کیا ہے۔

خطوط زندگی کے ظاہر و باطن کا آئینہ دار ہوتے ہیں، وہ باتیں جو عام کتابوں میں نہ لکھی جا سکتی ہیں اور نہ کہی جا سکتی ہیں وہ خطوط میں لکھ دی جاتی ہیں، گویا خطوط زندگی کا حقیقی مرقع ہیں، کیوں کہ ان میں تصنع و تکلف نہیں ہوتا ہے، وہ ایک خود ساختہ تخلیق ہوتا ہے، اس لیے خطوط کی زندگی میں بڑی اہمیت ہے اور پھر مشاہیر کے خطوط کی مزید اہمیت ہے۔ ان کے خطوط ادب عالیہ اور ایک تاریخی دستاویز کا مقام حاصل کر لیتے ہیں۔

ہندوستان کے جن ادباء شعراء اور علماء نے عابدی صاحب کو خطوط لکھے ہیں وہ سب اپنی جگہ قابل احترام اور قابل عزت ہیں، ان کا مقام ان کے ناموں اور کاموں سے ہی ظاہر ہے۔

خالد عابدی صاحب نے ملک کے جن مشہور اہل علم، ادباء، شعراء اور نقادوں سے مراسلت کی ہے ان کی تعداد بہت بڑی ہے، وہ موضوعات بھی بہت ہیں جن کا تعلق خط و کتابت سے ہے۔ ذیل میں ہم بعض مشاہیر کا ذکر کر رہے ہیں، علی سردار جعفری، امتیاز علی عرشی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، گیان چند جین، مجروح سلطان پوری، نورالحسن ہاشمی، جگن ناتھ آزاد، شعری بھوپالی، قرۃ العین حیدر، کوثر چاند پوری، مالک رام، حیات اللہ انصاری، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر مختارالدین احمد آرزو، نثار احمد فاروقی، ان حضرات سے خالد عابدی صاحب کی خط و کتابت سے اندازہ ہوگا کہ خالد عابدی صاحب کو علم وادب کی ہر چھوٹی بڑی بات کی کتنی فکر رہتی تھی، اور وہ نامعلوم کو معلوم کرنے کے

لیے بڑوں سے رجوع کرنے میں کوئی تکلف محسوس نہیں کرتے ہیں، اس کا احساس واعتراف خود مکتوب الیہم کے جوابات سے آپ کو ہو جائیگا۔

● مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ناظم اعلیٰ تھے۔ اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر۔ خالد عابدی صاحب نے "مدھیہ پردیش میں اردو" کے موضوع پر تحقیقی کام کیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو خط لکھا۔

درج بالا سطور سے ثابت ہوتا ہے کہ فخر الدین صاحب کی "مدھیہ پردیش میں گرانقدر خدمات رہی ہیں۔ مجھے یہ تصدیق کرنا ہے کہ ناگود یہ وہی ریاست ہے جو ستنا اور پنا کے درمیان ہے۔ ایک صاحب کا کہنا ہے کہ ناگود راجستھان میں ہے۔ میں جب ریوا میں تھا اور وہاں سے بھوپال آتے وقت یہ ناگود راستہ میں پڑتا تھا نیز ساگر"

۷رمئی ۱۹۸۲ء

مولانا سید فخر الدین صاحب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے دادا تھے۔ "تذکرہ شعراء اردو موسوم بہ گل رعنا میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کے والد حکیم سید عبدالحیٔ نے اپنے والد سید فخر الدین کا ذکر کیا ہے اور ناگود میں ان کے قیام اور ابتدائی تعلیم و تربیت کی بھی وضاحت کی ہے۔ خالد عابدی صاحب نے خط لکھا جس کا جواب مولانا ابوالحسن علی ندوی نے کچھ اس طرح دیا تھا۔

"جواباً تحریر ہے کہ ناگود وہی ریاست ہے جو ستنا اور پنا کے درمیان ہے اور وہ مدھیہ پردیش میں واقع ہے میرے دادا صاحب کی تصنیف تاریخ بگھیل کھنڈ پر مستقل ہے۔"

۲۳رمئی ۱۹۸۲ء

● جگن ناتھ آزاد

اردو شعر و ادب کی مقتدی شخصیت اور اقبالیات کے ماہر جگن ناتھ آزاد سے خالد عابدی صاحب کی خط و کتابت (بقول خود) اس زمانہ میں شروع ہوئی جب جگن ناتھ آزاد پریس انفارمیشن بیورو، ریسی ڈینسی روڈ سرینگر (جموں کشمیر) کے ڈائریکٹر، پبلک ریلیشنز تھے۔ پھر وہ یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو کے عہدہ پر فائز ہو گئے۔ خالد عابدی صاحب آل انڈیا ریڈیو میں اس وقت ریوا میں تھے۔ وہیں ایک ریٹائرڈ پرنسپل کھیڑا صاحب سے ملاقات ہوئی۔ جو بذات خود علامہ اقبال کے ہم جماعت اور دوست رہ چکے تھے۔ اور ان کے لڑکے جگن ناتھ آزاد سے بخوبی واقف تھے۔ عابدی صاحب نے جگن ناتھ آزاد کو لکھا۔ بعد میں آزاد ایک پروگرام میں ریوا بھی آئے۔

اپنے ایک خط میں خالد عابدی صاحب نے جگن ناتھ آزاد کو لکھا" آزاد صاحب کیا آپ کے علم میں ہے کہ" بھوپال کے ذاتی کتب خانوں میں ایک کتب خانہ مجھ ناچیز کا بھی ہے۔ جو مکتبۂ عابدیہ کے نام سے رجسٹرڈ بھی ہے۔

بھوپال کی کوئی اور ذاتی لائبریری رجسٹرڈ نہیں ہے۔ میں زیادہ سے زیادہ کتابیں خریدتا ہوں بعض کتب فروش رعایت دیتے ہیں بعض نہیں، تاہم میرے کتب خانے میں روز افزوں کتابوں، رسالوں وغیرہ کا اضافہ ہو رہا ہے آپ جن کتب خانوں میں تحفۂ کتب پہنچاتے ہوں اس فہرست میں میری لائبریری مکتبۂ عابدیہ کا بھی اضافہ فرمالیجیے گا۔

۶ رجنوری ۱۹۹۴ء

جگن ناتھ آزاد عابدی صاحب کو جواباً تحریر فرماتے ہیں" اس اطلاع سے دلی مسرت ہوئی کہ آپ ایک کتب خانہ بھوپال میں چلا رہے ہیں۔ اپنے احباب کو میں اپنی کوئی نہ کوئی کتاب تحفتاً دیتا رہتا ہوں ایک کتاب اس خط کے ساتھ آپ کی نذر بھی کر رہا ہوں۔ ایسا نہیں کہ میں بعض کتب خانوں کو باقاعدہ کتابیں تحفۃً دیتا رہتا ہوں"۔ اس خط کے لفافے پر جگن ناتھ آزاد نے مزید لکھا:۔
" اندر خط میں تو یہ لکھا ہے کہ ایک کتاب بھیج رہا ہوں لیکن پارسل بند کرنے لگا تو خیال بدل گیا اور گیارہ کتابیں پارسل میں رکھ دیں"

۲۷ رجنوری ۱۹۹۴ء

اس موضوع کے علاوہ عبدالغفور نساخ اور عابدی کی تصنیف" باغ فکر" نیز مشاہیر کے خطوط کے سلسلہ میں دونوں حضرات کے درمیان قابل ذکر خط وکتابت رہی۔

● مالک رام

اردو زبان و ادب کی نامور شخصیت، غالبیات کے ماہر مالک رام سے بھی خالد عابدی صاحب کی خط وکتابت مسلسل رہی۔ غالباً ۱۹۷۶ء سے اس کا آغاز ہوا اور یہ سلسلہ مالک رام سے انتقال تک رہا۔ عبدالاحد تخلص بھوپالی، شعری بھوپالی، عبدالغفور نساخ سے متعلق کافی مکاتبت رہی۔ خالد عابدی نے مراسلت کے ذریعہ سی معلومات حاصل کیں۔ اسی طرح مالک رام نے بھوپال کی ادبی شخصیات کے بارے میں عابدی صاحب سے تعقد کیا اور ان شخصیات کے اعزا، رفقاء اور مصاحبین سے حالات معلوم کرنے کے لیے لکھا۔

خالد عابدی صاحب نے "تحریر" کے چندہ کے سلسلے میں کوئی رقم دفتر" تحریر" کو بھیجی تھی اس سے متعلق جانبین میں کوئی اشتباہ پیدا ہوا۔ جس کا اظہار عابدی صاحب نے ایک خط میں کر بھی دیا۔

س کے جواب میں مالک رام نے ایک زبردست نصیحت کی" میں اپنی عمر اور تجربے کی بنا پر ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں۔ جب تک آپ کو کسی شخص کے صریحاً جرم یا غلطی کا تعین نہ ہو جائے۔ ہمیشہ حسن ظن سے کام لیں۔ اس سے آپ خود بہت سی غلطیوں کے ارتکاب سے بچ جائیں گے، خیر مضیٰ ما مضیٰ۔

۳ر اگست ۱۹۷۶ء

خالد عابدی صاحب کے ذخیرہ خطوط میں وہ خط بھی موجود ہے جو تخلص بھوپالی کے بھائی جناب عبدالصمد خاں صاحب (سابق جیلر بھوپال) کے نام ہے۔ جو تخلص کے انتقال کے بعد لکھا گیا تھا۔

"مکرمی جناب عبدالصمد خاں صاحب۔ آداب، جناب عبدالاحد خاں تخلص کے انتقال پر بہت افسوس ہوا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان سے عفو وکرم کا سلوک فرمائے اور انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے، آمین۔ مجھے ایک تذکرے کے لیے ان کے مفصل حالات درکار ہیں"۔

(مکتوب مالک رام، بنام عبدالصمد خاں صاحب)

ان دونوں شخصیتوں سے مراسلت بھی خالد عابدی کی رہبری کی بناء پر ہوئی تھی۔

● **پروفیسر مختار الدین آرزو**

ملک کے ممتاز اہل علم وادب میں صف اول کی شخصیت ہیں۔ خالد عابدی نے ان سے بھی مراسلت کی ہے۔ خالد عابدی صاحب کو پروفیسر عبدالقوی دسنوی سے معلوم ہوا کہ آرزو صاحب بھی قاضی عبدالودود صاحب پر کام کر رہے ہیں اور اس سلسلہ میں قاضی صاحب کے خطوط ان کو مطلوب ہیں۔ عابدی صاحب نے بہ اہتمام ان خطوط کی نقول آرزو صاحب کو ارسال کیں جو قاضی عبدالودود صاحب نے عابدی صاحب کو لکھے تھے۔

خالد عابدی صاحب اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں "میں نے قاضی عبدالودود مرحوم کے خطوط تلاش کیے۔ پانچ خطوط دستیاب ہوئے۔ فوٹو اسٹیٹ کاپی اور اصل خطوط کو علیحدہ کاغذ پر نقل کر کے بھی روانہ خدمت کر رہا ہوں"

"یہ خطوط بنگال کے شاعر وتذکرہ نگار عبدالغفور نساخ کی ایک کمیاب کتاب "باغ فکر معروف مقطعات نساخ" کی تدوین کے سلسلے میں ہیں۔ میں نے مذکورہ کتاب اور نساخ کے

بارے میں کچھ معلومات حاصل کی تھیں۔ وہ معلومات یہی خطوط ہیں۔ قاضی عبدالودود مرحوم سے میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ اطلاعاً عرض ہے کہ "باغ فکر معروف بہ مقطعات نستاخ" میں نے ترتیب دی تھی اور وہ ۱۹۷۷ء میں شائع بھی ہو چکی ہے۔ (مکتوب مورخہ ۱۲ر نومبر ۱۹۸۷ء بنام مختار الدین احمد آرزو)

خالد عابدی صاحب کو مختار الدین احمد صاحب نے ۷ر فروری ۲۰۰۵ء کو لکھے گئے خط کے جواب میں کچھ یوں تحریر فرمایا۔

"آپ کے نام قاضی صاحب کے خطوط مل گئے تھے، مجموعہ مکاتیب میں شائع ہو گئے۔ آپ نے حالات پہلے بھی منگوائے تھے۔ میں نے مختار نامہ کے مرتب کو آپ کی فرمائش لکھوادی تھی میں پھر لکھوں گا۔ آپ ایک کارڈ انھیں لکھ دیں۔

● مکتوب ۱۲ر فروری ۲۰۰۵ء

دونوں حضرات کے درمیان اس کے علاوہ، آغا حشر کاشمیری، ارمغان الفت مرتبہ مالک رام، ڈاکٹر انجمن آراء، و دیگر موضوعات پر خط و کتابت ہوئی، جن کے مطالعہ سے علمی فائدہ ممکن ہوتا ہے۔

● پروفیسر آل احمد سرور

پروفیسر آل احمد سرور ملک کے ممتاز ادیب اور ناقد تھے اردو زبان و ادب میں ان کا نام سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ محمد خالد عابدی نے محی الدین زور سے متعلق معلومات کے سلسلہ میں سرور صاحب کو خطوط لکھے تھے۔ جو جوابات سرور صاحب نے دیے، ان میں خالد صاحب کے سوالنامے کے کُل جوابات تو نہیں ملے۔ البتہ مختصراً ذکر ضرور کیا گیا۔

خالد عابدی نے اپنے ایک خط میں لکھا "محترم آل احمد سرور صاحب۔ السلام علیکم۔

"میں نے غالباً ۲۵ر مئی ۱۹۷۸ء کو آپ کی خدمت شریف میں ایک خط روانہ کیا تھا شاید ملا ہو۔ جی! ہاں محی الدین قادری زور مرحوم سے متعلق ضروری تفاصیل درکار ہیں۔" یہاں ریوا میں علی گڈھ کا کوئی شخص" آل احمد سرور ڈے" کے نام پر چندہ جمع کر رہا ہے۔ میں نے تحقیق کی ہے معلوم ہوا ہے کہ جناب مبشر علی صدیقی صاحب کے عزیز تھے"

۲۶ر جون ۱۹۷۸ء

آل احمد سرور نے خالد عابدی صاحب کو جواب لکھا ''زور صاحب کے متعلق اپنے تاثرات ہفتے عشرے کے بعد بھجوا سکوں گا۔ ویسے آپ کس خاص پہلو پر معلومات چاہتے ہیں؟

وہ تو بڑے جامع صفات آدمی تھے۔ میری پہلی ملاقات ۱۹۳۶ء میں علی گڈھ کی اردو کانفرنس میں ہوئی تھی۔ (مکتوب بنام خالد عابدی، مورخہ ۸ رمئی ۱۹۷۸ء، کشمیر یونیورسٹی)

ایک اور خط میں آل احمد سرور لکھتے ہیں'' ریوا میں جو صاحب میرے نام سے یا آل احمد سرور ڈے کے نام سے چندہ جمع کر رہے ہیں۔ ان کو آپ یا کوئی اور قطعی کسی قسم کا چندہ نہ دیں۔ یہ صاحبزادے اگر چہ میرے عزیز ہوتے ہیں مگر گھر سے فرار ہیں اور اب ان کا یہی مشغلہ ہے''۔

● مکتوب بنام خالد عابدی مورخہ ۱۸/ اگست ۱۹۷۸ء ۔ سری نگر

☆

دونوں شخصیات کے درمیان اس کے علاوہ ''سر راس مسعود، فانی بدایونی، حامد حسن قادری، اور آل احمد سرور صاحب کی کتاب ''عکس غالب'' و دیگر موضوعات پر مراسلت رہی۔

''ایک خط میں خالد عابدی صاحب نے آل احمد سرور کو لکھا'' فانی بدایونی، مہاراجہ گوالیار کے اردو استاد ہو کر آئے تھے۔ جب فانی کو یہ معلوم ہوا کہ مہاراجہ کا انگریزی استاد زیادہ تنخواہ پا رہا ہے۔ اور اردو استاد کو قلیل تنخواہ پر رکھ رہے ہیں تو وہ واپس ہو گئے۔ یہ بات شاید حسن الدین احمد صاحب نے لکھی ہے۔ لیکن کوئی حوالہ درج نہیں ہے۔''

● مکتوب بنام آل احمد سرور۔ ۱۲/ اپریل ۱۹۸۴ء

● علی سردار جعفری

ہندوستان میں علم و ادب کی ممتاز شخصیت، ترقی پسند شاعر، اور فلموں میں شعر و ادب کی پذیرائی کے متقدمین میں سے ہیں۔ خالد عابدی صاحب بھی ادبیات زبان کے علاوہ ریڈیو کے ڈراموں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ فلموں میں اردو زبان و ادب کے دخل اور اثرات پر کام کر چکے ہیں۔ دونوں کے درمیان قلب و نظر کی ہم آہنگی ہے۔ عابدی صاحب نے علی سردار جعفری سے مختلف مقاصد اور موضوعات کے سلسلے میں خط و کتابت کی ہے۔ اور ان کو جعفری صاحب سے بھی تسلی بخش جوابات بھی ملے ہیں۔

خالد عابدی صاحب لکھتے ہیں:۔

محترم ترین۔ علی سردار جعفری صاحب۔ السلام علیکم

''میرا تحقیقی مقالہ ''فلموں کی ترقی میں اردو کا حصہ'' کے لیے چند اور سوالات، جوابات کے

طالب ہیں۔ آپ کے علاوہ دیگر حضرات سے تعاون حاصل نہیں ہے۔ یہ آپ کی محبت۔ آپ کا کرم ہے کہ آپ میرے ذریعہ دی گئی تکلیف کو بار بار برداشت کرتے ہیں۔ یہ سوال قلم سے وابستہ دیگر اردو قلم کاروں سے کرنا تھے اور ان کے جوابات مقالے میں شامل کرنا ہیں۔ لیکن افسوس کہ ان کا غرور آسمان کو پہونچا ہوا ہے''۔

(مکتوب بنام خالد عابدی۔ ۱۰؍جون ۱۹۷۸ء)

علی سردار جعفری نے جواباً تحریر کیا۔ آپ کا سوالنامہ جون میں آیا تھا۔ میں بے انتہا مصروف ہوں۔ اولین فرصت میں جواب لکھ کر بھیج دونگا۔ ویسے فلموں سے میری زندگی کا کوئی گہرا تعلق نہیں ہے۔ بہت سے احباب وہاں کام کرتے ہیں۔ میں کبھی کبھی بہک کر اُدھر چلا جاتا ہوں۔ پھر واپس آجاتا ہوں، آپکا سردار جعفری۔

(مکتوب بنام خالد عابدی۔ یکم ستمبر ۱۹۷۵ء)

ایک اور خط میں خالد عابدی صاحب کو مطلع کیا گیا۔

''عنایت نامہ کا شکریہ! دلیپ کمار کو دادا صاحب پھالکے ایوارڈ ملنے پر میں نے آل انڈیا ریڈیو کو جو بیان دیا تھا اُس کا خلاصہ تحریر کر رہا ہوں۔ میں نے کہا دلیپ کمار نے اتنی تاخیر سے ملنے والے ایوارڈ کو قبول کر کے اپنی شرافت کا ثبوت دیا ہے۔ فرانس کے مشہور ادیب کاموس (Camus) نے تاخیر سے ملنے والے نوبل انعام کو لینے سے انکار کر دیا تھا۔ بہرحال خوشی کی بات ہے کہ جس انعام پر وہ ہر طرح سے مستحق تھے وہ انکو پیش کیا گیا۔ اس سے انعام کا وقار بھی بڑھ جاتا ہے۔ میں دلیپ کو غالب کے اس شعر کے ساتھ مبارکباد دے رہا ہوں۔

ترے جواہر طرف کلہ کو کیا دیکھیں
ہم اوج طالع لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

(مکتوب بنام خالد عابدی۔ ۳؍اگست ۱۹۹۵ء)

● کوثر چاندپوری

بھوپال سے قریب اندور روڈ پر آشٹہ کے قرب میں جاور ایک قصبہ ہے۔ کوثر چاندپوری وہاں رہے ہیں۔ بھوپال بھی ان کا وطن ثانی ہے۔ ادب و معاش نے ان کو بھوپال سے دور کیا اور وہ تحریر کے امام بن کر بیسویں صدی اور دیگر ادبی رسائل میں مشہور افسانہ نگار کوثر چاندپوری قرار دیے گئے۔ آج ساری دنیا انھیں اسی نام سے جانتی ہے۔ خالد عابدی کے ان سے گہرے تعلقات رہے۔

خط وکتابت علمی اوبی موضوعات سے متعلق رہی۔ عابدی صاحب کے ذخیرہ میں ان کے بھیجے ہوئے خطوط اور ان کے جوابات محفوظ ہیں۔ جن میں بہت سی علمی، ادبی، اور تاریخی حقیقتیں منکشف ہوتی ہیں۔

کوثر چاند پوری کو عابدی صاحب نے ۳۱ سوالات پر مشتمل ایک خط بھیجا تھا۔ جس کے جوابات کوثر چاند پوری نے ارسال کیے۔ وہ بھی اس ذخیرے میں موجود ہیں

خالد عابدی صاحب نے کوثر چاند پوری کو لکھا:

''میں اردو ڈرامے پر کچھ کام کر رہا ہوں۔ مواد کی تلاش میں آپ کا ایک ڈرامہ کا نام ''منزل کتنی دور'' بھی ملا۔ لیکن یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ ڈراما کب اور کہاں شائع ہوا۔ اور یہ ڈرامہ ریڈیو ڈرامہ ہے یا اسٹیج؟ آپ کے ایک خط سے معلوم ہوا تھا کہ آپ کا ایک مزاحیہ ریڈیو ڈرامہ ''منشی جی'' بھی ہے۔ اگر آپ کی دانست میں آپ کے اور دوسرے ڈراموں کے نام ہوں تو تحریر فرما دیں۔ عین نوازش ہوگی۔

کوثر صاحب آپ نے میرا سوالنامہ پُر کر کے واپس روانہ کیا تھا۔ لیکن مجھے ہنوز نہیں مل سکا۔ حتیٰ کہ میں نے پوسٹ آفس میں جا کر معلومات بھی کی۔ دوبارہ جوابات دینے کی گنجائش ہو تو میں سوالنامہ ارسال خدمت کر دوں۔

ایک افسوسناک خبر سنیے کہ تخلص بھوپالی کا انتقال ہو گیا ہے''

۷راگست ۱۹۷۷ء

اس کے جواب میں کوثر چاند پوری نے لکھا:۔

''برادرم خالد عابدی صاحب۔ تسلیم۔ آپکا عنایت نامہ مورخہ ۷راگست ۱۹۷۷ء وصول ہوا۔ شکریہ! آپ نے میرے جس ڈرامہ کا حوالہ دیا ہے۔ ''غالباً وہ صبح یا نئی صبح'' پٹنہ میں شائع ہوا تھا۔ اس کا ماحول میرے ذہن میں نہیں۔ غالباً ریڈیو ڈرامہ ہی تھا۔ ویسے آپ اسے پڑھ کر اندازہ کر لیں گے۔ ''منشی جی'' بہت اچھا مزاحیہ ڈرامہ تھا۔ بھوپال سے نشر ہوا تھا۔ اس کے بعد وودھ بھارتی سے متعدد بار نشر ہوا۔ اس کی کوئی کاپی میرے پاس نہیں ہے۔ چند اور ڈرامے بھوپال ہی سے نشر ہو چکے ہیں۔ ان کے نام تک بھول گیا ہوں۔ کسی کام کو دوبارہ کرنا میرے لیے بہت مشکل ہے۔ آپ سوالنامہ بھیجدیں۔ دیکھ لوں گا۔

۱۰راگست ۱۹۷۷ء

• حیات اللہ انصاری

حیات اللہ انصاری ایڈیٹر قومی آواز لکھنو، ذہنی طور پر کانگریس سے وابستہ تھے۔ لیکن علم وادب سے بھی گہرا واسطہ تھا۔ ترقی اردو بورڈ کے چیئرمین بنائے گئے تھے۔ خالد عابدی کا ان سے ملاقات ومراسلات کے ذریعہ تعلق رکھنا ایک یقینی امر تھا۔ دونوں حضرات کے درمیان یہ ربط کب شروع ہوا یہ تو متعین طور پر معلوم نہیں۔ البتہ جو مراسلت ہوئی اس کے نمونہ ذیل میں ہیں۔

ایک خط میں عابدی صاحب حیات اللہ انصاری کو لکھتے ہیں۔

''محترم حیات اللہ انصاری صاحب۔ السلام علیکم۔ آج آپ کا ۲۰؍مارچ کا خط ملا۔ فلم ''نیچا نگر'' کے بارے میں تفصیلی خط پڑھ کر اطمینان ہوا۔ انصاری صاحب میں تو آپ کے جواب کی طرف سے مایوس ہو چکا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کہیں وہاج الدین انصاری مل جائیں تو ان سے شکایت بھی کی جائے۔ بہر حال جواب موصول ہوا۔ دیر آید درست آید۔ انصاری صاحب فلم نیچا نگر کے بارے میں چند مختصر سوالات نے اور جنم لے لیا ہے۔ مثلاً (۱) فلم نیچا نگر کے مکالمہ نویس اور نغمہ نگار کون تھے؟ (۲) رشید انور کا مختصر تعارف کرا دیجیے۔

۴؍مارچ ۱۹۷۷ء

اس کا جواب حیات اللہ انصاری نے کچھ اس طرح دیا تھا۔

''مکرمی خالد صاحب۔ تسلیم۔

مجھے افسوس ہے کہ میں بہت دیر کر کے آپ کو جواب دے رہا ہوں۔ میں دورے پر رہا اور کچھ کاموں میں مصروف۔ دوسری بات یہ کہ میں آپ کے سوالوں میں بہت کم کا جواب دے سکتا ہوں (۱) نیچا نگر کا مکالمہ نویس میں ہی تھا (۲) رشید انور مسلم یونیورسٹی کے گریجویٹ ہیں۔ پہلوانی کے بہت شوقین ہیں اور لندن میں، ہندوستان میں انھوں نے بہت سے اکھاڑے کرائے ہیں اور لوگوں کو کشتیوں سے روشناس کرایا دارا سنگھ کو وہی اس میدان میں لائے۔''

۲۱؍جولائی ۱۹۷۷ء

• ڈاکٹر نثار احمد فاروقی

اردو زبان وادب کے مشہور ادیب اور نقاد نثار احمد فاروقی سے بھی محمد خالد عابدی کی خط وکتابت رہی۔ عابدی صاحب کے ذخیرہ میں فاروقی صاحب کو لکھے گئے خطوط تو نہیں مل سکے۔ البتہ نثار احمد فاروقی نے جو خطوط لکھے اس کی نقول موجود ہیں۔ اپنے ایک خط میں فاروقی صاحب لکھتے ہیں۔

"مجھے معلوم ہو کر خوشی ہوئی کہ آپ عبدالغفور نساخ کی حیات اور تصانیف پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ ان کے بارے میں آپ کو کتابیں کلکتہ، پٹنہ (اور کسی حد تک حیدر آباد) میں ملیں گی۔ مقطعات رسالہ اردو کراچی میں بھی چھپی تھی۔ میں نے اسے علی گڈھ میں دیکھا تھا اگر آپ ان کتابوں کی فہرست تیار کر سکیں جن کی آپ کو ریسرچ کے سلسلہ میں ضرورت ہوگی تو شاید آپ کو بتا سکوں کہ ان میں سے کون سی کتابیں کہاں دستیاب ہے"۔

۲۳ نومبر ۱۹۷۵ء

• قرۃ العین حیدر

مشہور افسانہ نگار اور ادیبہ قرۃ العین حیدر سے خالد عابدی کی مراسلت رہی۔ قرۃ العین حیدر کے تین خطوط عابدی صاحب کے پاس ہیں۔ ایک خط میں لکھتی ہیں۔

"محترمی تسلیم۔ "تاریخ اندور" سجاد حیدر یلدرم کی تصنیف نہیں ہے۔ البتہ خافی خاں کے فرضی نام سے یلدرم نے حسرت موہانی پر ایک مضمون لکھا تھا۔ جو میں نے "کار جہاں دراز ہے" جلد اول میں شامل کیا ہے"۔ (خط بنام خالد عابدی، مورخہ ۲۹ راپریل ۱۹۸۹ء)

اس کے علاوہ دو دوسرے خطوط میں گیان پیٹھ ایوارڈ دیئے جانے پر عابدی صاحب نے جو مبارکباد پیش کی تھی اس پر شکریہ ادا کیا گیا۔ اور دوسرے خط میں سجاد حیدر یلدرم نے مہاراجہ اندور اور نواب باندہ کو جو خطوط لکھے تھے ان پر لاعلمی کا اظہار کیا گیا ہے۔

• شعری بھوپالی

مشہور شاعر شعری بھوپالی اگر چہ بھوپال ہی کے تھے۔ چونکہ خالد عابدی آکاشوانی کی ملازمت کی وجہ سے بھوپال سے باہر بھی آتے جاتے رہے اس لیے مختلف مقامات سے شعری بھوپالی سے خط و کتابت رہی۔ ذیل میں عابدی صاحب کو لکھے گئے بعض خطوط کے اقتباسات دیے جارہے ہیں۔

"محترم المقام عزیزی خالد میاں سلمہ اللہ العزیز

"جوابی پوسٹ کارڈ ملا، ۷ رمارچ ۱۹۷۸ء تک میرے پاس وقت نہیں ہے۔ اگر مارچ کے دوسرے ہفتے کہیں مشاعرہ ہو تو میں شرکت کر سکتا ہوں۔ رہا سوال نذرانے وغیرہ کا تو اس کے لیے آپ ہی میری طرف سے ان کے بجٹ وغیرہ کا جائزہ لے کر طے کر دیجئے۔ میں حسب اطلاع آجاؤں گا"۔

۱۵ رفروری ۱۹۷۸ء

ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"کرم نامہ ملا، یاد آوری کا شکریہ ایونیورسٹی کے مشاعرہ کی روداد معلوم ہوئی۔ میرا خیال ک آئندہ آپ میرے متعلق اپنی رائے محفوظ رکھئے۔ کیونکہ اگر رائے نہ مانی جائے تو ایک طرح کی توہین بھی ہے۔ میری وجہ سے آپ کی بات ضائع ہو میرے لیے بھی تکلیف دہ ہے"۔

۱۶ر مارچ ۱۹۷۹ء

ایک اور خط میں عابدی صاحب کو لکھا:۔

"ریوا کا موسم اگر زیادہ گرم نہ ہو تو لکھئے تا کہ میں ایک دو دن کے لیے حاضر ہو جاؤں۔ آپ کی موجودگی سے مجھے کسی بھی طرح کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ اپنے ایسے دوست جو با صلاحیت ہوں ان سے میرا سلام کہیئے"

۱۸ر مئی ۱۹۷۹ء

● پروفیسر نورالحسن ہاشمی

محمد خالد عابدی کی سب سے زیادہ مراسلت نورالحسن ہاشمی صاحب سے ہوئی۔ نورالحسن ہاشمی کے بھوپال سے خاندانی تعلقات رہے ہیں۔ رشتہ داریوں کے سلسلہ میں ایک زمانہ تک یہاں ان کی آمد ورفت رہی۔ اور دیگر علماء ادباء سے ملاقاتیں بھی رہیں۔

خالد عابدی اور نورالحسن ہاشمی کے مابین مراسلت کا موضوع قدیم وجدید شعراء وادباء ان کی تخلیقات وتصنیفات ہیں جو دونوں حضرات کا دلچسپ موضوع ہیں۔ تمام خطوط اور ان کے جوابات کا تجزیہ واستنباط کیا جائے تو پوری ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ اسی سے اندازہ لگایئے کہ دونوں کے خطوط کی تعداد کتنی ہوگی؟

خالد عابدی صاحب اپنے ایک خط میں نوالحسن ہاشمی کو لکھتے ہیں:۔

"بھوپال کا ادبی جائزہ لینے کے لئے کافی مواد ہے۔ جو لائبریریوں میں محفوظ ہے اور مضامین وکتب کی شکل میں بھی۔ سنہ ۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر سلیم حامد رضوی نے "اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ" اپنا تحقیقی مقالہ شائع کیا ہے۔ موصوف نے یہ مقالہ آگرہ یونیورسٹی کے لیے لکھا تھا۔ مقالہ طویل تھا۔ اشاعت کے وقت کچھ ابواب وغیرہ کی تخفیف کردی تھی۔ سنا ہے کہ پروفیسر عبدالقوی دسنوی کے داماد جناب محمد نعمان خاں "انضمام کے بعد بھوپال میں اردو" موضوع پر پی ایچ ڈی کر رہے ہیں"۔

۱۰ر دسمبر ۱۹۸۳ء

نورالحسن ہاشمی بھوپال سے متعلق اپنے احساسات کا بیان ایک خط میں کچھ اس طرح کرتے ہیں:۔

''۱۹۲۹ء میں پہلی مرتبہ بھوپال گیا تھا۔ اور اس کے مناظر اور موسم کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد سے متعدد بار بھوپال آیا گیا ہوں۔ اپنے چچا زاد بھائیوں سے بھی مراسلت رہتی ہے۔ ان میں سے ایک بیٹی میری بہو ہے۔ جو میرے ساتھ اب لکھنؤ میں رہتی ہے۔ اس طرح آپ کو اندازہ ہو سکے گا کہ بھوپال سے میرے ذہنی تعلقات کتنے پرانے اور گہرے ہیں اگرچہ میں خود وہاں زیادہ دنوں کبھی نہ رہ سکا۔ اس لئے وہاں کی سماجی زندگی سے لطف اندوز نہ ہو سکا''۔

۳۱رمئی ۱۹۷۷ء

● مجروحؔ سلطانپوری

مشہور شاعر مجروح سلطان پوری سے بھی محمد خالد عابدی کی مراسلت رہی۔ خالد عابدی نے مجروح صاحب کو بھی دیگر مشاہیر کی طرح ان کے سوانح حیات معلومات کرنے کے لیے سوالنامہ بھیجا تھا۔ جس کا جواب عابدی صاحب کو دیا گیا۔ اس کے علاوہ فلموں اور فلموں کے گانوں سے متعلق بھی خطوط مجروح صاحب کو ارسال کئے گئے۔ مجروح پر تحقیق کے سلسلہ میں اطلاع و استصوابات پر مشتمل خطوط بھی عابدی صاحب نے لکھے۔ مشاعرے بھی زیر بحث آئے۔ ذیل میں دونوں حضرات کے خطوط کے اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔

''اس وقت آپ کو زحمت دینے کا باعث یہ ہے کہ میرے ایک قریبی دوست ہیں وہ اردو ادب میں پی۔ ایچ۔ ڈی کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ مجھ سے مشورہ کر رہے تھے۔ چنانچہ میں نے انہیں ''مجروح سلطانپوری، فن اور شخصیت'' موضوع پر کام کرنے کی تجویز رکھی۔ وہ گویا ہوئے کہ مجروح صاحب پر مواد آسانی سے دستیاب نہیں ہو سکے گا۔ میں نے کہا آپ کچھ کوشش تو کیجئے۔ ان پر بہت مواد مل جائے گا۔ وہ عنقریب آپ سے رابطہ قائم کریں گے۔ کاش آپ تعاون فرمائیں''۔

۲۱رجولائی ۱۹۸۶ء

مجروح صاحب نے اس کا جواب کچھ اس طرح دیا:۔

''عزیزم خالد صاحب۔ جو صاحب آنا چاہتے ہیں آئیں۔ مگر ان کا مبلغ علم معلوم کئے بغیر میں کوئی فیصلہ ابھی نہیں کر سکتا۔ اب سے پہلے بھی دو چار خواتین و حضرات آ چکے ہیں۔ مگر کچھ یونہی سے ثابت ہوئے۔ ورنہ آج کل پی۔ ایچ۔ ڈی تو ہر کسی ایرے غیرے پر لوگ کر رہے ہیں اور ڈگریاں بھی حاصل ہو رہی ہیں۔ کتب معلوم و اہل مکتب معلوم''۔

۲۷رجولائی ۱۹۸۶ء

• امتیاز علی عرشی

رضا لائبریری رامپور

خالد عابدی اور عرشی کے درمیان خط و کتابت کا موضوع بھی دیگر اہل علم اور ارباب دانش وادب کی طرح علمی و ادبی تحقیقات ہیں۔ اس مراسلت میں داغ کے خطوط بنام نساخ، اور مقطعات نساخ کے بارے میں عرشی سے عابدی صاحب نے استصواب کیا ہے۔ نموتہً کچھ اقتباسات پیش ہیں۔

''محترم ترین عرشی صاحب۔ السلام علیکم

حسب ارشاد میں نے سکریٹری صاحب کے نام درخواست ارسال کردی ہے۔ جس میں نساخ کی خودنوشت سوانح عمری کی ''نقل'' کے بارے میں لکھ دیا ہے۔

قبلہ آپ کی رہنمائی اور کوشش سے وہ نساخ کی سوانح عمری کی نقل تو موصول ہو جائیگی۔ ایک زحمت اور دینا چاہتا ہوں وہ یہ کہ نساخ سے متعلق ''صحیفہ اور'''مہر نیمروز'' میں بھی مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ان مضامین کی بھی سخت ضرورت ہے۔

۸/فروری ۱۹۷۷ء

ایک خط میں عرشی صاحب نے خالد عابدی کو کچھ اس طرح لکھا:۔

عزیز ارجمند، سلامت باشند

پہلے آپ کا'' آواز نما'' اور آج مودت نامہ ملا۔ مجھے اس کتابچہ کو پڑھ کر جو مسرت ہوئی وہ دوبالا ہوئی۔ جب میں نے آپ کے مکتوب میں پڑھا کہ یوپی اکیڈیمی نے اس پر آپ کو ایک ہزار روپیہ کا انعام دیا ہے۔

خدا کرے آپ بڑے سے بڑا انعام پا کر ہمسروں میں سر بلندی حاصل کریں، آمین۔ آپ مقطعات نساخ ضرور ایڈٹ کریں۔ اس سلسلے میں مجھ سے بھی خدمت لیں مگر یہ ملحوظ رہے کہ میں کنج کاری کے لائق نہیں رہا۔ اپنے فرائض منصبی ادا کرتا رہوں۔ تو یہ پروردگار کا بڑا کرم ہوگا۔ امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا۔ والدعا۔ احقر۔ عرشی۔

۱۴/اپریل ۱۹۷۶ء

• ڈاکٹر گیان چند جین

اردو کے مشہور ادیب، مصنف اور ناقد ہیں۔ بھوپال اور بھوپال کے اہلِ علم وادب اور تعلیمی

اداروں سے ان کا قریبی تعلق رہا۔ خاص طور پر علم و تحقیق سے متعلق شخصیات و اکابر سے ان کے مراسم رہے۔ ملازمانی سلسلہ میں بھوپال میں کچھ دن مقیم رہے۔ خالد عابدی بھی ان سے بھوپال میں ملاقاتیں کرتے رہے۔ پھر جب عابدی صاحب اور جین صاحب اپنی اپنی ملازمانی مصروفیات کی بنا پر دوسرے شہروں میں منتقل ہوتے رہے تو وہاں سے بھی خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ ظاہر ہے یہ مراسلت بھی علمی ادبی اور تحقیقی موضوعات سے متعلق ہوتی تھی۔ عابدی صاحب جین صاحب سے علمی ادبی استفسارات کرتے تھے اور ان کو اس کا تشفی بخش جواب جین صاحب سے ملتا تھا۔

ایک خط میں عابدی صاحب جین صاحب کو لکھتے ہیں:۔

''میں بھوپال سے اپنی سابقہ ملازمت چھوڑ کر آل انڈیا ریڈیو ریوا پر پروڈکشن اسسٹنٹ ہو گیا ہوں۔ لیکن جین صاحب یہاں اردو کا قطعی ماحول نہیں ہے۔ یہاں لوگوں کے پاس نہ کوئی اردو اخبار آتا ہے اور نہ کوئی ادبی رسالہ، بہت خشک جگہ ہے۔

ہاں البتہ یہاں ٹی آر ایس (ٹھاکر رنمت سنگھ) کالج میں کچھ اردو کتابیں ہیں اور کچھ کتابیں اردو کی یہاں کی ایک شاید سینٹرل لائبریری میں ہیں، خیر، قبلہ آپ سے یہ دریافت کرنا تھا کہ ''مثنوی معراج المضامین'' کا مصنف منیر شکوہ آبادی ہی ہے نا؟ اور کیا اس مثنوی کا ذکر آپ کی کتاب ''اردو مثنوی شمالی ہند میں'' ملتا ہے۔ آپ کی یہ کتاب یہاں نہیں مل سکی۔ اس لئے آپ کو زحمت دے رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ نشاندھی فرمائیں گے''

دسمبر ۱۹۷۷ء

اس کا جواب ڈاکٹر گیان چند جین نے ''شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی'' سے اس طرح دیا:

''مکرمی تسلیم

''اب آپ ہمارے بہت پاس آ گئے ہیں۔ میری کتاب ''اردو مثنوی'' کئی سال سے (Out of Paint) ہے۔ اس میں منیر اور ''معراج المضامین'' کا ذکر ہے۔ اس مثنوی کا مصنف منیر شکوہ آبادی ہی ہے۔ مثنوی کا نام تاریخی ہے۔ ۱۲۸۶ھ تاریخ تصنیف ہے اور ۱۲۹۱ھ میں شائع ہوئی۔ اسٹیٹ لائبریری (رضا لائبریری) رام پور میں مصنف کے ہاتھ کا مخطوطہ بلکہ مسودہ موجود ہے۔ جس میں مصرعوں کو کاٹ کر اصلاحیں کی گئیں ہیں۔ ریوا میں آپ کو شہاب اشرف پروفیسر کامرس کے پاس اردو کا ماحول ملے گا۔ ان سے ملئے۔

۲۷ دسمبر ۱۹۷۷ء

گذشتہ اوراق میں یہ کچھ نمونے ان خطوط کے پیش کیے گئے جو مشاہیر سے منسوب تھے۔ خالد عابدی نے تقریباً تین سو (۳۰۰) سے زیادہ مشاہیر اہل قلم سے خط و کتابت کی ہے۔ اور ان کے اصل خطوط اور ان کی نقول ان کے پاس موجود ہے۔ بذات خود یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر ایک تحقیقی مقالہ مرتب کیا جاسکتا ہے اور علم و ادب، زبان و بیان کی بہت سی نزاکتیں سامنے آسکتی ہیں۔ خالد عابدی ایک سرگرم صاحب علم و ادیب ہیں۔ وہ دل کے جذبات و احساسات کے ترجمان نہیں بلکہ علم و حقیقت کے پیام بر ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ وہ جب تحقیق کرنے پر آتے ہیں تو ایک لفظ کی اصلیت و ماہیت ان کو بیسیوں مشاہیر سے رجوع کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اور ایک کتاب کی تلاش، اس کے مصنف کا نام، سن طباعت، کی جستجو ان کو کئی نامور اور بے نام صاحبان قلم تک پہونچا دیتی ہے۔ ہم نے اپنی زندگی میں پچاسوں علماء، فضلاء، شاعروں اور نقادوں کو دیکھا ہے اور پڑھا ہے۔ بہتوں کے مبلغ علم پر فخر و مسرت ہوتی ہے اور بعض پر حیرت بھی۔ لیکن عابدی صاحب سے ذاتی واقفیت ان مضامین و مقالات کے مطالعہ، ان کے کتب خانہ کی زیارت اور مشاہیر کے خطوط بنام عابدی سے اندازہ ہوا کہ یہ شخصیت کچھ اور ہے۔ خدا نے ان کے دل و دماغ کو ہمہ وقت بیدار رکھا ہے۔ ان کی طبیعت میں جستجو ہے۔ علم و فن کی تلاش ہے۔ وہ کام شروع کرتے ہیں تو اس کو پورا بھی کرتے ہیں۔ میں نے وہ خطوط پڑھے دیکھے جو انہوں نے مشاہیر کو لکھے۔ زبان و علم سے متعلق ان کے استفسارات دیکھ کر متعجب ہوا، بعض سوالات انہوں نے کئی لوگوں سے کئے اور سب نے ان کو جواب دئے۔ وہ چاہتے تو کسی ایک جواب سے مطمئن ہو جاتے اور بات ختم کر دیتے۔ ایک خاص بات ان خطوط سے یہ ظاہر ہوتی ہے کہ وہ ہر کام کرنے والے کو اہمیت دیتے ہیں۔ قدیم و جدید دور میں جس کسی صاحب قلم، ادیب، و شاعر نے کچھ کام کیا ہے۔ یا صرف وہ اردو سے تعلق و محبت رکھتا ہے وہ اس کے تعارف اور اس کی تخلیقات کے تعارف میں مصروف ہو جاتے ہیں اور پھر اس کو منظر عام پر لانے کی کوشش کرتے ہیں۔

مشاہیر نے ان کو جو خطوط لکھے ہیں یا ان کے خطوط کے جواب دئے ہیں۔ ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ملک کے یہ عمائد ان پر کامل اعتماد رکھتے ہیں۔ وہ ان کی علمی ادبی قابلیت کا اعتراف ہی نہیں کرتے بلکہ ان کو اپنا ہمسر و معاصر رفیق سمجھتے ہیں۔ آج کے زمانہ میں جب کہ زبان وادب کی خدمت ''زبانی'' ہوگئی ہے۔ عابدی صاحب نے زبان و ادب کی روایت کی حفاظت پر بہت کچھ خرچ کر دیا ہے۔ صرف پوسٹ کے مصارف کا ہی اندازہ لگایا جائے تو وہ ہزاروں میں

پہونچے گا۔ مفت خوری اور استحصال کے اس ماحول میں عابدی صاحب کا یہ حوصلہ ایک باوقار معیار سند کی حیثیت رکھتا ہے۔

۔ مکاتیب وخطوط تو ان کی زندگی کا صرف ایک پہلو ہے۔ ان کے کمالات وخدمات بے شمار ہیں اور ضرورت ہے کہ اس پر کام کیا جائے۔

اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت میں مختلف موضوعات وفنون پر تصنیف وتالیف کی گئیں کتابوں کا بڑا دخل ہے۔ یہ کتابیں ادبی وراثت کی امین ہوتی ہیں اور نسل در نسل مختلف طبقات میں علم وادب کی روشنی پہونچاتی ہے اور اس طرح زبان محفوظ رہتی ہے۔ اس ضمن میں مکاتیب وخطوط کی بھی بڑی اہمیت ہے جو شخصیات کے قلبی وذہنی رجحانات وترجیحات کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ زبان وادب کے نشیب وفراز بھی ظاہر کرتے ہیں۔ طرز تحریر، طرز تخاطب، القاب وآداب اور مضامین کے تغیرات سے وہ سب کچھ سامنے آجاتا ہے جو گھروں، محفلوں اور بازاروں میں ہوتا رہتا ہے۔ جو کبھی بھی کتابوں میں نہیں آسکتا۔ اس لئے دیگر علمی ادبی تصانیف کی طرح مکاتیب وخطوط کی طباعت واشاعت بہت ضروری ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے یہاں اس کا رواج ہے اور اس کا فائدہ بھی ہے۔ محمد خالد عابدی کے ذریعہ لکھے گئے خطوط اور مشاہیر علم وادب کے وہ خطوط جو عابدی صاحب کو لکھے گئے بلاشبہ علم وادب کا بڑا اہم ذخیرہ ہیں۔ ان کا منظر عام پر آنا اور زیور طبع سے آراستہ ہونا بہت ضروری ہے۔ بہت سے ادارے اور اکیڈمیاں ہر اعتبار سے یہ استطاعت رکھتی ہیں کہ وہ اس قیمتی سرمایہ کو طبع کرا کر بازار میں لے آئیں۔ یہ ان کے لئے ایک اہم فریضہ ہوگا۔ اس سے پبلیشر، شہر بھوپال اور یہاں کے بہت سے مخلصین کا نام تو ہوگا ہی ساتھ ہی ایک امانت اس کے مستحقین تک پہونچ جائے گی۔ یہ خطوط انتظار میں ہیں کہ کوئی صاحب خیر ہاتھ بڑھائے اور قدردانوں کے شکریہ کا مستحق بن جائے۔

سپاس نامہ

''ہم خیال''

جناب محمد خالد عابدی

آج احساسات اور خیالات کے
بحر بیکراں کے تلاطم میں ہم وہ الفاظ ڈھونڈ نہیں
پا رہے ہیں جنھیں رقم طراز کر کے ہم اپنے دلوں کی ترجمانی کر سکیں کیونکہ آپ کی شخصیت کے اتنے پہلو ہیں اور ہر پہلو اس قدر درخشندہ و تابندہ ہے کہ انھیں صرف محمد خالد عابدی کہہ کر ہی پکارا جا سکتا ہے اور کچھ نہیں۔

آپ ایک مشفق اور مہربان دوست ہیں۔ ہمدرد رفیق ہیں۔ دیانت دار ادیب ہیں اور حروف صحیفہ کے پرستار ہیں ہم آپ کی اردو دوستی اور خدمات کا دل سے اعتراف کرتے ہیں۔

اندور میں آپ کا چند سالوں کا قیام اس شگفتہ غنچہ کی مانند رہا جو ہر سمت خوشبو بکھیرتا ہے اس چشمے کی طرح آپ یہاں رہے جس کے تازہ اور شیریں پانی سے دوست ہی نہیں بلکہ غیر بھی فیض یاب ہوتے رہے۔ آج سب کے دلوں پر ایک بوجھ ہے آنکھیں پرنم ہیں کیونکہ آپ اپنی اس جامعہ شخصیت کو سمیٹ کر اندور سے منتقل ہو رہے ہیں حالانکہ اس میں آپ کی بہتری ہے۔ مگر آپ کا حلقۂ احباب آپ کو ایک پل کے لئے بھی فراموش نہیں کر سکے گا ہم سب کی نیک دعا آپ کے ساتھ جائیں گی اور دعا کے لئے ہمارا ہاتھ اس کی بارگاہ میں آپ کے حق میں ہمیشہ خیر کا طالب رہے گا بلکہ بہ زبانِ خاموش یہ کہتا رہے گا کہ آپ جہاں بھی رہیں خوش رہیں کامیابی و کامرانی آپ کے قدم چومتی رہے۔

آپ اندور سے چلے تو جائیں گے لیکن اندور کے حلقۂ احباب آپ کو ہمیشہ یاد رکھیں گے اور آپ جب بھی گذارے ہوئے لمحات یاد کریں گے ہمیں اپنے بہت قریب پائیں گے

ہم ہیں آپ کے ہم خیال

۱/۸ ہاتھی پالہ مین روڈ، اندو ۲۵ر ستمبر ۱۹۸۸ء

کہکشانِ ادب۔ بھوپال

سپاس نامہ

محترمی جناب محمد خالد عابدی صاحب

کہکشان ادب بھوپال کے لئے بڑے فخر کی بات ہے کہ اس نے سرزمین بھوپال کے مایہ ناز اردو اور ہندی کے شاعروں اور ادیبوں کے اعزاز و استقبال کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اسے عوام اور خواص کے وسیع حلقے میں تحسین کی نگاہوں سے دیکھا جارہا ہے، جو ہمیں مزید آگے بڑھنے کا حوصلہ بھی دیتا ہے۔

آج ہم آپ کا اعزاز اور استقبال کرتے ہوئے اپنے اندر بے پناہ مسرت محسوس کررہے ہیں کیونکہ آپ نے اردو زبان و ادب کی ترویج اور فروغ کے سلسلے میں جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں جنہیں مستقبل کا مورخ کبھی نظر انداز نہیں کر سکے گا۔

محترم کہکشان ادب بھوپال کو قلب کی گہرائیوں سے اس بات کا اعتراف ہے کہ آپ نے فلمی مضامین نگاری سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کرتے ہوئے افسانہ نگاری، مضمون نویسی، ڈرامہ نگاری اور تحقیق کے شعبوں میں جو کارنامے انجام دیے ہیں انھیں برصغیر کے مشاہیر اور دانشوروں نے پورے صدق دلی کے ساتھ سراہا ہے اور آپ کے تلاش و تجسس اور تحقیق کو اعتبار کا درجہ عطا کیا ہے۔ نامناسب نہیں ہوگا اگر اس سپاسنامہ میں ان ممتاز قلمکاروں میں سے جنھوں نے آپ کی تخلیقی کاوشوں کو اہم اور مفید قرار دیا ہے چند حضرات کے کچھ اقتباسات شامل کرلیے جائیں۔ گوپی چند نارنگ اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں "جناب محمد خالد عابدی پروگرام ایگزیکٹو کی حیثیت سے آل انڈیا ریڈیو بھوپال سے منسلک ہیں لیکن ان کی بنیادی حیثیت ایک ڈرامہ نویس اور صاحب علم کی ہے وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اردو زبان و ادب کی تاریخ اور اردو کے ادبی سرمائے سے انھیں عشق ہے انھوں نے ادبی و علمی کتابوں کا جو ذخیرہ جمع کیا ہے وہ دوسروں کے لئے مثال کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ لوگ جو ادب کو منافع کا کاروبار سمجھتے ہیں ان کو محمد خالد عابدی کی زندگی سے سبق لینا چاہئے" اسی طرح معتبر ادیب اور شاعر جناب اختر سعید خاں اپنے ایک مضمون میں یوں رقمطراز ہیں "اس اعتراف میں کسی کو تامل نہ ہوگا کہ خالد عابدی ہمہ جہت قلمکار ہیں۔ افسانے ڈرامے رپورتاژ خاکے، انٹرویو تنقیدی اور تحقیقی مضامین غرض ہر موضوع انکا میدان ہے۔ بیشتر تخلیقات کتابی شکل میں موجود ہیں۔ افسانے کی داد وہ مرحوم کوثر چاند پوری اور رام لعل صاحب جیسی شخصیتوں سے پاچکے ہیں"۔

جناب عشرت قادری نے مضامینِ خالد کے بارے میں بجا طور پر فرمایا ہے کہ "مضامینِ خالد ان کی تازہ تصنیف ہے جو ان کے ادبی سفر اور ہوشمندانہ تخلیقی گرم روی کی نشاندہی کرتی ہے"۔

ان آرا سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ آپ نے مکمل طور پر اپنے آپ کو علمی اور ادبی خدمات کے لیے وقف کردیا ہے۔

کہکشان ادب بھوپال آپ کی خدمت میں یہ سپاسنامہ پیش کرتے ہوئے بے پایاں مسرت محسوس کرتی ہے اور اس یقین کا اظہار کرتی ہے کہ آپ مزید شہرت مقبولیت اور ترقی کی منزلیں کامرانی کے ساتھ طے کرتے رہیں گے۔

عارف عقیل	**ڈاکٹر عظیم انصاری**	**سلیم قریشی**
سرپرست کہکشان ادب	صدر	سکریٹری
ایم۔ ایل۔ اے۔ بھوپال	کہکشان ادب، بھوپال	کہکشان ادب بھوپال

محمد خالد عابدی کی متوقع کُتب اور مضامین

۱۔ مصاحبہ (بھوپال کے شعراء، ادباء سے روبرو انٹرویو)

۲۔ گفتگو (ریڈیو سے نشر شدہ انٹرویو)

۳۔ انٹرویو (شعراء، ادباء، اور فلمی ہستیوں سے لئے گئے مراسلاتی انٹرویوز)

۴۔ متاعِ رفتہ (مرحوم شعراء وادباء کے خطوط محمد خالد عابدی کے نام)

۵۔ اردو ڈائریکٹری (اردو کے شعراء، ادباء اور صحافیوں کے حالاتِ زندگی اور ان کی علمی، ادبی خدمات)

۶۔ فلم ڈائریکٹری

۷۔ فلموں کی ترقی میں اردو کا حصہ۔

۸۔ مدھیہ پردیش میں امیر مینائی، داغ دہلوی، مضطر خیرآبادی، مولانا احسن مارہروی اور سیماب اکبرآبادی کے تلامذہ۔

۹۔ مدھیہ پردیش کے اردو افسانہ نگار۔

۱۰۔ مدھیہ پردیش کے اردو ناول نگار۔

۱۱۔ مدھیہ پردیش کے اردو ڈراما نگار۔

۱۲۔ مدھیہ پردیش کی خواتین قلم کار۔

۱۳۔ مدھیہ پردیش میں اردو طنز و مزاح۔

۱۴۔ مدھیہ پردیش کے اردو اخبار و رسائل اور گلدستے۔

۱۵۔ مدھیہ پردیش کے ہندو شعراء و ادباء۔

۱۶۔ نقطۂ نو گریز (منی افسانوں کا مجموعہ)

۱۷۔ بھوپالی لغت۔

مضامین :

۱۔ اردو لغات نگاری میں بھوپال کا حصہ۔

۲۔ نواب شیفتہ کا بھوپال سے تعلق۔

۳۔ ریاست بھوپال اور اردو ڈراما۔

۴۔ سر راس مسعود اور بھوپال۔

۵۔ سر راس مسعود اور اُن کی تصنیفات و تالیفات۔

۶۔ بھوپال کے قدیم مطابع اور ان کی مطبوعات۔

۷۔ مولانا حالی اور بھوپال۔

۸۔ علامہ راشد الخیری اور بھوپال۔

۹۔ بھوپال کے تاریخی یادگار مشاعرے۔

۱۰۔ تذکرہ چمنستان سخن۔

۱۱۔ ایک نایاب اور فراموش شدہ تذکرہ: گلزار سخن۔

۱۲۔ ایک گمنام شاعر منشی جگنا تھ پرشاد شر۔ فیض بلاسپوری۔

۱۳۔ ایک گمنام شاعر: سید محمد طفیل احمد بدر امروہوی

۱۴۔ اشاریہ آغا حشر کاشمیری۔

۱۵۔ حکیم اجمل خاں اور بھوپال

من کہ محمد خالد عابدی

نام : محمد خالد عابدی (بقول چھوٹی پھوپی محترمہ قریشہ بیگم سابق ہیڈ مسٹریس سلطانیہ گرلس اسکول بھوپال) بوقت پیدائش کچھ اور نام تھا۔ بعدہٗ دادی محترمہ خدیجہ بی اتالیق سلطان جہاں بیگم آف بھوپال نے محمد خالد نام تجویز فرمایا)

ولدیت : محمد عابد (سابق فوجی سلطانیہ انفینٹری بھوپال اور بھوپال کے مشہور ترین خیاط اور شرٹ اسپیشلسٹ دل آرام اینڈ سنس کے نام سے معروف تھے)

پیدائش : ۱۷راگست ۱۹۴۷ء بھوپال (سرکاری کاغذات میں ۱۷رنومبر ۱۹۳۹ء درج ہے)

تعلیم : ایم۔اے۔(اردو) فرسٹ ڈویژن (میرٹ میں سیکنڈ پوزیشن) ''بیسویں صدی میں اُردو کا مکتوباتی ادب'' موضوع پر پی۔ایچ۔ڈی کے لئے برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال میں رجسٹریشن۔ نگراں پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب۔

قلمی نام : آصف کمال/محمد خالد عابدی

ملازمت : پروگرام ایگزیکیٹو (اردو) آل انڈیا ریڈیو بھوپال۔

تصنیفات و تالیفات:

۱۔ ''آوازنما'' (ریڈیو ڈراموں کا مجموعہ) ۱۹۷۵ء

۲۔ ''باغِ فکر معروف بہ مقطعات نساخ'' (ترتیب وتدوین) ۱۹۷۷ء

۳۔ ''پیکر آواز'' (ریڈیو اور اسٹیج ڈراموں کا مجموعہ) ۱۹۸۳ء

۴۔ ''زخموں کے دریچے'' (افسانوں کا مجموعہ) ۱۹۸۸ء

۵۔ ''شکایات عرض ہے'' (طنزیہ ومزاحیہ مضامین کا مجموعہ) ۱۹۹۱ء

۶۔ ''اردو انٹرویوز'' (اردو ادیبوں'' شاعروں اور فلمی ہستیوں سے مراسلاتی انٹرویوز) ۱۹۹۲ء

۷۔ ''ٹیچر کے بغیر'' (بچوں کے ڈرامے) ۱۹۹۴ء

۸۔ ''مضامین خالد'' (تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ) ۱۹۹۵ء

۹۔ ''اردو مراسلاتی انٹرویو'' (شعراء، ادباء اور فلمی ہستیوں سے انٹرویو) ۱۹۹۶ء

قیام مکتبہ عابدیہ بھوپال :۔ ۱۹۷۰ء میں مکتبہ عابدیہ ریسرچ سینٹر قائم کیا۔ مکتبہ عابدیہ بھوپال میں اردو، ہندی، عربی، فارسی اور انگریزی کی تقریباً پانچ ہزار کتب بشمول رسائل محفوظ وموجود ہیں۔ نیز فلمیات پر کتب ورسائل سے شائقین استفادہ کررہے ہیں اردو کے اہم رسائل کے فائل بھی ہیں ملک کے ممتاز قلم کاران نے مکتبہ عابدیہ کا مشاہدہ فرما کر اپنے تاثرات سے بھی نوازا ہے۔

نشرو اشاعت: تقریباً ایک سو پچاس تحقیقی وتنقیدی مضامین، ڈرامے، افسانے، فیچر وغیرہ اردو ہندی رسائل میں شائع اور آل انڈیا ریڈیو کے مختلف اسٹیشنوں سے نشر ہو چکے ہیں۔

خصوصی ذکر حوالہ و اعتراف: تقریباً پندرہ ایم۔اے۔ ایم فل اور پی۔ایچ۔ ڈی (اردو) کے تحقیقی مقالوں میں ذکر، حوالہ اور اعتراف کیا گیا ہے۔

فلمیات پر نمائش اور فلم کوئز :۔ ۱۸ر سے ۱۹ر جولائی ۱۹۹۲ء کو بمقام کلا پریشد بھوپال میں ''فلمیات'' پر نمائش کا انعقاد۔ آل انڈیا ریڈیو بھوپال کے مختلف پروگراموں اور ''رنگ کرتی'' بھوپال کی جانب سے ۲۱ر فروری ۱۹۹۲ء کو ٹی آئی آڈیٹوریم میں اور نومبر ۱۹۹۳ میں کمیونٹی ہال ٹی۔ٹی۔ نگر بھوپال میں منعقدہ پروگراموں میں ''فلم کوئز ماسٹر'' اور اسمٰعیل مرچنٹ کی فلم ''محافظ'' میں دو دن تک ایکسٹرا میں کام کیا۔ ۷ر سے ۱۴ر جولائی تک بھارت بھون، بھوپال میں فلم پر ورکشاپ کیا۔

نظامت:۔ آل انڈیا ریڈیو کے مختلف پروگراموں و دیگر اداروں کے علمی، ادبی اور

ثقافتی پروگراموں اور نشستوں وغیرہ کی نظامت وغیرہ انجام دی۔

سیمناروں میں شرکت: یو جی سی کے ذریعہ اندور میں منعقد" اردو شاعری میں قومی یک جہتی" مدھیہ پردیش اردو اکادمی (بھوپال) کی تقریب میں علامہ محوی صدیقی چند باتیں چند یادیں اور مدھیہ پردیش میں اردو ڈرامے کی روایت" ساہتیہ اکادمی (اقبال مرکز بھوپال) کی تقریب مین علامہ اقبال کا کلام فلموں میں موضوعات پر پرچہ خوانی۔

قلمی وعملی تعاون: بھوپال، ریوا، اندور، بیتول، جھالاواڑ (راجستھان) کی مختلف علمی ادبی تہذیبی وثقافتی تنظیموں، اردو ایم۔اے۔ایم۔فل، پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کے طلباء، طالبات، اسکالرس، آل انڈیا ریڈیو، دوردرشن بھارت بھون بھوپال کو شعراء، ادباء اور فن کاروں کے نام، پتے، فوٹو سوانحی کوائف وغیرہ یادگاری مجلوں کے لئے فراہم کیئے۔ نئے اور نوجوان فنکاروں کو ریڈیو، ٹی وی اور رسائل وغیرہ سے متعارف کرایا۔ نیز ان کی ذہنی تربیت کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

مراسلاتی کورس اور ورکشاپ: سہارن پور، انبالہ لکھنؤ بھوپال اور دہلی سے فلمی صحافت، ڈراما، اور بیسک ٹریننگ کے سلسلے میں مراسلاتی کورس اور ورکشاپ میں شرکت۔

خصوصی مطالعہ: فلم، ڈراما اور مدھیہ پردیش کا شعروادب۔

ریڈیو، ٹی وی پروگراموں میں شرکت:۔

۱۔ فلمی کہانی نویس وگیت کار جاوید اختر سے بھوپال ریڈیو اور دور درشن بھوپال کے لئے انٹرویوز۔

۲۔ گذشتہ تیس برس سے ریڈیو سے اردو پروڈکشن۔

۳۔ بی۔بی۔سی۔لندن نے اُردو کتب خانوں پر انٹرویو کیا۔

۴۔ ای۔ٹی۔وی۔حیدرآباد نے مکتبہ عابدیہ پر فلم شوٹ کی۔

۵۔ اندور ریڈیو کے لئے مدر ٹریسا کی اندور آمد پر انھیں ریکارڈ کیا۔

انعامات، اعزازات اور سپاس نامے :۔

۱۔ لیکھک پرشکشن مہاودیالیہ سہانپور سے ''ساہتیہ لکار'' کی سند یکم مئی ۱۹۷۴ء کو حاصل کی۔

۲۔ ۱۹۷۵ء میں اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ نے میری پہلی تصنیف ''آواز نما'' (ریڈیو ڈراموں کا مجموعہ) پر انعام دیا۔

۳۔ ٹی۔آر۔ایس کالج ریوا کے شعبۂ اردو کی طرف سے استقبالیہ۔

۴۔ ادارہ ہم خیال اندور (۲۵ ستمبر ۱۹۸۸ء) کی جانب سے باتصویر سپاس نامہ۔

۵۔ مدھیہ پردیش فلم جرنلسٹ ایسوسی ایشن بھوپال کی جانب سے ''فلم سور بھ'' سمان ۱۹۸۹ء۔

۶۔ کہانی لیکھن مہاودیالیہ انبالا چھاؤنی کے مراسلاتی کورس ''فلم کتھا لیکھن'' کی تکمیل پر ۳۱ر دسمبر ۱۹۹۱ء کو سرٹیفکٹ۔

۷۔ ''فن اور فنکار بھوپال'' کی جانب سے ۳۱ر جولائی ۱۹۹۵ء کو ''پروگرام ایکزیکٹو عہدے پر ترقی وتبادلے پر وداعیہ۔

۸۔ بہار اردو اکادمی پٹنہ کی جانب سے کتاب ''مضامین خالد'' پر ۱۹۹۵ء کا انعام وسند۔

۹۔ باب العلم پبلی کیشنز دہلی کی جانب سے رسالہ ''فکر و آگہی'' کی خصوصی اشاعت ''بھوپال نمبر'' کی تکمیل میں قلمی معاونت، عملی معاونت اور گرانقدر خدمات کے اعتراف میں ۱۴ر جون ۱۹۹۶ء کو سند پیش کی گئی۔

۱۰۔ سنچالک مدھیہ پردیش راجیہ شکشک انوسندھان اور پرشکشن پریشد مادھیمک شکشا منڈل بھوپال کی جانب سے (۲۴ ستمبر ۱۹۹۶ء سے ۲۸ر ستمبر ۱۹۹۶ء تک) درجہ اول اردو مضمون کے ''سیکھنا سکھانا پیکیج'' میں شرکت۔

۱۱۔ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کی جانب سے منعقدہ ریڈیو ڈراما پروڈکشن ورکشاپ (۳/ مارچ ۱۹۹۷ء تا ۷/ مارچ ۱۹۹۷ء) میں تربیت حاصل کی۔

۱۲۔ ویسٹرن کول فیلڈس لمیٹیڈ پاتھاکھیڑا ضلع بیتول مدھیہ پردیش میں (۷ فروری ۱۹۹۸ء) ''لگھو ناٹیہ پرتی یوگیتا'' میں ''نرنایک'' (منصف) کے فرائض انجام دیے۔

۱۳۔ ادارہ ''سنسکار'' بیتول کی جانب سے ۱۲/ اگست ۱۹۹۸ء کو ثقافتی پروگرام میں منصف اور استقبالیہ۔

۱۴۔ آل انڈیا ریڈیو اسٹاف ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ (پروگرامس) نئی دہلی سے بیسک کورس اون پروگرامنگ'' کی ایک ماہ کی تربیت (۱۷/ اگست ۱۹۹۸ء تا ۱۸/ ستمبر ۱۹۹۸ء) کی سند۔

۱۵۔ ضلع راشٹر بھاشا پرچار سمیتی بیتول (۱۹۹۹ء۔۱۹۹۸ء) کی جانب سے ''ہندی سیوی سمان'' اور توصیفی سند۔

۱۶۔ صدر جمہوریہ ہند عزت مآب ڈاکٹر اے۔ پی۔ جے۔ عبدالکلام کی ۵/ ستمبر ۲۰۰۲ء کو بھوپال آمد پر پروگرام کوریج پر اسٹیشن ڈائریکٹر شری لکشمیندر چوپڑہ صاحب کی جانب سے توصیفی سند۔

۱۷۔ رائٹرس ایکتا منچ بھوپال کی جانب سے ۱۵/ اگست ۲۰۰۳ء کو اعزازی سند۔

۱۸۔ مدھیہ پردیش مسلم وکاس پریشد کی منعقدہ تقریب ۲۹ جولائی ۲۰۰۳ء کے سووینیئر میں تصویر و تعارف کی اشاعت اور وزیر اعلیٰ مدھیہ پردیش شری دگوجے سنگھ صاحب کے دستِ مبارک سے اعزاز۔

۱۹۔ ادبی تنظیم گلدستہ بھوپال کی جانب سے ۲۴/ جنوری ۲۰۰۴ء کو ادبی خدمات کے اعتراف میں اعزازی سند۔

۲۰۔ آل انڈیا ریڈیو بھوپال کی جانب سے منعقدہ ہندی مضمون نویسی مقابلے میں پہلا انعام ومقام (۲ستمبر۔۲۰۰۴ء) کی سند۔

۲۱۔ ۵رمارچ ۲۰۰۵ء کو کہکشان ادب بھوپال نے ادبی خدمات کے اعتراف میں سپاس نامہ پیش کیا۔

۲۲۔ ساہتیہ اکادمی بھوپال کے منعقدہ علامہ اقبال ڈراما ورکشاپ۔ (۲۱رجنوری ۲۰۰۶ء) میں شمولیت۔

۲۳۔ ڈاکٹر رضیہ حامد اور جناب رہبر جونپوری کے اشتراک وتعاون سے محمد خالد عابدی کی شخصیت اور فن پر (۲۰۰۶ء) کتاب کی اشاعت۔

۲۴۔ موجودہ ملازمت:۔ پروگرام ایکزیکٹو (اردو) آل انڈیا ریڈیو بھوپال۔

۲۵۔ **پتہ**:۔(۱) مکتبہ عابدیہ۔۵۴۵۔دل آرام ہاؤس ہوامحل روڈ، بھوپال۔

(۲) ''رائل ہوس'' فلیٹ نمبر جی/۳، ۱۷۔ا۔چوبدار پورہ، نزد مسجد کلوّو، پرانا قلعہ، بھوپال۔

आज तक इस बात का अहसास तक भी नहीं है और ना ही कभी उन्होंने किसी को एहसास कराने की कोशिश की भी नहीं, जो हंसते मुस्कुराते ख़ालिद आबिदी नज़र आते हैं दर हक़ीक़त वो खुद ऐसी किताब बन गये हैं जो ट्रेजिडी भरे अफसानों से भरी पड़ी है मगर कवर पेज से कहकहों के गुलिस्ताँ का गुमान होता है बचपन की जद्दोजहद, जवानी के टूटे ख्वाब, रिश्तों की कशमकश दोस्तों की मोका परस्ती और उस्तादों की नज़र अन्दाज़ी जैसे उनवानों से उनकी ज़िन्दगी का हर अफसाना ख़ालिद आबिदी की शख़्सियत को बुलन्द दर बुलन्द करता है।

यह मेरी खुशकिस्मती रही है कि उनकी संघर्षमय गाथा हर अफ़साने को मैंने पढ़ा ही नहीं बल्कि कुछ अफसानों से जुड़ते देखा है उन्होंने उन रिश्तों को भी बख़ूबी निभाया है जिन्होंने सिवाऐं रूसवाई के कुछ नहीं दिया उस जुबान से भी गाली सुनी है जिसे अपने हाथों से निवाला खिलाया था। उन्होंने उस दोस्ती को भी बख़ूबी निभाया है जिन्होंने रास्ते मे काँटें बिछाने के सिवाए कुछ नहीं किया। मुझे तो कभी-कभी ऐसा लगता है कि उन्होंने अपने दुखदर्द को छिपाने के लिये फिल्म की किताबें और अदब की दीवानगी से नाता जोड़ा है क्योंकि यह सब कभी धोखा नहीं देते।

मेरे लिये वो उस्ताद भी हैं, दोस्त भी। इन दोनों ही रिश्तों में यह किताबों का जागीरदार मेरे लिये हमेशा खुली किताब रहे। जिसके हर वरक़ पर दूसरों के लिये कुछ करने की चाह देखी है चाहे वो मौका परस्त भाई हो या नाक़दरदान परिवार हो ख़ालिद आबिदी ने अपनी ज़ात से कभी किसी से नाइन्साफी नहीं की सिवाऐ एक शख़्स के वो हैं खुद ख़ालिद आबिदी।

संगीतकार इक़बाल क़ुरैशी(जो आबिदी साहब के रिश्तेदार भी है) ने किसी फिल्म पर बहस पर उतर आये तो ख़ालिद आबिदी ने उर्दू रिसाले रूबी को सबूत की तोर पर पेश करके उनको हैरान कर दिया था ऐसी हैरानी शायद गीतकार जांनिसार अख़्तर को गीतकार एच०एस०बिहारी के मुताल्लिक़ सच जानने पर हुई थी यह किताबों के जागीरदार की दीवानगी का एक पहलू यह भी है उन्हें हर रिसाले के कवर पेज तक याद हैं एक बार एक शख़्स ने चैलेन्ज के साथ यह बात कही कि उर्दू फिल्म रिसाला शमा पर फिल्मी कलाकार की तस्वीर नहीं छपती थी बल्कि क़लमी फ़ोटो होते थे तो आबिदी साहब ने 1947-48 की शमा को पेश किया जिस पर फिल्म अदाकारा नर्गिस का फोटो था इस खुले सबूत के सामने चैलेंज गायब हो गया। फिल्म से जुड़ी ऐसी हज़ारो गल्तियों से फिल्म रिसालों को रूबरू करवाया है इस पहलू पर भी मैंने उनसे सवाल किया था कि आपको इतनी बातें याद कैसे रह जाती हैं तब उन्होंने एक और हैरत अंगेज़ बात बताई कि ऐसे दिन भी गुजरे है जबकि फिल्मी हफ़्तावार उर्वशी ओर उर्दू फिल्म रिसाला कहकशां की कीमत चार आने थे जिसे वह खरीद नहीं पाते थे लेकिन बुकसेलर ने उनकी दीवानगी को देखकर यह सहूलियत दी कि वह सिर्फ दस पैसे देकर यह दोनों फिल्मी अख़्बार दुकान पर खड़े खड़े पढ़ सकते हैं और हैरत की बात यह है कि इन दोनों रिसालो से जुड़ी जानकारी आज भी उनके दिमाग में महफूज़ है।

फिल्मी मालूमात में रचे बसे ख़ालिद आबिदी को एक बात का गिला हमेशा रहेगा कि जब भी फिल्मी दुनिया ने उनकी ओर हाथ बढ़ाया तो उनकी मजबूरियों ने उस बढ़े हाथ को नहीं थामा चाहे फिल्म मंदिर मस्जिद के डॉयलाग लिखने की जिम्मेदार हो या केदार शर्मा के साथ काम करने का मौका हो सबसे अफसोस का पहलू है जिनके ख़ातिर ख़ालिद आबिदी ने सुनहरे मौकों को गवाया है उन्हें

शहर गवाह है कि अपने घर और आफिस से किसी जरूरी काम से जाना हुआ तो टी०टी० नगर, ऐशबाग, ईदगाह हिल्स, आरिफ़ नगर तक पैदल चले गये। प्रोफेसर अज़ीज़ इन्दौरी ने कहा था कि आबिदी साहब के पैदल चलने पर एक मज़मून लिखा जा सकता है।

किताबों के जागीरदार की इस दीवानगी के गवाही उनके फटे जूते भी देते हैं उनकी हर मँहगी किताब उनके कलेक्शन तक पहुँचने की अपनी अलग दास्तान भी रखती है उनकी इस दीवानगी की ज़िद ने मुफ़्त की चीज को भी पैसे से खरीदी मामूली चीज को भी मँहगी खरीदी। क्योंकि उनकी अपनी जागीर को बढ़ाने का जनून एक है मैंने एक बार उनसे पूछा कि आपकी नज़र में ऐसा कौन सा शख़्स है जिसके पास फिल्म लिटरेचर का इतना अच्छा और अनमोल कलेक्शन है तो उन्होंने अपने कयास से कहा कि श्रीराम ताम्रकार और जयप्रकाश चौकसे के बाद शायद मेरा तीसरा नम्बर है।

इतने बड़े कलेक्शन को संभालना और सवाँरना भी एक मुश्किल काम हैं इसी बात को सोचकर मैंने उनसे पूछा था कि इन किताबों के ताल्लुक से कभी दुख भी पहुँचा तो उन्होंने बताया 1962 में इम्तिहान में फ़ेल हो जाने की वजह से उनके वालिद ने कई बेश्कीमती फिल्मी रिसाले और किताबें जला दी थीं इसके बाद बैतूल में आये सैलाब बाढ़ की वजह से कई फिल्मी रिसाले और किताबें बरबाद हो गई जो आज भी आंसुओं के सैलाब में तैरती नज़र आती हैं इसी तरह हिन्दी की बेहतरीन फिल्म मैगज़ीन माधुरी के कलेक्शन का एक बड़ा हिस्सा दीमक की खुराक बन गया जिसका दुख आज भी महसूस होता है ख़ालिद आबिदी का मिशन सिर्फ़ किताबों को कलेक्ट करना ही नहीं है बल्कि उन फिल्मी रिसालों और किताबों से अपनी मालूमात को वो ऊंचाईयाँ दी हैं जो सबको हैरान कर देती हैं फिल्मी दुनिया से जुड़े लोग भी उनकी मालूमात के सामने शिकस्त मान चुके हैं एक बार फिल्म

इस प्रोग्राम की ख़ासियत यह थी कि ख़ालिद आबिदी साहब बिना स्क्रिप्ट लिखे तैयार करते थे इसी तरह फिल्म के ताअल्लुक़ से एक रिसर्च भरा फिल्मी प्रोग्राम तैयार किया जिसमें फिल्मों के अनछुए पहलू को लिया था जिसे अक्सर नज़र अन्दाज़ किया जाता है जैसे बेकग्राउंड म्यूज़िक फिल्मी कोरस की अहमियत फिल्मों में पेंटिंग्स की अहमियत इत्यादि शामिल थे इसके अलावा भी ख़ालिद आबिदी ने फ़िल्मों के तआल्लुक़ से ऐसे कई फ़िल्मी प्रोग्राम (इन्टरव्यू) तैयार किये हैं जो दस्तावेज़ बन गये हैं।

वैसे ख़ालिद आबिदी हम जैसे लोगों के लिये ही चलते फिरते दस्तावेज के मानिन्द हैं उनकी इसी फ़िल्मी मालूमात के मद्देनज़र म०प० फिल्म जर्नलिस्ट एसोसिएशन ने एक फिल्मी नॉलेज काम्पीटीशन रखा जिसमें क्विज़ मास्टर की जिम्मेदारी ख़ालिद आबिदी को सौंपी गई। इस प्रोग्राम में फिल्म अदाकार राजीव वर्मा भी मौजूद थे जो ख़ालिद आबिदी के जादू से नहीं बच सके। इस प्रोग्राम की कामयाबी के बाद दोबारा इस फिल्मी क्विज़ को टिकट से किया जो हाऊस फुल रहा। इसके साथ ही इस संस्था ने ख़ालिद आबिदी के कलेक्शन में जमा सभी फिल्मी रिसालों और किताबों के कलेक्शन की नुमाइश की मेरी मालूमात के मुताबिक यह हिन्दुस्तान की पहली और अनोखी फ़िल्मी किताबों की नुमाईश थी। म०प्र० कला परिषद की कला वीथिका में रखी गई सभी किताबों को देखकर ख़ालिद आबिदी की दीवानगी को एहसास होता था तब मैंने उनसे पूछा था कि आपके इस कलेक्शन पर कितना खर्च आया होगा---

उन्होंने जवाब में कहा था कि ताजमहल, खजुराहो, अजंता बेशकीमती चीजें हैं उन पर कितना खर्च आया होगा यह बेमाअनी बात है लेकिन यह कह सकता हूँ कि इस कलेक्शन के लिये मैंने कई सालों तक ईद पर कपड़े नहीं बनाऐ, बीमार हुआ तो दवाऐं नहीं खरीदीं, मेरा

असर पैदा कर रही हों वहां ख़ालिद आबिदी जैसे लोगों पर तंज़ करना अनोखी बात नहीं होती है ऐसे लोगों के मतलबी मिजाज़ से बखूबी वाकिफ़ ख़ालिद आबिदी सभी तंज तानो की परवाह किये बगैर अपनी जिन्दगी को अपने अन्दाज़ से जी रहे हैं। मेरी दूसरी शिकायत उनसे यह रही है कि उन्होने उर्दू और उर्दू वालों के लिये सब कुछ कुरबान किया जिसका हासिल कुछ नहीं हुआ फ़िल्मों पर उन्होंने इतना लिखा है कि अगर उसे तोला जाये या नापा जाये तो भी मध्यप्रदेश में दूसरा फ़िल्मी उर्दू सहाफ़ी नहीं मिलेगा इतना काम हिन्दी या किसी दूसरी जुबान में किया होता तो पद्मश्री के हक़दार जरूर हो जाते सो मैं ने एक बार उनसे उर्दू कि बजाये हिन्दी में लिखने को कहा था तो उन्होने अपना नज़रिया कुछ इस तरह बयां किया कि माँ की मौजूदगी में माँ को छोड़कर ख़ाला की ख़िदमत करना दुनिया और आख़िरत दोनों में ग़लत है।

लेकिन ख़ालिद आबिदी पर नज़र नहीं गई। चापलूसी में घिरी अकादमी के सामने उन्होंने कभी कोई शिकायत की लेकिन आकाशवाणी उर्दू प्रोग्राम मैं सब ख़ालिद आबिदी को ही क्यों याद करते हैं। यह बात भी मेरी समझ में नहीं आई मैंने अक्सर लोगों से यह जुमला सुना है अरे ख़ालिद भाई जब आप नहीं होते तो आकाशवाणी के उर्दू प्रोग्राम सुनने में मज़ा नहीं आता ज़्यादातर पुरानी रिकार्डिंग ही बजती रहती है इसकी वजह यह है उन्होने आकाशवाणी में भी नौकरी नहीं बल्कि ख़िदमत के ज़ज्बे से काम किया है ऐसी कई प्रोग्रामों की रिर्कांडिंग के किस्से सुने हैं जो उन्होंने बड़ी जद्दोजहद से बनाये थे मलिका-ए-ग़ज़ल बेगम अख़्तर पर बनाये एक प्रोग्राम के लिये उन्होंने लखनऊ हैदराबाद तक की ख़ाक छानी तब जाकर यादगार प्रोग्राम तैयार हुआ फ़िल्म के ताअल्लुक़ से भी उन्होने आकाशवाणी के लिये कई यादगार प्रोग्राम तैयार किये हैं इनमें से एक प्रोग्राम ऐसा था जिसमें फिल्मी गीत के साथ उस गीत से जुड़े रोचक तथ्य भी बताये जाते थे

रूबी, स्क्रीन, फ़िल्म फैअर, रंगभूमी शामिल है जो शायद किसी लायब्रेरी के पास भी नहीं होगी किताबों के इस कलेक्शन को रहमदिल जागीरदार की तरह खुली किताब के मानिन्द रखते हैं जिससे कई लोगों ने फ़ायदा उठाया इन किताबों की संगत में ख़ालिद आबिदी भी खुली किताब बन गये हैं जिस तरह किताबें सभी को इल्मो हुनर देती हैं बिना किसी लोभ लालच के उसी तरह ख़ालिद आबिदी ने भी कोई फ़ायदा उठाने की कोशिश नहीं की।

मैं ऐसे कई मौक़े का चश्मदीद गवाह भी रहा हूँ कि जब ख़ालिद आबिदी को किसी किताब की मुंह मांगी क़ीमत मिल रही थी मगर उन्होंने फ़ायदा नहीं उठाया फ़िल्म राईटर जावेद अख़्तर को अपने दादा मरहूम मुज़तर ख़ैराबादी की किताब नज़रे खुदा की तलाश थी जिसका ज़िक्र उन्होने अपने उस्ताद जहांकदर चुग़ताई साहब से किया तो उन्होने कहा था- किताबों का एक ही दिवाना है ख़ालिद, अगर यह किताब उनके पास नहीं मिले तो फिर मध्यप्रदेश में कहीं और तलाश मत करना चुग़ताई साहब की बात सच भी थी वो किताब ख़ालिद आबिदी के पास थी जबकि चुग़ताई साहब चाहते थे कि ख़ालिद आबिदी इसका अच्छा मुआवज़ा लें मगर ख़ालिद आबिदी ने बिना किसी मुआवज़े के उस किताब की फ़ोटो कापी जावेद अख़्तर को दे दी उनका कहना है जब मैंने ग़ैरों से किताबों का फ़ायदा नहीं हासिल किया तो अपने उस्ताद भाई से क्या फ़ायदा हासिल करूं? जो लोग दुनिया को मतलब के चश्में से देखते हैं उनके लिये महज़ बेवक़ूफ़ी होगी जिसे कुछ लोग कहते भी हैं मुझे भी उनसे कई बार शिकायत हुई कि वो अपनी क़ीमती किताबें ऐसे मौक़ा परस्त लोगों के घर जाकर दे आते हैं जो पीठ पीछे उनकी ही बुराई करते हैं कुछ लोग ऐसे भी हैं जिन्होने अपना मतलब निकाल लेने के बाद Refrence में भी नाम देना मुनासिब नहीं समझा आज जिस समाज में माँ दूध नहीं पिलाती जब तक बच्चा नहीं रोता जैसी कहावतें

फिल्मों से दिलचस्पी होने की वजह से ख़ालिद आबिदी के वालिद नाराज़ रहते थे उन्हें आधी रात में इस तरह परेशान होने पर गुस्सा भी आया मगर ख़ालिद आबिदी को सोते में उठा या मनोहर लाल चोरे को तो जानीवाकर का पता मिल गया मगर ख़ालिद आबिदी को कई दिनों तक अपने वालिद की तीखी बातें सुनना पड़ीं कभी कभी घर वालों की मुख़ालेफ़त भी फ़ायदेमंद साबित होती है यही कुछ ख़ालिद आबिदी के साथ भी हुआ ख़ालिद आबिदी के फ़िल्मी शौक़ से मुख़ालिफ़ रहने वाले वालिद ने बाद में अपने बेटे पर सबसे ज़्यादा फ़ख्र भी किया।

अपने वालिद की मुख़ालिफ़त और हौसला अफ़ज़ाई ने भी ख़ालिद आबिदी को निखारा है ज़्यादातर लोग उनकी मालूमात पर हैरानी करते हैं लेकिन मैं इस बात पर हैरान होता हूँ कि उनको फ़िल्म और उसकी कास्टिंग ही नहीं बल्कि कई फ़िल्मों के फ्रेम टू फ्रेम मंजर भी याद है सो मुझ जैसे फ़िल्म सहाफ़ी के लिये तो चलता फिरता कम्प्यूटर है बिना किसी पासवर्ड के भी कहीं भी पूरी मालूमात मिल जाती हैं उनके इस ज़हनी कमाल को खुदा की देन के साथ किताबों के साथ दीवानगी को भी माना जा सकता है किताबों के साथ दीवानगी को भी माना जा सकता है किताबों के ऐसे दीवाने को अंग्रेज़ी में Book warm कहते हैं यानि किताबी कीड़ा मगर यह लफ़्ज़ ख़ालिद आबिदी की शख़्सियत से जोड़ना नाइंसाफ़ी होगी मुझे तो वो किताबी रियासत के ऐसे जागीरदार नज़र आते हैं जिसको अपनी जागीर के हर फ़र्द की जानकारी है और किस मौक़े पर किस से बेहतर काम लिया जा सकता है उनकी किताबों के कलेक्शन में हर शौबे की किताबें मौजूद है फ़िल्मों पर लिखी गई हिन्दी, उर्दू, अंग्रेज़ी की किताबों के साथ फ़िल्म मेगज़ीन के ख़ास नंबर तो कई फ़िल्म रिसालों का पूरा कलेक्शन मौजूद है और किस रिसाले में क्या खास बात है वो भी उनको बख़ूबी याद है अनगिनत फ़िल्म रिसाले जिनमें फ़िल्म इंडिया पिक्चर पोस्ट शमां सुषमा,

नहीं सके ऐसी ही ख़्वाहिश फ़िल्मकार सागर सरहदी ने सेफ़िया कालेज भोपाल आने पर ज़ाहिर की थी तब भी वो मिल नहीं सके थे। वह उन दिनों इंदौर में थे मशहूर फिल्म लेखक अख़्तर उल ईमान अपने आख़िरी वक़्त में बीमार होंने के बावजूद ख़ालिद आबिदी के खतों का जवाब खुद लिखकर देते थे यह बात उनकी शरीके हयात ने खुद लिखी थी इसी ख़तो किताबत की वजह से कई फिल्मकारों के पते भी उनको मुंह ज़बानी याद हो गये थे इस बात की तस्दीक़ तलत मेहमूद और उनकी गायिका मुबारक-----तक ने की थी तलत मेहमूद जब भोपाल आये तो ख़ालिद आबिदी ने उनसे इंटरव्यूह का वक़्त लिया इस इन्टरव्यू के दौरान अपनी मालूमात से तलत मेहमूद को बेहद मुताअस्सिर किया इन्टरव्यू के बाद तलत मेहमूद ने कहा आप का इन्टरव्यू छपने के बाद एक कापी मुझे ज़रूर भेज दें आप मेरा पता नोट कर लें।

मुझे आप का पता याद है ख़ालिद आबिदी ने कहा तो उन्हें हैरानी हुई सो उन्होने पूछ लिया बताइये.क्या पता है मेरा?

कम्प्यूटर की तरह पूरा पता जब बताया तो तलत मेहमूद ने कहा था- मैं अपनी जिन्दगी में हजारों फ़िल्मी सहाफ़ी से मिला हूँ ज्यादातर को मेरे फिल्मी कैरियर की मालूमात नहीं होती है लेकिन ऐसा फिल्मी सहाफ़ी से पहली बार मिला हूँ जिसे मेरी फिल्मोंग्राफ़ी ही नहीं बल्कि मेरा पता तक रटा हुआ है।

यह बात तलत मेहमूद के लिये ही नहीं बल्कि भोपाल के बुज़ुर्ग हिन्दी अख़बार के सहाफ़ी मनोहर लाल चौरे के लिये भी हैरत की हो गई थी जब उनको जानीवाकर के पते की ज़रूरत थी क्योंकि उनके कोई रिश्तेदार उनके पास गये थे मगर दो तीन दिन तक कोई ख़बर न मिलने पर घर वाले परेशान हो गये किसी को जानीवाकर का पता नहीं मालूम था सो मनोहर लाल चोरे जानते थे कि फिल्मों पर लिखने वाले ख़ालिद आबिदी को शायद कुछ मालूमात हो आधी रात उनके घर पर पहुंच गये

उनकी अदबी मालूमात पर हैरत भी करता हूँ इसलिये कभी कभी यह फैसला करना मुश्किल हो जाता है उनको अदब का आदमी कहूँ या फिल्मी सहाफ़ी लेकिन ख़ालिद आबिदी ने अपने इन दोनों फ़नों में ग़ज़ब का तालमेल भी बिठाया है अपने इस अनूठे तालमेल के बल पर फिल्मी सहाफ़त में उनकी अलग पहचान भी बन गई है क्योंकि अदबी मालूमात से उनके फिल्मी मज़ामीन में जो खुसूसियत पैदा हुई है वो दूसरे फिल्म सहाफ़ी में मैंने नहीं देखी है अगर मेरी इस बात से कोई मुतमइन नही है तो उनको एक बार उन मज़ामीन को ज़रूर पढ़ना चाहिये, जिसमें जोश, अली सरदार जाफ़री कैफ़, ताज, शैरी भोपाली, प्रेमचंद, कृष्ण चंद्रा इस्मत चुग़ताई जैसे अदबी लोगों की फिल्मी सफ़र को तफ़सील से लिखा गया है ऐसे मज़ामीन लिखना दो धारी तलवार पर चलने जैसा होता है किसी भी Refrence में शक पैदा होने से पूरे मज़मून पर अंगुली उठ जाती है शायद इसी लिये दूसरे फिल्मी सहाफ़ी इस तरह के मज़ामीन लिखने की हिम्मत नहीं करते हैं जबकि ख़ालिद आबिदी अपनी बेहतरीन मालूमात के बावजूद फ़िल्म और अदबी लोगों से ख़तों किताबत रखते हैं कोई शक शुब्हा होने पर किसी न किसी पहलू से सच्चाई जान लेते हैं इस ख़तो किताबत के ज़रियें उनके पास बेशक़ीमती खतों का कलेक्शन है फिल्मी दुनिया के लोगों में मजरूह सुल्तानपुरी, तलत मेहमूद, तेजनाथ जार, केदार शर्मा जैसे बुलन्द सितारों के ख़त मौजूद हैं। नर्गिस, सुनील दत्त, रफ़ी अली रज़ा, सागर सरहदी, वज़ाहत मिर्ज़ा, हिम्मतराय शर्मा, अहमद वसी, मास्टर, मास्टर निसार, अपने समय का सुपर स्टार और विनोद कुमार के ख़त मौजूद हैं उनके ख़तो किताबत की फिल्मी लोगों में क्या अहमियत है उसका अन्दाज़ा इस बात से लगाया जा सकता है कि दो बरस पहले दिलीप कुमार भोपाल आये थे उन्होने ख़ालिद से मिलने की ख़्वाहिश ज़ाहिर की थी उस वक़्त झालावाड़ रेडियो स्टेशन पर पोस्टिंग होने की वजह से मिल

की तरह फ़ाइलों पर फ़ाइलें खुलना शुरू हो गईं एक फ़िल्म और उसके एक गाने पर इतनी मालूमात मैंने ख़ालिद आबिदी के अलावा अब तक किसी में नहीं पाई। इन मुलाकातों के बाद मुलाकातों का सिलसिला शुरू हो गया। हर मुलाक़ात में मेरी मालूमात में इज़ाफ़ा होने लगा जो फ़िल्म के साथ दूसरे शोबे की भी होती थी। जिससे यह अन्दाज़ा लगाना मुश्किल हो जाता है कि ख़ालिद आबिदी फ़िल्मी मालूमात में महारत रखते हैं या अदब में जिसके कई किस्से सुनने को मिलते हैं।

एक बार मरहूम जहाँ क़दर चुगताई साहब के पास एक मोहतरमा पी०एच०डी० के सिलसिले में कुछ मालूमात करने की ग़र्ज़ से मिली, चुगताई साहब ने उनके सब्जेक्ट को देखकर कहा इस सब्जेक्ट की मालूमात ख़ालिद आबिदी को अच्छी है क्या आप उन्हें जानती हैं ?

नहीं मैं नहीं जानती। यह कौन शख़्स है? हैरत है तुम भोपाल शहर में रहकर पी०एच०डी० कर रही हो और ख़ालिद को नहीं जानतीं। जबकि वो तुम्हारे पूरे ख़ानदान को जानता होगा। चुग़ताई साहब ने जवाब दिया।

चुग़ताई साहब ख़ालिद आबिदी के उस्ताद थे उनके पसंदीदा शागिर्दों में जावेद अख़्तर और ख़ालिद आबिदी अहम थे। जब जावेद अख़्तर ने फ़िल्मी दुनिया में अपना मुकाम बना लिया तब चुग़ताई साहब ने ख़ालिद आबिदी को भी फिल्मी दुनिया से जुड़ने की सलाह ही नहीं बल्कि जावेद अख़्तर को ख़त भी लिख दिया कि ख़ालिद की मदद करें लेकिन अपनी घरेलू ज़िम्मेदारी के मद्देनज़र उन्होने मुम्बई जाना मुनासिब नहीं समझा आज ख़ालिद आबिदी अपने इस फ़ैसले पर क्या सोचते हैं मैं नहीं जानता पर यह जानता हूँ अगर ख़ालिद आबिदी फिल्मी दुनिया के हो जाते तो कई पी०एच०डी० करने वालों की कुछ परेशानियाँ बढ़ जाती।

मैं उनकी फिल्मी मालूमात से जितना मुताअस्सिर हूँ उतनी ही

चला कि वो मुशायरे की रिकार्डिंग कर रहे हैं। इस वक्त रिकार्डिंग रूम में हैं। कुछ देर इन्तेज़ार करना पड़ेगा। मैं उनसे मिलने के इरादे से रिकार्डिंग रूम के बाहर बैठ गया। दस पन्द्रह मिनिट बाद नौजवान शायर सोहेल सिद्दीक़ी रिकार्डिंग रूम से बाहर आये और उन्होंने बताया कि शायर ज्यादा हैं सो रिकार्डिंग में वक्त लगेगा। इसलिए मैंने कहा बैठकर इंतेज़ार करना मुनासिब नहीं समझा। फिर कभी मिलने के इरादे से रवानगी डाली।

मगर जिस तरह हसन भाई और सोहेल सिद्दीक़ी ने जिस अपनेपन से ख़ालिद आबिदी का जिक्र किया तो मुझे कुछ शुब्हा हुआ कि मैं जिस ख़ालिद आबिदी से मिलना चाहता हूँ क्या यह वही होंगे? क्योंकि मैंने देखा है कि एक दो मज़मून छोटे-मोटे अख़बार में लिखकर कुछ लोग इतने सुकड़ जाते हैं कि उनके अज़ीज़ व दोस्त भी मिलने जुलने वाली बातों पर कतराते हैं। कई तकाज़ों के बाद मिलवाते हैं मगर ख़ालिद आबिदी के मसले पर बद्र वास्ती, हसन भाई और सोहेल सिद्दीकी ने बड़ी असानी से उनसे मिलवाने की कोशिश की इसीलिए मुझे ऐसा लगा शायद नाम की ग़लतफ़हमी होगी और यह ग़लतफ़हमी जल्द ही दूर हो गई। बद्र वास्ती के साथ ही आकाशवाणी में ख़ालिद साहब से मुलाक़ात हुई मेरा तारूफ़ कराते हुए बद्र वास्ती ने कहा आपको भी फिल्म पर लिखने का शौक है ---तो ख़ालिद आबिदी साहब ने मुझे हैरानी से देखा जैसे मैंने कोई ग़लत फील्ड चुनी हो मैं कुछ कहने की हिम्मत भी नहीं कर पाया था कि अचानक एक मोहतरमा तेजी से आईं और बोलीं -- ख़ालिद भाई हंसता हुआ नूरानी चेहरा गीत किस फिल्म का है?

पारसमणी सवाल सुनते ही उन्होंने तपाक से जवाब दे दिया। वो मोहतरमा तो चली गईं मगर मेरे लिए बातचीत का मौका छोड़ गईं फिर इसी गाने और फ़िल्म पर बातचीत का सिलसिला शुरू हो गया कम्प्यूटर

ने बताया कि किसी वजह से ख़ालिद आबिदी जी ने ही कालम लिखना बन्द किया है उन्होंने हमारी बात उन तक पहँचा दी है और उम्मीद है कि वो फिर से कालम लिखेंगे लेकिन ऐसा हुआ नहीं ---

इसके कुछ अरसे बाद भोपाल में उर्दू जुबान में हिन्दी अख़बार अफ़क़ार शुरू हुआ जिसका फ़िल्म पेज डॉ औसाफ़ शाहमीरी की देखरेख में तैयार होता था। मेरे भी कुछ फ़िल्मी आर्टीकल उसमें छपते थे एक बार शाहमीरी जी ने ख़ालिद आबिदी के पुराना फिल्म कालम का जिक्र करते हुए कहा कि उन्हें इस तरह के फ़िल्मी Informative Article चाहिए तब भी मुझे यह गुमान नहीं था कि मोहम्मद ख़ालिद आबिदी भोपाल के बाशिन्दे हैं। आकाशवाणी भोपाल की उर्दू सर्विस में है इसी दौरान इन्दौर नई दुनिया ने हिन्दुस्तानी सिनेमा पर ख़ास नम्बर निकाला जिसमें देशभर के चुनिन्दा फ़िल्म सहाफ़ियों के मज़मून थे इसी ख़ास नम्बर में ख़ालिद आबिदी साहब की फिल्मकार कैदार शर्मा से लम्बी बातचीत का कुछ भाग था। राजकपूर, मधुबाला, गीता बाली, राजेन्द्र कुमार, माला सिन्हा जैसे कलाकारों को पहला फिल्मी ब्रेक देने वाले कैदार शर्मा से बेबाक बातचीत में ख़ालिद आबिदी ने उन अनछुऐ पहलुओं पर भी नज़र डाली जो मुझ जैसे फ़िल्म पर लिखने वाले के लिए भी नये थे। इस इन्टरव्यू का जिक्र मैंने अपने अज़ीज़ दोस्त बद्र वास्ती से किया तो उन्होंने बताया कि वो ख़ालिद आबिदी को जानते हैं आकाशवाणी भोपाल में है और उनसे मिलवाने का वादा भी किया लेकिन बद्र वास्ती की कुछ मसरूफ़ियत की वजह से कोई वक्त़ मुकर्रर नहीं हो रहा था कि हम दोनों साथ जाकर मिलें।

वैसे रेडियो ड्रामों की वजह से मेरा आकाशवाणी जाना होता ही था सो मैंने खुद ही उनसे मिलने का सोचा। उस वक्त ड्रामों की रिकार्डिंग हसन भाई करते थे सो मैंने उनसे ही ख़ालिद आबिदी से मिलने की तमन्ना ज़ाहिर की वो उनसे मिलवाने उर्दू डिर्पाटमेन्ट मे ले गये वहाँ पता

सिनेमा और ख़ालिद आबिदी

रफ़ी शब्बीर

सिनेमा ऐसा मीडिया है जिसका असर समाज के हर तबके पर नजर आता है ज्यादातर लोगों ने इसे सिर्फ़ तफ़रीह समझा है जिसे देखकर कुछ घन्टों के लिए अपने दुख-दर्द भूल जाते हैं फिर वही उनकी रोज़मर्राह की ज़िन्दगी शुरू हो जाती है लेकिन ऐसे लोग बहुत कम नज़र आते हैं जिन्होंने सिनेमा को निचौड़कर ज़िन्दगी में ढाल लिया है। अपने दुख-दर्दों को उसके साथ जोड़ लिया है। ऐसे ही लोगों में से एक मोहम्मद ख़ालिद आबिदी हैं।

ख़ालिद आबिदी साहब से मेरी पहली मुलाकात अख़बार के फिल्मी कालम के जरिये हुई। दैनिक जागरण के भोपाल एडीशन में वो हफ़तावार फिल्मी कालम लिखते थे जो फिल्मी गासिप न होकर Informative होता था। फिल्मी सहाफ़त में गॉसिप तो कोई भी लिख सकता है मगर फ़िल्मी Informative सहाफ़त की हमेशा कमी रही है क्योंकि Informative वही लिख सकता है जो सिनेमा मे रच बस गया हो इसलिये उस फ़िल्मी कालम को पढ़कर सोचता था कि यह फ़िल्मी दुनिया से जुड़े होंगे और यक़ीनन इनका आशियाना बम्बई में ही होगा क्योंकि ज्यादातर फ़िल्मी Informative आर्टिकल लिखने वालों में इन दो बातों में से एक सलाहियत होती है। इस तरह के लिखने वालों में बद्री प्रसाद जोशी, इसाक़ मुजावर, ब्रजेश्वर मदान, जय प्रकाश चौकसे, श्रीराम ताम्रकार, विनोद तिवारी, निकहत काज़मी जैसे नामी गिरामी फ़िल्मी सहाफ़ी के नाम शामिल हैं इसी बीच जागरण ने फ़िल्मी कालम बन्द कर दिया मेरी तरह कई लोगों ने एडिटर को खत लिखकर इसे दोबारा शुरू करने का इसरार किया जिसके जवाब में एडिटर साहब

प्रसारण करना है तो इसके इतिहास के बारे में पूरी जानकारी श्रोताओं को दी जाती है जैसे कि अनारकली और मुगल-ए-आज़म कथानक एक ही था। अनारकली पहले रिलीज हुई। बड़ी अद्भुत फिल्म थी। अकबर का रोल मुबारक ने किया था। इस फिल्म के दो संगीतकार वसंत प्रकाश और सी रामचन्द्र तथा चार गीतकार थे।

"आपकी पसंद के अभिनेता-अभिनेत्री ?"

दिलीप कुमार, राजकुमार, संजीव कुमार, अशोक कुमार मेरे पसंदीदा अभिनेता हैं।

"आपने उर्दू में जो पुस्तकें लिखी हैं उनका हिन्दी अनुवाद करने का विचार है ?"

कुछ पुस्तकों का अनुवाद किया जा सकता है लेकिन कुछ पुस्तकों का अनुवाद करने से उनकी मूलभावना मे बदलाव आ जाता है इसलिए अनुवादित पुस्तकों का महत्व कम हो जाता है।

आपका सपना ?

पारिवारिक दायित्वों से मुक्त होने के बाद मेरा सपना है कि यदि सस्ती दर पर जमीन मिल जाए, चाहे वह शहर से बाहर ही क्यों न हो हम वहां चले जाएगें और अपनी लाइब्रेरी का विस्तार कर उसे आधुनिक रूप प्रदान करेंगे। शोधार्थी अगर भोपाल से बाहर के आते हैं तो उनके लिए अतिथि गृह का भी प्रावधान हो ताकि वे इत्मीनान से अपना शोध कार्य पूरा कर सकें। यही मेरा सपना है।

ख़ालिद आबिदी से हमारे खास प्रतिनिधि की बातचीत

संपर्क सूत्र
खालिद आबिदी
53, हवामहल रोड, भोपाल

● मासिक सदी से सरोकार जुलाई २००३ •

कि - आप हमसे किताब वापस क्यों माँग रहे हैं ? कई बार लड़ाई-झगड़े की नौबत भी आई। पुस्तकों के अलावा कई पत्रिकाओं का भी मेरे पास संग्रह है। दयाकृष्ण निगम द्वारा संपादित ज़माना के कई दुर्लभ अंक तथा आजकल पत्रिका के कई अंक इस पुस्तकालय में सुरक्षित हैं। लक्ष्मीशंकर बेनीलाल दो भाई थे। उन दोनों भाईयों ने एक पुस्तक लिखी। इसकी पांडुलिपि मेरे पास है। पिछले दिनों भोपाल मे पुस्तक मेला लगा, उस मेले में रामपुर से रजा पुस्तकालय का स्टाल भी लगा था। उसके संचालक ने एक पांडुलिपि का चयन प्रकाशन के लिए कर लिया है। उससे जो पारिश्रमिक मिलेगा उसे किताबें और अलमारी खरीदने में खर्च करूँगा।

"आपके इस गैर पारंपरिक शौक से परिवार के सदस्य विचलित तो नहीं होते ?"

17 अलमारियों की वजह से घर का काफी हिस्सा पुस्तकालय ने लिया है। परिवारजन इससे असुविधा महसूस करते हैं। जगह की कमी खलती है। परिवारजनों की दिलचस्पी होती तो फिर पुस्तकों में दीमक नहीं लगती।

आपकी अभिरूचियां ?

आकाशवाणी की नौकरी के बाद जो समय मिलता है, वह पुस्तकालय को समर्पित है। फिल्म और थियेटर में मेरी काफी रूचि रही। संगीतकार इक़बाल कुरैशी हमारे रिश्ते में थे जब वे भोपाल आते थे तब उनसे संसर्ग होता था। पिताजी को मेरा यह फिल्मी अंदाज पसंद नहीं था। एक बार मैंने मुंबई जाने का विचार भी किया लेकिन शिखरवार्ता के संपादक और उस समय हमारे पड़ौसी श्री मनोहर चौरे की समझाइश पर मैंने मुंबई जाना कैंसिल कर दिया। फिल्मी रूझान होने की वजह से पिताजी मुझसे कहा करते थे- तुम क्या फिल्मों से रोजी-रोटी कमाओगे। आज देखिए आकाशवाणी में मुझे फिल्मी गीत संबंधी प्रसारण का काम दिया गया। अनारकली के गीतों पर यदि

वाले की कृपा से अच्छी नौकरी और तनख़्वाह है फिर भी पारिवारिक जिम्मेदारियों के चलते हुये इतना विशाल पुस्तकालय मेनटेन करना मुश्किल है। पहले स्टील की अलमारियाँ नहीं थीं, तब पाँच अलमारियों में आने वाली पुस्तकों में दीमक लग गई। वे सारी नष्ट हो गईं। इन पुस्तकों के विनाश पर मैं कई बार रोया। पिताजी भी मेरी स्थिति देखकर चिंतित हुए।

आपके पुस्तकालय में कितनी पुस्तकें हैं?

१७ अलमारियाँ हैं और एक अलमारी मे डेढ़ अलमारी क्षमता की पुस्तकें हैं। प्रमोशन पर बैतूल गया तो वहाँ पुस्तकें भी ले गया। दुर्भाग्य से वहाँ बाढ़ आ गई और मेरी कई दुर्लभ पुस्तकें बाढ़ में बह गई। उसी बाढ़ में मेरी पी०एच०डी० की थीसिस जिसके साढ़े तीन सौ पृष्ठ मैं लिख चुका था, वह भी बह गई। मेरी थीसिस का टॉपिक उन्नीसवीं शताब्दी का उर्दू पत्र साहित्या। मैंने इस शोध पर काफी मेहनत की थी। सौ-डेढ़ सौ पेज और लिखने थे, वह शोध पूरा हो जाता और पी०एच०डी० अवार्ड हो जाती लेकिन बाढ़ की भयावह त्रासदी ने मेरे सपनों की शवयात्रा निकाल दी। उस हादसे से सबक लेकर मैंने स्पेशल अलमारियाँ बनवाई जिनकी ऊंचाईं बढ़वाकर एक अतिरक्ति बुक सेल्फ बनवाया। इस समय तकरीबन तीस हजार पुस्तकें हमारे पुस्तकालयय में मौजूद हैं।

शोध छात्रों के लिये आपकी पुस्तकें कितनी उपयोगी हैं?

मेरे पुस्तकालय में कई शोध छात्र आते हैं। मैं उन्हें एक बार में ही दस-दस किताबें इश्यू कर देता हूँ ताकि उन्हें बार-बार पुस्तकें लेने न आना पड़े। मैं नि:शुल्क रूप से यह सेवा करता हूँ। कोई शोध छात्र यदि फोन कर देता है तो मैं उसे उसके घर जाकर पुस्तकें दे आता हूँ। कुछ लोग तो किताबें पढ़कर वापिस कर देते हैं और कुछ लोग उन्हें हज़म कर लेते हैं। किताब वापस माँगने के बड़े तल्ख़ अनुभव हुए हैं। कुछ लोगों ने तो किताबें वापिस मांगने पर मेरा गिरेबान ही पकड़ लिया

पहले का जो टेस्ट वह अक्षय कुमार जैन ने लिया। मैं टेस्ट में पास हो गया। दसवीं कक्षा तक मैं नियमित छात्र रहा पर इसके बाद की उच्च शिक्षा मैंने प्रायवेट पास की। मेरे पिताजी भोपाल के बहुत मशहूर टेलर थे। मैं उनके साथ दुकान पर बैठा करता था। फ़ादर पहले फौज मे थे। वहां से नौकरी छोड़कर वे कपड़े सीने लगे। उस समय वे भोपाल के वी०आई०पी० लोगों के कपड़े सिला करते थे। अल्लामा इकबाल और अलीगढ़ यूनिवर्सिटी के संस्थापक के पोते जो कि भोपाल रियासत के शिक्षा मंत्री थे उनके भी कपड़े फादर ने सिए। बड़े-बड़े शायरों और लेखकों के वे प्रिय टेलर रहे।

पुस्तक संग्रह का विचार कैसे आया?

मेरे फादर मिडिल पास भी नहीं थे लेकिन उन्हें पढ़ने-लिखने वालों के प्रति उनके मन में अभूतपूर्व प्रेम था। विशाल हदय था उनका। उनके मन में भाषायी विवाद नहीं था बल्कि वे मुझसे कहते थे कि तुम्हारी हिन्दी बहुत उम्दा होनी चाहिए। फादर दूरदृष्टा थे, वे जांनते थे कि हिन्दी का महत्व आगामी समय में बढ़ने वाला है। आज से पचपन साल पहले उन्होंने मेरी रूचि हिन्दी में बढ़ाने के लिए प्रेरित किया। पिताजी अध्यनशील थे। मेरी दादी उस वक्त नवाब पटौदी की नानी को पढ़ाया करती थीं। पिताजी चाहते थे कि मैं खूब पढ़ूँ। यह मकान पहले कच्चा था। इस मकान में पुस्तकों का रख-रखाव मुश्किल था। हमारे परिवार मे हकीमी पुस्तकों का भ़डार था। कई ऐसी थीं कि उन्हें छोटे बच्चे उठा भी नहीं पाते थे। हमारे पूर्वजों में कई हकीम और हाफ़िज भी हुए। मैं जब नाइंथ में पढ़ता था, तब से ही पुस्तकें खरीद्ने लगा था। कुछ लोग कहा करते थे कि -मैं इधर-उधर से पुस्तकें इकठ्ठी किया करता हूँ। उस दिन से मैंने पुस्तकों की ख़रीदी रसीदें जमा शुरू कर दिया। आज पुस्तकें बाजार में मेरी पहचान पुस्तक ख़रीदने वालों में है। १६-१७ अलमारियाँ आप देख रहे हैं, इन सब में केवल पुस्तकें ही पुस्तकें हैं। किसी से मदद माँगने के लिये मुंह खुलता नहीं है। ऊपर

बहुआयामी व्यक्तित्व के धनी
मो० ख़ालिद आबिदी का कहना है कि
पुस्तकालय को आधुनिक स्वरूप प्रदान करना ही मेरा सपना है

मो० ख़ालिद आबिदी इन दिनों भोपाल आकाशवाणी में कार्यक्रम अधिकारी हैं। आबिदी का मिज़ाज बेहद खुलूस भरा और खुशनुमा है। आबिदी को पढ़ने का इतना जुनून है कि आज उनके निजी पुस्तकालय में तक़रीबन तीस हजार किताबें हैं। यह पुस्तकालय आबिदी की जिंदगी का ख़ज़ाना है। आबिदी ने उर्दू साहित्य में एम०ए० किया। ढेर सारी किताबें लिखी और फिल्मों पर शोधपरक आलेख लिखने में उन्हे महारत हासिल है। आबिदी ने उर्दू और हिन्दी दोनों भाषाओं में जमकर क़लम चलाई है। हर विद्या में उन्होंने डटकर लिखा है। कई नाटक, कहानियां वार्ताऐं, फिल्म क्विज़ इंदौर, रीवा, भोपाल आकाशवाणी केन्द्रो से प्रसारित हो चुके हैं। उन्हें यू०पी० और बिहार उर्दू अकादमियों ने पुरस्कृत और सम्मानित किया है।

आबिदी एक उम्दा लेखक ही नहीं बल्कि बेहतर इंसान भी हैं। उनसे मिलने वाले उन्हें जीवन भर याद रखते हैं। हमेशा अपने पुस्तकालय के भविष्य को लेकर वे चिंतित भी दिखाई देते हैं। अपना पूरा समय वे पुस्तकों के बीच गुजारना पसंद करते हैं। पिछले दिनों उनके हवामहल स्थित आवास पर लंबी बातचीत हुई, उसी के प्रमुख अंश यहां प्रस्तुत हैं।

आपका जन्म एवं शिक्षा-दीक्षा ?

17 नवंबर 1949 को भोपाल में ही हुआ। प्रारंभिक शिक्षा ब्रिजिसिया स्कूल में हुई। सेफ़िया स्कूल में दाख़िला लिया। दाख़िले के

अब तक उ०प्र० उर्दू अकादमी म०प्र० फिल्म जर्नलिस्ट सो० क़लम कारान-ए- इन्दौर ठाकुर रणमता सिंह महा० रीवा आदि संस्थानों से सम्मानित हो चुके है। राष्ट्रपति द्वारा विमोचित भोपाल ग्रंथ के लेख संग्रह में सहयोगी संपादक समूह में अपनी सेवा देने वाले श्री आबिदी बताते है कि उन्हें उन सब का बचपन से ही शौक़ है दो बार तो उनके पिता उनके बहुमूल्य संग्रह की होली तक जला चुके हैं। मगर उनके सिर से फिल्मी भूत न उतरना था न उतरेगा। कोर्स की किताबें खरीदने के लिये मिले पैसों से फिल्मी पत्रिका ख़रीदकर अपने संग्रह में शामिल कर लेने वाले श्री आबिदी 20 वीं शताब्दी में उनका पत्र साहित्य विषय पर पी०एच०डी० कर रहे हैं। इन सब के बावजूद ही वे न केवल तीन जवान बच्चों के बाप है वरना परिवार में वरिष्ठ होने के साथ ही उन पर तमाम जवाबदारियाआयद हैं। बहरहाल फिल्मी भूत का शिकार यह व्यक्तित्व और अधिक और यानि ढेरो फिल्मी साहित्य इक्टठा करने का शौक़ पाले उनका दुर्लभ संग्रहालय भी रहा है। यदि आप चाहें तो उन्हें भेज दें कोई पत्रिका ?

●दैनिक सांध्य प्रकाश भोपाल 4-3-1997

लेकर तब तक के अंक जब पत्रिका फ़िल्म फ़ैयर के नाम से आने लगी। रंग भूमि चित्र लेखा ज़ी स्टार उर्दू की पुरानी फिल्मी पत्रिका समाचार पत्र शमा के अंक फिल्मी हस्तियों के हस्तलिखित पत्र उर्दू साहित्यकारों के 1300 फ़ोटो गायिका लता से संबंधित साहित्य सन 1931 से बोलती फिल्मों से लेकर 1980 तक के गीतों का 5 खंडो में संग्रह फ़िल्मों के 75 व 100 वर्षों के अवसर पर अनेक पत्र-पत्रिकाओं द्वारा प्रकाशित किये गये विषेश अंक हिन्दी स्क्रीन का संपूर्ण रिकार्ड आदि के दुर्लभ संकलन के साथ ही भारत के महापुरूषों संत और न जाने क्या क्या अपनी लायब्रेरी में भर कर रखने का शौक पाले श्री आबिदी 35 फिल्मों पत्रिकाओं के वार्षिक ख़रीददार हैं। फिल्मी विशेषांक श्री आबिदी के पुस्तकालाय की शोभा बड़ा रहे हैं।

फिल्मों से संबंधित बारीक से बारीक जानकारी रखने के शौक़ीन श्री आबिदी ने अपनी लायब्रेरी के लिये ख़रीदा फिल्मी इनसाईक्लो-पीडिया उन्हें अपूर्ण लगता है। आक्सफ़ोर्ड पब्लिकेशन के इस प्रकाशन के बारे में श्री आबिदी बताते है कि फिल्मी इनसाईक्लो-पीडिया के नाम पर पाठकों से किया गया वह एक भद्दा मज़ाक है जिसमें फिल्मों की बारीक तो क्या मोटी जानकारी भी नहीं है।

उर्दू पत्रकारिता से लेकर रेडियो साक्षात्कार क्वीज़ मास्टरी और न जाने क्या-क्या कौन सी फ़िल्मी धुनों में समाए श्री आबिदी लेखक भी हैं। उनकी अब तक नौ पुस्तके, नाटक संकलन, कथा संग्रह व लगभग 40 फ़िल्मकारों के स्वयं के द्वारा लिये गये साक्षात्कार प्रकाशित हो चुके है। फ़िल्म संग्रह पर भोपाल में दो बार प्रदर्शनी लगा चुके श्री आबिदी के इस अजूबे मकतबा आबिदिया शोध संस्थान में मौजूद दुर्लभ सामग्री को रिसर्च स्कालर तो मांग कर ले ही जाते है आकाशवाणी दूरदर्शन भारत भवन जैसी संस्थाऐं उनके द्वारा एकत्र की गई सामग्री को उपयोग का करती हैं।

लगभग 15 शोध ग्रंथों व शोध पत्रों में उल्लेखित यह शख़्सियत

फिल्म और फिल्मी साहित्य के पीछे हैं दीवाने: ख़ालिद

फिल्मों और उनसे जुड़े लोगों के बारे में तमाम जानकारियाँ रखने के शौकीन और उस पर लाखों रूपये फूँक देने वाली एक शख़्सियत बैतूल में मौजूद हैं।

खाने और जेब खर्च के लिए मिले पैसों अपने वेतन का एक हिस्सा फ़िल्मी साहित्य को खरीदने में लगा देने और नये नये कार्यक्रम खोज निकालने वाली ऐसी ही शख़्सियत है ख़ालिद आबिदी झीलों की नगरी और फ़िल्मी हस्तियों से जुड़ी भोपाल की सरज़मी पर 17 अगस्त 1947 में जन्में श्री आबिदी एक ऐसा व्यक्तित्व है जिसे काम करने का भूत सवार होता है।

नाटक कथा कहानी, लिखने वालों और आकाशवाणी से कार्यक्रम अधिकारी के रूप में सम्पति दे रहे श्री आबिदी पर अगर काम करने के अलावा एक और बड़ा भूत पिछले 40 सालों से सवार है तो यह अचरज की बात नहीं होगी कि वाकई वे इस भूत की सवारी के चलते पागल है। जी हाँ श्री आबिदी पर सवार है फ़िल्मी साहित्य इकटठा करने का भूत जिस पर वह अब तक लगभग एक लाख रूपये खर्च कर चुके है। घर परिवार के विरोध के बावजूद नौ साल की उम्र से फ़िल्मी साहित्य की एक एक जानकारी एकत्रित कर रहे श्री आबिदी के भोपाल स्थित निवास पर 11 आलमारियों में रखी 7 हज़ार पुस्तकें जिनमें उर्दू फ़ारसी की पाण्डुलिपियां फिल्मों पर आधारित साहित्य पुरानी फ़िल्मी मैग्ज़ीन की फ़ाइल। सन् 1995 से अब तक का फ़िल्म फ़ैयर 25 वर्षों फिल्मी पाक्षिक फिल्मी पत्रिका माधुरी के प्रथम अंक सुचित्रा से

पर एक विशेष पहचान है। प्रतिमाह वे लगभग तीस-पैंतीस पत्र-पत्रिकाऐं मँगवाते हैं और उनका एक अच्छा खासा संग्रह उनके पास है। फ़िल्म साहित्य को सुरक्षित रखने के लिए उन्होने भोपाल में मकतबा आबिदिया की स्थापना कर उसके द्वारा शोधार्थियों के लिए खोल दिये हैं। इस संस्थान में लगभग पांच हज़ार उर्दू, हिंदी, अंग्रेज़ी, अरबी, फ़ारसी भाषाओं की पुस्तकें, पत्र-पत्रिकाएं, चित्र एवं फिल्म साहित्य पर दुर्लभ सामग्री का संग्रह है। इस संस्थान से अनेक रिसर्च स्कालर संपर्क बनाए हुए हैं।

फ़िल्म विषय में काफ़ी रूचि होने के कारण व फ़िल्म विषय पर प्रकाशित सामग्री पत्र-पत्रिकाओं का विशाल संग्रहकर्ता होने की वजह से श्री आबिदी के फ़िल्म संग्रह की 18-19 जुलाई 1992 को म०प्र० कला परिषद भोपाल में एक प्रदर्शनी भी लगाई जा चुकी हैं इस फ़िल्म में रूचि रखने वालों का अच्छा प्रतिसाद भी मिला। आकाशवाणी भोपाल के अनेक कार्यक्रमों के अंर्तगत एवं रंग कृति संस्था भोपाल द्वारा 21 फरवरी 1992 को टी०टी०टी०आई० सभागार एवं कम्यूनिटी हाल में फिल्म क्विज़ मास्टर के रूप में सैकड़ों क्वीज़ टीमों के बीच वे निर्णायक रहे। साथ ही उन्होंने आकाशवाणी पर कई कार्यक्रमों, सांस्कृतिक आयोजनों एवं साहित्यिक गोष्ठियों का संचालन भी किया।

यू०जी०सी० द्वारा इंदौर में आयेजित उर्दू, शायरी मैं कौमी यक-जहती विषय पर पत्र वाचन एवं म०प्र० उर्दू अकादमी द्वारा आयोजित सेमीनार में म०प्र० में उर्दू ड्रामें की रिवायत (नाट्य परंपरा) एवं अल्लामा महवी सिद्दीक़ी की चंद बातें यादें विषयों पर शोध पत्र वाचन कर श्री आबिदी ने उर्दू को जीवित रखने का पक्ष रखा। इन्होने भोपाल, रीवा एवं इंदौर की अनेक संस्थाओं को हर प्रकार का सहयोग देकर आकाशवाणी, दूरदर्शन, भारत भवन एवं अन्य संस्थाओं के कार्यक्रमों के विषय में साहित्य सामग्री, फोटो एवं पतों की सूचियाँ उपलब्ध कराई। वर्तमान में श्री आबिदी शोधार्थियों को पत्राचार से काफ़ी सहयोग देते हैं।

●भास्कर, ९३ मार्च १९९६

संघर्ष ही सफ़लता की सीढ़ी हैः आबिदी

कहते हैं योग्यता किसी चीज़ की मोहताज नहीं होती, जिस तरह सोना आग में, भट्टी में तपकर कुंदन बन जाता है ठीक उसी तरह कुंदन बनकर म०प्र० के लेखकीय क्षितिज पर चमक रहे हैं मो० ख़ालिद आबिदी जिनका लेखन उर्दू के माध्यम से जन-जन तक पहुँच रहा है अपने शिक्षणकाल से ही उर्दू के प्रति समर्पित श्री आबिदी ने काफ़ी संघर्ष किया तथा उस दौर में अपने परिवार वालों की उपेक्षा भी झेली। लेकिन वे अपने लेखन से विमुख नहीं हुए। अब तक श्री आबिदी की लगभग एक दर्जन पुस्तकें प्रकाशित हो चुकी हैं, जिनमें आवाज़नुमा (रेडियो नाट्य संग्रह) बाग़-ए-फिक्रो मारूफ़ ब मक़त्तेआत-ए-नस्साख़ (एक दुर्लभ पुस्तक का संपादन) पैकर-ए-आवाज़ (रेडियो एवं मंचीय नाट्य संग्रह) ज़ख्मों के दरीचे (कथा संग्रह) शिकायतन अर्ज़ है (हास्य व्यंग्य लेखों का संग्रह) उर्दू इंटरव्यूज़ (उर्दू साहित्यकारों एवं फ़िल्मकारों से पत्राचार द्वारा इंटरव्यूज़) टीचर के बग़ैर (बाल नाट्य संग्रह) फ़िल्म व अदब (फिल्म एवं उर्दू साहित्य संबंधी लेख) मज़ामीने ख़ालिद (समीक्षात्मक लेख) प्रमुख हैं।

इनके अतिरिक्त श्री आबिदी के लगभग एक सौ पचास लेख विभिन्न विषयों पर देश की पत्रिकाओं में प्रकाशित हुए हैं। साथ ही उनके कई नाटक, रूपक वार्ताऐं एवं कहानियाँ आकाशवाणी भोपाल, आकाशवाणी रीवा और आकाशवाणी इंदौर से प्रसारित हो चुके हैं। लगभग पंद्रह शोध ग्रंथों एवं शोध पत्रों में उल्लेखनीय योगदान के लिए भी श्री आबिदी को स्थान दिया गया है।

इस सबके अतिरिक्त श्री आबिदी फ़िल्म व नाटक साहित्य के विशेषज्ञ भी माने जाते हैं। फ़िल्म समीक्षक के रूप में इनकी प्रदेश स्तर

उपयोगिता के बारे में उन्होंने बताया कि इस प्रदर्शनीय का उद्देश्य ऐक समृद्ध फिल्मी संग्रह का लोकार्पण है ताकि लेखक, पत्रकार प्रकाशक और संस्थाऐं भी इसमें रूचि लें और कांम को आगे बढ़ाने में मेरा सहयोग लें भी तथा दें भी। मैंने इस प्रदर्शनी के ज़रिये प्रदर्शनियों की परंपरा को तोड़ा है।

गीतों का कोष भी है जो कि 300 रू० मूल्य का है। भारतीय फ़िल्मों के इतिहास संबंधी भी अनेक पुस्तकें ख़ालिद के पास मौजूद हैं। ख़ालिद का मानना है कि वैज्ञानिक के लिए लेब की तरह और अच्छे लेखक के लिए अच्छी पुस्तकें और पत्रिकाएें आवश्यक है।

व्यवहार में मिलनसार और स्वाभाव से आत्मीय श्री ख़ालिद यूँ तो 1960 से कुछ न कुछ लिखते रहे हैं किन्तु 1967 में उनका पहला बड़ा लेख दिलीप कुमार पर प्रकाशित हुआ उसके बाद अनेक पत्र–पत्रिकाओं में लेख और साक्षात्कार छपने लगे। आबिदी का एक लंबा इंटरव्यू बी०बी०सी० लंदन से म०प्र० के पुस्तकालय एवं दुर्लभ पुस्तकें शीर्षक से प्रसारित हो चुका है। उसके अलावा आकाशवाणी भोपाल से दो रूपक भारतीच फिल्मों के ७५ वर्ष और भारतीय फिल्में तब और अब भी प्रसारित हो चुके हैं आबिदी की अभी तक चार पुस्तकें प्रकाशित हुई हैं और उ०प्र० उर्दू अकादमी से वे पुरस्कृत भी हो चुके हैं।

आबिदी का इरादा है कि वे एक फ़िल्म लायब्रेरी बनायेंगे और अपने लेखों को पुस्तक की शक्ल देंगे। अपने लेखों के बारे में उन्होंने कहा कि मेरे लेखों में रिसर्च एप्रोच ज्यादा है उन्होने आज के फ़िल्मी लेखन पर दो टूक शब्दों में प्रतिक्रिया व्यक्त की कि अनेक लेखों में गलत जानकारियाँ देखने में आती हैं।

ख़ालिद आबिदी जो कि फ़िल्मी जानकारियों के संग्रह के स्वयं पर्याय है बताते हैं कि मैं स्वर्गीय गीतकार जांनिसार अख़्तर और संगीतकार इक़बाल क़ुरैशी से फिल्मी शर्तें जीत चुका हूँ। मैं तो इसे भी अपनी उपलब्धि मानता हूँ।

आबिदी गंभीरता से फिल्म पर ही लिखने को प्राथमिकता देते हैं क्योंकि इस लेखन में अजीब आनंद है, सुख है। वैसे मैं भविष्य में नाटक और हास्य व्यंग्य पर भी लिखना चाहूँगा।

भोपाल में आयोजित अपने संग्रह की दो दिवसीय प्रदर्शनी की

चलाने वाले श्री आबिदी के लेखों की संख्या लगभग ढाई सौ तक पहुंच गई है। म०प्र० विद्युत मंडल में एक लिपिक के रूप में कार्य कर अपना जीविकोपार्जन करने वाले आबिदी को उनकी प्रतिभा ने आकाशवाणी तक पहुँचाया। आकाशवाणी के रीवा और इंन्दौर में रहने के बाद इन दिनों ख़ालिद स्थानीय आकाशवाणी मे बतौर प्रस्तुतिकरण सहायक कार्य कर रहे हैं।

उर्दू में प्रथम श्रेणी स्नात्कोत्तर श्री आबिदी का अतीत संघर्षों का रहा। अपने शौक को वे एक जोख़िम भरा काम बताते हुए कहते हैं कि आज मेरे पास जबकि रहने के लिए उचित आवास भी नहीं है तब भी किसी तरह ऐसे कागज़ी संग्रह को सहेज कर रखने में लगा रहता हूँ। मुश्किलें हैं। मौसमों के बदलाव से पुस्तकों पर तो बुरा असर पड़ता है। घर की कच्ची दीवारें, मामूली छत, नदारद खिड़कियाँ और आसपास की प्रतिकूल पर्यावरण मेरे संग्रह के दुश्मन ही हैं। ख़ालिदं कहते हैं मैं बचपन से ही पुस्तक प्रेमी रहा हूँ यही वजह है कि मैं जब 9 वीं कक्षा में था तो परीक्षा में फ़ेल हो गया। फिर क्या था, घरवालों ने अपना प्रतिशोध मेरे उस समय के संग्रह से लिया और मेरे सामने बलपूर्वक वह सब कुछ मेरी आंखों के सामने नष्ट कर दिया। मैं फ़ेल होने पर इतना नही रोया था जितना पुस्तकों, पत्र पत्रिकाओं, फ़ोटो इत्यादि को चिता में भस्म होते देखकर आंसू बहाये। किताबों के शौक़ में अन्न त्याग दिया। आज भी वही आलम है, एक बार भोजन भले ही न हो पर पत्र-पत्रिकाऐं मैं जरूर पढ़ता हूँ। अपनी अनेक जरूरतों को रोककर मैंने पुस्तकें और पत्रिकाऐं ख़रीदी हैं। ख़ालिद का विश्वास है कि उनहें भोपाल का लगभग प्रत्येक पुस्तक विक्रेता जानता है। श्री ख़ालिद के पास उर्दू-हिन्दी और अग्रेंजी भाषाओं का फ़िल्मी साहित्य है तथा लगभग डेढ़ हज़ार रू० का फ़िल्मी गीत कोष है जो कि पांच खंडो में है। एक एक खंड 700-800 पृष्ठों का है। लता मंगेश्कर के प्राय: सभी

पुस्तकों के मोह में भौतिक सुख मैंने हाशिये पर रख दिये: ख़ालिद

विनय उपाध्याय

कला और शौक़ का संसार इतना विस्तीर्ण है कि उसे किन्हीं सीमाओं में आबंद्ध नहीं किया जा सकता। वह तो किसी भी रूप में व्यक्ति का महत्वपूर्ण अंग बन सकती है कि फिर जीवन में उसके रास्ते आने वाले हर चुनौती का सामना कर वह अपने गन्तव्य को छू सकने के लिए ललक पड़ता है। भोपाल की संस्कृतिक दुनिया में एक नाम बहुत लगन और एक निष्ठता अपने काम को निश्श्चत दिशा देने में तल्लीन है, बहुत खामोशी से। मोहम्मद ख़ालिद आबिदी- जिन्होंने विगत बीस वर्षों से संग्रह और लेखन का रास्ता चुना है। फिल्मों के अनेक आयामों पर इस लंबी अवधि में न केवल उन्होंने दुर्लभ और महत्त्वपूर्ण सामग्रियों को बटोर कर सहेज रखा है बल्कि स्वयं ने सिनेमा केन्द्रित विषयों पर साफ़ सुथरे और सत्यता से पूर्णता: ओतप्रोत लेखन कर फिल्मी पत्रकारिता की दुनिया के सामने एक मिसाल कायम की है। बहरहाल अपने काम और शौक़ को संतोष और सुख की रेखा तक पहुँचाने के लिए जीवन के भौतिक सुखों की अनेक चीज़ों को हाशिये पर रखने वाले ख़ालिद आबिदी की अपनी अलमस्त दुनिया है। कलाओं की राजधानी भोपाल में विगत 18 व 19 जुलाई को स्थानीय फिल्म जर्नलिस्ट एसोसिएशन के तत्वाधान मे उनके फिल्मी संग्रह और स्वयं की प्रकाशित सामग्री के संकलन की एक अनोखी प्रदर्शनी म०प्र० कला परिषद की विथिका में आयोजित की गई।

हिंदी और उर्दू में फ़िल्म के अनेक विषयों से अनवरत कलम

हस्तियों से इंटरव्यू लिए है। विशेष रूप से वह पुराने कलाकारों और भूले बिसरे और शोषित कलाकारों को तलाशते हैं।

कुछ माह पूर्व आकाशवाणी भोपाल से उनके दो रूपक भारतीय फिल्मों के 75 वर्ष और फिल्में तब और अब आधे-आधे घंटे के प्रसारित हो चुके हैं श्री आबिदी की अभी तक चार पुस्तकें प्रकाशित हो चुकी हैं। दो संग्रह नाटकों के एक कथा संग्रह और एक शोध निबंध। आप उत्तर प्रदेश उर्दू अकादमी से पुरस्कृत भी हो चुके हैं।

श्री आबिदी का एक लंबा इंटरव्यू बी०बी०सी० लंदन से म०प्र० के पुस्तकालय एवं दुर्लभ पुस्तकें शीर्षक से प्रसारित हो चुका है एवं प्रकाशित भी हो चुका है।

श्री आबिदी ने फिल्मों से संबंधित साहित्य, चित्र लेख पत्र-पत्रिकाऐं एवं पुस्तकों का एक अच्छा संग्रह किया है जो उनके पुस्तकालय के रूप में सुरक्षित है। इस संग्रह को वह भविष्य में प्रदर्शनी का रूप देना चाहते हैं। एवं फिल्म लायब्रेरी की भी योजना बना रहे हैं।

श्री आबिदी फिल्म समीक्षा एवं लेखों में स्वतंत्रता और निर्भिकता के हामी हैं। उनका कहना है कि हमारी फ़िल्मी पत्रिकाओं और विशेषत: समाचार पत्रों में जो समीक्षाएं छपती हैं वह विज्ञापन की शिकार हो जाती हैं क्योंकि टाकीज़ के मालिक या फिल्म के वितरक अपनी पसंद की समीक्षा चाहते हैं इस प्रकार समीक्षक के दृष्टिकोण और उसकी राय पर अंकुश लग जाता है। अत: वह ऐसी पत्रिका को पसंद करते हैं जिसमें फ़िल्म के सभी मुद्दों पर खुलकर लिखा जा सके।

फिल्म जर्नलिस्ट ऐसोसिएशन ने श्री आबिदी को फ़िल्म संबंधी लेखन के लिए फ़िल्म सौरभ सम्मान प्रदान किया है। ऐसोसिएशन उनके संकलन पर केंद्रित एक प्रदर्शनी इसी माह मध्यप्रदेश कला परिषद भवन में आयोजित कर रही है।

●दैनिक सांध्य प्रचार, भोपाल
१० जुलाई १९९२

मो० ख़ालिद आबिदी साहित्य से फ़िल्म लेखन तक

मध्यप्रदेश जहाँ प्राकृतिक सौंदर्य से भरा पड़ा है, वहाँ प्रतिभावान कलाकारों की भी कमी नहीं है। हमारे म०प्र० के शहर भोपाल के श्री मो० ख़ालिद आबिदी भी उन फ़िल्म लेखकों में से है जो गत बीस बाईस वर्षों से फ़िल्म के अनेक विषयों पर निरंतर और समान रूप से उर्दू हिन्दी में लिख रहे हैं अभी तक उनके लेखों की संख्या ढाई सौ तक पहुँच गयी है।

श्री आबिदी 17 अगस्त 1947 को भोपाल में जन्में । म०प्र० विद्युत मंडल में एक लिपिक के रूप में नौकरी की परंतु चार वर्ष क्लर्की करने के पश्चात आकाशवाणी रीवा से संबद्ध हो गये वहाँ से पाँच वर्ष पश्चात आकाश्वाणी इंदौर से जुड़े रहे। अब स्थानांतरित होकर आकाशवाणी भोपाल में प्रस्तुतिकरण सहायक के रूप में कार्य कर रहे हैं।

श्री आबिदी का बहुत संघर्षमय जीवन रहा है। उनकी शैक्षणिक यात्रा भोपाल, रीवा और इंदौर में पूर्ण हुई। उन्होंने प्रथम श्रेणी में एम०ए०(उर्दू) उर्तीण किया।

श्री आबिदी यूँ तो 1960 से छुटपुट लिख रहे हैं। परंतु 1967 में उनका एक बड़ा लेख दिलीप कुमार पर प्रकाशित हुआ, तदुपरांत आज तक यह सिलसिला क़ायम है। शुरूआत उर्दू लेख से हुई थी परंतु साथ ही साथ वह हिंदी में भी लिखने लगे दैनिक नई दुनिया, दैनिद भास्कर, दैनिक नवभारत, दैनिक जागरण, दैनिक चौथा संसार इत्यादि में उनके लेख प्रकाशित हो रहे हैं।

श्री आबिदी अनेक पत्रों के प्रतिनिधि भी रहे। अनेक फिल्मी

”جناب محمد خالد عابدی سے بھوپال میں شرفِ نیاز حاصل ہوا۔
اگرچہ وہ پروگرام ایگزیکیٹو کی حیثیت سے آل انڈیا ریڈیو بھوپال
سے منسلک ہیں لیکن ان کی بنیادی حیثیت ایک دانشور اور
صاحبِ علم کی ہے۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور سب سے
بڑی بات یہ ہے کہ اردو زبان و ادب کی تاریخ اور اردو کے ادبی
سرمائے سے انھیں عشق ہے۔ انھوں نے اپنی علمی کتابوں کا
ذخیرہ وقف کیا ہے وہ دوسروں کے لئے مثال کا درجہ رکھتا ہے۔ جو
لوگ جو ادب کو منافع کا کاروبار سمجھتے ہیں ان کو محمد خالد عابدی کی
زندگی سے سبق لینا چاہیے“

گوپی چند نارنگ